

اکتوبر 2014

مبارک عید

دکری

ماہنامہ



WWW.PAKSOCIETY.COM

اس شمارے کے ساتھ  
کرن کماجے

عید شل





نہرو کی انجمن کی ایئر اوڈنٹس سیکرٹری  
صدر بازار، لاہور، غزالہ جلد ساز

سہل سہل

- |     |             |                  |     |                   |                    |
|-----|-------------|------------------|-----|-------------------|--------------------|
| 274 | خالہ جیلانی | کرن کار سترخوان  | 268 | شعاع حمید         | کرن کرن خوشنویس    |
| 282 | ادارہ       | حسن و صحت        | 272 | بشری محمود        | یادوں کے دیکھ سہ   |
| 286 | ذوالقرنین   | نہل یہ دہلا      | 273 | شگفتہ سیلوان      | مجھے شاعر لپکتا ہے |
| 287 | مدیرہ کرن   | ناع منی کے زناہم | 278 | ریحانہ امجد بخاری | مُسکراتی کرنیں     |

اکتوبر 2014  
جلد 37 شمارہ 7  
قیمت 60 روپے

خاک و کتابت کا پیٹہ  
کرن  
37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ گمان، 37- اردو بازار کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ٹاؤن، اسلام آباد، کراچی  
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872  
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

- حمد  
نعت
- 11 خالد ایاز ساحل  
11 حافظ مظہر الدین

بیاد محو بابر فیصل

- پردہ شب میں
- 12 ساجدہ حبیب

اسٹریو

مکمل ناول

- |     |             |                  |
|-----|-------------|------------------|
| 14  | شاہین رشید  | بہ روز عید قربان |
| 25  | عابدہ پروین | میری بھی سنئے    |
| 29  | ادارہ       | عید الاضحیٰ      |
| 271 | ادارہ       | پیغام دوست       |
| 20  | شاہین رشید  | منشا پاشا        |
| 265 | آسیہ آفتاب  | مقابلہ آئینہ     |

ناولٹ

- 120 خالہ سالا اور والہ

افسانے

- |     |                |                   |
|-----|----------------|-------------------|
| 34  | تفسیر سعید     | اک ساگر ہے زندگی  |
| 162 | فرمانہ ناز ملک | شاہ آرزو          |
| 58  | ام ٹامہ        | بلاوا             |
| 109 | میمونہ صدف     | ابڑ دریا اور حید  |
| 142 | مصباح علی      | تبدیلی            |
| 186 | صفیہ احمد      | زندگی سے ڈرتے ہیں |
| 150 | سائرہ رضا      | سودا کا کمالا     |

ناول

روزنامہ گمان کی بکسٹریکٹوری  
پاکستان (سالانہ) --- 700 روپے  
ایشیا افریقہ یورپ --- 5000 روپے  
امریکہ کینیڈا آسٹریلیا --- 6000 روپے

ماہنامہ خوانین و انجمن اور ادارہ خوانین و انجمن کے تحت شائع ہونے والے رجول ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی قریب ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔





اکتوس کا کہنا ہے کہ ہاتھوں میں ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قربانی کی جو عظیم الشان نظیر قائم کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے بچے کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور سعادت مند فرزند نے بخوشی سر تسلیم خم کر دیا۔ ایشاد قربانی اور تسلیم دینا کی یہ اللہ تعالیٰ کو اتنی پسند آئی کہ روز قیامت تک اس کی یاد تازہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ دنیا بھر کے مسلمان عید الاضحیٰ کے موقع پر تین دن تک قربانی کے اس عظیم واقعے کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ حج ہو یا قربانی اسلام کی کوئی بھی عبادت بے مقصد نہیں۔ حج بمثل مساوات، بھائی چارے اور قربانی کی تعلیم دیتا ہے۔ اور قربانی ایشاد و محبت، طاعت و تسلیم اور خیر خواہی کا بیجام۔ خوشنویں کا لطف تب ہی ہے جب ان میں دوسروں کو بھی شریک کیا جائے۔ اپنے ارد گرد نظر ڈالیں۔ آپ کی فدا سی امانت سے کچھ لوگوں کو عید کی خوشیاں عیتر آسکتی ہیں اور اصل عید وہی ہے جس میں سب کے دل سرور ہوں۔

ادارہ کرن کی طرف سے قارئین کرام کو عید کی دلی مبارکباد۔

### محمود بابر فیصل

کچھ لوگ عید کے کرتے ہیں اور طویل زندگی پاتے ہیں۔ محمود بابر فیصل کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے مختصر سی زندگی میں کئی کامیابیوں کا انعام دیا ہے۔ محبتیں اور خوشیاں باتیں۔ ذوالقرنین کے دہلے میں اپنے برجستہ جواب سے مسکرائیوں کے پھول کھلانے والے محمود بابر فیصل 25 اکتوبر 1993ء کو دنیا سے رخصت ہو کر ہزاروں لوگوں کو اشک بار کر گئے۔ ان کی برسی کے موقع پر بہنوں سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں (علامہ) سے نوازے۔ (آمین)

### اس شمارے میں،

- یاد محمود بابر فیصل
- "بہ روز عید قربان" مشہور شخصیات سے عید الاضحیٰ کی مناسبت سے دلچسپ سروے،
- "گلوکارہ عابدہ بروین" کہتی ہیں "میری بھی بیٹی"
- "دراڑ" کی بھانجی "منشا بانشا" سے شایین رشید کی ملاقات
- اس ماہ اسب آفتاب کے مقابل ہے آئینہ
- "عید الاضحیٰ اور آپ" قارئین سے دلچسپ سروے،
- "پیغام دوست" ہماری نئی کہیں کے پیغامات پر مبنی نیا سلسلہ
- "نفسیہ سعید اور فرحانہ ناز ملک کے سلسلے دار ناول"
- "قتل ملک" خزانہ جلیل راؤ اور عائشہ ناز کے مکمل ناول،
- "خالہ" سالانہ ادب پر والا "فاخرہ گل کی دلچسپ مزاحیہ تقریر"
- "میرے صدف" ام خمار، مصباح علی، سائرہ رضا اور حفیظہ احمد کے افسانے اور مستقل سلسلے،
- "مغفرت"
- گوشت کے منہ دار بکون کی ترکیب پر مشتمل کرن کتاب "عید پیش" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ
- مغفرت و شش خدمت ہے۔

ماہنامہ کرن 10



میں بھی دیار شاہ اُمم تک پہنچ گیا  
اک تشنہ کام بھر کر م تک پہنچ گیا  
پہنچی تھی داستان مہ کنعاں کی مصر تک  
شہرہ مکہ عرب کا عجم تک پہنچ گیا  
اب مجھ کو غمگسار کی حاجت نہیں رہی  
اب میرا حال شانِ کرم تک پہنچ گیا  
کیا رحمت تمام کا یہ معجزہ نہیں  
مجھ سا غریب اُن کے حرم تک پہنچ گیا  
بیٹھا بونعت بکھنے میں خیر الا نام کی  
جسہول لے کے لوح و قلم تک پہنچ گیا  
اب جاوہ آشنا بھی ہے منزل شناس بھی  
منظر کہ ان کے نقش قدم تک پہنچ گیا

حافظ مظہر الدین

ماہنامہ کرن 11



## پردہ شب میں چھپ گیا خورشید

ساجدہ حبیب



آج 25 اکتوبر ہے باہر بھائی! ہجر کا یہ سال بھی گھر گھر گزر گیا۔ بے آنسو، دلوں سے اٹھتی آہیں، لبوں سے اندر دل کے پھیلے صحرا تک پکارتی آوازیں، شب و روز کے چکر میں گزرتے موسم سب ہی کچھ تو بیت گیا۔ اور یہ لمحات پھر آگئے آفس کے دروازے آج تک نوحہ کناں ہیں سوہ خالی کرسی منتظر ہے جہاں ایک درویش منش، لفظوں کا چاند گر چہرے پر دانش مندی کا چشمہ سجائے ہماری تحرروں کا انتظار کیا کرتا تھا۔

مگر سب ہی کچھ خاک نشین ہو گیا۔

ان گزرتے لمحوں کے بیچ آپ کی جانب سے جو محبتیں ہمارا انصیب بنیں، جو خلوص ہماری زندگی کو گل رنگ کر گیا۔ برسوں ہماری آنکھوں کو برساتا رہے گا۔ ہاں بچ ہی تو کما تھا محمود خاوری نے کہ ”چار اکتوبر بھلا اب کیا کرنے آئے گا۔“

آپ کی جانب سے محبتوں کا جو قرض ہم پر واجب الادا ہے وہ بھلا کیوں کراوا ہو گا۔ مگر اک ستم آپ نے بھی تو کیا۔

اس طویل ہجر کی صورت میں جو سود آپ نے وصول کیا وہ بڑا اذیت ناک ہے۔

اب کی بار اکتوبر کے اوائل میں وہ شام یاد آئی جب

ماہنامہ کرن 12

محترمہ بشری رحمان کے لیے آپ کے ہاں ”کرن شام“ منائی گئی۔ چاند نگر کی کھلی چھت پر کیسی حسین محفل جمی تھی۔ اور اپنی بہنوں کے درمیان کتنے زیادہ خوش گوار موڈ میں آپ میزبانی کے تمام فرائض سرانجام دے رہے تھے۔

ریاض صاحب نے اس موقع پر محترمہ بشری رحمان کے لیے تعریفی کلمات ادا کرتے ہوئے دعوے کے ساتھ کہا۔

”بشری میری بہن ہیں۔“

”بہن کا بوجھ اٹھائیں گے؟“ بشری رحمان نے فوراً سوال کیا۔

”کتنا ہے؟“ باہر بھائی نے آواز لگائی۔

محفل میں مسکراہٹ کے شگوفے پھوٹنے لگے اور بشری جی نے اپنے مخصوص بے تکلف لہجے میں خاص پنجابی زبان میں آپ کو پیار بھری ڈانٹ پلائی۔

”حسن مزاج بہت تیز ہے۔“ میں نے بے سرو کیا۔

”جی ہاں۔“ آپ نے اعتراف کیا۔

”مگر تیز رو سے زیادہ نہیں۔“

تو اب۔۔۔ بس یادیں ہی یادیں رہ گئیں۔ قدرت بھی کبھی کبھی بڑے ستم کر جاتی ہے۔ ہجر کے ان سالوں میں ہماری زندگی جاری و ساری رہی، مگر اک خلش، اک تشنگی کا وہ احساس بھی ساتھ ساتھ رہا، جس سے ہم کبھی آشنا تھے۔ بہت سے احباب کے ساتھ، میں بھی ان خطوط کی منتظر رہی۔ جو میرے نام آیا کرتے تھے۔

خطوط تو بہت آئے باہر بھائی، احباب نے یاد بھی کیا۔ خیریت بھی ہو چھی، مگر وہ دنوں تحریریں تو کھو گئیں، ناخن کے لیے آج بھی نظریں ترستی ہیں۔ آپ کی تحریر اور خالدہ اسد کے طویل خطوط۔

”سنئے! آپ خاک نشین تھیں اور ہم اس دنیا کے پاس، لیکن جب ہماری جانب سے دعاؤں کے انمول تحائف لے کر فرشتے آپ تک پہنچاتے ہوں گے تو عالم بالا میں آپ کی روح کس قدر خوش ہوگی۔ بس یہی احساس ہمیں اس زندگی میں اب تک مطمئن اور خوش رکھے ہوئے ہے۔“



ماہنامہ کرن 13



عید الاضحیٰ ہمارا مقدس مذہبی تہوار ہے۔ عید الاضحیٰ صرف اجتماعی خوشی کا تہوار ہی نہیں بلکہ اس میں جذبہ قربانی کا احساس بھی شامل ہے۔ اس عید کا پیغام ہی قربانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کے احکام کی تعمیل میں اپنی عزیز ترین شے اور قیمتی خواہشات کو قربان کرنے کا جذبہ ہی قربانی کا اصل مفہوم ہے۔ بحیثیت مسلمان کیا ہم قربانی کے اس مفہوم کو سمجھتے ہوئے قربانی کرتے ہیں یا قربانی کا مقصد محض نمود و نمائش ہے اسی حوالے سے ہم نے مشہور شخصیات سے کچھ سوال کیے ہیں آئیے دیکھتے ہیں انہوں نے ان سوالات کے کتنے ”چے“ اور ”دکھپ“ جوابات دیے ہیں۔

### سوالات

- 1۔ عید الاضحیٰ کے دن اگر آپ کو اپنی عزیز ترین ”ہستی“ کی قربانی دینے کو کہا جائے تو آپ کس کو قربان کریں گی / گے؟
- 2۔ جب بکرا چھری تلے ہوتا ہے تو آپ کا کیا دل چاہتا ہے کہ اس کے ”بیچے“ کس کو ہونا چاہیے؟
- 3۔ آپ کے خیال میں ”قربانی“ گھر کے باہر ہونی چاہیے یا مذبح خانے میں؟

## بہ روز عید قربان

### شائین رشید

چھری تلے آجائیں۔ تو کیا ہی بات ہو جائے۔  
3۔ سب کا اپنا اپنا خیال ہوتا ہے۔ اور میرے خیال میں تو گھر کے باہر ہی قربانی ہونی چاہیے۔ ہاں صفائی ستھرائی کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے اور رکھنا بھی چاہیے۔ کیونکہ ثواب بھی ملتا ہے اور اچھا بھی لگتا ہے۔

### ردا آفتاب (شیف)

1۔ میں تو خود ہی قربان ہو جاؤں گی لیکن اپنی کسی عزیز



### عیشا نور (آرٹسٹ)

- 1۔ ”عزیز ترین ہستی“ مجھے اس دنیا میں جو شخصیت سب سے زیادہ عزیز ہیں وہ میری ”امی“ ہیں۔ میں انہیں کھونا نہیں چاہتی لیکن جب اللہ کی راہ میں قربانی کی بات ہے تو میں اپنی امی کو قربان کر دوں گی۔
- 2۔ قلمبند۔ آج کل جو ملک کے حالات ہیں ان کو دیکھتے ہوئے تو یہ ہی کہوں گی کہ ”تمام سیاست دان“



ترین ہستی کو قربان نہیں کروں گی۔ میں تو ایک چیونٹی کو بھی قربان نہ کر سکوں تو قریب ترین ہستی تو بہت دور کی بات ہے۔ خود اپنے آپ کو قربان کر دوں گی کہ نہ میں ہوں گی اور نہ ہی انتہا پر قدم اٹھانے کی نوبت آئے گی۔

2۔ یہ کس طرح کا سوال ہے توبہ توبہ۔ میں تو اس کا جواب بالکل بھی نہیں دے سکتی۔

3۔ جی قربانی گھر کے اندر ہی ہونی چاہیے۔ کیونکہ قصائی آپ کے سامنے قربانی کرتا ہے آپ خود دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ مذبح خانے میں تو بتا بھی نہیں چلتا کہ کس طرح گوشت بنا۔ تو میرے خیال میں گھر ہی بہتر رہتا ہے۔

### مسعود عالم (میوزک ڈائریکٹر، فلم میکر)

- 1۔ میں تو اپنی ”اما“ کی قربانی دوں گا۔ اگرچہ یہ مشکل کام ہے مگر کرنا پڑے گا۔
- 2۔ ہشتے ہوئے۔ میرے دل میں کسی کے لیے تعصب نہیں ہے اس لیے میں ایسا کچھ نہیں سوچتا اور سب اپنے اعمالوں کے خورزمہ دار ہیں اور میں تو لوگوں کو اپنی میوزک کے ذریعے زندگی دیتا ہوں تو کسی کو چھری تلے لیسے دے سکتا ہوں۔
- 4۔ گھر کے باہر بھی نہیں اور گھر کے اندر بھی نہیں۔ بلکہ مذبح خانے میں ہونی چاہیے۔ اس طرح نہ گھر کے باہر زندگی ہوتی ہے نہ گھر کے اندر۔

### عظمیٰ رزاق (کوئینٹ ٹیچر اور ریڈیو پکچرز)



1۔ یہ تو بہت ہی مشکل سوال ہے۔ عزیز ہستی قربان کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ بلکہ عمر بھر ساتھ رہنے یا ساتھ رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے ہی تو کسی عزیز ہستی کی قربانی نہیں دے سکتی۔

2۔ ایمانداری سے بتاؤں۔ ایک زمانہ ہو گیا ہے بکرا کٹتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ دوسری بات کہ میری کسی سے اگر اس حد تک دشمنی ہوئی بھی تو اس کے مرنے کی خواہش کبھی نہیں کروں گی۔ کیونکہ ہم کو بھی اور ہمارے پیاروں کو بھی ایک دن مری جانا ہے۔

3۔ اس سوال کے میں آپ کو دو جواب دوں گی۔ ایک تو یہ کہ مخصوص جگہ یا مذبح خانے میں جانور کی قربانی سے ایک تو صفائی ستھرائی رہتی ہے اور نمائش کا عنصر بھی کم ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ مذبح خانے میں قربانی کرنے سے عید، عید نہیں لگے گی اور آج کی ”نئی نسل“ جو ویسے ہی اپنے کلچر اور لہجہ سے ناواقف ہے۔ اس تہوار کی اہمیت کو محسوس کرنے سے محروم ہو جائے گی۔



### عطا الرحیم (Concept Writer)

1۔ میری ایک بہت اچھی دوست ہے۔ کانسیپٹ رائٹر صحابی ہے، میں چاہوں گا کہ عید کے دن اس کی قربانی دے دوں۔ آپ کے ادارے میں ہی کام کرتی



## سمیرا حسن (آرٹسٹ)

1۔ بہت مشکل سوال ہے اگر لازمی ہے قربانی دینی تو انسان کی اپنی جان ہی عزیز ترین ہوتی ہے تو میں اپنی جان کو ہی قربان کر سکتی ہوں اور کسی عزیز ترین ہستی کو قربان کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔

2۔ چھری کے نیچے سیاست دانوں اور دہشت گردوں کو ہی ہونا چاہیے کیوں کہ وہ پاکستان کے لیے بوجھ بن گئے ہیں۔

3۔ سو فیصد منہ خانے میں قربانی ہونی چاہیے اتنا خوب صورت تموار گندگی کی وجہ سے برا لگنے لگتا ہے اور ایسے میں اگر بارش ہو جاتی ہے تو پھر بیماریاں پھیلنے کا بھی خطرہ ہو جاتا ہے۔ گورنمنٹ کو گھر کے باہر یا گھر کے اندر قربانی کرنے پر پابندی لگانی چاہیے اور منہ خانے میں قربانی کو لازمی قرار دینا چاہیے اور صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھیں۔



## ظفر معراج (ڈرامہ رائٹر+شاعر)

1۔ میں کوئی پیغمبر نہیں ہوں۔ بلکہ ایک انسان ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ادنیٰ سا بندہ کسی کو قربان کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

2۔ نہیں کسی کو نہیں رکھنا چاہتا۔ جب دوست اور عزیز ترین ہستی کے بارے میں سوچ نہیں سکتا تو اپنے

2۔ چھری تلے "ادبانا" کو رکھنا چاہتا ہوں۔

3۔ قربانی گھر میں ہی ہونی چاہیے۔ لیکن صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔

صائمہ اکرم چوہدری (ڈرامہ نگار)

1۔ اف پہلا سوال تو اتنا دل ہلا دینے والا آپ نے کیا ہے کہ جواب دینے سے پہلے ہندو ہزار دفعہ سوچے ہم عام انسانوں کی کمیٹی گھوٹی سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ جو اپنے رشتے ناتوں اور چیزوں کے معاملے میں بہت Possessive ہوتے ہیں۔ ہمارا تعلق تو اس قوم سے ہے جو بے کار چیزوں کو بھی گھر سے پھینکنے سے پہلے ہزار دفعہ سوچتی ہے۔ میری زندگی میں سب سے قیمتی مجھ سے وابستہ میرے پیارے رشتے ہیں جن میں سرفہرست میرے والد صاحب، قابل احترام سر صاحب اور میاں جی ان کو کھونے کا تصور کرنا ہی میرے لیے تکلیف دہ امر ہے۔ اس لیے پلیز اس سوال کا جواب مجھ جیسے چھوٹے دل کے لوگوں سے نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔

2۔ جب بکرا چھری تلے ہوتا ہے تو بہت سی شخصیات ذہن میں آتی ہیں کہ کاش ان کی قربانی اس طرح سے کی جاسکتی، ان میں سرفہرست تو ہمارے محب وطن سیاست دان ہیں جن کی وجہ سے ہمارا ملک اس پنج تک پہنچ گیا ہے کہ غنیمت ملک سے بجلی نام کی چیز ہی ناپید ہو جائے گی کاش ان سیاست دانوں کو قربان کر کے میں ان کا گوشت امریکا کو بھجوا سکتی۔

3۔ قربانی جب تک گھر میں نہ ہو عید کا اصل لطف ہی نہیں آتا جانور جسے اتنے دن پہلے آپ نے اتنی محبت سے رکھا ہوتا ہے اس کا اتنا تو حق بنتا ہے کہ آپ اسے اللہ کی راہ میں قربان کرتے ہوئے اپنے ہی گھر میں اس کا اہتمام کریں۔ میں تو اس حق میں ہوں کہ قربانی آپ کے اپنے گھر میں ہی ہونی چاہیے، لیکن اس قربانی کی باقیات کو گلی میں نہیں سجانا چاہیے یہ انتہائی غلط حرکت ہے جو ہم میں سے بے شمار لوگ کرتے ہیں۔

جو کسی سیاست دان اور ایکٹرس سے کم نہیں ہوتے کون اٹھائے۔ منہ خانے میں قربانی کا فائدہ یہ بھی ہے کہ گوشت صرف بن جاتا ہے۔ بلکہ قربانی کی کھال مانگنے والوں سے چھٹکارا مل جاتا ہے اور گوشت کی اور خون کی بو گھر میں نہیں پھیلتی۔ مجھے تو قربانی کے بعد کی Smell بہت اچھی لگتی ہے۔ میں ہوں ہی نہیں ایسی دنیا کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گھر کی صفائی کون کرے۔ مجھے تو یہ خواہوہ کے نخرے لگتے ہیں بس۔ میں نے کون سا سب کچھ خود کرنا ہوتا ہے۔



## شبم ثانی (آرٹسٹ)

ہمارا اتنا حوصلہ کہاں۔ یہ تو عظیم پیغمبر کی دی ہوئی قربانی ہے جو ہمیں یاد رکھنی چاہیے۔

2۔ بابا! ملک کے سیاست دانوں کو جو اس پاک سرزمین پر بوجھ ہیں اور جو اس پاک فریضے کے قابل نہیں مگر ان پر کوئی چھری پھیر ہی دے تو بہتر ہے۔

3۔ منہ خانے میں ہو تو بہتر ہے۔ اس طرح گھر اور گھر کے باہر گندگی سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔

## امبرارشد (آرٹسٹ)

دشمن کے بارے میں کیوں سوچوں۔

3۔ جن کے لیے قربانی تماشا ہے وہ تو "دکھاوا" کریں گے۔

## بنت ارسلان (فوٹو گرافر+اسٹر)

1۔ بکرا عید کے دن مجھے اپنی عزیز ترین ہستی کو قربان کرنے کے لیے کہا جائے تو میں یہ "موصلا ابراہیمی" نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ جو مجھے عزیز ہے میں اس پر تو قربان ہو سکتی ہوں اسے قربان کر ہی نہیں سکتی۔

2۔ جب بکرا چھری تلے ہوتا ہے تو میں اس کا دم نکالتے دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں، مگر ایسا بہت ہی کم ہوا ہے، اتنی مقدس قربانی یہ یہ سوچنا کہ اس قربانی کے وقت کوئی اور ہو، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قربانی تو منتخب جانداروں کی ہی ہو سکتی ہے۔ ہاں مگر عام روٹین میں یہ پوچھا جاتا تو بہت نام ہیں جنہیں "صدقے" میں قربان کروں اور کس کس کا نام لیں کہ کہیں ہم بھی کسی کے نام کی ہٹ لسٹ میں شامل نہ ہوں۔

3۔ قربانی ایک اہم فریضہ ہے، حکم ربی اور احکام



شرعیہ میں بھی یہی ہے کہ قربانی کے جانور کو کچھ عرصہ اپنے گھر میں رکھو اسے پیار دو تاکہ جب قربانی کرو تو اس پیار کا احساس رہے۔ ہمارے یہاں تو قربانی گھر کی دلیز پر ہوتی ہے مگر کچھ عرصے سے ٹریڈ لاء ہے کہ منہ خانے میں جانور قربان کروایا جاتا ہے کہ قصائی کی کھال اتروائی، لیس سے بچت ہو جاتی ہے اور ان کے نخرے



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### مجموعہ خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



حیثیت ایک مسلمان کے نہیں کسی کی جان لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔  
3۔ تو آپ کے اپنے اوپر منحصر ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ گھر کے اندر یا باہر ہی ہو، منہ خالے میں نہیں۔ ہاں صفائی ستھرائی کا خیال رکھیں۔ کیونکہ گندگی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ منہ خالے میں بھی اس مذہبی تہوار کا تصور نہیں آتا۔

آر جے صارم (FM)

- 1۔ اپنی قربانی دے سکتا ہوں مگر اپنی عزیز ترین ہستی کی نہیں۔ کیونکہ انسان کو اپنی ذات سے زیادہ کوئی عزیز نہیں ہوتا۔
- 2۔ کرپشن کو۔
- 3۔ منہ خالے میں۔ اس طرح گھر اور گھر سے باہر ہونے والی گندگی سے بچ سکتے ہیں۔



- 1۔ بھئی جی پوچھیں تو پہلا سوال تو بہت عجیب سا اور مشکل بھی ہے۔ جو پیارے ہوتے ہیں عزیز ہوتے ہیں بھلا ان کو کون قربان کر سکتا ہے۔ ان پر تو قربان ہوا جاسکتا ہے۔
- 2۔ جناب چھری تلے جانور کو ہی ہونا چاہیے۔ قربانی اللہ کے نام کی ہوتی ہے۔
- 3۔ گھر کے باہر قربانی ہونی چاہیے اور گھر کے تمام افراد کو قربانی دیکھنی چاہیے سنت ابراہیمی کے مطابق۔ منہ خالے میں نہیں۔



عاصمہ جمالیئر (آرٹسٹ)

- 1۔ اپنے علاوہ میں کسی اور کو ہرگز قربان نہیں کرنا چاہوں گی۔
- 2۔ ایسا کوئی نہیں کہ جو میں چھری تلے لانا چاہوں گی۔ چھری تلے صرف بکرے کو ہی ہونا چاہیے۔
- 3۔ گھر کے اندر ہی ہونی چاہیے۔ کیونکہ قربانی اللہ کے لیے ہی کی جاتی ہے۔ دکھاوے کے لیے نہیں۔

میکال ذوالفقار (آرٹسٹ)

- 1۔ افس۔ یہ کیا سوال ہے۔ تصور کرنا محال ہے۔ قربانی تو بہت دور کی بات ہے۔ اپنے پیاروں پر خود نہ قربان ہو جائیں۔
- 2۔ ہا ہا۔ یہ بھی ایک مشکل سوال ہے اور نام تو لینا بھی نہیں چاہیے۔ ویسے ایسا سوچنا گناہ ہے۔ کیونکہ یہ



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY



## منشا پاشا سے ملاقات

شاہین رشید

کم کام کر کے زیادہ شہرت حاصل کرنے والی فنکارہ ”منشا پاشا“ کو۔ آپ ”دراڑ“ میں دیکھ رہے ہیں۔ اس سے قبل آپ نے انہیں ”میری صبح کا ستارہ“ اور ”میرے اپنے“ میں دیکھا ہو گا اور ان دونوں میں ان کے کردار بہت مختلف تھے۔ منشا پاشا نے اپنی خوب صورت پر فاف منس سے اس فیلڈ میں اپنی جگہ بنائی ہے اور ایک دن ایسا آئے گا کہ منشا بہت بڑی اور منجھی ہوئی فنکارہ کہلا جائیں گی۔

کرن کے لیے ہونے والی گفتگو آپ بھی پڑھیے۔ منشا پاشا نے مصروفیات کے باوجود ہمیں ٹائم دیا اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

\* ”جی کیسی ہیں منشا پاشا صاحبہ؟“

☆ ”جی اللہ کا شکر ہے۔“

\* ”آپ کا نام منشا پاشا ہے تو منشا تو عموماً ”لڑکوں کا نام

ہوتا ہے؟“ ☆ ”ہاں جی لڑکوں کا نام ہوتا ہے۔ لیکن میرے والدین نے میرا نام منشا رکھا مگر میں لڑکی ہوں۔ اصل میں میری امی میرا نام ”مارشا“ رکھنا چاہتی تھیں لیکن مارشا کا ساؤنڈ انگریزی نام کی طرح ہے تو اس لیے منشا رکھا کیونکہ منشا کے معنی بھی بہت اچھے ہیں اور پاکستان میں یہ نام لڑکیوں کا نہیں ہوتا مگر بیرون ملک بہت سی لڑکیوں کا نام ”منشا“ ہوتا ہے جیسے شیم لڑکوں کا نام بھی ہوتا ہے اور لڑکیوں کا بھی تو نام تو نام ہی ہوتا ہے۔“

\* ”بالکل۔۔۔ نام تو نام ہی ہوتا ہے۔۔۔ کچھ مزید اپنے بارے میں بتائیں کہ کب کہاں جنم لیا وغیرہ وغیرہ؟“

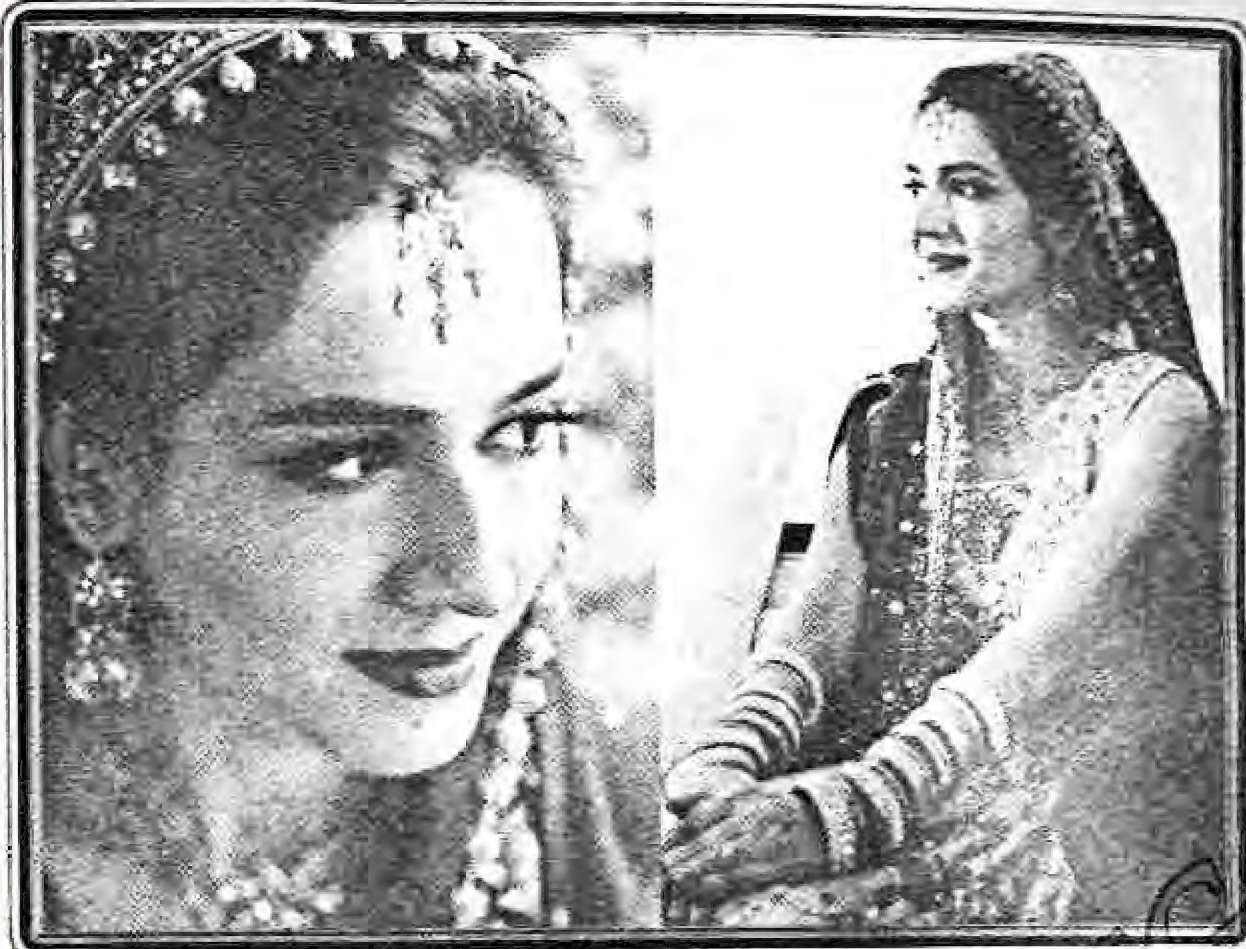
☆ ”جی 19 اکتوبر 1987ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئی۔ میری تین بڑی بہنیں ہیں اور میرا نمبر آخری ہے اور میں نے میڈیا سائنس میں چھل کر لیا ہے اور نہ ہیڈ میں بھی تو ایک سال کی اسکا ر شپ ملی تو امریکہ سے گریجویٹ مکمل کیا جبکہ میری بنیادی تعلیم ”ہیکن ہاؤس“ سے ہوئی ہے۔“

\* ”آپ کی تین بڑی بہنیں ہیں اور پھر آپ۔۔۔ بہنیں بھی اس فیلڈ میں ہیں؟“

☆ ”نہیں وہ اس فیلڈ میں نہیں ہیں۔ میری دو بہنیں ملک سے باہر رہتی ہیں اور تینوں کام کرتی ہیں۔ ایک لائبریرین۔ ایک ڈاکٹر ہیں اور ایک بکری ہیں جبکہ میں واحد اس فیلڈ میں ہوں۔ یعنی ٹیلی ویژن انڈسٹری میں۔“

\* ”آپ کا دل نہیں چاہا کہ میں بھی ڈاکٹر بن جاؤں یا لائبریرین جاؤں یا کچھ اور؟“

☆ ”نہیں نہیں ایسا کچھ نہیں تھا اور نہ سوچا تھا کیونکہ میرے والدین نے کبھی کسی پروفیشن کے لیے فورس نہیں کیا بلکہ یہی کہا کہ جو پروفیشن آپ کو پسند ہو



کہ وہ شادی سے پہلے کیا سوچتی ہیں شادی کے بعد کیا سوچتی ہیں اور کس طرح ان کی زندگی میں تبدیلیاں آتی ہیں۔“

\* ”تھوڑا پیچھے کی طرف جاتے ہیں ”صبح کا ستارہ“ میں ایک بہت چالاک اور بولنے والی لڑکی دکھایا گیا تھا آپ کو تو آپ جیسی لڑکیاں تو بہت ہوتی ہیں کیا ”رومیسٹر (منہم جنگ) جیسی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں؟“

☆ ”جی نہیں ہوتی ہیں یا نہیں لیکن میں ایسی لڑکی سے کبھی نہیں ملی، مگر ہو سکتا ہے کہ آج کے معاشرے میں اتنی معصوم لڑکیاں بھی ہوں اور وہ زیادہ معصوم اس لیے بھی مکی کہ اس کے ارد گرد کچھ زیادہ ہی چالاک لوگ تھے جس کی وجہ سے اس کی معصومیت زیادہ ابھر کر سامنے آئی۔“

\* ”ڈراموں کی کہانیاں ملتی جلتی ہوتی ہیں آپ محسوس کرتی ہیں اس بات کو؟“

☆ ”جی ہوتی ہیں کیونکہ تمام کہانیاں اس معاشرے کی ہوتی ہیں۔ ڈرامہ سیریل ”میرے اپنے“ جو کافی

اسی کی تعلیم حاصل کریں اور ہم بہنوں نے ایسا ہی کیا۔“

\* ”امریکہ جا کر تعلیم مکمل کی۔۔۔ واپس آنے کو دل چاہا تھا؟“

☆ ”بہتے ہوئے ”ایسا نہ دل چاہا اور نہ ہی سوچا کہ وہیں رہ جاؤں۔ اگرچہ وہ ملک اچھا ہے مگر جہاں آپ کا کام ہے جہاں آپ کے گھر والے ہیں تو وہیں رہنے کو دل چاہتا ہے اور چونکہ میں گئی بھی اس نیت سے تھی کہ مجھے جانا ہے۔ تعلیم مکمل کرنی ہے اور واپس آنا ہے۔ اس لیے میں واپس آئی۔“

\* ”اور شادی؟“

☆ ”جی الحمد للہ تقریباً ”ڈیڑھ سال ہو گیا ہے شادی کو۔“

\* ”آج کل کیا کیا چل رہا ہے اور کیا کیا بن رہا ہے؟“

☆ ”کچھ تو چل کر ختم ہو گئے ہیں کچھ چل رہے ہیں ”دراڑ“ تو آپ دیکھ ہی رہی ہیں اور آج کل جو ڈرامے بن رہے ہیں وہ لڑکیوں کی نفسیات پر ہی بن رہے ہیں





پروڈکشن کا ہینڈل کرنا ہوتا ہے اور شروع سے آخر ہر کام میں پروڈیوسر آگے آگے ہوتا ہے۔  
\* ”اپنے کام میں پنچو مل ہیں؟“  
☆ ”الحمد للہ جس دن شوٹ ہو اور صبح کے وقت جانا ہو تو پھر صبح پانچ بجے یا چھ بجے اٹھ جاتی ہوں اور وقت پر پہنچ جاتی ہوں اور جس صبح شوٹ ہوتی ہے تو کوکوشش کرتی ہوں کہ رات کو جلدی سو جاؤں۔“  
\* ”اپنے کام سے اپنی زندگی سے خوش ہیں یا کچھ کمی محسوس کرتی ہیں؟“

☆ ”بالکل جی اپنے کام سے بھی بہت خوش ہوں اور اپنی زندگی سے بھی بہت خوش ہوں اور کبھی نہیں سوچتی کہ یہ کمی ہے یا وہ کمی ہے میں یہ نہیں کہنا چاہتی کہ ہر چیز مکمل سے مگر کیا فائدہ سر پر چڑھانے کا اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ آپ کے پاس ہے آپ اس کا شکر ادا نہیں کرتیں میں تو بہت سے لوگ دیکھتی ہوں کہ جن کے پاس جسمانی اور مالی بہت سی نعمتیں نہیں ہیں تو سوچتی ہوں کہ اللہ نے ہمیں ہر نعمت سے نوازا ہوا ہے۔“

\* ”تقید ہوتی ہے؟ برا لگتا ہے؟“  
☆ ”مجھ پر تقید بھی ہوتی ہے اور تعریف بھی اور ایسا نہیں ہے کہ تعریف سن کر بہت خوش ہو جاتی ہوں اور تقید پر غصہ آتا ہے اور شکر الحمد للہ مجھ پر زیادہ تقید نہیں ہوتی ہے مگر میں سمجھتی ہوں کہ ایک آرٹسٹ کے لیے تقید بھی بہت ضروری ہے۔“

\* ”بالکل۔۔۔ ویسے ماشاء اللہ سے آپ کافی فنکاروں کے ساتھ کام کر چکی ہیں پھر بھی کوئی آرٹسٹ ہیں ایسے جن کے ساتھ خواہش ہو کام کی؟“

☆ ”شکر الحمد للہ میں نے بہت اچھے اچھے آرٹسٹوں کے ساتھ کام کیا ہے جیسے سینئر آرٹسٹ بشری تاجاوید شیخ صاحب کے ساتھ کام کر چکی ہوں اور میں بہت کمی رہی ہوں اس معاملے میں کہ بہت اچھے اچھے لوگوں کے ساتھ کام کیا ہے۔“ میرے اپنے میں ندیم بیگم کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔“

\* ”کون سا کردار کرنے کی خواہش ہے اور کوئی کردار

چھوٹے گھروں کا یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ اس میں گھر والے بھی رہ رہے ہوتے ہیں آپ شوٹ بھی کر رہے ہوتے ہیں تو تھوڑا مسئلہ ہوتا ہے اور میرا اپنا یہ خیال ہے کہ سب سے اچھا شوٹ چھوٹے گھروں کا ہی ہوتا ہے کیونکہ بہت دلچسپ باتیں نکل کر سامنے آتی ہیں۔ اور مجھے مزا آتا ہے چھوٹے گھروں میں شوٹ کرنے کا کبھی درخت کے پاس کھڑے ہو گئے، کبھی کسی کوٹے میں، بہت اچھے انداز میں بنے ہوئے ہوتے ہیں چھوٹے گھر۔“

\* ”آپ کے کرداروں میں غصے کا اہلیمنٹ ضرور ہوتا ہے اصل زندگی میں بھی غصہ ہے؟“

☆ ”نہیں میں کافی نارمل قسم کی لڑکی ہوں تھوڑی سنجیدہ ہوں، فریڈلی بھی ہوں، لیکن غصہ نہیں آتا مجھے اور آپ یقیناً یہ پوچھیں گی کہ پھر میں ایسے رول کیسے کر لیتی ہوں۔ تو کبھی کبھی آپ کوئی وی اسکرین پر وہ چیز نہیں دکھائی ہوتی جو آپ ہیں اور میں تو بہت دور بھاگتی ہوں ان کرداروں سے جو میری شخصیت کے قریب ہوں اور ”صبح کا ستارہ“ میں میرا کردار میری شخصیت سے بالکل برعکس تھا اور میرے لیے بہت مشکل تھا وہ کردار کرنا اور آپ یقین کریں کہ پروڈکشن ہاؤس کے سب لوگ بہت حیران تھے کہ میں نے یہ کردار کس طرح لے لیا کیونکہ سب مجھے رستہ جانتے تھے تو آپ کو وہ کردار کرنا پڑتا ہے جو آپ کی شخصیت سے مختلف بھی ہو اور دلچسپ بھی ہو۔“

\* ”اس فیلڈ میں آمد کیسے ہوئی؟“

☆ ”میں اپنی تعلیم کی وجہ سے اس فیلڈ میں آئی پہلے میں مول پروڈکشن میں پروڈیوسر تھی پھر مجھے اداکاری کی آفرز آنے لگیں تو میں اداکاری کی طرف آ گئی۔“

\* ”تو جب آفرز آئیں تو لگا کہ میں کرلوں گی یا نہیں کر پاؤں گی اور یہ حیثیت پروڈیوسر کے کیا کام کیسے؟“

☆ ”جی مجھے اندازہ تھا کہ میں کرلوں گی اور میرا پہلا ڈرامہ سیریل ”زندگی گزار رہے“ تھا اور اس نے مجھے شہرت سے ہمکنار کیا اور پروڈیوسر کا بنیادی کام

ہٹ گیا تھا اور اس میں سینئر سینئرز کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ جب ان کے بچے جوان ہوتے ہیں تو ان کی زندگی کس طرح بدل جاتی ہے۔ بہت اچھی اور دل کو چھو جانے والی کہانی تھی۔“

\* ”ہم ڈراموں سے کچھ سیکھتے ہیں؟ کہ کہیں ہمارے ساتھ ایسا نہ ہو جائے یا ہمیں یہ کام نہیں کرنا چاہیے؟“  
☆ ”بالکل سیکھتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر آپ کے دل میں کوئی درد ہے کوئی احساس ہے یا اپنے ارد گرد کچھ دیکھتے ہیں اور مسائل کو سلجھانا چاہتے ہیں تو میرا خیال ہے کہ آپ بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور صرف ڈراموں سے ہی نہیں آپ ہر اچھے پروگرام سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ خاص طور پر وہ خواتین اور وہ لڑکیاں جو گھر سے باہر زیادہ نہیں نکلتیں وہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہیں۔ ان کے لیے تو بیوی ایک دروازہ یا کھڑکی ہے جس سے وہ باہر کی دنیا کو دیکھ سکتی ہیں۔“

\* ”ہمارے ڈراموں میں بہت کلیمو دکھایا جاتا ہے۔ محل نما گھر دکھائے جاتے ہیں تو مل کلاس کے لوگوں خاص طور پر لڑکیاں فرسٹریشن کا شکار نہیں ہو جاتیں کیا؟“

☆ ”ایسا نہ کہیں کہ صرف کلیمو اور محل نما گھروں کی ہی کہانیاں ہوتی ہیں۔ مل کلاس کی کہانیاں بھی ہوتی ہیں اب ”میری صبح کا ستارہ“ میں مل کلاس کی ہی لڑکیاں دکھائی گئی تھیں۔ تو میں سمجھتی ہوں کہ دونوں طرح کی کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں اور ہمارے ملک میں محل نما گھر بھی ہیں اور بہت چھوٹے گھر بھی ہیں اور ڈراموں کا مطلب یہ نہیں کہ آپ صرف کہانیاں ہی دیکھیں۔ ڈراموں میں انجوائے منٹ کا پہلو بھی رکھنا پڑتا ہے کچھ ایسے اہلیمنٹ بھی رکھنے پڑتے ہیں کہ آپ دیکھیں تو حیران نہ جائیں۔ اگر انسان سیکھنے والا ہو تو ہر چیز سے سیکھ سکتا ہے۔“

\* ”مشکل کہاں پیش آتی ہے ریکارڈنگ کی چھوٹے گھروں میں یا بڑے گھروں میں؟“

☆ ”مشکل تو خیر شوٹنگ کے دوران پیش آتی ہی ہے



☆ ”ہر رول اپنے ساتھ مشکل چیس لے کر آتا ہے تو رول کو حقیقت کا رنگ دینا ایک مشکل کام ہوتا ہے اور یہ ہی ہمارے لیے چیلنجنگ ہوتا ہے اور روٹینک اور پوزیشن رول بھی اس طرح کریں کہ وہ انسان لگے فرشتہ نہ لگے۔ اس طرح ”صبح کا ستارہ“ میں میرا نیکٹو رول تھا مگر اس کردار سے نفرت نہیں ہوئی۔ بلکہ ہنسی آتی تھی اور چڑی ہوتی تھی کہ کس قسم کی لڑکی ہے۔ ٹوٹل نیکٹو نہیں ہونا چاہیے بلکہ



کردار کے شیڈز ہونے چاہیں۔“  
☆ ”پلاننگ دور تک کرنی ہیں یا سال دو سال کی؟“  
☆ ”زیادہ دور تک نہیں کی پلاننگ۔ اس سال کے لیے کچھ ڈرامے پلان کیے ہوئے ہیں۔ کچھ کام پلان کیے ہوئے ہیں۔ بہت زیادہ اگر فوج میں رہیں تو پھر جال بہ دھیان نہیں رہتا۔“  
☆ ”گھر بلیو امور سے دلچسپی ہے؟“  
☆ ”ہاں بالکل ہے۔ اچھے اچھے کھانے پکالتی ہوں اور زیادہ تر کاشی نیشنل کھانے پکالتی ہوں۔ پھر اپنے

میاں صاحب کے بھی زیادہ تر کام میں ہی کرتی ہوں مجھے اچھا لگتا ہے ان کے کام کرنا۔“  
☆ ”اب تک کتنے کمرشلز کر چکی ہیں اور کمرشل لینے وقت کن چیزوں کو اہمیت دیتی ہیں؟“  
☆ ”اب تک 15 کے قریب کمرشلز کر چکی ہوں اور یہ دیکھتی ہوں کہ ڈائریکٹر کون ہے اور ایجنسی کون سی ہے۔ پیسے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ ویسے کام تو وہ دن میں ہو جاتا ہے۔ بے شک پیسہ زندگی کے لیے بہت ضروری ہے مگر کچھ اور باتوں کو بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔“

☆ ”مارنگ شو ہونے چاہیں اور اس کو بگاڑنے سنوارنے میں کس کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہوسٹ کا یا ڈائریکٹر کا؟“

☆ ”ہاں ہونے چاہیں اچھے ہوتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی تھوڑے روٹین سے ہٹ جاتے ہیں ریٹنگ کے چکر میں اور میں سمجھتی ہوں کہ اس کو بگاڑنے میں ہوسٹ کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا، چینل کی غلطی ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے کنٹریکٹ سائن کیا ہوا ہوتا ہے اور انہیں پھر وہ ہی کچھ کرنا ہوتا ہے جو ان سے کہا جاتا ہے۔“

☆ ”وینٹن شائن ڈے منانا کیسا لگتا ہے؟“

☆ ”میں تو کہتی ہوں کہ انسان کو ہر دن منانا چاہیے۔ اور جن لوگوں سے وہ محبت کرتا ہے خواہ وہ آپ کے شو پر ہوں، بیوی ہو، بچے ہوں، ماں باپ ہوں ایک ایسی شکل دن بنا ہوا ہے تو ضرور منائیں مگر لوگ اس کو غلط انداز میں بھی لیتے ہیں اور غلط استعمال بھی کرتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ یہ انسان کے کردار پر ہے سب کچھ کہ آپ کس چیز کو کس طرح لیتے ہیں۔“

☆ ”قلم کے لیے لالی ووڈ، بلی ووڈ یا ہالی ووڈ میں جانے کا سوچتی ہیں؟“

☆ ”کردار دیکھوں گی کہ کس کا اچھا ہے اسٹوری کیسی ہے پھر ہی کوئی فیصلہ کروں گی۔“

☆ ”اس کے ساتھ ہی ہم نے منشا شاہ سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔“

☆ ☆

میری بھی سنی

## عابدہ پروین

شاہین رشید



1 ”میرا نام؟“  
”عابدہ پروین۔“  
2 ”پیدائش؟“  
”سندھ کے شہر لاڑکانہ میں پیدا ہوئی اور دن ماہ اور نال بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔“  
3 ”بہن بھائی؟“

”میرے والد صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ میں ان کی پہلی بیگم میں سے ہوں اور اپنے والدین کی اکلوتی ہوں۔ جبکہ دوسری والدہ سے دو بھائی اور تین بہنیں ہیں۔“

4 ”سو تلے سکے کا فرق؟“  
”کبھی نہیں ہوا۔ ہم سب بہنیں اور بھائی سکے بہن بھائیوں کی طرح ہی رہے ہیں۔“

5 ”گھر کا ماحول؟“

”مذہبی مگر دوستانہ۔ مگر پردے کی پابندی تھی۔“

6 ”میری تربیت؟“

”میرے والدین نے تو کی ہی ہے۔ مگر ان کے علاوہ

”پہچھو اماں“ نے بھی میری تربیت کی ہے۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔“

7 ”تعلیم؟“

”لی اے۔“

8 ”گھانے کا آغاز کب کیا؟“

”گھروالے کہتے ہیں کہ تین سال کی عمر میں میں نے گانا شروع کر دیا تھا۔“

9 ”پبلک میں فن کا مظاہرہ کب کیا؟“

”جب میں تقریباً بارہ سال کی تھی اور مجھے شاہ

عبداللطیف بھٹائی ایوارڈ بھی ملا تھا۔“

10 ”پہلی پرفارمنس پر تاثرات؟“

”بہت گھبراہٹ تھی اور اتنے سال گزر گئے گاتے ہوئے گھبراہٹ اور خوف آج تک سر پر سوار رہتا ہے۔ ہر بار نئی بات لگتی ہے۔“

11 ”ایوارڈ کی تعداد؟“

”بے شمار ایوارڈ مل چکے ہیں۔ شاہ عبداللطیف

بھٹائی ایوارڈ تو کافی مل چکے ہیں ان کے علاوہ حضرت

شاہ قلندر شہباز ایوارڈ، پرائڈ آف پرفارمنس، ہلال

افتیاز، مگر بی بی ایوارڈ اور انڈیا والوں نے لائف ٹائم

اچیومنٹ ایوارڈ بھی دیا ہے۔“

12 ”میک اپ میں کتنی دلچسپی لگاتی ہیں؟“

”میک اپ؟۔ اپنے لیے کبھی استعمال نہیں کیا نہ

ابھی نہ کبھی تو جوانی میں ہاں لی وی پروگراموں میں

ضرورت کی وجہ سے ہلکا میک اپ کروالتی ہوں۔“





”زیادہ پسند نہیں ہے۔ کبھی کبھار سن لیتی ہوں اور وہ بھی اس لیے کہ آج کل کی میوزک سے واقفیت رکھ سکوں۔“

32 ”آج کل کے گلوکاروں کو کتنا چاہتی ہوں کہ؟“

”کہ وہ اچھا گارے ہیں لیکن وہ ٹینک بھی ضرور لیں کہ گلوکاری کی لمبی عمر پانے کے لیے سیکھنا بہت ضروری ہے۔“

33 ”میری کامیابی کا کریڈٹ؟“

”پہلے میرے والدین پھر شوہر اور اب بچوں کو کریڈٹ دوں گی۔“

34 ”تمہاری میں کس سے ہم کلام ہوتی ہوں؟“

”تمہاری میں اپنے رب سے ہم کلام ہوتی ہوں اور اکیلی کب ہوتی ہوں۔ میرا خدا میرے ساتھ ہوتا ہے۔“

35 ”ایک واقعہ جو میں سنانا چاہتی ہوں؟“

”وہ یہ کہ ایک بار جب انڈیا گئی تو وہاں ایک خاتون مجھ سے ملنے آئیں اور کہنے لگیں کہ میں بیمار رہتی ہوں۔ لیکن اب میں ٹھیک ہوں۔ میں نے پوچھا کیا علاج نہیں کرایا تھا؟ جو اتنا ٹائم لگا۔ کہنے لگیں میں نے بہت علاج کرایا مگر صحت یاب نہ ہو سکی۔ کسی نے مجھے کہا کہ آپ عابدہ پروین کا کلام سنیں تو آپ کو شفا ہوگی اور ایسا ہی ہوا میں نے آپ کا کلام سننا شروع کیا اور خدا نے مجھے صحت دی اور آج میں اس قابل ہوں کہ آپ سے ملنے آگئی۔ تو شفا تو اللہ ہی دیتا ہے بس وسیلہ انسان کو دیتا ہے۔“

36 ”گھر کو بنانے میں زیادہ ذمہ دار کون ہوتا ہے؟“

”اس کے لیے یہ کہنا کہ مرد ذمہ دار ہوتا ہے یا عورت ذمہ دار ہوتی ہے تو غلط ہوگا۔ مرد ہو یا عورت جو سمجھ دار ہو گا وہ ہی ذمہ دار بھی ہوگا۔“

37 ”کس کام میں دیر نہیں کرتی ہوں؟“

”کسی کام میں دیر نہیں کرتی۔ وقت کی پابند ہوں۔“

38 ”محبت کا اظہار کرنا چاہیے؟“

23 ”بچوں کی رائے کو کتنی اہمیت دیتی ہوں؟“

”بہت زیادہ اندازہ ہے کہ آج کل کی سسل میں سوچنے سمجھنے کی زیادہ صلاحیت ہے اور ان سے بہت کچھ سیکھتی بھی ہوں کبھی یہ نہ سمجھا کہ چونکہ میں بڑی ہوں تو میں ٹھیک ہوں اور بچے غلط ہیں۔“

24 ”پسندیدہ لباس؟“

”گھر میں سادہ سا کرتا شلوار گھر سے باہر بھی سادہ لباس ہی پہنتی ہوں البتہ ”جرک“ ضرور لیتی ہوں چادر کے طور پر یا دھوپے کے طور پر۔“

25 ”انسان اپنی کس برائی پر قابو نہیں پاسکتا؟“

”جھوٹ اور غیبت پر۔ اللہ سب کو ان برائیوں سے دور رکھے کہ یہ بہت بری عادتیں ہیں۔“

26 ”فیس بک اور انٹرنیٹ سے دلچسپی؟“

”بہت ہے فیس بک اور ٹویٹر کا استعمال اور مطالعہ کرتی ہوں۔“

27 ”کتابی مطالعہ؟“

”وہ بھی بہت شوق سے کرتی ہوں کیونکہ مطالعہ کے بغیر تو انسان ادھورا ہے۔ مجھے تو جب فرصت ملتی ہے میں کتابیں لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔ مجھے اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کو پڑھنا اچھا لگتا ہے۔“

28 ”شاعری سے لگاؤ؟“

”بہت زیادہ ہے اگر شاعری سے لگاؤ نہ ہو تو پھر کلام کا انتخاب کیسے کروں گی۔“

29 ”پسندیدہ شاعر؟“

”مجھے زیادہ تر صوفی شعراء پسند ہیں کیونکہ مجھے صوفیانہ کلام پڑھنا یا گانا ہی اچھا لگتا ہے۔ احمد فراز، فیض احمد عبید اللہ، علیم اور نصیر ترابی، پروین شاکر بھی بہت پسند ہیں۔“

30 ”ڈراما ٹیگ کے وقت کس کو سنتی ہوں؟“

”جتنے بڑاؤں۔ انڈیا میوزک سنتی ہوں۔ ویسے تو سننے کا موقع نہیں ملتا مگر ڈراما ٹیگ کے دوران تو اپنے آپ کو ہی سنتی ہوں۔“

31 ”آج کل کی میوزک؟“

13 ”شادی؟۔ بچے؟“

”الحمد للہ شادی ہوئی ہے اور میرا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ بیٹے اور ایک بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔“

14 ”میوزک کے علاوہ مشاغل؟“

”فلمیں دیکھتی ہوں۔“

15 ”انڈین پاکستانی؟ پسندیدہ فلمی فنکار؟“

”دونوں دیکھتی ہوں۔ جس کی تعریف زیادہ سنو وہ تو ضرور دیکھتی ہوں مگر کبھی کبھار کیونکہ ٹائم نہیں ملتا پاکستانی فنکاروں میں تو ریمیا اور شان انڈیا میں کافی فنکار ہیں جو بہت پسند ہیں۔ فرست لپی ہے۔“ (تقریباً)

16 ”کتنی زبانوں میں گاتی ہوں؟“

”سندھی، اردو اور پنجابی میں یا آسانی گاتی ہوں۔ باقی مجھے عربی اور فارسی سیکھنے کا بہت شوق ہے۔ کیونکہ حضرت رابعہ بصری کا کلام عربی زبان میں ہے جو کہ بہت خوب صورت ہے تو کوشش کر رہی ہوں سیکھنے کی۔“

17 ”اللہ سے قربت؟“

”بہت زیادہ ہے اور قربت کی وجہ سے ہی تو میں صوفیانہ کلام گاتی ہوں کیونکہ یہ اللہ کے نیک بندے ہیں۔“

18 ”نماز روزے کی پابندی کرتی ہیں؟“

”بالکل کرتی ہوں۔ ہر وقت سچ میرے ہاتھ میں رہتی ہے اور رات کا زیادہ تر وقت عبادت میں ہی گزرتا ہے۔“

19 ”آواز کی حفاظت کس طرح کرتی ہوں؟“

”کھانسی سے پرہیز کرتی ہوں۔“

20 ”کون سے کھانے شوق سے کھاتی ہوں؟“

”مجھے براؤن بریڈ بہت پسند ہے۔ یہ کھانا تو نہیں ہے مگر میں کھاتی ہوں۔ اگرچہ چاول مجھے پسند نہیں۔ لیکن پھر بھی چائے شوق سے کھاتی ہوں۔“

21 ”اور مشروب؟“

”صرف اور صرف سادہ پانی اور وہ بھی نیم گرم۔“

22 ”بچوں کے ساتھ میرا رویہ؟“

”ہمیشہ دوستانہ رہا ہے۔ کبھی ڈانٹ مار نہیں کی بلکہ بچوں کی شرارتیں مجھے بہت پسند ہیں۔“



## عید الاضحیٰ اور آپ

اداره

کائنات خالده۔۔۔ کراچی

کمرے میں بیٹھ کے کھاتے ہیں اور ہمارے گھر وال  
جاہل بنتے ہیں وہ بھی کوئی نہیں کھاتا، کیونکہ دماغ پہ  
گوشت کی بوسماکی ہوتی ہے اور اس دن تو مجھ سے کچھ  
کھانا ہی نہیں جاتا۔

3۔ کوئی خاص ٹوٹکا تو نہیں گوشت کو محفوظ رکھنے کا  
سوائے اس کے گوشت کے کباب بنا کر یا کو فٹے ہنا کے  
اسے فریزر میں رکھ دیں تاکہ لمبا عرصہ چل سکے۔ ہاں  
یاد آیا گوشت کو ایل کر بھی فریز کر سکتے ہیں۔

4 - بابا! اس سوال پہ جیسی اس لیے آئی کیونکہ مجھے جانوروں سے بہت ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ مار نہ دیں۔ جب بھائی لوگ قریب ہوں تب بکرے کو گھاس کھلا دیتی ہوں، ڈر ڈر کے وہ بھی جس پہ سب مذاق بھی اڑاتے ہیں اور جانور کو زخم ہوتے ہوئے تو میں دیکھ ہی نہیں سکتی، مجھے خوف آتا ہے۔ ویسے واقعہ تو بہت ہیں پر زیادہ کچھ یاد نہیں آ رہے، لیکن ایک واقعہ

1 - مجھے یاد تو نہیں پڑا کہ کبھی ایسی قربانی یا ایثار میں نے دیا ہو، لیکن ہاں یہ یاد ضرور پڑتا ہے کہ میں نے کام بہت کیے ہیں جیسے کہ سب سے بڑا کام دھڑ کوشت کو ہاتھ لگانا میرے نزدیک یہ میرے نفس کی قربانی ہے (کیونکہ پہلے مجھے گوشت کو ہاتھ لگانے ہوئے بہت ڈر لگتا تھا) اور دوسری قربانی نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی خالہ نالی کے کلچر کے برتن دھونا (مطلب یہ کہ میں کلچر مگر وہ وغیرہ ان سب چیزوں کے قریب بھی نہیں جاتی)

2 - بابا باب - کیا سوال پوچھ لیا، مجھے لگتا ہے کہ ہمارا گھر عید الاضحیٰ میں وہ واحد گھر ہوتا ہے جہاں عید کے دن گوشت کا کچھ بھی نہیں بنتا، اصل میں بات یہ ہے کہ میرے ابو، تایا ابو اور بڑی بہن (جس کی اب شادی ہو گئی ہے) کے علاوہ کوئی بھی گوشت گروہ، کبلی پسند نہیں کرتا، اسی لیے خالہ کلجی بناتی ہیں تو وہ لوگ الگ

اسلام کی کوئی بھی عبادت بے مقصد نہیں۔ سچ ہمیں مساوات بھائی چارے اور قربانی کی تعلیم دیتا ہے اور قربانی ایثار و محبت، طاعت و تسلیم اور خیر خواہی کا پیغام۔ اس اجتماعی تہوار کا حقیقی مفہوم تب ہی پورا ہو سکتا ہے جب ہم اس کی روح کو سمجھیں اور صدقِ دل سے اس پر عمل پیرا ہوں۔ کیا ہم قربانی کی اصل روح سے واقف ہیں؟ غمیدہ الائجی کی آمد کے موقع پر قارئینِ کرام سے کچھ سوالات اسی حوالے سے کیے گئے ہیں۔ دیکھیں قارئین اس بارے میں کیا کہتی ہیں۔

## سوالات

- 1۔ عید الاضحیٰ کا ستوار ہمیں ایثار و قربانی کی یاد دلاتا ہے۔ آپ نے زندگی میں کبھی ایسا ایثار کیا یا قربانی دی جو آپ کے خیال میں بارگاہ الہی میں بے حد پسندیدہ ہو گا اور اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔
- 2۔ عید الاضحیٰ پر گوشت کے پکوان تو بہت بنتے ہیں۔ کوئی ایسی خاص ڈش جو گوشت کی نہیں ہو اور اس عید پر آپ سے فرمائش کی جاتی ہو۔
- 3۔ گوشت کا ذائقہ برقرار رکھنے اور اسے زیادہ عرصے محفوظ رکھنے کے لیے خاص ٹونکے جو آپ استعمال کرتی تھے۔
- 4۔ قربانی کے جانور سے متعلق کوئی خاص واقعہ جو آج بھی آپ کے لبوں پر مسکراہٹ لے آتا ہے۔



وہاں رہنے والے ہر مذہب کے لوگ بھی شریک ہوئے تو مجھے یاد ہے کہ جب پروگرام ختم ہوا تو وہاں کی لڑکیاں دیوانہ وار دوڑتی ہوئی میرے پاس آئیں اور آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولیں ہم نے اسلام قبول کیا اور اس وقت میری حالت دیکھنے والی تھی۔“

45 ”بہت خوش ہو رہی ہے؟“

”اس وقت جب میرے پروگرام شروع ہونے سے دو تین گھنٹے پہلے ہی لوگ آنا شروع ہو جاتے ہیں۔“

46 ”میرا مشن ہے؟“

”میں نے اسلام آباد میں ایک آرٹ گیلری بنائی ہے جس کا افتتاح فہمیدہ مرزا (سابق اسپیکر قومی اسمبلی) نے کیا تھا۔ اس آرٹ گیلری میں کافی شعبے قائم کیے ہیں ہم نے جس میں کافی کام ہو رہا ہے تو اس گیلری سے خواتین کو بہت اچھا روزگار مل رہا ہے تو میرا مشن ہے کہ میں اس آرٹ گیلری میں موسیقی کی کلاسز بھی شروع کروں اور پوری دنیا سے قابل پروفیسرز کو لیکچر کرنے کے لیے بلاؤں۔“

47 ”میرے بچے اور یہ فیلڈ؟“

”باقاعدہ تو کوئی نہیں آیا۔ مگر رحمان ہے ان کا اور  
سیری بیٹی کو تو ہر طرح کی ڈیزائننگ کا شوق ہے اور  
عماری آرٹ گیلری کو سنوارنے کے کھارے میں اس کا برا  
تھ ہے۔“

48 ”مَزاں میں نرمی ہے یا گرمی؟“  
”گرمی نہیں ہے خوش مَزاں ہوں غصہ کم آتا ہے۔“

49 ”سنجیدہ کب ہوتی ہوں؟“

”جب اپنے کام میں مگن ہوتی ہوں۔“

50 "خوش کب ہوتی ہوں؟"

”جب لوگ تعریف کرتے ہیں میری گانگیسی پہ  
 لالیاں بجاتے ہیں اور مجھے آکر گلے لگاتے ہیں۔“

51 ”موسم جو پسند ہے؟“

”مسروہی اور بہار۔“

52 ”وعائیں قبول ہوتی ہیں؟“

5 ”ماضی کیا ہے؟“

”جو کھو جائے وہاپس نہ

54 ”زندگی میں کیا کھویا؟“

”جو وقت خدا کی یاد کے بغیر

55 "کیا کیا؟"

”جو اس کی یاد میں گزارا وہ پاپا اور صوفیانہ کلام کا لڑ  
جزیرہ پر آئی ملی وہ پاپا۔“

58 میری آنڈیل محبت؟

”محکمیت نہیں، تحقیقات ہیں۔“ حضرت رابعہ  
 مصری، حضرت بی بی فاطمہؓ اور حضرت بی بی زینب رضی  
 اللہ تعالیٰ عنہ۔“



تھی، بڑی بہن (صبا جہانزیب) اس وقت میٹرک کی طالب علم تھی، درحقیقت یہ واقعہ پیش بھی انہی کے ساتھ آیا ای ابو جج کے لیے سعودی عرب گئے ہوئے تھے اور ہم بچے صبا، زہیر، عائشہ، عمیر، تیا اور تائی کے پاس تھے۔ جی جناب تیا ابو بکرالے کے آئے انہوں نے ہمارے گھر باندھ دیا۔ ہمارا گھر ایک ہی سے پورشن آنے سامنے بنے ہوئے ہیں بڑی بہن جب صبح سو کر انہی تو دیکھا کہ بکرا غائب بہت پریشان ہوئی، سخن میں دیکھا تو محترم بکرا صاحب مزے سے نسل رہے تھے پتا نہیں کیسے اس کی رسی ڈھیلی ہو گئی اور بکرے کے مزے ہو گئے پھر کیا تھا بکرے کو قابو میں کرنے کے لیے اس نے تیا ابو کو آواز میں دس (حالانکہ وہ بڑی جی دار ہے ماشاء اللہ) پھر تیا ابو نے بکرے کو قابو کیا لیکن اس کے بعد ہمارا پورا سخن، گیلری بکرے کے گند کی وجہ سے گند اہو گیا تھا جیسے ہی وہ بکرا گیا میں بھی کھسک گئی (صفائی نہ کرنی پڑے اسی وجہ سے) خیر جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو ہنسی بہت آتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ کا شکر ادا بھی کرتی ہوں کہ بکرے کو چور نہ لے اڑا، کیونکہ یہ قول تیا ابو کے انہوں نے بکرے کو صحیح طرح باندھا تھا۔ میری طرف سے تمام مسلمانوں کو "عید مبارک"

### ثناء شہزادہ۔۔۔ کراچی

1 - آپ کے پہلے سوال نے تو ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ویسے تو مجھ میں ایثار و قربانی کا جذبہ کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا ہے اور ایک بار قربانی دی بھی ہے اپنی محبت کی (میری محبت میرے منگیتر تھے) اپنے والدین کے لیے اور اس کا اجر میرا رب مجھے ضرور دے گا کیونکہ مجھے اس پر کامل یقین ہے۔ اگر میں چاہتی تو اپنی محبت کے لیے تو بھی سکتی تھی اپنے ماں باپ سے مگر اس انسان کے لیے کیسے لڑتی جس نے مجھے بچا رہا میں چھوڑ دیا۔ میرے والدین مجھے اس دنیا میں لانے کا ذریعہ بنے جنہوں نے میری ہر خواہش پوری کی مجھے اتنا بار انہی اہمیت دی ان سے جھکا کر کے خدا کے پاس کس منہ

سے جاتی اور اچھی بیٹیاں تو ماں باپ اور بھائیوں کا غرور ہوتی ہیں۔ یہ بات میں نے کرن کی کمائیوں سے سیکھی ہے اس سوال کا اتنا جواب کافی ہے۔

2 - دیکھیں جی عید الاضحیٰ پر سب کے گھروں میں گوشت کے ہی پکوان بنتے ہیں کیونکہ جس طرح شیخی عید سوپوں کے بغیر ادھوری ہے اسی طرح بکرا عید کیٹی اور گوشت کے بغیر ادھوری ہے۔ ہمارے یہاں کیٹی والی روٹی، بریانی، زردہ، تولازی بنتا ہے ہر سال۔ لیکن اس بار میرے چھوٹے بھائی نے کوکونٹ رول کی فرمائش کی ہے کیونکہ یہ اسے بہت پسند ہیں اس کے علاوہ بیٹھے کا وہ بہت شوقین ہے کسٹرو ٹکاب جامن، لمب شیریں یہ چیزیں اسے روز مل جائیں تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔

3 - پہلے زمانے میں ایسا ہوتا تھا کہ گوشت کو محفوظ کرنے اور اس کا ذائقہ برقرار رکھنے کے لیے الگ الگ ٹوکے اپنائے جاتے تھے گوشت کو نمک لگا کر وائل کر کے رسی سے سکھایا جاتا تھا اور بھی پتا نہیں کیا کیا کرتے ہوں گے لیکن آج کے دور میں تو فرنیج اور ڈیپ فریزر نے ان ٹوکوں کی جگہ لے لی ہے تو لوگ گوشت کو محفوظ کرنے کے لیے ان ہی کا سہارا لیتے ہیں۔ ویسے میں نے ابھی بھی دیکھا ہے جن کے گھروں میں فرنیج جیسی سہولت نہیں ہوتی وہ اب بھی ان ٹوکوں کا استعمال کرتے ہیں اور گوشت کو زیادہ عرصے تک محفوظ کر لیتے ہیں۔

4 - اوہ وہ سوال پڑھ کر تو خود بخود ہنسی نے ہمارے ہونٹوں کو چھو لیا۔ ہمارے دوا کے چھوٹے بھائی ہیں ان کے یہاں ہر سال ایسا ہوتا ہے کہ ان کی گائے گاڑی سے اترتے ہی بھاگ جاتی ہے اور جس دن قربان کر رہے ہوتے ہیں اس دن گائے گرنے کا نام ہی نہیں لیتی ایک بار تو ایسا ہوا کہ یہ لوگ گرانے میں کامیاب ہو گئے چھری بھی پھردی مگر گائے میڈم اپنے پیچھے کے دو پیروں پر کھڑی ہو گئیں ہم اپنی پھت پر سے دیکھ رہے تھے پہلے تو ہم لوگ ڈر گئے مگر پھر بعد میں ہنسی بھی خوب آئی۔

### شمینہ اکرم۔۔۔ ہمارا کالونی ملیاری۔ کراچی

1 - عید الاضحیٰ کا تہوار سنت ابراہیم علیہ السلام ہے یہ ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایثار اور قربانی کی یاد دلانا ہے۔ دن ہمیں سچی قربانی کا درس دیتا ہے مگر آج کل عید الاضحیٰ ایثار و قربانی کے بجائے جانوروں کی نمود و نمائش کا تہوار بن گیا ہے۔ نیتوں سے اخلاص منقود ہو گیا ہے اور محض مقابلہ بازی رہ گئی ہے۔ اب تو اکثر کی سوچ یہ رہ گئی کہ میں ایسا منگنا جانور خریدوں کہ دور دور تک دھوم مچ جائے اللہ پاک ہمیں اخلاص سے قربانی کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری نیت صرف اور صرف قربانی کے طفیل رضائے الہی کا حصول ہو۔ (امین) اکتوبر 2012ء کی عید الاضحیٰ کے فوراً بعد میرا پیارا شہزادہ معین اکرم ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گیا تھا۔ یہی وہ ایثار ہے جو اللہ کی رضائے کے لیے میں نے صبر کی صورت میں کیا۔ وہ 2012ء کی عید قرباں کا منظر میری آنکھوں میں ٹھہر سا گیا ہے۔ اب ہر سال عید الاضحیٰ مجھے شہید معین اکرم کی شدت سے یاد دلانا ہے۔ میرا ایسا کوئی ایثار و قربانی جس پر مجھے یہ گمان ہو کہ یہ بارگاہ الہی میں مستجاب ہوئی ہے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ کبھی میں نے ایسا کچھ کیا ہو۔ مگر میں زندگی میں چھوٹی چھوٹی نیکیاں کرنے کے قائل ہوں جیسے کہ اگر میں ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے جاؤں تو اپنی باری ایسے مریضوں کو دے دیتی ہوں جو بہت زیادہ بیمار ہوں اور زیادہ دیر بیٹھ نہ سکتے ہوں۔ اکثر اپنی اشد ضرورت کی اشیاء دوسرے ضرورت مندوں کو دے دیتی ہوں۔ اپنے لیے کچھ بھی خاص چیز رکھی ہو کوئی اچانک آجائے تو اس کے سامنے پیش کر کے خوش محسوس کرتی ہوں۔ اپنا ناشتا اکثر اپنی کام والی کو کھلا دیتی ہوں۔ یہ وہ کام تھے جو میں چھپ کر کرتی ہوں آج مجبوراً "ذیر قلم" لانے پڑے۔ اس جیسے بہت سے دوسرے کام بھی اکثر و بیشتر میرے قلب سکون کا باعث بنتے ہیں اور اجر کی امید تو بہر حال ہوتی ہے۔

2 - عید الاضحیٰ پر لوگ تو مزے مزے کے گوشت کے پکوان شوق سے کھاتے ہیں۔ مگر میرے بچے پہلے دن عید پر گوشت بالکل نہیں کھاتے انہیں تو ہر چیز میں خون کی بو آتی ہے۔ دوسرے دن باری کی شوق سے کھالیں گے اس لیے پھر یہ۔۔۔ میکرولی بنانے کی فرمائش کرتے ہیں اور اسود کے لیے فروٹ ٹرانزفل کسٹرو بنانا پڑتا ہے۔ عید کی صبح چنے دی ہوئے بنانے کی فرمائش بھی پوری کرنی پڑتی ہے جب تک کیٹی فراہم ہو تب تک لذت کام دہن کے لیے کچھ نہ کچھ تو چاہیے ہوتا ہے ہلکا کھلکا کچھ نہ کچھ۔

3 - گوشت کا ذائقہ لذت برقرار رکھنے کی ایک یونٹک شپ۔۔۔ کہ آپ گوشت کو جلدی جلدی الگا کر کھالیں (با۔۔۔ با۔۔۔) زیادہ عرصہ گوشت کو اگر محفوظ رکھنا مقصود ہو تو گوشت بغیر دھوئے پیکٹ بنا کر فریزر کر دیں۔ دوسرے گوشت دھو کر اس میں نمک ڈال کر چولھے پر چڑھا دیں۔ یہ اپنے ہی پانی میں گل جاتا ہے اور گوشت کے ساتھ موجود چکنائی میں بہت اچھا فراہم بھی ہو جاتا ہے اور زیادہ عرصہ بغیر فرنیج کے بھی رکھ سکتے ہیں بس دن میں ایک مرتبہ گرم کرنا پڑتا ہے اور میرے سرال میں تو گوشت کا اچار ڈال کر اسے محفوظ کیا جاتا ہے۔ مگر زیادہ عرصہ گوشت رکھنے سے اس میں بیکٹریا پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہذا اصل ذائقہ اور لذت کے لیے۔۔۔ مختلف ڈشز بنا کر جلدی استعمال کر لیں۔

4 - قربانی کے جانور سے متعلق واقعہ معین اکرم کی آخری عید قرباں سے متعلق ہے۔ اس عید پر وہ بہت خوش تھا اور اپنے نئے ڈیجیٹل کیمرے سے ہر فرنیج ہونے والی گائے کی ویڈیو بنا رہا تھا بلکہ ساتھ ساتھ کنٹری بھی کر رہا تھا۔ ایک گائے کا منہ قربانی کے وقت جب بھی کعبہ کی طرف کیا جاتا وہ فوراً "اپنا رخ موڑ لیتی۔ اس پر معین کے کھنٹس جب عید کی گائے پر لپکی کا بچہ مزے سے بیٹھا تھا یہ لحاظ بھی اس کے کیمرے میں محفوظ ہیں۔ جب بھی دیکھوں بے ساختہ (اداس آنکھوں اور دل کے ساتھ) مسکرا ہٹ لیوں پہ



آجاتی ہے۔ اس نے یہ سب اس طرح فنی وید پوز بنائیں کہ ہر جانور کے ساتھ کچھ نہ کچھ الگ سے دیکھنے کو ملا اور یہی بات اس کر دیتی ہے کہ اسے کیسے پتا چلا کہ یہ میری آخری عید ہے جو اس نے اسے اتنا یاد گار بنایا اپنی پچھو کی لگائے بھی خود کھڑے ہو کر قربان کرائی اس کا گوشت بنایا اور اپنی شرارتوں سے سب کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

ہمارے گھر ہر سال بکرے کی قربانی ہوتی ہے۔ قربانی کی لگائے میں حصہ بھی لیا جاتا ہے۔ قربانی کا بکرا کافی دنوں پہلے آجاتا ہے تاکہ بچے خوش ہو کر اس کی دیکھ بھال کریں۔ ایک عید پر ہم نے جو بکرا خریدا وہ کسی کے گھر کا پالتو تھا۔ پڑا ہی شاہانہ مزاج کا بکرا تھا۔ اس کو کمرے میں اندر باندھ کر سب اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے میں اندر کسی کام سے گئی تو دیکھا کہ بکرے صاحب صوفے پر براجمان ہیں اور نیند کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ بے ساختہ ہی مجھے ہنسی آگئی کہ یہ بے زبان جانور کتنا سمجھ دار ہے۔ جتنے دن بھی وہ ہمارے گھر رہا صوفے پر ہی سوتا تھا۔ فی وی دیکھا اور چارہ پانی ہاتھوں میں لے کر کھانا پڑتا۔ جب حاجت کی ضرورت محسوس ہوتی اتر کر پانی ہر چلا جاتا۔ صوفے پر اس نے کبھی گندگی نہیں پھیلانی۔ اس کی انسانوں جیسی عادتیں مسکرانے پر مجبور کر دیتیں۔ جب وہ قربان کیا گیا تو بچے بہت اداس ہو گئے۔

### افشین فاروق - کراچی

1 - نیکی ہمیشہ چھپا کر کرنی چاہیے۔ جی ہاں میں نے بھی ایسا رو قربانی کی ہے اللہ قبول فرمائے لیکن اگر نیکی بتا دیں تو اجر و ثواب میں کمی کا ڈر ہوتا ہے۔

2 - جناب یہ دُش میرے شوہر اور بچے فرمائش کر کے عید الاضحیٰ پر بنواتے ہیں قربانی کی لگائے کی ہڈیاں خوب گلا کر ان کا سوپ نکال دیتی ہوں پھر اس میں رات بھر کی بھکی ہوئی چنے کی دال ڈال کر پکاتی ہوں اس میں مسالا بھون کر مکس کر دیتی ہوں پھر اوپر سے ہر مسالا ڈال کر سرو کرتی ہوں آپ بھی ٹرائی کیجیے بہت بہترین

دُش ہے قربانی کا گوشت دیکھ کر اور کھا کر دل بھر جاتا ہے اس کو کھا کر آپ کو بہت مزہ آئے گا اوپر سے گرم مسالا اور بھنا پسا زیرہ بھی چھڑک کر لیوں ڈال کر مکمل فرمائیں۔

3 - گوشت کا ذائقہ برقرار رکھنے کے لیے اسے دھو کر نہیں رکھتی دھو کر رکھنے سے اس میں بیکٹیریا ہو جاتے ہیں اسے زیادہ عرصے محفوظ رکھنے کے لیے اسے ابل لیں۔ اس کے کباب بنالیں اس کا اسٹیم رو سٹ بنالیں۔ کوفتے کی بالزنا کر فریز کر دیں۔

4 - قربانی کے جانور سے متعلق یہ واقعہ یاد کر کے میرے لبوں پر فوراً "ہنسی آجاتی ہے۔"

یہ واقعہ میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ پیش آیا تھا میرے چاچا اور ان کے دو تین دوست مل کر طبری منڈی جانور دیکھنے گئے ساتھ ہی میرے بھائی کو بھی لے گئے جو کہ اس وقت میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا۔

کافی دیر تک وہ لوگ منڈی میں گھومتے رہے اپنی پسند کا جانور دیکھنے کے لیے کافی اندر جانے کے بعد ایسی جگہ آئی جہاں جانور بہت قریب قریب بندھے ہوئے تھے وہ لوگ جہاں جانور دیکھ رہے تھے وہیں بیچ میں چھوٹی سی ٹولی ہوئی دیوار بھی تھی اچانک ان لوگوں نے کیا دیکھا کہ ایک بیل جہاں میرا بھائی عاصم کھڑا تھا اس نے اس کی ٹانگوں کے بیچ میں سینک ڈالا اور اسے اٹھا لیا سب لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے بھائی بہت پریشان ہوا پھر اس بیل نے اس دیوار کی طرف پھینک دیا وہ دیوار سے ٹکرا کر نیچے گرا جلدی سے سب نے اس کو اٹھایا اللہ کا شکر ہوا کوئی جوت نہیں آئی اس کے بعد سب کے منہ سے ہنسی کے فوارے برآمد ہوئے۔

### قرۃ العین بنت یوسف - فیصل آباد

1 - ہم تو اللہ کے بڑے گناہ گار سے بندے ہیں یاد نہیں کبھی کوئی ایسا کر کیا ہو جو ہمیں بارگاہ خداوندی میں سرخو کرتا سوائے اس کے کہ گوشت کے عمل منصفانہ تین حصے بناتے ہیں اور ہمیشہ اپنے حصے میں

سے بھی بلا ججک گوشت بانٹ دیتے ہیں۔ نتیجتاً تین دن میں حصہ ختم۔

2 - عید الاضحیٰ پر تو گوشت کی دُشیز سے فرصت نہیں ملتی۔ مگر پھر بھی کئی دُشیز ایسی ہوتی ہیں جو ہم سے فرمائش کر کے پکوائی جاتی ہیں۔ جن میں سرفہرست ہمارے ہاتھ کے مشہور و معروف خستہ سمو سے اور "لڈو کھیاں" شامل ہیں۔ لڈو کھیاں کی ترکیب لکھ رہی ہوں۔

### لڈو کھیاں

ضروری اجزاء :

بیسن	ایک پاؤ
املی کا گودا	آدھی پیالی
خوبانی (اچھی طرح نرم)	ایک پیالی
چاٹ مسالا	ایک پیٹ
نمک	ایک پیالی
باریک کشا پیاز	ایک عدد

ترکیب :

بیسن کو چھان کر پانی اور حسب پسند نمک مکس کر کے گاڑھا سا آمیزہ بنالیں فراٹنگ بین میں آئل گرم کر کے چمچے کی مدد سے چھوٹے چھوٹے لڈوؤں کی شپ کی طرح آئل میں بیسن کا آمیزہ ڈالیں سنہری ہونے پر نکالیں یونہی سارے آمیزے کے لڈو بنالیں نیم گرم پانی میں ڈالتے جائیں نرم ہونے پر پانی میں سے نکال کر رے میں رکھتے جائیں۔

(کھٹے کے لیے)

املی اور خوبانی کا گودا اچھی طرح بلینڈ کر کے پانی اور برف ڈال کر قدرے گاڑھا کھٹا تیار کر لیں۔ دو چمچے چاٹ مسالا ایک چمچ نمک ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب ایک گہری پلیٹ لیں اس میں لڈو ڈال کر کھٹا اتار ڈالیں کہ اس کے اندر لڈو بھیک جائیں اوپر ذرا سا چاٹ مسالا دو چمچے نمک اور تھوڑا سا کشا پیاز چھڑک کر سرو کریں اور یونہی سب کے لیے پلیٹیں تیار کر لیں۔ سب انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔

3 - گوشت کو اچھی طرح دھو کر شایروں میں ڈالنے کے بعد چھری کی نوک یا لسی بھی ٹوکدار چیز سے شایروں کے پینڈے میں باریک باریک سوراخ کر دیں سارا اضافی پانی پھر جائے گا گوشت بدبو سے پاک ترو مان رہے گا۔

اس طریقے کے علاوہ ہم گوشت "دس" بھی لیتے ہیں۔

ایک دستے میں گوشت بغیر پانی کے (دھلا ہوا) نمک کا پی مرچ دار چینی کا ایک ٹکڑا بڑی لالہ پی ڈال کر پکنے دیں گاہے بگاہے چمچے چلاتے رہیں ایک دو گھنٹوں میں گوشت کا پانی مکمل خشک ہو کر گوشت نمکین خستہ اور کراہ ہو جائے گا۔ بعد ازاں جتنے دن رکھنا ہو اس گوشت کو دھوپ لگوائی رہیں بے حد اعتدال ذائقہ ہو گا۔ مگر پھر بھی گوشت محفوظ رہنے کا دعوا نہیں کرتے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ آپ بھی ہم سب کی طرح گوشت پکنے کے ساتھ دیکھ اٹارتے ہی اس کے گرد بیٹھ کر اسے منٹوں میں چٹ کر جائیں ہاتھوں میں بوتلیں پکڑے جیسا کہ ہم کرتے ہیں۔

4 - یہ واقعہ بہت پرانا تو نہیں مگر حسب بھی یاد آتا ہے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے ہوا کچھ یوں کہ چاند رات کو ابو اور چھوٹا بھائی صحت مند سا چھترالے کر آئے جسے دیکھ کر ہم سب کی باچھیں خوشی سے پھیل گئیں۔ میٹرھیوں کی گرل کے ساتھ اسے باندھ دیا ابو لوگ قصائی کا پتا وغیرہ کرنے چلے گئے۔

سارے دن کی صفائی ستھرائی کے بعد ہم اب فارغ ہوئی تھیں آئی (چچی) اپنے کمرے میں تھیں۔ پورے گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی چھترے کے پاس کوئی نہیں تھا۔ ہم نے اس کا ایک دیدار کرنے کے لیے رون اٹھایا تو وہ مفکر بکرا بنا خاموش سر جھکائے کھڑا تھا۔ ایک دم سے ہی ہمارا دل اس کی تنہائی پر دکھی ہوا تھا۔ ہم نے کمرے کے اچلے فرش کو نظر انداز کرتے ہوئے اسیب سے کہا کہ کوئی بات نہیں اسے کھول کر اندر لے جاؤ تاکہ بے چارے کا دل بھل جائے وہ اسے

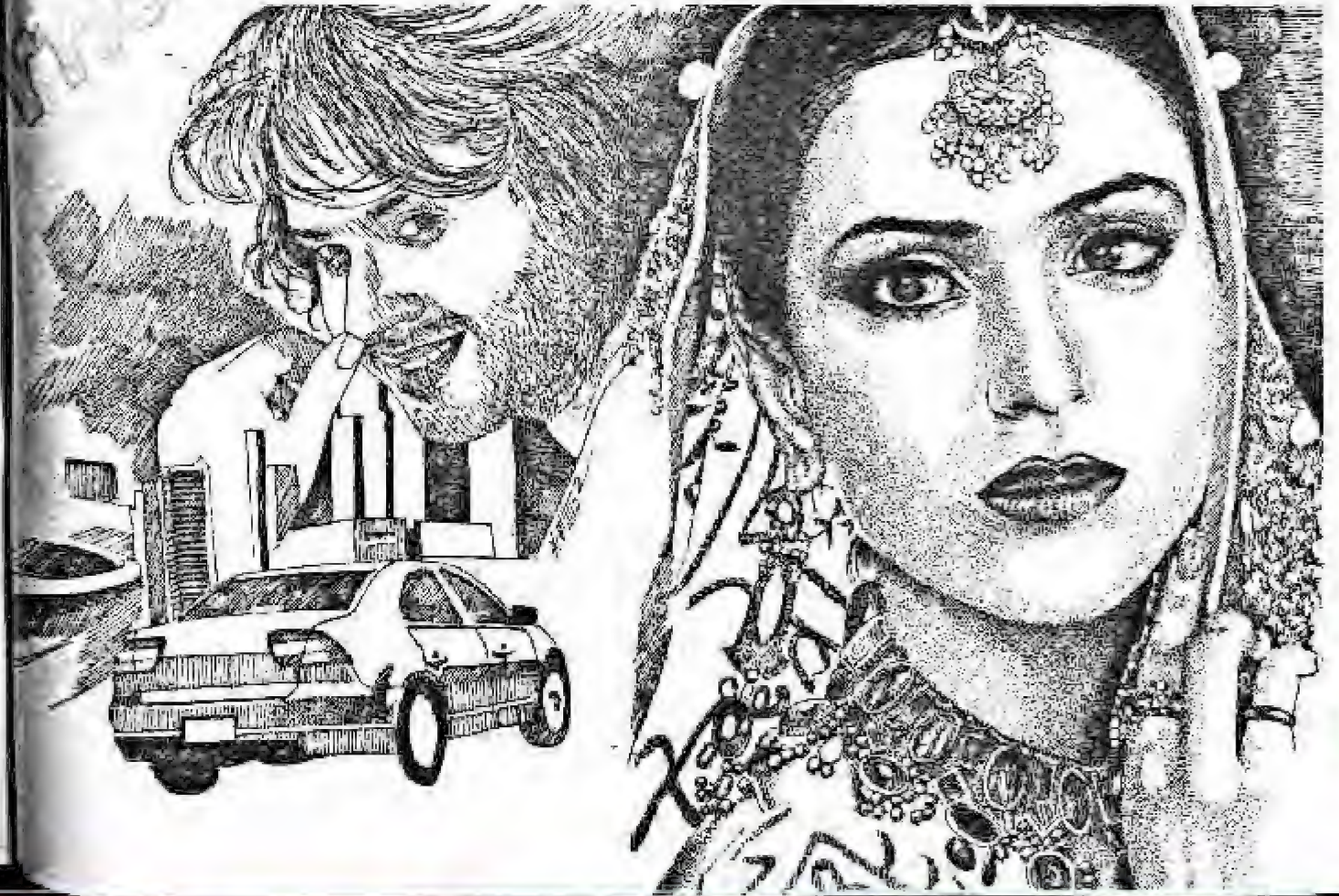


تفیسر سعید

## اگساگر ہے زندگی

ملک صاحب اپنے گھر والوں کو بے خبر رکھ کر اپنے کم سن بیٹے ایشال کا نکاح کر دیتے ہیں جبکہ ایشال کی دلچسپی اپنی گزند عرشہ میں ہے۔  
 جیب تعلیم حاصل کرنے کے لیے حیدر آباد سے کراچی آئی ہے۔ شاہ زین کے والد نے اسے اپنے آفس میں پابند کر لیا  
 شاہ زین جیب میں دلچسپی لینے لگا۔  
 فرہاد غنیم بھائی ہیں۔ فرہاد کے دونوں بھائی معاشی طور پر مستحکم ہیں اور دونوں اپنی بیوی بچوں کی ضروریات کو دل کھول کر  
 پورا کرتے ہیں جبکہ فرہاد اپنی بیوی زینب اور بچیوں کی ضروریات پوری کرنے میں بے حد تجوی سے کام لیتا ہے جو زینب  
 بالکل پسند نہیں۔  
 فرہاد کے بڑے بھائی کی بیوی نغمہ زینب کی خوب صورتی سے حسد کرتی ہیں اور آئے دن اس حسد کا اظہار کرتی رہتی ہیں  
 (اب آگے پڑھیے)

چوتھی قسط





آج کل ایشال کچھ عجیب سی کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔ آگے کو بڑھتا وقت اسے دھیرے دھیرے تمام رشتوں کی نزاکتوں سے آگاہ کرتا جا رہا تھا وہ جو ہمیشہ اس غلط فہمی کا شکار رہا کہ پایا کا بہ حالت مجبوری جوڑا جائے والا رشتہ کسی اہمیت کا حامل نہیں ہے یا وہ جب چاہے اپنی مرضی سے کوئی دوسرا نیا رشتہ استوار کر سکتا ہے۔ وقت نے اس کی اس سوچ کو قدرے تبدیل کر دیا۔ اب اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ مجبوری میں باندھا گیا۔ ایک بندھن اس کی ساری زندگی پر محیط ہو گیا ہے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اپنی تعلیم کے مکمل ہونے سے وہ خوف زدہ تھا۔ اسے لگتا وطن واپس جاتے ہی نکاح کا آنکھوں سے ڈس لے گا۔

وہ اس نکاح کو اتنا اپنے اوپر حاوی نہ کرتا جتنا اس کی ممانے بار بار ذکر کر کے کیا تھا وہ مہینے میں ایک بار ضرور اسے سمجھایا کرتی کہ تم نے بھی زندگی میں اس لڑکی سے شادی نہیں کرنی جس سے تمہارا نکاح ہوا ہے۔ کیونکہ وہ ایک بد چلن ماں کی بیٹی ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ بیٹی ہمیشہ اپنی ماں کی خصلت لے کر دنیا میں آتی ہے۔ اس لیے یاد رکھنا تمہاری بیوی بھی تمہاری وفادار نہ ہوگی۔ یہ سب باتیں اس کے نزدیک غیر اہم ہو سکتی تھیں۔ اگر اسے عریشہ سے محبت نہ ہوتی۔ وہ لڑکی کون تھی؟ اس کی ماں کا ایسا کون سا فعل تھا جو اس کی ممانے آج تک نہ بھولی تھیں۔ اسے ان سب باتوں سے کچھ لینا نہ پاتا تھا۔

اس کا اصل مسئلہ صرف یہ تھا کہ اسے عریشہ کے علاوہ کسی اور سے شادی ہی نہیں کرنا تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے پایا سے اس مسئلہ پر کس طرح بات کرے۔ کیسے انہیں سمجھائے کہ مجھے آپ کی بیٹی سے شادی نہیں کرنی۔ لہذا ایلیز میری خوشی کی خاطر آپ اس رشتہ کو ختم کر دیں۔ اس کا کئی بار دل چاہا کہ وہ پایا کو فون کرے اور ان سے رو کر درخواست کرے کہ پلےز مجھے اس طوق سے نجات دلا دیں جو آپ نے میری لائیکلی میں میرے گلے ڈالا تھا۔ مگر وہ کبھی ایسا کرنے کی ہمت ہی نہ کر سکا۔ اسے کاش میں اس دن ان پیپر پر سائن ہی نہیں کرتا۔

کئی بار کا سوچا ہوا یہ خیال پھر سے اس کے ذہن میں آ کر اسے بے چین کر گیا۔ اسی بل جب وہ انتہائی کرب کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اس کے آس پاس ایک مدھم سی روشنی پھیل گئی۔ اس کے کانوں میں کچھ عرصہ قبل کے کہے ہوئے اپنی ماں کے الفاظ گونجے۔

”کبھی ایشال انسان کو زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ لہذا یہ اس کا حق ہے کہ وہ اسے اچھی طرح سوچ سمجھ کر گزارے۔ اپنی زندگی دوسروں کی خوشی کے لیے برباد کرنا بالکل بھی عقل مندی نہیں ہے۔ اگر تم اپنے پایا کے جوڑے گئے رشتے سے مطمئن نہیں ہو تو انہیں صاف صاف لفظوں میں یہ بات سمجھا دو۔ یقیناً جانو آج تمہارا انکار ان کے دل کو دکھنی ضرور کرے گا۔ مگر کل اس کا نتیجہ کئی زندگیوں کو تباہ ہونے سے بچالے گا۔ سب سے پہلے تو تم خود ایک تائید شدہ زندگی گزارنے کے عمل سے بچ جاؤ گے۔ اس لیے میری مانو تو اپنے پایا سے بات کر کے جتنی جلدی ممکن ہو سکے اس لڑکی کو طلاق دے دو۔ اس کے پاؤں میں پڑی اپنے نام کی زنجیر سے اسے بھی آزاد کرو۔ اس سے نہ صرف تمہارا بلکہ اس کا بھی بھلا ہوگا۔ آج اس کی عمر ہے جو بھی کوئی اچھا لڑکا اس کے نصیب میں ہوگا اسے مل جائے گا اور تم بھی اپنی زندگی اپنے من پسند ساتھی کے ساتھ گزار سکو گے اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔“

اسے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب وہ اپنے پایا کے ساتھ اس ٹوٹے ہوئے اندھیرے گھر میں گیا تھا جہاں وہ تیار آئی اپنی سبزیوں والی بیٹی کے ساتھ رہتی تھیں۔ اسے آج بھی یہ سوچ سوچ کر حیرت ہوتی کہ اس جس زندہ گھر میں وہ دونوں سانس بھی کس طرح لیا کرتی تھیں۔ اس گھر کی سیلن زندہ بودہ اتنے سالوں میں بھی نہ بھولا تھا اس کے لیے اس گھر میں ایک بل گزارنا نہایت مشکل امر تھا جبکہ اس کے پایا نہایت اطمینان اور سکون سے ان

آئی کے قریب بیٹھے تھے جن کی شکل دیکھتے ہوئے بھی ایشال کو خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اسے آج احساس ہوا کہ اس کے پایا کا اس وقت کا کیا ہوا فیصلہ جذباتی نہ تھا۔ بلکہ نہایت سوچ سمجھ کر کیا جانے والا ایک ایسا عمل تھا جس کی مکمل تیاری وہ پہلے سے کر کے اس گھر میں گئے تھے۔ اپنے پایا کی اس وقت کی کیفیت وہ کبھی نہ بھول پاتا اور جب جب وہ یہ سب سوچتا اسے لگتا اپنی ماں کی سمجھائی ہوئی باتوں پر عمل کرنا اتنا آسان نہ تھا جتنا وہ سمجھ رہی تھیں۔ یہ تو سو فیصد طے تھا کہ وہ اپنی زندگی اس لڑکی کے ساتھ نہیں گزار سکتا تھا یا شاید گزارنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مگر یہ بات اپنے پایا کو کس طرح سمجھائے یہ فی الحال ایک قدرے مشکل امر تھا۔

”بہر حال جو بھی ہو پایا میں یا نہ ماں نے مجھے اس لڑکی سے کبھی شادی نہیں کرنی۔ جسے نہ میں جانتا ہوں اور نہ ہی کبھی دیکھا ہے۔ میری زندگی میں اگر کوئی لڑکی بیوی کی حیثیت سے داخل ہوگی تو وہ صرف عریشہ ہو سکتی ہے اور کوئی نہیں۔“

اور یہ اس کا کیا جانے والا آج کا آخری فیصلہ تھا جسے کرنے کے بعد اس کا دل قدرے مطمئن ہو گیا۔



”تم جانتی ہو آج میں نے سالار کے ساتھ شاپنگ سینٹر میں کیسے گھومتے دیکھا ہے۔“ صباحت کے فون اٹھاتے ہی وہ بنا کسی سلام و دعا کے شروع ہو گئیں۔ ان کے لمبے میں دبا جوش و خروش کسی بہت ہی اہم خبر کی اطلاع دے رہا تھا اور ویسے بھی صباحت کو دعی رہتے ہوئے پاکستان کے تمام حالات سے آگاہی صرف اور صرف فضا بھابھی کے دیے گئے خبرنامہ کی بدولت ہی ہوتی تھی جس کا اعتراف وہ اکثر بڑی صاف گوئی سے ان کے سامنے کیا کرتی۔

”کیسے دیکھ لیا آپ نے سالار کے ساتھ اب بھلا بتائیں اتنی دور بیٹھ کر مجھے کیسے پتا چلے گا کہ وہ پاکستان کے کسی شاپنگ مال میں کس کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ جب تک آپ نہ بتائیں گی۔“ یہ جان کے کہ فضا بھابھی کے پاس سالار کے حوالے سے کوئی اہم خبر ہے وہ سر تپا گوش ہوتے ہوئے بولی۔

”زینب کے ساتھ تھا وہ دونوں اتنے مزے سے گھوم رہے تھے کہ مانو مجھے تو یقین ہی نہ آیا۔“ بنا کوئی تجسس پھیلائے وہ کھٹ سے بولیں۔ اس بات میں کتنی مبالغہ آمیزی کا عنصر شامل تھا۔ یہ وہ خوب اچھی طرح جانتی تھیں اور ان کے اس جواب نے صباحت کے کسی نئی خبر کو جاننے کے جوش و خروش کو مکمل طور پر تسکین نہیں کر دیا۔

”یقیناً جانو مجھے تو دیکھ کر یقین ہی نہ آیا کہ وہ زینب ہے اتنی تیار کہ بس میرا دل تو بہت چاہا کہ جا کر پوچھوں بی بی یہ تم یہاں کیا گلچھوڑے اڑا رہی ہو؟ کیونکہ تمہیں تو میرا پتا ہے کہ میں ہر بات منہ پر کہہ دینے کی عادی ہوں۔ دل میں بات رکھنے کی عادت نہیں ہے میری۔“

ہر بات بنا سوچے پیچھے لوگوں کے منہ پر کہہ کر ان کے دل خراب کرنے والی ان کی یہ عادت فضا بھابھی کے نزدیک ایک ایسی خوبی تھی جس کا ذکر وہ ہمیشہ بڑے فخر سے کیا کرتیں۔ صباحت کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ انہیں ان تمام باتوں کا کیا جواب دے۔

”تو تم تو اس خبر کو سن کر اتنی حیران ہوئی ہو کہ تمہاری تو لگتا ہے زبان ہی بند ہو گئی۔“

صباحت کی خاموشی سے انہوں نے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا۔  
”اصل میں بھابھی شاید میں آپ کو بتانا بھول گئی تھی کہ نازیہ پچھلے دنوں میڑھیوں سے گر گئی تھی۔ جس کے باعث اس کا اپارشن ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ شادی کے تین سال بعد انہیں اولاد سے نوازے لگا تھا کہ یہ حادثہ ہو گیا۔ مگر



چلیں جو اللہ کو منظور جب اس کی مرضی ہوگی ضرور دے گا۔

بہر حال آپ کو تو شاید یہ بھی علم نہیں کہ نازیہ کی والدہ خاصی عمر رسیدہ ہیں جبکہ اس کی بھابھی اور بہن بھی یہاں پاکستان میں نہیں سالار کی اپنی والدہ کا انتقال بھی کئی سال قبل ہی ہو گیا تھا۔ ایسے میں جب اس نے انتہائی پریشانی کے عالم میں مجھے فون کیا تو میں نے ہی اسے زہن کا مشورہ دیا تھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ پریشانی کے ان لحاظ میں نازیہ کے لیے اس سے بہتر ساتھی کوئی اور نہ ہو گا اور اپنے اس فیصلے کے درست ثابت ہونے کی حتمی خوشی مجھے اصل میں کل اس وقت ہوئی جب نازیہ نے فون کر کے میرا شکریہ ادا کیا۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس نے بتایا کہ بیماری کی حالت میں زہن نے اس کی اس قدر خدمت کی کہ کیا ہی کوئی سگی بہن کرے گی اور میرے ہی کہنے کے مطابق سالار نے اسے کچھ تحفے تحائف بھی دیے ہیں۔ کیونکہ میرے نزدیک اس کی تمام خدمات کا بدلہ اس سے بہتر نہ اور کوئی نہ تھا اور شاید اسی سلسلے میں سالار اسے ایک دوبار بازار بھی لے گیا تھا۔ وہیں آپ نے اسے دیکھ لیا ہو گا۔

ویسے بھی بھابھی اس نے نازیہ کی خدمت بڑے ہی خلوص اور محبت سے کی ہے اور اس طرح کے خلوص کا بدلہ کبھی ادا نہیں کیا جاسکتا۔ سوائے اس کے کہ بدلے میں ہم بھی پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ کوئی اچھا سا تحفہ دیں۔

صباحت نے مکمل وضاحت کے ساتھ انہیں ہر بات سمجھانے کی کوشش کی کیونکہ وہ فضا بھابھی کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھی۔ جانتی تھی کہ اگر انہیں یہاں ہی نہ روکا گیا تو یہ خبر مریض سالار کے ساتھ خاندان بھر میں نشر ہو جاتی ہے۔

”تو ضروری تھا کہ تحفے کر دینے کے لیے اسے تنہا بازار لے جایا جائے۔“  
وہ قطعاً ہار ماننے کو تیار نہ تھیں۔

”ویسے بھی خوب صورت عورت ایک سانپ کی مانند ہوتی ہے جہاں موقع ملاؤ سننے سے گریز نہیں کرتی۔ یہ بات تم اچھی طرح نازیہ کو بھی سمجھا دینا۔“  
ان کا یہ بیان کردہ فلسفہ صباحت کی سمجھ میں بالکل بھی نہ آیا۔

”چلیں بھابھی چھوڑیں نہیں کیا جب ان دونوں کے اس طرح بازار جانے پر فرہادیا نازیہ کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو پھر ہم کون ہوتے ہیں بلاوجہ کی انگلیاں اٹھانے والے دفع کریں اتنی فضول باتیں سوچ سوچ کر آپ کیوں اپنا بلڈ پریشر ہائی کرتی ہیں۔“

صباحت کے جواب نے ہر بات کو یکسر ختم کر دیا۔ فضا بھابھی تو ان دونوں کو ایک ساتھ شاپنگ سینٹر میں دیکھ کر جانے کون کون سی کہانیاں سوچے بیٹھی تھیں جو انہوں نے صباحت کو سنائی تھیں۔ مگر یہاں تو صباحت نے سرے سے کسی بات میں دلچسپی ہی نہ لی۔ فی الحال تو اس مسئلے پر خاموشی اختیار کرنا ہی انہیں زیادہ بہتر لگا۔ مگر ان کا دل کسی بھی طرح یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا وہ کوئی عام سا منظر تھا۔ اس عام سے منظر کے پیچھے کوئی خاص بات ضرور تھی۔ انہیں لگ رہا تھا کہ سالار اور زہن کی یہ غیر معمولی دوستی جلد ہی کوئی رنگ دکھائے گی۔ جس کا احساس ان دونوں سے منسلک لوگوں کو آہستہ آہستہ ہی ہو گا۔  
”پچلو جب چاند چڑھے گا کل عالم دیکھے گا۔“

صباحت کی پیش کردہ تمام وضاحت کا جواب انہیں اس سے بہتر کوئی اور نہ ملا۔ انہیں امید تھی کہ جس بات پر آج صباحت ان سے اختلاف کر رہی ہے آنے والے کل میں وہ خود انہیں ایسی ہی کوئی خبر ضرور دے گی، جانے

کیوں وہ زہن سے منسوب کوئی نہ کوئی غلط بات سننے کے لیے ہمیشہ تیار رہتیں۔ حالانکہ انہیں اپنی اس کوشش میں فی الحال کوئی کامیابی نہ ہوئی تھی۔



زندگی بیمار کا گیت ہے اسے ہر دل کو گانا پڑے گا  
زندگی غم کا ساگر بھی ہے جس کے اس پار جانا پڑے گا  
زندگی ایک احساس ہے نولے دل کی کوئی آس ہے  
زندگی ایک بن باس ہے کات کر سب کو جانا پڑے گا  
زندگی بے وفا ہے تو کیا اپنے رونگھے ہیں ہم سے تو کیا  
ہاتھ میں ہاتھ نہ ہو تو کیا ساتھ پھر بھی نبھانا پڑے گا  
زندگی بیمار کا گیت ہے اسے ہر دل کو گانا پڑے گا  
زندگی ایک مسکان ہے درد کی کوئی پہچان ہے  
زندگی ایک مہمان ہے چھوڑ سنسار جانا پڑے گا

گانے کا ایک ایک بول اس کے دل میں اتر رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش چت لیٹی اوپر چھت کو یک ٹک گھورے جا رہی تھی۔

”زندگی کیا ہے۔“ اس کی بہتر عکاسی اس گانے سے بہتر نہیں ہو سکتی تھی یا شاید یہ گانا اس کی زندگی کا مکمل عکاس تھا۔ اسی لیے اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جو بھی تھا گانے کا ایک ایک بول اس کی ہر رگ میں درد بھر رہا تھا۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ اس کی آنکھوں کے گونے پانی سے بھر گئے۔ پھر اس بے پانی نے پورا تکیہ بھگو دیا۔ وہ آہستہ آہستہ بے آواز رونے لگی۔ اپنے دل کا جو جھل بن اس طرح رو کر رو کرنا بھی کبھی اسے بہت اچھا لگتا جانتی تھی کہ کھل کر رونے کے بعد اس کے اگلے چند دن سکون سے گزر جائیں گے۔ وہ اپنی زندگی کے ایسے دور ہے پر کھڑی تھی جہاں سے آگے جانے والے سارے راستے بند تھے۔ اس کی ساری طنائیں وقت کے ہاتھ میں تھیں۔ وقت جس طرف چاہتا اسے لے جاتا۔ ایسے میں جب اسے اپنے چاروں طرف پھیلے اندھیرے میں روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تو وہ اسی طرح یاسیت کی کیفیت کا شکار ہو جاتی اور پھر وہ رو کر اپنے دل کا جو جھ اسی طرح ہلکا کر لیتی جیسے اس وقت کر رہی تھی۔



وہ بچن میں کام کر رہی تھی۔ جب باہر سے آتی سالار کی آواز سن کر اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا، جہاں بالکل ہی پل وہ آن کھڑا ہوا تھا۔

”کیا کیا ہے؟“ اس کا سر تپا جا رہا تھا لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔  
”آلو قیہ۔“ سالار میں پیچھے چلا تے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔

”آپ کو کھانا دوں۔“ سالار کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے پیچھے مڑ کر خود ہی پوچھ لیا۔

”ہاں۔“ وہ ایک عجیب بے خودی کی کیفیت میں گرفتار اسے دیکھے ہی جا رہا تھا۔ وہ سالار والا چولہا بند کر کے سک کی جانب آگئی۔ تاکہ قیل سے اپنے ہاتھ دھو سکے۔ جب وہ آہستہ آہستہ چلتا بالکل اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا اتنا پیچھے کہ اگر وہ مڑتی تو سر اس کے سینے سے ٹکراتا۔



”آج جب آفس میں کام کرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ تم میرے گھر ہو تو دل چاہا پر لگا کر اڑتا ہوا آجاؤں اور تمہیں اپنے سامنے بٹھا کر اس وقت تک دیکھتا رہوں جب تک جی نہ بھرے جانتی ہو اب تو مجھے اس وقت تک سکون نہیں ملتا جب تک دن میں ایک بار تمہارا دیدار نہ کر لوں۔“

اس نے آہستہ سے بڑے پیار کے ساتھ اس کے چہرے پر آئے بالوں کو پیچھے ہٹایا۔ زہنب نے ایک گہری سانس کے ساتھ سالار کے جسم سے اتنی کدون کی مخصوص خوشبو کو اپنے اندر اتارا وہ آنکھیں بند کیے بے خود کھڑی اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کو اپنے دل میں اتارنا چاہتی تھی کہ ایسے میں باہر سے آئی نازیہ کی آواز سننے ہی جیسے وہ ہوش میں آگئی گرنٹ کھا کر پٹی تیزی سے آگے بڑھ کر دروازے پر لٹکا اپنا دھناتا تار کر کندھے پر ڈالا اور سلیپ پر رکھے برتنوں کی جانب آگئی۔ سالار بھی فوراً ”دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا“ جب نازیہ کچن کے دروازے پر نمودار ہوئی۔

”یہ بشری پونچھا مارنے میں اس طرح ڈنڈی مارتی ہے۔ آدھا فرش سوکھا پڑا ہے۔“ اس نے اپنے زور زور سے بولنے کی وضاحت کی۔

زہنب نے بنا کوئی جواب دیے پاس رکھے ڈونگے میں سالن نکالنا شروع کر دیا۔

”آپ کب آئے؟“ نازیہ نے سالار کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

”ابھی ابھی آیا ہوں سوچا تم سو رہی ہوگی۔ اسی لیے سیدھا کچن کی طرف آگیا۔ تاکہ زہنب سے کہہ کر کھانا لگوالوں۔“ زہنب کو اس کا لہجہ عجیب شرمندہ سا لگا۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

”اب تو اللہ کا شکر ہے کافی بہتر ہوں۔ آپ چل کر ٹیبل پر بیٹھیں۔ میں کھانا لاتی ہوں۔“

سالن ڈونگے میں نکالتی زہنب نے اپنا ہاتھ وہیں روک دیا۔

”بشری ہاتھ دھو کر اندر آؤ صاحبہ جی کے لیے روٹی بناتی ہے۔“

بشری کو آواز دیتی وہ فریق کی جانب بڑھ گئی۔

”میں نے روٹیاں پکا دی ہیں۔ تم جاؤ اپنا کام مکمل کرو۔“

بشری کے کچن میں آتے ہی زہنب نے اسے واپس کر دیا۔

”تم نے روٹیاں کیوں پکائیں۔ بشری کو کہتیں وہ بناتی تھیں۔“

نازیہ فریق سے دی نکال کر سلیپ کی طرف آگئی۔

”لاؤ مجھے دینی دو میں راستہ بنا دیتی ہوں تمہارا ہر چل کر بیٹھو ابھی تمہیں ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔“

زہنب نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں پکڑا پاؤں قیام لیا اور ایک نظر کچن سے ذرا دور رکھی ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھے سالار پر ڈالی جو جانے کس سوچوں میں گم تھا کچھ دیر قبل اس کے دل میں پیدا ہونے والی شرمندگی اب کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔

”میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتی زہنب تم نے اس موقع پر جس طرح میرا ساتھ دیا ہے کوئی سگی بہن بھی ہوتی تو شاید کبھی نہ دیتی تمہاری وجہ سے ہی میں اپنے دکھ اور درد کو برداشت کرنے کے قابل ہوئی ہوں۔“

وہ اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ اظہار تشکر سے اس کا لہجہ قدرے بوجھل ہو گیا تھا۔ زہنب کو ایسا لگا جیسے کسی نے اسے تھے صحرائیں پھینک دیا ہو وہ ایک بار پھر شرمندگی میں ڈوب گئی۔

”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ انسانیت کے ناتے جو میرا فرض تھا اسے پورا کرنے کی ایک ہلکی سی کوشش ضرور کی ہے۔“

دینی پینٹ کر اس نے جلدی جلدی راستہ تیار کیا۔

”تم اندر چل کر لیٹو میں تمہارا دل لے کر آئی ہوں۔“

وہ چاہتی تھی کہ نازیہ جلد از جلد وہاں سے ہٹ جائے نازیہ کی موجودگی اسے بلاوجہ کی شرمندگی سے دوچار کر رہی تھی۔

”میں میں لیٹ کر تھک چکی ہوں۔ اس لیے ابھی باہر سالار کے ساتھ بیٹھتی ہوں تم بشری کے ساتھ مل کر وہیں کھانا لگاؤ ہم سب آج ایک ساتھ مل کر کھانا کھائیں گے۔“

اپنی انہی سادگی سے جواب دیتی وہ کچن سے باہر نکل گئی مگر زہنب کو ایسا لگا جیسے وہ سالار اور اس کے دل میں چھپے چور کو بھانپ چکی ہے۔ شاید اب اس کے اور سالار کے درمیان کھیلنا جانے والا کیم جلد ہی ختم ہونے والا ہے۔

”چلو جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“

سالار نے چند دنوں میں ہی اسے خاصا بہادر بنا دیا تھا اور اب اس نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے گھبرانا چھوڑ دیا تھا۔ بنایہ جانے کہ آنے والا وقت اسے کن مشکلات سے دوچار کرنے والا ہے۔ فی الحال وہ اپنے حال میں مست تھی۔



وہ کٹہرے میں کھڑی تھی۔ اس کے سامنے پوری ایک عدالت جی ہوئی تھی۔ پھر بھی اس کے چہرے پر چھایا اطمینان انتہائی قابل دید تھا۔ عدالت کیا فیصلہ سنانے والی ہے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی اور نہ ہی کسی قسم کا خوف اس پر سوار تھا۔ وہ بالکل مطمئن تھی کیونکہ اپنا فیصلہ وہ خود کر چکی تھی۔ اب اسے کسی کے فیصلے کا کوئی انتظار نہ تھا۔

”اس جیسی فاحشہ کو تو سرعام پھانسی دے دینی چاہیے تاکہ دوسرے لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ استغفر اللہ اتنا دھوکا اس قدر بے حیائی۔“

اپنے عقب سے ابھرنے والی آواز وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بنا بھی پہچان سکتی تھی کہ کس کی ہے۔ اس کے لبوں پر بے ساختہ شکر اہٹ آگئی۔ اس نے ایک نظر اپنے سامنے موجود ڈاکٹر پر رکھی اوپچی سی کرسی پر ڈالی جس پر بیٹھا شخص یقیناً ”اس عدالت کا جج تھا جو اپنے دونوں ہاتھوں کی کمبیاں ٹیبل پر ٹکائے ہوئے صفا فی کابیان سننے میں بری طرح محو تھا۔ سامنے موجود کالے کوٹ والا شخص ضرور سرکاری وکیل تھا۔“

اس نے دونوں میں اس پر جانے کتنے الزامات عائد کیے جا چکے تھے۔ اس کے کردار کی دھجیاں اس بری طرح اڑائی تھیں کہ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ وہ خود پر لگائے گئے کسی بھی الزام کا جواب دینے کے لیے بالکل بھی راضی نہ تھی۔ اسے اگر کوئی جواب دینا تھا تو اس عدالت میں جو روز محشر لگائی جانے والی تھی اور جہاں موجود مصنف کا ہر فیصلہ اسے منظور تھا۔ اس نے اپنی سزا اور جزا کا فیصلہ خدا پر چھوڑ دیا تھا۔

سرکاری وکیل نے دوبارہ اس کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اس کا نام پکارتے ہوئے کچھ کہا۔ مگر اس کی کوئی بھی آواز اس کے کانوں تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اس نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے اپنے دائیں ہاتھ پر کھڑی پولیس والی پر ایک نظر ڈالی جو چہرے پر انتہائی سخت تاثرات لیے بالکل سیدھا سامنے دیکھ رہی تھی۔ اب اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی عدالت میں موجود حاضرین پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی بالکل سامنے والی پہلی رد میں



بیٹھے ہوئے ہر فرد کو وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی یہ تمام وہ لوگ تھے جنہیں بھی اس کے رشتے دار ہونے کا شرف حاصل تھا۔ مگر آج ان کے اجنبی چروں پر اس کے لیے سوائے نفرت کے کچھ نہ تھا۔ ان سب کی آنکھوں میں اپنے لیے حقارت ہی حقارت نظر آئی۔ سوائے ایک شخص کے جس کی آنکھیں پانی سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کے جھکے کندھے اپنی شکست کا اعتراف کر رہے تھے۔

ساری زندگی وہ اس ایک شخص کی ایک نظر کرم کی پیاسی رہی مگر شاید وہ عورت کے نازک جذبات و احساسات کو سمجھنے کے قابل بھی نہ تھا۔ روپیہ سینت کے رکھنا اس کے نزدیک دنیا کا سب سے بہترین فعل تھا۔ جب تک وہ اس کی دسترس میں بھی بالکل خالی دامن اور تھی دست رہی اور اب جب وہ یہ سب کچھ بہت پیچھے چھوڑ کر اندھا دھند آگے کی جانب نکل آئی تو وہ شخص اس کی محبت کا طلب گار بن کر راہ میں آگیا۔

وہ دری تقدیر نے سب کچھ تب دیا جب میری ضرورت ہی ختم ہو گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ کی لکیروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سوچا اس سوچ کے آتے ہی وہ بے اختیار ہنس دی۔ یہ سوچے بنا کہ وہ کہاں اور کس حال میں کھڑی ہے۔ وہ جو ہنسنا شروع ہوئی تو ہنسی ہی جلی گئی۔

”شاید بے درپے صدیوں نے میری موکلہ سے ان کا داغی تو ازن چھین لیا ہے۔ جانے یہ کون بے وقوف تھا جو اس قسم کے گھٹیا تجربے پیش کر کے خود کو عقل مند ثابت کر رہا تھا۔ وہ ہنسنے ہنسنے رُک گئی۔

”میرا خیال ہے وکیل صاحب آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ورنہ الحمد للہ میں داغی طور پر بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس کی پراعتاد آواز عدالت میں گونجتی ہی ہر طرف ایک سناٹا سا چھا گیا۔

وہ اریشہ کے ساتھ گئے ان ٹاور آیا تھا اسے ہمیشہ یہاں کی بلندیوں میں بیٹھ کر لچک لچکا اچھا لگناؤن کے وقت اس ریو الونگ ریسٹورنٹ کے شیشے کی دیوار کے عین قریب بیٹھ کر پورے لندن کا نظارہ اتنا حسین لگتا کہ ایشال کا جی چاہتا کہ ہمیشہ یوں ہی یہاں بیٹھا رہا اور زندگی گزرتی جائے وہ واپس جانے سے قبل اچھی طرح پورا لندن گھومنا چاہتا تھا ان دونوں کے ساتھ سریش اور دیوینا بھی تھے پر تکلف ماحول میں ایک اچھا سا لچ کر کے جیسے ہی وہ باہر نکلے اریشہ ایک جیولری شاپ کے سامنے رُک گئی ایشال جانتا تھا اچھی جیولری ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہی ہے وہ بھی اس کے قریب ہی جا کھڑا ہوا جبکہ دیوینا اور سریش آہستہ آہستہ چلتے آگے کی جانب بڑھ گئے۔

”آف ایشال یہ رنگ کس قدر حسین ہے۔“ اپنے قریب ایشال کی موجودگی محسوس کرتے ہی اریشہ نے اسے مخاطب کیا۔ ایشال نے دیکھا سامنے نظر آنے والے شیشے کے باکس میں موجود سفید نگ والی انگوٹھی نے اریشہ کی پوری توجہ اپنی جانب مبذول کروا رکھی تھی۔

”تمہیں پسند ہے؟“ ایشال نے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”آف کورس اسی لیے تو تمہیں دکھا رہی ہوں۔“ جواباً وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے قیمت پوچھ لو گنتے کی ہے؟“ ایشال کی بات سنتے ہی وہ شیشے کا ڈور دھکیلاتی شاپ کے اندر داخل ہو گئی ایشال نے اس کے پیچھے جانے کے لیے جیسے ہی اپنا قدم اٹھایا اس کا سیل بج اٹھا پاکستان کا نمبر دیکھتے ہی اس نے فوراً ”کال ریسیو کی۔“

”سلام علیکم“ یس کاٹن دبا کر سیل اپنے کالوں سے لگا کر وہ وہیں دروازے کے باہر رُک گیا۔

”و علیکم السلام بیٹا کیسے ہیں آپ؟“ دوسری طرف ملک صاحب تھے غیر متوقع طور پر اپنے بابا کی آواز سنتے ہی وہ خوش ہو گیا عام طور پر پاپا سے اس کی بات کم ہی ہوا کرتی تھی جبکہ ماما سے تو وہ تقریباً ”روزنی بات کیا کرتا تھا اگر کسی دن کبھی کسی وجہ سے ان سے بات نہ ہو پاتی تو اسے ساری رات نیند ہی نہیں آتی تھی۔

”بالکل ٹھیک اور فٹ آپ سنا میں طبیعت کیسی ہے؟“ وہ بولا تو خوشی اس کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔

”میں بھی ٹھیک ہوں بہت ادا واپس کب آرہے ہو میرا خیال ہے تمہارا لاسٹ سمسٹر ختم ہوئے بھی کافی دن ہو گئے۔ آجاؤ یا رہم سب تمہیں بہت یاد کر رہے ہیں۔“

جواباً وہ ہلکا سا ہنسنے ہوئے بولے۔

”آپ کو ماما نے نہیں بتایا۔“ وہ تھوڑا سا حیران ہوا۔

”میں نے انہیں بتایا تھا کہ ہم لندن گھومنے کے بعد واپس آئیں گے آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مجھے لندن ہمیشہ سے بہت پسند رہا ہے میرے خوابوں کا شہر ہے لندن۔“

”چلو اب واپس آجاؤ دوبارہ پھر چلے جانا لندن کون سا کہیں بھاگا جا رہا ہے۔“ بابا کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔

”بتا نہیں کیوں بابا مجھے لگتا ہے کہ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد انسان شاید زندگی کو اتنا انجوائے نہیں کر سکتا جتنا اس وقت ہم کر رہے ہیں۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

”اچھا تو پھر ایسا کرتے ہیں تمہارے واپس آتے ہی تمہاری شادی کر دیتے ہیں اور تم اپنا اپنی مومن لندن جا کر منانا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ساری بھول ہماری تھی



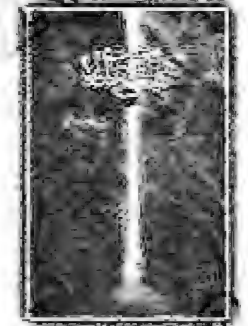
راحت جبین قیمت - 300/- روپے

شریک سفر



زہرہ ممتاز قیمت - 550/- روپے

کسی راستے کی تلاش میں



میمونہ خورشید علی قیمت - 350/- روپے

میرے خواب لوٹا دو



نگہت عبداللہ قیمت - 400/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی فون نمبر: 32735021



پھر ہمیں اندازہ ہو گا کہ شادی کے بعد کاسر زیادہ انجوائے فل ہوتا ہے اور یقیناً ہمیں اس سے زیادہ اچھا لگے گا جتنا اس وقت تم محسوس کر رہے ہو۔“

ان کی سرسری انداز میں کی جانے والی گفتگو اس کے آس پاس ایک خطرے کی گھنٹی سی بجائی اس نے نظریں اٹھا کر شاپ کے اندر جھانکا سامنے کاؤنٹر کے قریب کھڑی اریشہ منتظر نگاہوں سے اس کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔

”کیس ایسا نہ ہو میرے واپس جانے سے قبل ہی یہ میری ڈیٹ فکس کر دیں اور میرے پیچھے پیچھے کارڈ بھی تقسیم ہو چکے ہوں۔“

آج کی گفتگو نے یکدم ہی اسے کئی طرح کی منفی سوچوں میں پھنسا دیا۔

”نی الحال بابا مجھے ابھی شادی نہیں کرنی اور میں آپ کو کچھ دیر بعد کال بیک کرتا ہوں اللہ حافظ۔“

ان کا جواب سنے بغیر ہی اس نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کر کے فون بند کر دیا اسے اندازہ تھا کہ اندر موجود اریشہ کا موڈ اس وقت کافی خراب ہو چکا ہو گا یہ ہی سوچ کر اس نے تیزی سے شیشے کا دروازہ کھیل کر اندر قدم رکھا ہی تھا کہ باہر آنے والی کسی شخصیت سے بری طرح ٹکرا گیا۔

”اوسو آئی ڈیٹ ناٹ سی یو۔“

آواز کسی لڑکی کی تھی ایشال نے ناک رگڑتے ہوئے اپنا سر اٹھایا گرین ٹی شرٹ پر گرین ہی پر مشد اس کا رخ گلے میں ڈالے ایک گوری جیٹ سی لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”اٹس اوکے۔“ اس نے بشکل جواب دیا بیباکی بات ختم ہوتے ہی سبز لباس والی ایک لڑکی سے ٹکراؤ اسے وہم میں مبتلا کر گیا ایسا لگا جیسے یہ رنگ اس کے اور اریشہ کے درمیان حائل ہو گیا ہو حالانکہ وہ تو ہم پرست نہ تھا پھر بھی جانے کیوں اس عجیب و غریب سوچ نے اس کے دماغ کو بالکل ماؤف سا کر دیا اور وہ بنا کچھ کہے اریشہ کا بازو تھامے دکان سے باہر نکل آیا۔



وہ جیسے ہی آفس میں داخل ہوا نگاہ ہال میں رکھی کرسی پر بیٹھی حبیبہ پر پڑی جس کے بالکل سامنے بلیک سیکشن کا حصو لغاری اپنی ٹانگیں لمبی کیے بیٹھا جانے لگی کیا باتیں کر رہا تھا کہ حبیبہ کی ہنسی ہی نہیں رک رہی تھی شاہ زین کا اچھا بھلا موڈ فوراً ہی آف ہو گیا وہ تیزی سے ان کے پاس سے گزرتا اپنے کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔

”جی سر۔“ فوراً سے پیٹری علی احمد حاضر ہو گیا وہ باہر ہی اپنے صاحب کے موڈ کا اندازہ لگا چکا تھا۔

”مس حبیبہ کو بلائیں۔“ کرسی کھینچ کر بیٹھنے سے قبل ہی اس نے حکم صادر فرما دیا وہ سرے ہی بل حبیبہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”آپ نے مجھے بلایا۔“

عام طور پر اسے کبھی بھی شاہ زین نے اس طرح نہیں بلایا تھا اسی لیے اس کی حیرانی بجاتی تھی جبکہ دوسری جانب شاہ زین خود بھی اپنی اس غیر اختیاری حرکت کو محسوس کرتے ہوئے کچھ نروس سا ہو گیا تھا اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ حبیبہ کو کیا جواب دے اس لیے خاموشی سے دراز کھولے اس میں مصروف ہو گیا جب حبیبہ نے ایک بار اپنا سوال پھر سے دہرایا۔

”آپ نے مجھے بلایا تھا سر۔“

”لغاری صاحب کی فائل آپ کے پاس ہے؟“ بروقت اس سے بہتر سوال اس کی سمجھ میں اور کوئی نہ آیا۔

”جی میرے پاس ہی ہے آپ کو چاہیے۔“

”پلیز اگر زحمت نہ ہو تو ابھی علی احمد کے ہاتھ بھیج دیں۔“

”اوکے سر۔“ وہ جیسے ہی واپس پلٹی شاہ زین کی آواز نے اس کے آگے بڑھتے قدم روک دیے۔

”ایک منٹ حبیبہ۔“

”جی سر۔“ اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

”یہ عمر لغاری کو آپ کیسے جانتی ہیں؟“

”مطلب؟“ شاہ زین کے سوال نے اسے تھوڑا سا حیران کر دیا۔

”وہ یہاں ہمارے ہی آفس کا بندہ ہے سر یعنی میرا کولیگ تو پھر میں کیسے اسے نہیں جانوں گی۔“ اس کا جواب خاصا معقول تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر چونکہ اس کا ڈیپارٹمنٹ بالکل علیحدہ ہے اس لیے پوچھ لیا اگر میرا سوال آپ کو برا لگا ہو تو معذرت چاہتا ہوں۔“

”برا تو لگا، کیونکہ کسی سے جان پچان میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق میری جاب سے نہیں ہے مگر پھر بھی بتا دیتی ہوں، ہم دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں ہوتے ہیں۔ میں جاؤں اب۔“ بات ختم کر کے اس نے سوالیہ انداز میں شاہ زین کی جانب دیکھا۔

”جی۔“ اس نے آہستہ سے جواب دے کر سامنے رکھی فائل قریب کر لی۔

”میں آپ کی مطلوبہ فائل بھیجتی ہوں۔“

اتفاق کہ کروہر کی نہیں تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے شاہ زین کچھ نکل سا ہو گیا۔ اپنی جلد بازی میں کی جانے والی اس حرکت پر وہ خاصا شرمسار تھا۔



”کتنے ہی دن ہو گئے زینب سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

اس نے کروٹ بدلتے ہوئے اپنے قریب بیٹھے سالار کو مخاطب کیا جو ٹیبل لیپ کی روشنی میں ہیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔

”خیر بہت۔ یہ تمہیں اتنی رات گئے زینب کیسے یاد آئی؟“

سائڈ ٹیبل پر رکھی چھوٹی سی گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے اس نے نازیہ پر اک حیرت بھری نظر ڈالی۔

”یاد تو خیر وہ ہمیشہ ہی رہتی ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”عام طور پر میری اس سے فون پر بات ہو جاتی ہے مگر اب ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا مجھے اس سے بات کیے ہوئے شاید اس کا فون خراب ہے“ آج صبح بھی کیا تھا مگر کوئی رسپانس ہی نہیں ملا۔“

”اچھا چلو تم بھی کیا یاد کرو گی؟ کل شام میں تیار رہتا اس کے گھر جا کر مل آتے ہیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ خوشی سے جواب دیتے ہوئے وہ کینوں کے بل اٹھ بیٹھی۔

”سالار۔“ اسے پھر شاید کچھ یاد آگیا۔

”ایک بات پوچھوں۔“ وہ پر سوچ نکا ہیں سالار کے چہرے پر ڈالتے ہوئے بولی۔

”پوچھو یا رکھنا پوچھنا ہے تمہیں کوئی بات پوچھنے کے لیے میری اجازت کی ضرورت کب سے پڑ گئی۔“ وہ اپنی کتاب بند کر کے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ قلمی پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹھریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیری کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

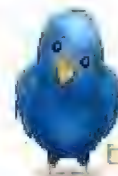
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



”آپ کے دل میں کبھی یہ خواہش نہیں جاگی کہ ہمارے بھی بچے ہوں جو ہم سے فرمائش کریں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر ضد کریں اور۔۔۔“ اس کی آواز بھینگ گئی اور اس سے آگے وہ بول ہی نہ پائی۔

”دیکھو نازیہ یہ ایک فطری خواہش ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی نہیں، کیونکہ مجھ سے زیادہ یہ خواہش تمہارے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ صبح کہہ رہا ہوں نا۔“

انتا کہہ کر وہ رکاوڑ نازیہ کی جانب تصدیق طلب نظروں سے دیکھا۔

”ہاں۔۔۔“ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اعتراف کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی چلیں بھی بھینگ گئیں جسے سالار نے دیکھا ضرور مگر نظر انداز کر دیا۔

”دیکھو نازیہ یہ ان خواہشوں میں سے ایک ہے جسے پورا کرنا کسی بھی انسان کے بس کی بات نہیں اور جو خواہش ہم خود پوری کرنے میں ایک فیصد بھی قادر نہ ہوں اس کے لیے بھلا اپنے دل کو برا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جس طرح زندگی اور موت پر ہمارا اختیار نہیں بالکل اسی طرح اولاد بھی ہمارے اپنے اختیار کی چیز نہیں اگر تمہارے آسیب میں ہوا تو یقیناً وہ تمہاری اس خواہش کو ضرور پورا کرے گا اور اگر نہ کرے تو جان لینا اس میں بھی اس پروردگار کی کوئی مصلحت ہے۔ یہ ہی سوچ کر ہمیشہ اس کا شکر ادا کرتی رہو یا در کھو وہ شکر کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔“

نازیہ کے آنسو سالار کے دل کو دکھی کر گئے۔ اسی لیے وہ اسے اچھی طرح سمجھاتے ہوئے بولا۔

”ویسے میری ڈاکٹر ذکیہ عالم سے بات ہوئی ہے۔ وہ اگلے ہفتے پاکستان آرہی ہیں۔ پھر ہم ان سے ملیں گے تمہاری رپورٹس میں نے انہیں فیکس کر دی تھیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ضرور ہمیں کوئی اچھی خبر دیں گی۔ تمہاری خواہش پوری کرنے کی جس حد تک میں کوشش کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔“

اس نے نازیہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے سارے بال بکھیر دیے۔

”پھر بھی سالار اگر کبھی آپ کو ایسا لگے کہ میرا وجود آپ کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے ادھورا ہے تو پلیز بنا کوئی خیال دل میں لائے آپ دوسری شادی کر لیجیے گا۔“

اس نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کھلے دل سے مشورہ دیا۔

”اچھا چلو اب تم سو جاؤ ہم اس مسئلے پر پھر کبھی بات کریں گے۔“

سالار جانتا تھا کہ اس وقت وہ کافی اب سیٹ ہے اس لیے بہتر تھا کہ اس لمحہ اس سے کوئی بحث نہ کی جائے۔ نازیہ اس کی بات سن کر بغیر کوئی ضد کیے اپنا تکیہ سیدھا کرتے ہوئے لیٹ گئی۔ سالار بھی ٹیبل لمپ آف کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

\*\*\*

اماں اپنا پرانا باکس کھولے جانے اس میں کیا تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے ایک دوبار نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر سے اپنے ہوم ورک میں مصروف ہو گئی۔ آج صبح سے ہی گرمی بہت زیادہ تھی۔ سورج چھ بجے سے ہی سوا نیزے پر کھڑا تھا۔ جس کی برستی گرم کرنوں نے ان کے کپے آنگن کو خوب اچھی طرح تپانے کے بعد اس اکلوتے کمرے کا رخ بھی کر لیا تھا۔ جہاں چھت پر لگا پنکھا بالکل ہولے ہولے گھوں گھوں کرتا ایسے گھوم رہا تھا۔ جیسے گرم آگ ہو اکی صورت اندر پھینک رہا ہو۔ ایک دوبار اس نے اپنا ہوم ورک روک کر دھیرے دھیرے گردش کرتے پنکھے کی جانب بھی دیکھا۔ مگر شاید یہ گرمی صرف اس کو ہی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ جبکہ اس کی ماں اس کی شدت سے بالکل بے نیاز اپنے کام میں بری طرح مصروف تھی کمرے میں چھانی خاموشی کا احساس ہوتے ہی وہ یک دم گھبرا



انھی اور اس خاموشی کو توڑنے کے لیے بے اختیار ماں کو بکار بیٹھی۔

خاموشی کو توڑتی اس کی آواز کچھ عجیب سی محسوس ہوتی۔

”کیا بات ہے؟“ ماں نے ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے اپنا بکس بند کر دیا۔

”آج بہت گرمی ہے۔“ وہ اپنی کاپی اٹھا کر بالکل نکلے کے نیچے آگئی۔ اس کی قمیص سینے سے بھیک کر کرے چپک سی گئی تھی۔

”مٹی کے پیچھے میں ہمیشہ اتنی ہی گرمی ہوتی ہے۔“ ماں اپنا بکس بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”ہاں مگر آج شاید کچھ زیادہ ہی ہے یا پھر ہمارا پنکھا بہت سلو چل رہا ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ وہ ہمیشہ اتنی ہی مختصر بات کرنے کی عادی تھیں، جواب دے کر وہ داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئیں۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں۔“

”اتنی گرمی دھوپ میں ماں کو کمرے سے باہر جانا دیکھ کر وہ برداشت نہیں کر سکی اور فوراً ہی بول اٹھی۔

”صبح کپڑے بھگوانے تھے سوچ رہی ہوں انہیں دھو کر خود بھی نہالوں۔“ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔

”ماں نہا کر آئیں تو میں بھی نہا لیتی ہوں۔“ یہ خیال دل میں آتے ہی وہ جلدی جلدی اپنا ہوم ورک ختم کرنے لگی اور جب فارغ ہو کر باہر نکلی تو دھوپ کی شدت میں خاصی کمی تھی۔ سامنے والی دیوار کا سایہ بڑھ گیا تھا۔ شاید

آسمان پر بادل آگئے تھے۔ اس نے ہاتھوں کا چھجاسایا کر اوپر دیکھا۔ سورج بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ اس

نے اپنی کاپی بند کر کے بیگ میں ڈالی اور خود دروازے کی چوکھٹ پر آ بیٹھی اس دم ماں دھلے ہوئے کپڑوں کی بانٹی

ہاتھ میں تھامے ہاتھ روم سے باہر نکلیں۔ وہ عام طور پر گرمیوں میں نہانے کے بعد تولیہ استعمال نہیں کرتی تھیں۔

اس سبب ان کی قمیص پانی سے گیلی ہو گئی تھی۔ اس نے غور سے اپنی ماں کے چہرے کو ٹکا، زمانے کے سرد گرم نے

انہیں بہت بدل دیا تھا مگر آج بھی انہیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں تھا کہ یہ کھنڈر زدہ عمارت کسی زمانے

میں بہت عالی شان رہی ہوگی۔ وہ خاموشی سے انہیں تار پر کپڑے پھیلاتے دیکھ رہی تھی کہ جانے کہاں سے ایک

خیال اس کے ذہن میں آیا۔

”ماں۔۔۔“ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک بار پھر انہیں پکارا۔

”اب کیا ہو گیا؟“ اپنا دوپٹا اچھی طرح نیچوڑ کر انہوں نے سارا پانی نکالا اور پھر اسے تار پر پھیلاتے ہوئے

پلٹ کر اسے دیکھا۔

”ماں آپ کی کوئی بہن نہیں ہے۔“

”نہیں۔“ مختصر سا جواب دے کر وہ پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

”اور بھائی۔“ وہ پھر سے بول اٹھی۔

”نہیں۔“ ماں نے بالٹی بھر کر پانی سارے صحن میں بہا دیا یا فرش کی گرمی پہلے سے کیس کم ہو گئی۔

”ہمارا کوئی بھی رشتہ دار کیوں نہیں ہے؟“

کئی زمانے سے دل میں آئے سارے سوال دھیرے دھیرے اس کے لبوں پر آگئے۔ ماں نے حیرت سے پلٹ

کر اسے دیکھا۔ انہوں نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنے سالوں بعد اپنی اولاد کو ان تمام سوالوں کا جواب دینا

ہو گا۔ اچانک ہوا چلی تار پر پھیلا دیا ہوا دوپٹا نیچے گر کر خراب ہو گیا۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنا دوپٹا

اٹھایا۔

”ماں آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

جی نے ایک بار پھر جواب طلبی کی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا وہ چوکھٹ پر بیٹھی ان ہی کی جانب متوجہ تھی۔

”کس بات کا جواب۔“ وہ ایک دم ہی انجان بننے ہوئے دوبارہ سے ہاتھ روم میں گھس گئیں۔ تاکہ دوپٹے کو

ایک بار پھر سے صاف پانی سے نھار لیا جائے اور خوب دیر لگا کر واپس نکلیں۔ وہ ابھی بھی چوکھٹ پر بیٹھی شاید ان

کے جواب کی منتظر تھی۔ ایک ایسا جواب جو دینے والے کے دل کے اندر ترانہ ہو گیا تھا۔

”تم نے اپنا ہوم ورک ختم کر لیا۔“ وہ اس کی توجہ ہٹانے کے لیے بولیں۔

”تھوڑا سا رہ گیا ہے ابھی کر لیتی ہوں مگر آپ پہلے میری بات کا جواب دیں ہمارا کوئی ماموں، خالہ، پھوپھی کیوں

نہیں ہیں۔ جیسے دوسروں کے ہوتے ہیں ہمارے گھر کبھی بھی کوئی رہنے کیوں نہیں آتا اور نہ ہی ہم کہیں جاتے ہیں

ہمارے گھر کبھی بھی کوئی مہمان عید، بقیہ عید پر نہیں آتا۔ ایسا کیوں ہے۔ جواب دیں ماں۔“ وہ اپنا چہرہ ہتھیل پر

دھرے پر جوش انداز میں بولتی چلی گئی۔

”کیا ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“ ماں کی خاموشی سے اس نے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا، اک حسرت سی اس کے

لبے میں گھل گئی۔

”اللہ نہ کرے۔“ وہ دہل اٹھیں، ایسا لگا جیسے کسی نے ان کا دل مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔ لاکھ چاہا ہر رشتے

سے انکار کر دیں مگر ہائے دل مانا ہی نہیں کہ سب کے ہوتے ہوئے انہیں جھٹکا دیا جائے۔

”سب ہیں مگر ہم سے کوئی نہیں ملتا، سمجھو ہم ان سب کے لیے مر گئے۔“

انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گئیں۔

”کیوں ہم نے ایسا کیا کیا ہے ماں جو جیتے جی سب کے لیے مر گئے۔“ ایک اور سوال۔

اب وہ کیا بتا تیں کہ سب ان کے اعمال کا کیا دھرا ہے جو وہ ساری دنیا سے کٹ کر اس طرح بے مرد سلامتی کی

حالت میں تین تہا زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ انہیں آج زندگی میں پہلی بار افسوس ہوا کہ وہ اسے اپنے ساتھ

کیوں لے آئیں اور اگر لے ہی آتی تھیں تو جب اس کے باپ نے انہیں کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا تو بلا چون چڑا

واپس کر دیتیں کم از کم آج وہ تو یہ زندگی نہ گزارتی جو ان کا مقدر بن گئی تھی۔ ”اے کاش گزر اوقت ایک بار واپس

آجائے تو شاید یہ معصوم اس گندی دلدل سے نکل جائے جو میں نے خود اپنے لیے خنجر کی اور ساتھ اسے بھی

گھسیٹ لیا۔“

انہوں نے ایک افسوس بھری نگاہ اپنے قریب موجود اپنی بیٹی پر ڈالی جس کا اس بھری دنیا میں ان کے سوا کوئی نہ

تھا۔ وہ ایک بار پھر پوری شدت سے پچھتا رہی تھیں یہ ایک پچھتاوا ہی تو تھا جو روگ کی طرح ان کی پوری زندگی پر محیط

ہو گیا تھا۔ ان کا دل بھر آیا اور وہیں گھنٹوں میں سر دے کر بے اختیار رونے لگتیں۔

میں تو اسے اپنے ساتھ بھٹلے کے لیے لائی تھی، کیا پتا تھا کہ وہ وقت میرے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل

جائے گا، نہ میرے آگے کچھ رہے گا اور نہ ہی پیچھے کچھ باقی بچے گا، سب ملیا میٹ ہو جائے گا۔ اچھی زندگی کی

خواہش سے میرا سب کچھ چھین لے گا۔ کاش میں جان جانی کہ برائی کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے۔ انسان بہت کچھ

سوچتا ہے مگر ہمیشہ وہی ہوتا ہے جو وہ سوچتا رہا ہے جو اس کے نصیب میں لکھ دیا جاتا ہے۔“

”ماں۔۔۔“ کندھا ہلانے پر انہوں نے اپنے گھنٹوں سے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

”بتائیں نانہ ماں ہم سے کوئی کیوں نہیں ملتا۔“

پھر وہی سوال شاید وہ اپنی تنہائی سے تنگ آ چکی تھی مگر ابھی وہ خود اس قابل نہ تھیں کہ اپنی بیٹی کے اس سوال کا

جواب دیتیں جانتی تھیں کہ ایک دفعہ انہیں اپنی بیٹی کے اس مشکل ترین سوال کا جواب ضرور دینا پڑے گا۔

”بتاؤں گی۔ ضرور بتاؤں گی مگر ابھی نہیں اور ہاں کوشش کرنا کہ مجھ سے ایسا سوال دوبارہ کبھی مت کرنا تم نہیں



جانتیں ایسے سوال میرے دل کو اندر تک چیر دیتے ہیں۔“  
آخری جملہ انہوں نے اپنے لبوں میں اس طرح ادا کیا کہ آواز قریب کھڑی بنی تک نہ جاسکے اور پھر گھٹنوں میں سر دبا کے گھسنے لگیں۔  
”جج ہے جیتے جی انسان کبھی بھی اپنے ماضی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا یہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جسے سمجھانے کے وقت جیسا استاد درکار ہوتا ہے۔“



آج اس کالونیورٹی میں داخلہ انٹرویو تھا اور وہ خاصی ندوس سی تھی اس سے پہلے اس نے کبھی اس قسم کا انٹرویو نہیں دیا تھا اس نے اچھی طرح تیار ہو کر قد آدم آئینہ میں اپنا جائزہ لیا لان کے بلیک اور وائٹ سوٹ کے ساتھ لمبے سے بالوں کی چوٹی میں اس کا چہرہ بالکل صاف اور شفاف نظر آ رہا تھا۔ میک اپ کے نام پر صرف پتک لب گلوں اس کے ہونٹوں پر تھا اپنے قریب رکھی کالی چادر اٹھا کر اس نے کھولی ہی تھی کہ یکدم سیکنڈ ہول آگئی۔  
”ارے بچے تمہارے سوٹ کا ڈیٹا بہت بڑا ہے اسے کھول کر اچھی طرح اوڑھ لو کیا ضرورت ہے اتنی بڑی چادر اوڑھنے کی کیسے بھی گاڑی میں جانا اور گاڑی میں ہی واپس آنا کون سا تم بس میں سفر کرنے جا رہی ہو۔“

”ہاں بیٹا اس بار تو ملک صاحب بھی ڈھکے چھپے کہ گئے کہ ایشال کو فیشن کرنے والی لڑکیاں پسند ہیں اور بات بھی ٹھیک ہے ساری زندگی یورپ میں گزارنے والا تم جیسی لڑکی کو کیسے پسند کرے گا سوچو ذرا وہ تو انگریزوں میں رہنے کا عادی ہو گیا ہے کچھ نہ سہی تو مجھے اپنے شوہر کی خواہش کے مطابق خود کو ڈھالو آخر ملک صاحب اسی لیے تو تم کو انٹی تعلیم دلار ہے ہیں ورنہ میٹرک گروا کے گھر بٹھا دیتے۔“

سیکنڈ خالہ اول تو بات ہی کم کیا کرتیں مگر جب کرتیں تو بڑا مکمل وضاحت خاموش ہی نہ ہوتیں ابھی بھی ایسا ہی ہوا جانے ملک صاحب کی کئی ہوئی کس بات کو انہوں نے اپنی مرضی کے معنی پر سنا کر ہر بات اسے سمجھادی کیا باج تھا اور کیا غلط وہ کچھ سمجھ نہ پائی مگر اتنا ضرور ہوا کہ ایشال کا نام سنتے ہی ہٹا کوئی بحث کیے اس نے خاموشی سے چادر اتار کر قریب رکھی کر سی پر ڈال دی سوٹ کا ڈیٹا استری اسٹینڈ سے اٹھا کر اوڑھتے ہوئے ٹیبل سے ہینڈ بیگ بھی اٹھالیا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی باہر کی جانب چل دی سیکنڈ اس کے پیچھے پیچھے ہی تھیں تاکہ باہر کا دروازہ بند کر سکیں جب دروازے کے باہر نکلتے نکلتے رک گئی۔

”اللہ حافظ آئی۔“ آہستہ سے کہہ کر وہ میڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔  
”اللہ تمہیں ہمیشہ کامیاب کرے۔“ اپنے پیچھے آئی سیکنڈ کی آواز اسے اپنی ماں کی یاد دلا گئی وہ بھی ہمیشہ اس کے لیے اسی طرح دعا کیا کرتی تھیں اسے اچھی طرح یاد تھا وہ پانچ وقت کی نماز کے بعد ہمیشہ اماں کے سر پر جا کھڑی ہوتی۔

”اماں میرے لیے اچھی سی دعا کرنا۔“

”اللہ ہمیشہ میری بچی کو ہر امتحان میں کامیاب کرنا۔“ ماں کا یہ جملہ ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا۔  
”آمین۔“ خالہ سیکنڈ کی دعا کا جواب دل ہی دل میں دیتی وہ میڑھیاں اتر گئی۔



اسے بریانی بے حد پسند تھی اس لیے آج وہ صبح سے کچن میں تھسی بریانی کی تیاری کر رہی تھی ساتھ ہی اس نے خرتج سے کھیرے نکال کر نوکری میں دھو کر رکھ دیے تاکہ پانی خشک ہونے کے بعد انہیں کٹ لے بریانی کے

ساتھ وہ ہمیشہ وہی میں کھیرے ڈال کر رات تیار کرتی جو اسے بے حد پسند تھا اس نے سالن میں چاولوں کی تہ لگا کر دم دے دیا بریانی کی خوشبو اس کے نعتوں میں گھس کر اس کی بھوک کو مزید بڑھا گئی اب اس کا ارادہ جلدی جلدی نہا کر کپڑے تبدیل کرنے کا تھا تاکہ اس کے بعد اطمینان سے اندر لی وی کے سامنے بیٹھ کر اچھی طرح بریانی سے لطف اندوز ہو سکے کہ اچانک ہی کسی نے باہر کی بیل بجادی۔  
”یہ اتنی گرمی میں اس وقت کون آگیا“ وہ منہ ہی منہ میں بریانی۔

”مریم بیٹا کھو یا ہر کون ہے؟“

اس نے وہیں کھڑے کھڑے مریم کو آواز لگائی دوسرے ہی پل مریم دوڑی دوڑی کچن میں داخل ہوئی اور پھولی ہوئی سانسوں میں بتایا۔

”اماں سالار انکل آئے ہیں۔“

”اس وقت۔۔۔“ وہ تھوڑا سا حیران ہوئی اور دروازے پر لٹکا اپنا ڈیٹا اتار کر تیزی سے باہر دروازے کی جانب آگئی جہاں سالار کے ساتھ نازیہ بھی موجود تھی۔

”ارے آپ لوگ باہر کیوں کھڑے ہیں اندر آجائیں۔“

ان دونوں کو اچانک اس طرح اپنے گھر کے دروازے پر دیکھ کر وہ اس قدر حواس باختہ ہوئی کہ سمجھ ہی نہ آیا کیا کرے۔

”میں صرف نازیہ کو چھوڑنے آیا ہوں یہ تم سے ملنے کے لیے خاصی بے قرار تھی اس لیے سوچا ابھی چھوڑ دوں شام میں واپس جاتے ہوئے لے لوں گا تم ڈسٹرب تو نہیں ہو سکیں۔“

اسی طرح بتاتے بھری دوہر زینب کے گھر آنے پر بلی سی شرمندگی کا احساس سالار کو بھی ہوا۔  
”نہیں میں نے بھلا کیوں ڈسٹرب ہونا ہے بلکہ اچھا ہوا یہ آگئی میرا وقت بھی اچھا گزر جائے گا۔“ وہ اس کی شرمندگی کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔

”چلو میں چلتا ہوں پانچ بجے تک تمہیں پک کر لوں گا۔“

اس دفعہ اس نے نازیہ کو مخاطب کیا جو بالکل خاموش کھڑی تھی۔  
”اللہ حافظ“ وہ دھیرے سے کہتی اندر داخل ہو گئی زینب اس کا ہاتھ تھامے اپنے کمرے میں ہی لے آئی

جہاں بستر پر سامنے ہی جگنو سو رہی تھی۔  
”تم یہاں بیٹھو میں ابھی کھانا لے کر آتی ہوں۔“

اسے وہاں چھوڑ کر وہ واپس ہی پٹی تھی کہ نازیہ نے آواز دے کر روک لیا۔

”ایسا کرو تم باہر آدے میں رکھی ٹیبل پر کھانا لگاؤ میں بھی وہیں کھاؤں گی۔“

نازیہ بنا تکلف کہتی اس کے پیچھے ہی باہر آگئی۔

زینب نے کھانے کے ساتھ اسکو اسٹیل بھی بنالیا اور پھر دونوں نے نہایت خوشگوار ماحول میں مزے کے ساتھ خوب ڈٹ کر کھایا۔

”تم بریانی بہت لذیذ بناتی ہو۔“

کھانے کے دوران کئی بار نازیہ نے اپنا یہ جملہ دوہرایا اور ہر بار وہ اس جملے کو سن کر شرمندہ ہوتی گئی کیونکہ جانتی تھی کہ نازیہ بہت بہترین کوکنگ کرتی تھی جس کی ہمیشہ سالار تعریف کیا کرتا اور پھر شام تک نازیہ اس کے ساتھ رہی تقریباً ”پانچ بجے جب سالار اسے لینے آیا تو خوب لدا چندا تھا ڈھیروں ڈھیروں کے سامان کے ساتھ

ساتھ کئی طرح کا فروٹ مریم اور جگنو کے لیے کچھ کھلونے جسے لا کر اس نے ٹیبل پر ڈھیر کر دیا“ زینب بنا کسی جرح



کے تمام سامان اٹھا کر اندر رچن میں میں لے آئی عرصہ ہوا اس نے سالار کے ساتھ روایتی مکالمہ بازی کا عمل ترک کر دیا تھا اس کی لائی ہوئی ہر چیز وہ پورے استحقاق سے استعمال کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔

\*\*\*

”ایک بات تو بتاؤ۔“ سامان پیک کرتے کرتے جیسے اریشہ کو یاد آگیا۔  
”کون سی بات۔“

ایشال جو پیکنگ میں اس کی مدد کر رہا تھا پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

”تم واپس جا کر اپنی اس کزن سے شادی کر لو گے جس سے کئی سال قبل نکاح کر کے آئے تھے۔“

دل میں دیا کئی سال پرانا خدشہ بالا خراس کے لبوں تک آئی گیا کیونکہ وہ دن بعد ان کی فلائٹ تھی اور وہ دونوں اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس جا رہے تھے اسی لیے شاید آج وہ چاہتی تھی کہ اپنی ہر بات کی وضاحت کرے مگر بعد میں کسی قسم کا کوئی مغالطہ اس کی زندگی خراب نہ کرے اور اس سوال کا کیا جواب دے یہ خود ایشال کی سمجھ میں بھی نہ آیا۔

”میں نے کوئی اتنا مشکل سوال نہیں کیا جس کا جواب دینے میں ہی تم نے پندرہ منٹ لگا دیے ہاں یا نہ کہو اور بات ختم کرو۔“

ایشال کی خاموشی نے اریشہ کا موڈ یکدم ہی آف کر دیا۔

”تمہیں کس نے یہ کہا کہ میں اس لڑکی سے شادی کر لوں گا جس کا آج تک مجھے نام بھی معلوم نہیں۔“

جواب دینے کے بجائے الٹا اس نے خود سوال کر ڈالا۔

”ظاہر ہے جب ہنا نام پوچھے نکاح کے پیرز پر سائن کر آئے تھے تو شادی بھی کرو گے ہی ناویسے بھی اب تو صرف رخصتی باقی ہے باقی سب کچھ تو ہو گیا ہے۔“

وہ بیک کی زپ بند کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتے ہوئے بولی۔

ایشال نے صرف ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی جو شاید غصہ کے باعث ہلکا سا سرخ ہو گیا تھا اور ایسا یقیناً ”اس کے نکاح کے ذکر کے باعث ہوا تھا“ وہ خاموشی سے آگے بڑھا ”اریشہ کے سامنے رکھا بیگ اپنی جانب کھسکایا اور خاموشی سے زپ بند کر دی۔“

”ضروری نہیں ہے کہ اگر بچپن میں میری مرضی کے خلاف میرا نکاح کر دیا جائے تو میں اب اسے رخصت کروا کے اپنے گھر بھی لے آؤں میں اب بالغ اور سمجھ دار ہوں شادی کا فیصلہ کرنے کا اختیار مجھے میرے مذہب نے بھی دیا ہے تو پھر میں کیوں وہ زندگی اپنے لیے منتخب کروں جو مجھے پسند نہ ہو۔“  
وہ سانس لینے کے لیے رکا۔

”میں فیصلہ کر چکا ہوں واپس جاتے ہی اسے طلاق دے دوں گا۔“ وہ فیصلہ کن لہجہ میں بولا۔

”تم کیا سمجھتے ہو یہ سب کچھ بہت آسان ہے اور انکل تمہیں ایسا کرنے دیں گے۔“

وہ جانتی تھی کہ بہت مشکل ہے ایشال کا اپنے فیصلہ پر عمل درآمد کرنا اور اس سلسلے میں اسے ملک انکل کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ وہ کبھی بھی یہ نہ چاہیں گے کہ ایشال ان کی بیٹی کو چھوڑ کر اریشہ سے شادی کرے اس کے نزدیک جذبات سے زیادہ عقل ایسے تمام اعمال کے لیے ضروری تھی۔

”وہ بعد کی بات ہے فی الحال جو فیصلہ مجھے کرنا تھا میں نے کر لیا اور میرے اس فیصلے میں ممانعت میرے ساتھ کھڑی ہیں میں تمنا نہیں ہوں اور مجھے یقین ہے ممانعت کے سامنے بیباکی ایک نہیں چلنے والی۔“

ماہنامہ کرن 52

باپ کے خوف پر ماں کی مدد کا جذبہ غالب آگیا ویسے بھی اسے اپنی ماں پر پورا بھروسہ تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف کیا کبھی بھی اس کی شادی نہیں کر سکتے۔ ”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“

”ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا تم فکر مت کرو میں تمام معاملہ حل ہونے کے بعد جلد ہی ممانعت کو تمہارے گھر بھیج دوں گا جس اس مسئلے کے حل ہونے تک تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہو گا اور اگر کوئی مشکل پیش آئے تو میرا ساتھ دینا ہو گا۔“

وہ اریشہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے ایک جذب کے عالم میں بولا۔

یہ پہلا عہد تھا جو آج اتنے سالوں میں اس نے کیا تھا اور یہ سب سننے کے لیے اریشہ کے کان جانے کب سے خنجر تھے وہ شروع سے جانتی تھی کہ ایشال اسے پسند کرتا ہے ایشال بھی اس کی دل کی کیفیت سے آگاہ تھا مگر ایشال کے نکاح نے ان دونوں کے درمیان ایک ان دیکھی دیوار سی کھڑی کر رکھی تھی۔ جسے آج ایشال نے گرا دیا ”بولو اریشہ میرا ساتھ دو گی۔“

اسے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر وہ پھر سے پوچھ بیٹھا۔

”میں تو ہمیشہ سے ہی تمہارے ساتھ ہوں بے شک جیسے بھی حالات ہوں۔“ اس اقرار نے اسے پرسکون کر دیا۔

”ٹھیک ہے اب جو کچھ ہو گا اسے واپس جا کر اکٹھے ایک ساتھ بھگتیں گے۔“

اس جواب نے ایشال کو ایک دم ہلکا پھلکا کر دیا اور وہ جیسے شانت ہوتا ہوا بولا۔

”ویسے ایک بات کہوں ایشال یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا سمجھ رہے ہو تمہیں اس سلسلے میں انکل کی ایک زوردار مخالفت کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا ہو گا۔“

اریشہ کا خدشہ موافقت درست تھا اور یہ بات ایشال خود بھی اچھی طرح جانتا تھا۔

”جانتا ہوں اور اس کے لیے میں ذہنی طور پر تیار بھی ہوں اسی لیے یہاں ایک کمپنی میں اپنی جاب کے لیے پیرز دے کر جا رہا ہوں مگر اگر مجھے اپنا گھر بھی چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دوں مگر میں کسی بھی صورت ایسی لڑکی کو بیوی بنا کر اپنے گھر نہیں لا سکتا جس کی ماں کی بد چلتی کے قصے پورے خاندان میں مشہور ہوں۔“

وہ سانس لینے کے لیے رکا اور اریشہ کے خنجر چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ ”اور اگر میں یہ سب کچھ بھول کر اسے اپنانے کا سوچ بھی لوں تو تمہاری محبت مجھے کبھی اس کا ہونے نہ دے گی اور یہ بات تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔“  
اریشہ کے چہرے پر اک اطمینان پھیل گیا یہ ہی تو وہ جملہ تھا جسے سننے کی وہ ہمیشہ سے منتظر تھی۔

\*\*\*

وہ جب اسکول سے واپس گھر آئی تھی اماں کو اندر کمرے میں چارپائی پر بے سدھ ہی پڑے دیکھا بخار تو انہیں رات سے ہی تھا مگر شاید اس وقت اس کی شدت زیادہ ہو گئی تھی اب اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ان حالات میں کیا کرے جس سے اس کی بستر پر بڑی ماں فوراً ”سے پشتر چاق و چونڈ ہو جائے اسے ہمیشہ سے ہی گھر میں چھایا سناٹا کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا گھر میں پچھلی خاموشی سے اسے گھبراہٹ ہوتی تھی اب تو اس سے باتیں کرنے والی واحد ہستی بھی چپ چاپ آنکھیں موندے بستر پر نہ حال پڑی تھی آخر گھر میں چھائی ویرانی سے وہ گھبرا گئی اور ماں کی چارپائی کے قریب جا بیٹھی۔

”اماں! اماں!“

ماں کا ہاتھ تھا کہ اسے پکارتے ہوئے وہ بالکل روہا سی ہو گئی اور ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے

ماہنامہ کرن 53



جب وہ ماں کے سرہانے بیٹھی بے اختیار بے آواز روتے چلی جا رہی تھی کہ اچانک اس بل کمرے کا دروازہ ہٹا کر برابر والی فاطمہ خالہ فرشتے کی صورت اندر داخل ہوئیں انہوں نے اپنے ہاتھوں میں ایک بڑا سا سلور کا ٹورا اٹھا رکھا تھا۔

”آئیں تم اسکول سے۔“ اس پر نظر پڑتے ہی وہ بڑی محبت سے بولیں۔

”جی خالہ۔“

انہیں دیکھ کر وہ جلدی اپنی آنکھیں صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پی کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے جب سے آئی ہوں ایسے ہی پڑی ہیں نہ آنکھیں کھولتی ہیں اور نہ ہی میری کسی بات کا جواب دے رہی ہیں۔“

انہیں بتاتے جاتے وہ ایک بار پھر سے رونے لگی۔

”ارے بیٹا رو کیوں رہی ہو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو وہ اپنا کرم ضرور کرے گا۔“

اسے خود سے لگاتے ہوئے خالہ نے بڑے پیار سے تسلی دی تھوڑی ہی دیر میں اس کے آنسو ختم سے گئے۔

”بیٹا یہ کٹورے میں برف ہے اسے کولر میں ڈال لو پھر کسی برتن میں ٹھنڈا پانی لاؤ تاکہ تمہاری ماں کی پٹیاں کریں اس سے ان شاء اللہ بخار کی شدت میں ضرور کمی ہوگی۔“

اس نے خالہ کے ہاتھ سے کٹورا اٹھا اور جلدی سے بچن میں جا کر ان کی تمام ہدایات پر عمل کرتی ہوئی ٹھنڈا پانی اور ساتھ ہی کپڑے کا ایک ٹکڑا لیے واپس آگئی اور پھر جلدی جلدی پانی میں کپڑا بھگو کر ماں کے ماتھے پر رکھا۔

”تم نے کھانا کھایا؟“ ٹھنڈے پانی سے اس کی ماں کے ہاؤں نیچے کرتیں خالہ کو جیسے اچانک ہی یاد آیا اور وہ اس کے ستے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سوال کر بیٹھیں۔

”نہیں۔“ جواب کے ساتھ ہی اس نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

”معاف کرنا بیٹا تین بج گئے اور مجھے یاد ہی نہ رہا کہ تم بھوکے ہو۔“ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”تم لگا تار پٹیاں کرو اپنی ماں کو یہ ابھی ہوش میں آجائے گی اتنی دیر میں تم لوگوں کے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔“

”جی اچھا۔“ اثبات میں جواب دے کر وہ پھر سے اپنی ماں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسے اپنی ماں کے بعد اگر کسی کا تھوڑا بہت بھی سہارا تھا تو وہ واحد فاطمہ خالہ تھیں جو ان دونوں ماں بیٹی کا خیال بالکل اپنوں کی طرح رکھتی تھیں صرف پانچ منٹ بعد جب وہ واپس آئیں تو ایک بڑی سی پلاسٹک کی پلیٹ تھامے ہوئی تھیں۔

”یہ بریانی ہے رات میری بہن کے گھر دعوت تھی واپسی میں اس نے ڈھیروں ڈھیر ساتھ ہی دے دی اب جتنی تمہیں کھانی ہے سو کھا لیتا باقی سنبھال لینا رات میں کام آئے گی پھر بھی اگر تمہیں کچھ ضرورت پڑے تو میری دیوار بجاؤ میں آجاؤں گی۔“

انہوں نے اسے پلیٹ تھماتے ہوئے سمجھایا بریانی کی خوشبو ناک میں جاتے ہی اس کی بھوک چمک اٹھی ذرا سی دیر میں وہ اپنی ماں کی بیماری بھی بھول گئی اسے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ آخری بار اس نے بریانی کب کھائی تھی شاید کئی زمانے بیت گئے وہ تو اپنی ماں کے ساتھ روکھی سوکھی کھانے کی ہی عادی ہو چکی تھی جلدی سے پلیٹ تھام کر اس نے بچن کی جانب جانے کے لیے اپنا قدم اٹھایا ہی تھا کہ پیچھے سے آئی ہلکی سی ماں کے کراہنے کی آواز نے اسے پھر اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

”ہائے۔“ اس نے پلیٹ کر دیکھا وہ تکلیف کی شدت سے آہستہ آہستہ تکیہ پر سر مار رہی تھیں وہ وہیں رک گئی ایک سی بل میں اس کی بھوک پیاس سب ختم ہو گئی۔

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ ٹھنڈا پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، ہائرل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

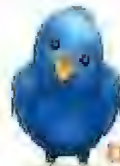
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1





”تم جاؤ گھانا کھاؤ میں اسے دیکھتی ہوں۔“

خالہ نے اسے اپنی جگہ کھڑا دیکھ کر کہا اور خود جلدی سے ٹھنڈے پانی کا کٹورا اٹھاتے ماں کے سرہانے جا کھڑی ہوئیں۔

”میرا خیال ہے تمہاری ماں بھی بھوکی ہے۔“

شاید اس کی ماں کے چہرے پر چھائی زردی نے انہیں یہ احساس دلایا وہ کچن میں جاتے جاتے رک گئی اسے یاد آیا ماں نے رات سے کچھ نہ کھایا تھا۔ سوائے ایک کپ چائے کے جو بڑی مشکل سے ان کے حلق سے اتری تھی رات انہوں نے روٹی پکائی ضرور تھی مگر کھانے کو دل نہ چاہا بخار کی وجہ سے ان کا حلق کڑوا ہو گیا تھا اس لیے وہ کچھ بھی نہ کھیا رہی تھیں۔

”ایسا کرو تم گلاس میں پانی لا کر اسے پلاؤ میں اس کے لیے بھی کچھ لاتی ہوں۔“

وہ ایک بار پھر پاؤں میں چپل پھنسا کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور اگلے ہی بل جب وہ واپس آئیں تو چائے کے ایک کپ کے ساتھ کچھ بسکٹ بھی تھے جنہیں چائے میں ڈبو ڈبو کر انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے ماں کے حلق میں اتارے وہی بسکٹ کھانے کے بعد ماں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کر دیا وہ کچن میں کھانا کھاتے ہوئے مسلسل دروازے سے باہر جھانک رہی تھی ماں کے کراہنے کی آواز کچھ ہی دیر میں قدرے کم ہو گئی شاید وہ سو گئی تھیں جب خالہ اندر سے باہر نکلیں۔

”میں گھر کا ایک چکر لگا آؤں ہو کو پکانے کے لیے کچھ لادوں ورنہ وہ سارا وقت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے گی۔ سوچ رہی ہوں آج رات یہاں ہی سو جاؤں تمہارے پاس بھلا تم آگئی ہو یا رہاں کو کیسے سنبھالو گی۔“

وہ بات جو وہ کہنا چاہتی تھی خالہ نے خود ہی کہہ دی۔

”ہاں خالہ آپ رات یہاں ہی آجائیں مجھے تو ویسے بھی اکیسے گھر میں بہت ڈر لگتا ہے۔“ وہ ایک بار پھر سے روپائی ہو گئی۔

”رو مت بیٹا میں آتی ہوں۔“ اسے تسلی دیتی وہ باہر نکل گئیں اور پھر اپنے وعدے کے مطابق عشاء پڑھ کر جب واپس آئیں تو ماں کے دل پہ بھی بھولا لائی تھیں۔ اس وقت تک ماں کا بخار بھی پہلے سے کم ہو گیا تھا انہوں نے تھوڑا تھوڑا کر کے اپنے ہاتھوں سے دلیہ بھی کھالیا۔

”سچ ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔“ قاطعہ خالہ کو دیکھ کر ساری رات یہی ایک خیال اس کے دل میں آتا رہا۔



اس کا انٹرویو بہت اچھا ہوا اور ملک صاحب کی منتخب کردہ ایک بہترین یونیورسٹی میں داخلہ بھی ہو گیا ویسے بھی اس کا کالج کو ایجوکیشن تھا دو سال وہاں لڑکوں کے ساتھ پڑھ کر اس میں خاصی خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی جسے وقت نے خاصا بڑھا دیا تھا اسے یاد تھا۔

شروع میں جب وہ اپنے محلے کا سرکاری اسکول چھوڑ کر شہر کے ایک بہترین اسکول گئی تھی تو خاصی ڈری سہمی رہا کرتی تھی مگر جب وہ اسکول کے دو سال مکمل کر کے باہر نکلی تو خاصی تبدیل ہو چکی تھی شاید اچھا لباس اچھی تعلیم اور بہترین گاڑی کی سہولت نے اس کے اندر موجود ڈر اور خوف نکال دیا تھا دو سال اسکول کی تعلیم کے دوران وہ اسکول ہی کے ہاسٹل میں رہی اور پھر ملک صاحب نے اسے شہر کے ایک پوش علاقے میں فلیٹ لے دیا جہاں فضل دین اور اس کی بیوی سیکنہ اس کے ساتھ تھے اب وہ محل پورہ کی پرانی گلیوں سے نکل کر سمن آباد کی باسی بن

چکی تھی ماں جیسا عظیم رشتہ کھونے کے بعد وہ ایک معزز شہری کا اعزاز حاصل کرنے کے قابل ہو گئی تھی اسے اچھی طرح یاد تھا کالج میں پڑھنے کے دوران کسی طرح کلاس کے لڑکے اس سے خائف رہا کرتے تھے کیونکہ وہ کبھی کسی سے زیادہ فری ہو کر بات ہی نہ کیا کرتی تھی۔

عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کسی وڈیرے یا جاگیردار کی بیٹی ہے جو تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر میں رہ رہی ہے اس نے کبھی بھی کسی کے اس خیال کی تردید یا تصدیق نہ کی یہاں تک کہ اس کی اکلوتی اور بہترین دوست حنفہ بھی اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہ جانتی تھی مگر اب یونیورسٹی آتے ہی اس نے اپنا رویہ تھوڑا سا تبدیل کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ لوگوں میں تھوڑا بہت محل مل جائے جس میں اسے خاصی کامیابی بھی حاصل ہوئی۔



اریشہ کا رشتہ آیا ہوا تھا شاہ زیب خان اس کے پاپا کے بزنس پارٹنر کا بیٹا تھا جو حال ہی میں لندن سے میٹنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وطن واپس لوٹا تھا اور یہ خبر اریشہ نے جب سے فون پر ایشال کو دی تھی وہ بے چین سا گھر میں پھر رہا تھا ماما بازار گئی ہوئی تھیں ورنہ وہ ابھی انہیں ساتھ لے کر ماموں کی طرف چلا جاتا اس ساری ٹینشن میں وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ خود کسی کی ذات سے منسوب ہے اور جب تک اس کا نام اس انجان لڑکی کے ساتھ رہے گا ماموں کبھی بھی اریشہ کا رشتہ نہ دیں گے۔

اریشہ خود بھی پاکستان آتے ہی فوراً ”سر رہنے والی اس شاہ زیب نامی افتادہ سے خاصی پریشان تھی جس کا اندازہ اس کی کچھ قبل آنے والی فون کال سے ایشال کو ہو چکا تھا اب یہ لازمی ہو گیا تھا کہ ایشال اپنی زندگی کے اس سب سے بڑے مسئلے کو فوری طور پر حل کرے اسے محسوس ہوا جسے وہ ایک دور ہے پر کھڑا ہے جہاں سے ایک راستہ اسے اریشہ کی طرف لے جاتا ہے جس کے ساتھ اس کی دنیا بھر کی خوشیاں جڑی تھیں اور وہ سارا راستہ پایا کے ساتھ چلتے ہوئے اس سبز روپے والی لڑکی تک جاتا تھا جہاں پہنچ کر شاید زندگی کی ہر خوشی اس پر ختم ہو جاتی اور یہ ”سرا راستہ اپنا اس کے نزدیک موت کو گلے لگانے کے مترادف تھا۔“

اب وہ وقت آچکا تھا کہ وہ اپنے لیے ان دونوں میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کرے اور وہ راستہ کون سا تھا اس کا فیصلہ تو وہ بہت پہلے ہی کر چکا تھا اور اب یہ فیصلہ صرف اپنے پایا تک پہنچانا تھا تاکہ وہ جلد از جلد اس قید سے رہائی پاسکے جس میں جانے کتنے سالوں سے اسے پایا کی محبت نے جکڑ رکھا تھا اور پھر بہت سوچنے کے بعد اس نے اریشہ کا نمبر ملایا دو سری ہی بل پر فون ریسو کر لیا گیا وہ شاید اسی کے فون کی منتظر تھی۔

”ہولو۔“ اریشہ کی ہنسی ہوئی آواز یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ رو رہی ہے۔

”پلیز اریشہ پریشان مت ہو میں آج ہی ماما کے ساتھ تمہارے گھر آکر ماموں سے بات کرتا ہوں۔“

یقیناً ”وہ جو فیصلہ کر چکا تھا اب اس پر عمل درآمد کا وقت آ گیا تھا۔“

”ٹھیک ہے میں انتظار کروں گی۔“ اور اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔

اب اسے صرف ماما کی واپسی کا انتظار تھا تاکہ انہیں ساری صورت حال سمجھا کر اپنے ساتھ ماموں کے گھر لے جانے پر آمادہ کر سکے اور اسے یقین تھا اس کی ماں کبھی بھی اسے انکار نہیں کرے گی۔

(یاتی اسٹندہ)



ام شمامہ



پیغام صبا لائی ہے گلزارِ مئی سے  
آیا ہے بلاوا مجھے دربارِ مئی سے  
پورے ہال کمرے میں نعت خواں کی آواز گونج رہی  
تھی جو حرفِ با حرفِ قدسیہ اور قدوس صاحب کے  
جذبات کا باخوبی اظہار کر رہی تھی۔ جو حج پر جا رہے تھے  
اور جانے سے پہلے انہوں نے تمام ملنے جلنے والوں کو  
اکٹھا کر کے میلاد کروایا تھا۔ بہت سارے لوگوں میں  
پیچھے ایک کونے میں خالہ آمنہ بھی بیٹھی تھیں جو  
پورے ذوق و شوق سے میلاد سن رہی تھیں۔ ان کی  
آنکھوں میں آنسو تھے اور دل میں خانہ خدا اور دربار  
رسول صلی اللہ علیہ وسلم دیکھنے کی لگن۔

میلاد پڑھنے والی نے دوسری نعت شروع کر دی  
تھی۔ خالہ کے آنسو ہچکیوں میں بدل گئے تھے اور بدن  
کا ہر روم روم دعا کی صورت اختیار کر گیا تھا۔  
سوئے طیب جانے والو مجھے چھوڑ کر نہ جانا  
میری آنکھوں کو دکھا دو شاہِ دین کا آستانہ  
جانے کب میلاد ختم ہوا، کب کھانا لگا وہ مجھے دل  
سے انھیں اور چپ چاپ گھر کی جانب چل دیں۔

یہ نہیں تھا کہ انہیں پڑوسیوں کے جانے کی خوشی  
نہیں تھی۔ ان کے لیے تو وہ بہت خوش تھیں بلکہ  
انہیں تو کہیں سے بھی پتا چل جاتا کہ کوئی حج یا عمرے پر  
جا رہا ہے تو وہ دس دس بار اس کے گھر کے پھیرے  
لگاتیں، ان آنکھوں کو عقیدت سے دیکھتی رہتیں جن  
آنکھوں نے وہاں کی زیارتیں کئی تھیں، ان ہاتھوں کو  
چومتیں جنہوں نے حجرِ اسود اور سنہری جالیوں کو چھونا  
تھا۔

ماہنامہ کرن 58



سارے سال وہ ایک نین کے ڈبے میں تھوڑے  
تھوڑے پیسے ڈالتی رہتیں اور جیسے ہی پتا چلتا کہ کسی کا  
بلاوا آیا ہے وہ اس کے پاس ہار پھول لے کر جاتیں اور  
لبو تروں کے باجرے کے لیے پیسے دیتی اور دعا کے  
لے کہتیں۔

”ہاں میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ مت جاؤ۔  
آپ گھر آ کر یوں ہی اداس اور بے حال ہو جاتی ہیں۔“  
زینب نے دکھ سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
جب سے ذیقعد کا مہینہ شروع ہوا تھا کسی نا کسی  
کے یہاں سے دعوت آ جاتی اور ماں پہنچ جاتیں اور یہ تو  
پڑوس کا معاملہ تھا۔ میاں بیوی دونوں حج پر جا رہے  
تھے وہ تھے تو ان کی طرح ہی غریب ہی مگر قدوسی  
صاحب کا ایک ہی بیٹا تھا جو اچھی ملازمت پر تھا، شادی  
شدہ تھا اور گھر بھی اپنا تھا، اس لیے اب سرکاری  
ملازمت سے جو ریٹائرمنٹ کا پیسہ ملا تھا، دونوں میاں  
بیوی حج پر جا رہے تھے۔

”ارے بیٹی ایسے مت بول، یہ تو میری تربیت ہے جو  
مجھے اداس کرتی ہے کہ جانے میرا بلاوا کب آئے گا۔  
بیٹی وہاں جا کر کوئی دعا رو نہیں ہوتی اس لیے سب سے  
جا کر دعا کا کہتی ہوں کہ وہ رحمان کب سن لے اور میری  
بھی قسمت کھل جائے۔“ آمنہ خالہ آنسو پونچھتے  
ہوئے بولیں۔

”چھاپاری اماں چلو، اب کھانا کھاتے ہیں، میں  
بھی آپ کا انتظار کر رہی تھی، مجھے پتا تھا آپ وہاں سے  
کھانا کھا کر نہیں آؤ گی۔ آپ فکر مت کریں، میں نے  
ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ اگر لگن اچھی ہو اور نیت

صاف ہو تو منزل خود بخود آسان ہو جاتی ہے۔“  
زینب باورچی خانے میں کھانا گرم کرنے چل دی  
اور آمنہ خالہ صحن میں لگے نلکے سے ہاتھ دھونے کے  
لیے تخت سے اٹھ کر چل پڑیں۔

چار مرلے کے کچے مکان کی بے رنگ دیواریں  
اس کی کسمپرسی کی کہانی بیان کر رہی تھیں۔ لکڑی کے  
ٹوٹے دروازے پر جھومٹا بوسیدہ پردہ گھر کے مکینوں کی  
حالت زار فاش کر رہا تھا۔ لال اینٹوں کا صحن جو کافی حد  
تک اکھڑا ہوا تھا۔

یہ خالہ آمنہ کا گھر تھا جہاں ان کی بیٹی زینب اور اس  
کا شوہر عامر ننھا احمد اور خالہ آمنہ یہ چاروں افراد رہتے  
تھے خالہ ابھی جوان اور زینب ابھی کم سن ہی تھی کہ  
خالہ ریاض کا انتقال ہو گیا۔ خالہ شماری عمر سلائی کڑھائی

کر کے اپنا اور اپنی اکلوتی بیٹی کا پیٹ بالا، کیا رکھا جیسا  
چھت اپنی تھی مشین کے پیسے کو گھماتے گھماتے  
جہاں آمنہ خالہ کے ہاتھوں میں بھریاں پڑنے لگیں  
وہاں زینب جوان ہو گئی۔

گزر بسر میں مشکل ہونے لگی تو زینب نے پاس ہی  
بنی فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ وہیں اس کی ملاقات عامر  
سے ہوئی جو نیاری کے کسی گاؤں سے نوکری کی تلاش  
میں کراچی آیا تھا اور اب فیکٹری میں کام کر رہا تھا۔  
دونوں کے والدین کی مرضی سے ان کی شادی ہو گئی اور  
خالہ کے بے حد اصرار پر وہ ان کے ساتھ ہی رہنے لگا۔  
اجناس عادت مند اور نیک بچہ تھا ہر ایک سال بعد گھر  
میں ننھے احمد کا اضافہ ہو گیا تو خالہ کا دل بہل گیا۔ دونوں  
میاں بیوی فیکٹری چلے جاتے اور خالہ کچھ نا کچھ کام

ماہنامہ کرن 59



کرتی اور ننھے احمد کو سنبھالتیں۔

گھر کا ماحول شروع سے ہی دینی تھا۔ زینب اور خالہ پانچ وقت کی نماز ادا کرتی روزے رکھتی اور شام کو خالہ آمنہ محلے کے غریب بچوں کو ناظرہ قرآن پاک بھی پڑھایا کرتی تھیں۔

خالہ آمنہ کو شروع سے ہی اللہ کا گھر دیکھنے کی بڑی لگن تھی۔ وہ بڑی مشکلوں سے پیٹ کاٹ کاٹ کر کچھ ٹاپکچھ جمع کرتیں، مگر کبھی بیماری، کبھی منگائی اور کبھی کسی ناکسی ضرورت کے لیے وہ پیسے نکل جاتے۔ اب تو ان کے اختیار میں ایک دعا بھی جو وہ خود بھی کرتیں اور جب پتا چلتا کہ کوئی عازم سفر ہے تو اس سے بھی کہنے کو کہتیں۔

رحب کی آخری تاریخیں تھیں اور خالہ آمنہ کے دل کو بے قراری سی لگی تھی کہ جانے کتنے خوش نصیبوں نے درخواستیں جمع کروائی ہوں گی اور کتنوں کا نام نکلے گا۔ شام کے سائے صحن میں لگے چنبیلی کے بوٹے سے پڑے کے آس پاس آسن مائے بیٹھے تھے۔ چڑیاں بھیگی شاخوں پر ادھر ادھر پھدک رہی تھیں۔ آمنہ خالہ صحن میں چھٹی چارپائی پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ زینب باورچی خانے میں سالن پکا رہی تھی کہ رات کا کھانا وہ عشاء کے فوراً بعد کھا کر سو جاتے تھے۔ دروازے پر ہونے والی دستک پر آمنہ خالہ نے تسبیح تخت پر رکھی اور دروازے کی جانب چل دیں۔

”آمنہ خالہ ہیں۔“ باہر سے ایک مردانہ آواز آئی۔ ”جی میں آمنہ ہی ہوں۔“ آمنہ خالہ نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔ باہران کی ماموں زاو بہن ساجدہ کا باورچی ڈرا پور کھڑا تھا۔

”جی وہ بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ ان کا حج اسکیم میں نام نکل آیا ہے۔ کل اسی سلسلے میں ایک تقریب ہے۔ آپ بارہ بجے تک آجائیے گا۔“

”ارے زینب ادھر آ۔“ وہ دروازے کے پاس ہی سے اسے آواز دینے لگیں۔

”ہاں اماں ایسا کیا ہو گیا میں نے سن لیا ہے۔“

”ارے لگی مبارک ہو، تیری ساجدہ خالہ حج پر جا رہی ہیں۔ مالک خیرا شکر ہے، اب تو میں اپنی بہن سے جا کر دعا کراؤں گی، وہ تو ضرور وہاں میرے لیے دعا کرے گی۔ آخر کو میری ماموں زاو بہن ہے۔“ وہ ایسے خوش ہو رہی تھیں، جیسے حج درخواستوں میں ان کا نام نکل آیا ہو۔

”اماں بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ پچھلے سال ان کا بیٹا اور سوچ پر گئے تھے۔ اب کے باران کا نام آگیا۔ ساری نوٹوں کی کمائی ہے۔“

اماں یاد ہے ان کے گھر سے کیسے سنہرے کین میں آب زم زم آیا تھا۔ جس پر اس قدر خوب صورت مکہ مدینہ بنا ہوا تھا اور نکلوں کی بنی رنگ برنگی ٹوکری جس میں عجوبہ کھجوریں تھیں۔ حج میں نے تو وہ دونوں چیزیں اب تک سنبھال کر رکھی ہیں۔ ”غروت کی حسرتیں اور خوشیاں دونوں زینب کے کعبے میں بول رہی تھیں۔“

”ناپایا نام میں تو نہ جاؤں، ایک تو اتنی بڑی دعوت دو سرا میرے پاس کوئی ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں تیسرا تین بیٹیں بدل کر اتنی دور جاؤ اور سب سے بڑی وجہ ساجدہ خالہ کی باتیں۔ آپ ہی ہو آنا۔“ یہ کہہ کر زینب واپس باورچی خانے کی طرف چل دی اور آمنہ خالہ کمرے میں بنی الماری میں رکھے تین کے ڈبے کی طرف تاکہ دیکھ سکیں کہ کتنے پیسے اس میں جمع ہیں۔ کچھ ہار پھول اور مٹھائی بھی منگوائی تھی۔ کراہی بھی چاہیے تھا۔ ساجدہ کی کوٹھی اتنی دور تھی اور کچھ پیسے اور بھی چاہیے تھے۔

ساجدہ آمنہ خالہ کی ماموں زاو بہن تھیں۔ قسمتوں کا پھیر تھا۔ وہ نہایت امیر کبیر گھرانے میں بیاہی گئی تھیں۔ بچپن سے جوانی تک ساجدہ کی آمنہ آیا سے بڑی دوستی تھی۔ مگر پھر پیسے نے ساجدہ کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ ان کے شوہر کا بڑا کاروبار تھا۔ وہ ماموں کی اہل کوئی اولاد تھیں ماموں، مملانی تو عرصہ ہوئے فوت ہو گئے تھے مگر غریب رشتہ داروں میں اپنی امارت کی دھاک بٹھانے کے لیے وہ انہیں ایسے موقعوں پر

ضرور بلاتی تھیں اور سدا کی بھولی آمنہ خالہ خوش خوش دعائیں دیتیں، ہر بار ضرور جاتی تھیں کہ بہن نے یاد کیا ہے۔

پجاری بہنو! حج ایک فرض عبادت ہے۔ یہ ان لوگوں پر فرض ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس کی استطاعت دی ہے۔ حج فرض لے کر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے کچھ قواعد و ضوابط ہیں جنہیں پورا کرنا بے حد ضروری ہے۔ بوڑھا ہو یا جوان جس پر جب حج فرض ہو جائے تو اسے چاہیے کہ یہ اس میں تاخیر نہ کرے۔ حج نام ہے صبر کا برداشت کا تمام ارکان کو باخوبی سمجھ بوجھ کے ساتھ پورا کرنے کا۔

یہ ایک بلاوا ہے۔ اس ذات کی طرف سے جو کل کائنات کا مالک ہے۔ وہ اپنے خاص بندوں کو میزبانی کا شرف بخشا ہے۔ وہ دلوں کے حال سے باخوبی واقف ہے۔ آئیے ہم سب دعا کریں کہ اللہ پاک ہمیں بھی حاضری کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

سامعین میں بیٹھی خالہ آمنہ نے بہت دل سے آمین کہا۔ ساجدہ نے بہت بڑی دعوت کی تھی لوگ بڑے بڑے تحفے اور پھولوں کے جھنگے منگے گلدستے لائے تھے۔ خالہ آمنہ نے چھوٹی سی تھیلی میں ڈالے اپنے دو ہاروں پر نظر ڈالی، جن پر پھول بھی کافی دور پر پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہ تھیلی خاموشی سے قالین کے کونے پر رکھ دی۔

”ارے ساجدہ بیگم، ابھی تو درخواستیں جمع کروانے کا عمل شروع ہوا ہے، آپ کو ابھی سے کیسے پتا چل گیا کہ قرعہ اندازی میں آپ کا نام آگیا ہے۔“ ساجدہ جیسی ایک اور بیگم ہنس کر ان سے بوجھ رہی تھیں۔ ”اب کیا بتاؤں فاصل کے محکمہ حج کے سیکرٹری سے دیرینہ تعلقات ہیں اور پھر ہم درخواست دیتے اور وہ منظور نہ ہو ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ آپ کو پتا ہے۔“

”آپ بھی ساجدہ بیگم حج دعوت کرنے میں بھی غبر لے گئیں، پہلی دعوت آپ کے یہاں ہی ہونی ہے۔“ کوئی دو سری بیگم بولیں تو ساجدہ غر سے مسکراتے

لگیں۔

جلد ہی سب لوگ کھانا کھا کر واپس چلے گئے۔ ان کے لیے تو یہ تقریب بسانہ تھی مل بیٹھنے کا، باتیں کرنے کا اور اپنے کپڑوں اور دولت کی نمائش کرنے کا، مگر آمنہ خالہ کے دل میں تو عقیدت تھی، محبت تھی اور تربت تھی۔

”ساجدہ بہت بہت مبارک ہو، تم اللہ کا گھر دیکھنے جا رہی ہو، مجھے تو کل سے پتا چلا تو بے حد خوش ہوئی۔“ جب سب لوگ چلے گئے تو ساجدہ آمنہ خالہ کو اپنے بیڈ روم میں لے آئیں، نیا فرنیچر بھی تو دکھانا تھا۔ انہوں نے حج دعوت سے پہلے سارے گھر کی نئی سیٹنگ کی تھی۔

”ہاں آمنہ آپا درخواست دی تھی، نام تو آتا ہی ہے۔“ انہوں نے رعوت سے کہا۔

”ہاں ساجدہ تو تو میری بہن ہے، میرے لیے وہاں یاد سے دعا کرنا کہ میرا بھی بلاوا آجائے۔“

”ارے بھولی آپا نوٹوں کے بغیر کیسے بلاوا آسکتا ہے۔ پاسپورٹ، ٹکٹ، ویزا کئی چیزیں ہوتی ہیں، کیا اب جہاز کی دم چھڑی پکڑ کر حج کرنے جاؤ گی۔“ لہجے میں تسخر نمایاں تھا۔

”مگر وہ جوا بھی مولائی جی بیان کر رہی تھیں۔ وہ بھی یہی کہہ رہی تھیں۔ جس کا بلاوا آجائے۔“ خالہ آمنہ نے دکھی دل سے کہا۔

”آمنہ آپا دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی، مگر آپ نہیں بدلیں۔ اب انہوں نے بیان میں بات ہی کرتی ہے۔ اب انسان کو خود عقل ہونی چاہیے۔ نوٹوں کے بغیر تو آپ میرے گھر تک نہیں پہنچ پاتیں، اللہ کے گھر کیا پہنچیں گی۔“

”چھا آمنہ آپا! اب مجھے اجازت دیں، چند مہینے رہ گئے ہیں اور ڈیموں شاپنگ کرنی ہے مجھے تو سمجھ نہیں آتا سب کیسے ہو گا۔“

”ہاں میں بھی چلتی ہوں، زینب انتظار کرتی ہوگی اور شام بھی ڈھنسنے والی ہے۔ اوہاں ساجدہ یاد آیا۔“ یہ میری طرف سے آقا دو جہاں صلی اللہ علیہ



و سلم کو سلام دینا اور وہاں کیورتوں کو دانا ڈال دینا۔  
خالہ آمنہ نے دوپٹے کے پلو سے ہچکچاتے ہوئے ایک  
تزامزا سا پانچ سو کا نوٹ نکالتے ہوئے ساجدہ کی طرف  
بڑھایا۔

”ارے آمنہ آیا یہ اتنے سے پیسے میں کہاں  
سنبھالتی پھوٹ گی؟ آگے ہی رشتہ داروں اور دوستوں  
نے لاکھوں روپیہ اور شاپنگ لٹیں تھما دی ہیں اور میرا  
خود کا ارادہ بھی عائشہ کے جینز کی شاپنگ وہاں سے  
کر کے لانے کا ہے۔ سنا ہے وہاں سونا بہت سستا  
ملتا ہے اور جب اللہ نے پیسہ دیا ہے تو یہ بمانہ ہی سہی۔  
تیار راہیور سے کہنا وہ تمہیں نی گڈی میں چھوڑ  
آئے گا۔ کہاں بسوں میں دھکے کھائی پھر س گی۔ اللہ  
جانتے کیسے آپ لوگ ان بسوں میں سفر کر لیتے ہو۔“  
”چھا ساجدہ اللہ تمہارا حج قبول کرے۔“

وہ دعا دیتی کمرے سے باہر نکل آئیں۔ لان میں  
اگر انہوں نے عینک ہٹا کر آنکھوں میں آئے آنسو  
صاف کیسے نوٹ کو واپس پلو میں باندھا اور دھیمے  
قدموں سے بس اسٹاپ کی طرف چل دیں کہ دھکے  
کھا کر ہی سہی گھر تو واپس جانا ہی تھا۔

\*\*\*

سوچ کی سنہری کرنیں چنبیلی کے بوٹے پیڑ پر اتنی  
روشنی بکھیر رہی تھیں۔ پتوں پر اوس کے قطرے اپنی  
چھب دکھا رہے تھے۔ چڑیاں رب رحیم کے ذکر کے  
بعد اب رزق کی تلاش میں اڑان بھر رہی تھیں۔ خالہ  
فجر کی نماز کے بعد صحن میں سخت پریش کر  
ملاوت کرتیں اور پھر کوئی نا کوئی کام کرنے لگتیں۔ آج  
کل انہوں نے ایک دوپٹا کروشا کرنے کے لیے لیا ہوا  
تھا۔ اب سلائی تو نہیں ہوتی تھی۔ مگر قریب کی نظر کا  
چشمہ لگا کر وہ کچھ نا کچھ کرتی رہتی تھیں۔ جس سے چار  
پیسے مل جاتے تھے۔

پاس ہی تھا احمد خالی ریلوں سے کھیل رہا تھا۔ فجر  
کے وقت جب وہ اٹھ جاتا تھا تو وہ اسے اپنے پاس لے  
آتی تھیں، تاکہ زینب غینہ پوری کر لے۔ سارا دن

بچی فیکٹری میں محنت کرتی تھی۔

صاف ستھرے صحن پر آمد کے ستونوں کے گرد  
آمنہ خالہ کی آواز اک سماں باندھ رہی تھی۔

سوئے طیبہ جانے والو مجھے چھوڑ کر نہ جانا  
میری آنکھوں کو دکھا دو شاہ دین کا آستانہ  
دروازہ کب سے بند رہا تھا۔ خالہ اپنے خیالوں میں  
مگن نعت پڑھتے جارہی تھیں۔ دروازہ ایک دم زور  
سے بجلا۔ آمنہ خالہ نے کروشیا کی سلائی رکھتے ہوئے  
گھڑی کی طرف دیکھا۔ اتنے سویرے کون آگیا۔ خدا  
خیر کرے۔ وہ دل میں دعا کرتی، دروازے کی طرف  
نکلیں۔

”السلام علیکم خالہ!“ کندی کھلتے ہی قدسیہ کے بیٹے  
نے سلام کیا۔

”و علیکم السلام۔ جیتے رہو بیٹا۔ خیر تو ہے“ اماں  
ٹھیک ہیں تمہاری۔“

”جی خالہ اماں نے یہ ایک فارم بھیجا ہے ابا کی دکان  
کے ساتھ کمپیوٹر والے کی دکان ہے اس نے بتایا تھا تو  
ابا آپ کے لیے آئے رات دیر ہو گئی تھی تو اماں  
نے سویرے ہی بھیج دیا کہ ابھی عامر بھائی گھر پر ہوں  
مگے معلومات لے لیں۔ خالہ اماں نے کہا ہے ضرور  
بھرا کر بھیجے گا۔ کیا پتا آپ کا بلاوا آجائے۔“

لڑکا کاغذ آمنہ خالہ کے ہاتھ میں تھا کرک کا واپس  
جا چکا تھا اور وہ امت بنی کھڑی تھیں۔ احمد کے رونے  
کی آواز نے ان کی سوچ اور قدموں کو جنبش دی۔ احمد  
کو فیڈر بنا کر دے کر خالہ نے فارم پر ہٹنا شروع کیا۔

وہ فارم کسی فاؤنڈیشن کی طرف سے تھا جو ایسے  
لوگوں کو کچ کر دیتی تھی جن کی عمر 60 سال سے  
زیادہ ہو۔ آمدنی کم ہو، جو تندرست ہو اور پہلے حج پر نہ  
گئے ہو یا فارم کے ایک طرف جلی حروف میں لکھا تھا  
کہ پواؤں اور مزدوروں کو ترجیح دی جائے گی۔

آمنہ خالہ کبھی فارم کو الٹ بلٹ کر کے دیکھتیں  
بھی آسمان کی طرف نظریں اٹھا لیتیں، کیا ان کا بلاوا  
آگیا ہے؟ اب کروشیا کسے یاد تھا۔ انہوں نے دھاگا  
سلائی اٹھا کر سائڈ میں رکھی احمد سوچا تھا۔ جیسے ہی عامر

اور زینب آئے جھٹ سے آمنہ خالہ نے فارم دکھایا  
اور قدسیہ کے بیٹے کی ساری بات بتادی۔

”عامر تم ابھی اس کمپیوٹر والے کے پاس جاؤ اور یہ  
فارم بھرا کر جمع کروادو۔“ خالہ آمنہ کی بے تابی عروج  
پر تھی۔

”مارے پیاری اماں ابھی تو ڈیوٹی کا ٹائم ہو رہا ہے۔  
گھر واپس آکر سب سے پہلے وہاں جاؤں گا اور ساری  
معلومات لے کر آپ کو بتا دوں گا۔“ عامر مسکراتے  
ہوئے منہ ہاتھ دھوئے چل دیا۔ وہ اماں کی کیفیت سے  
باخوبی واقف تھا۔

\*\*\*

شام دھیرے دھیرے رات میں ڈھل رہی تھی۔  
شام کی سلونی دس رات کا تاروں سے سجا آئین  
اور دھیمے بیٹھی تھی۔ چاند کی تیرہ تاریخ تھی۔ اجلی چاندنی  
ٹوٹے صحن میں جا بجا پھیلی ہوئی تھی۔ چنبیلی کے بوٹے  
سے بیڑ ڈھیلوں پھول مسکرا رہے تھے۔ ان کی بھینی  
بھینی خوشبو سے سارا گھر مہک رہا تھا۔

آمنہ خالہ تسبیح ہاتھ میں لیے مسلسل درو کر رہی  
تھیں۔ زینب، احمد کو سلا کر ان کے پاس آکر بیٹھ گئی  
تھی۔

”زینب کیا میرا بلاوا آگیا ہے؟“ خالہ کے آنکھوں  
اور جگرے کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔  
”ہاں اماں دعا کریں اب عامر آئے تو بتا چلے۔“

”السلام علیکم۔ اماں مبارک ہو، میں نے فارم بھر  
دیا ہے۔ بس صبح اپنے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی دینا وہ  
ساتھ لگا کر پوسٹ کروا دوں گا۔ پھر قریب اندازی میں  
جن جن لوگوں کے نام نکلیں گے انہیں وہ اپنے آفس  
انٹرویو کے لیے بلائیں گے اور وہاں طے ہو گا کہ کون  
کون جج پر جائے گا۔“

”مگر بیٹا حج تو محرم کے بغیر نہیں ہوتا اور تم تو صرف  
میرا فارم جمع کروا رہے ہو۔“ خالہ آمنہ دین کی بڑی  
سوچ بوجھ رکھتی تھیں۔

”ہاں اماں میں نے یو چھا تھا انہوں نے کہا کہ جس

عورت کا نام نکلے گا اس کا محرم بھی اس فاؤنڈیشن کی  
طرف سے ساتھ جائے گا۔“

”مگر اماں آپ کا محرم۔“ زینب نے پریشان ہو کر  
پوچھا۔

”بیٹی اللہ زندگی دے، عامر میاں ہے نا جب تک  
بیٹی نکل جس سے داماد محرم ہوتا ہے۔“

آج چھٹی کا دن تھا۔ فارم کو گئے سات، آٹھ دن  
ہو گئے تھے۔ وہ سب بیٹھے اسی پر بات کر رہے تھے۔  
وقت جیسے تھم سا گیا تھا۔ آمنہ خالہ صبح شام عامر سے  
پوچھتیں، کیونکہ انہوں نے فارم پر عامر کا فون نمبر ہی  
لکھا تھا۔

آمنہ خالہ ادھورا چھوڑا دوپٹا پورا کر رہی تھیں۔  
زینب چنبیلی کے بیڑ کی گڈی کر رہی تھی۔ عامر احمد  
سے کھیل رہا تھا کہ موبائل کی کھٹی بجنا شروع ہو گئی۔  
”جی میں عامر بول رہا ہوں۔“

”جی سہجی میں سمجھ گیا۔“

”ہم کل وقت پر پہنچ جائیں گے۔“ سلائی پر چلتے  
ہاتھ یک دم رکے اور ہر عضو کان بن گیا۔

”مارے اماں مبارک ہو۔ آپ کا قریب اندازی میں  
نام نکل آیا ہے اور اب کل انٹرویو دینے جانا ہے۔“

عامر نے خوشی سے اماں کے گرد بائیں ڈالتے ہوئے  
انہیں خوش خبری سنائی۔ زینب بھی مٹی سے سنے  
ہاتھوں سمیت دوڑی آئی اور اگر خالہ آمنہ سے جھٹ  
لگئی اور خالہ آمنہ تو بس روئے جارہی تھیں۔ انہیں  
یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان پر کرم ہو گیا ہے۔ وہ ان  
خوش نصیب لوگوں میں شمار ہونے جارہی ہیں جنہیں  
خدا اپنی میزبانی کا شرف بخشا ہے۔

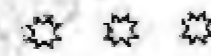
خالہ آمنہ جلدی سے انہیں اور شکرانے کے نفل  
بڑھنے چل دیں، ابھی تو کل کے انٹرویو کے لیے دعا بھی  
کرتی تھی اور پھر قدسیہ کے گھر جا کر اس کا شکریہ بھی ادا  
کرنا تھا۔ جس نے انہیں یہ راہ دکھائی تھی۔

آمنہ خالہ کا فائل سیکشن ہو گیا تھا۔ عامر اور ان  
کے پاسپورٹ بھی بن گئے تھے۔ انہوں نے اپنی سونے  
کی بالیاں بیچ دی تھیں۔ پاسپورٹ صرف خود بنوائے



تھے۔ باقی سب خرچہ فائونڈیشن والوں کا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے گزرنا لگا۔ خالہ اور عامر آخری دنوں میں ہونے والے حج تریقی کیسپ سے بھی ہو آئے تھے۔

انہوں نے بہت پیار اور طریقے سے ایک ایک بات سمجھائی تھی اور تحفہ "ایک احرام ایک سفری بیگ ایک پانی کی بوتل" ایک چھوٹا پرس اور فون کرنے والی سم بھی دی تھی اور بڑی شاندار دعوت بھی۔ خالہ جھولیاں بھر بھر کر انہیں دعائیں دیتی تھیں۔ بس اب انتظار تھا تو ٹکٹ اور ویزے کا جس کے بعد یہ طے ہو جاتا تھا کہ فلائٹ کب کی ہے۔



تقریباً "ایک مہینے ہونے والا تھا آفس والوں کی طرف سے کوئی فون نہیں آیا تھا۔ اب تو حج پروازیں جانے میں گنتی کے دن رہ گئے تھے۔ بیچ میں عامر نے یہ بھی بتایا تھا کہ پرائیویٹ کمپنیوں پر کسی نے کیس کر دیا ہے۔ اس لیے ویزوں کا کام رک گیا ہے۔

خالہ آمنہ کو ہول اٹھنے لگے عبادت اور تسمیعات میں اضافہ ہو گیا۔ اب تو منزل قریب آگئی تھی۔ خالہ نے حج کے متعلق بہت ساری کتابیں پڑھیں۔ ان لوگوں سے معلومات لی جو حج کر کے آئے تھے۔ اب وہ چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کر رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ خانہ خدا میں بھرپور تیاری کے ساتھ حاضری دیں۔

ساجدہ کو بھی انہوں نے فون پر بتایا تھا وہ خود مصروف تھیں۔ اس لیے مبارک باد دینے تک نہیں آئیں۔ ہاں انہوں نے یہ ضرور کہا کہ یہ تنظیمیں ایسے ہی جھوٹی ہوتی ہیں۔ اپنے نام کے لیے یہ ایسے کام شروع تو کرتی ہیں لیکن اوروں سے چھوڑ دیتی ہیں۔ خالہ آمنہ مجسم انتظار بنی ہوئی تھیں۔ دوبار فون کر کے پوچھ چکی تھیں۔ وہاں سے یہی جواب ملتا تھا۔ جیسے ہی ویزہ آئے گا آپ کو اطلاع دے دی جائے گی۔

"ہاں آپ وہاں سے ہمارے لیے کیا لائیں گی؟" زینب نے استیثاق سے پوچھا۔ حالات نے جلدی بڑا کر دیا تھا۔ اس کے اندر کی بچی اب بھی اس میں کہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔

"بیٹی میں تو اب زم زم اور کھجوروں کے علاوہ کچھ نہیں لائوں گی نہ تو میری بساط ہے اور اگر ہوتی بھی لاتی بیٹی ہم وہاں چپرس لینے تھوڑا ہی جاتے ہیں۔ خالہ آمنہ نے اپنے لیے دو نئے جوڑے سلوائے تھے۔ ایک حید کے دن پنسنے کے لیے اور دوسرا جب رحمت الملائین کے روئے پر حاضری دینی تھی۔ آج کل ماں بیٹی اسی تیاری میں لگی تھیں۔

خالہ کے پاس مختصر سا سامان تھا۔ چار عدد جوڑے عبا، اسکارف، ایک چادر، ایک پلاسٹک کا ٹکے میں ہوا بھری جاتی ہے، ایک جائے نماز، ایک نظر کی عینک وغیرہ۔

"اماں پھر جب آپ واپس آئیں گی تو ہم بھی ملنے والوں کے آگے اب زم زم اور کھجور کا تحفہ رکھیں گے۔" زینب نے خوش ہو کر کہا۔

"مگر ہاں اماں ہم اب زم زم میں پانی ملا لیں گے پھر وہ زیادہ ہو جائے گا۔ میری دوست کے ابا جب گئے تھے تو انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔"

"نہ بیٹی چاہے تھوڑا دلوں میں تو خالص اب زم زم ہی سب کو منے کو دوں گی۔ اس میں ہر تیاری کے شفا ہے۔ پچھلے سال قدسیہ نے مجھے خالص اب زم زم دیا تھا۔ ماشاء اللہ جب سے میرے گھٹنوں کا درد کہاں گیا کچھ پتا نہیں۔"

"لوگ اپنے لیے تو خالص اب زم زم کی بوتلیں بھر کر رکھ لیتے ہیں اور لوگوں کو پانی ملا کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پانی کی تو تاثیر ہے، چاہے جس میں ملے ہو۔ اگر ایسی بات ہے تو اپنے لیے بھی پانی ملا اب زم زم کیوں نہیں رکھتے ان کے لیے تاثیر نہیں ہوتی کیا کھجوریں بھی کراچی سے لے کر بانٹ دی جاتی ہیں۔ حالانکہ وہاں کا تحفہ سمجھ کر ان چیزوں کو عقیدت اور عزت دیتے ہیں اور بعض لوگ تو کھجور کی

تک نہیں بچھتے کہ یہ وہاں سے آئی ہے۔ میری نظر میں یہ جھوٹ اور دھوکا ہے اللہ معاف کرے میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔"

زینب کو اپنی ماں پر ڈھیروں پیار آیا جو صوم صلوٰۃ کی پابند تھی اور ایمان دار عورت ہے۔ اس نے صدق دل سے اپنی ماں کے لیے دعا کی۔

دیر سے ہی سہی خالہ اور عامر کے ٹکٹ اور ویزے آگئے تھے۔ کل صبح کی ان کی فلائٹ تھی۔ صحن پر تخت اور چارپائی پر تینوں نفوس جاگ رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ نیند آج اس آنگن میں اترنے والی نہیں تھی، خالہ آمنہ کو پتا چلا تھا کہ ساجدہ کی بھی وہی فلائٹ تھی، جو ان کی تھی، انہیں خوشی تھی کہ بہن ساتھ ہی ہوگی۔ وہ ایسی ہی تھیں سب کا بھلا سوچنے والی۔

زینب نے اتنے دن اپنے سرال میں جا کر رہا تھا، فیکٹری سے اس نے چھٹی لے لی تھی۔ وہ اکثر وہاں جاتی تھی، اس کے سرالی اچھے لوگ تھے۔ آدمی رات کے وقت زینب احمد کو ملاتے ملاتے خود سو گئی تھی۔ عامر بھی اندر کمرے میں کچھ دیر آرام کرنے چل دیا تھا۔ مگر آمنہ خالہ انہیں کہاں نیند آتی تھی۔ خوشی کے مارے ان کے قدم زمین سے نہیں لگ رہے تھے کہ اس ذات نے جو زمین آسمان کا مالک اور خالق ہے، ان کو اپنی میزبانی کا شرف بخش دیا تھا۔ بغیر پیسوں کے ان کا بلاوا آگیا تھا اور وہ صبح اس پاک سرزمین کی طرف پرواز کرنے والی تھیں۔

زینب اور عامر کو انہوں نے وصیت کر دی تھی کہ ان کی بڑی آرزو ہے کہ میں جاؤں تو وہیں رہ جاؤں اور اگر میری یہ خواہش پوری ہو جائے تو مجھے وہیں دفن کر دیا جائے۔

فجر کی اذان میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔ وہ تھوڑے اور شکرانے کے نفل ادا کرنے چل دیں کہ کتنا ہی شکر ادا کرتیں کم تھا۔

عامر، زینب، احمد اور خالہ آمنہ فجر کے بعد عیسیٰ میں ایریورٹ کی طرف روانہ ہو گئے وہاں ایک ہی فرد

کو اندر جانے کی اجازت تھی اور ان کے ساتھ تو زینب ہی تھی۔ وہ اندر داخل ہوئے تو زینب تو ایریورٹ کی وسیع عمارت اور اصلی جماد کچھ کمرچوں کی طرح مچنے لگی۔ ابھی گروپ بنے اور معلم کے آنے میں کچھ وقت تھا۔ آمنہ خالہ احمد سے کھیلنے لگیں۔

پارکنگ کے سامنے بنے چھوٹے سے دیشنگ روم میں وہ سب بیٹھے تھے کہ سامنے دو تین گاڑیاں آکر رکیں۔ ساجدہ بیگم بہت سارے لوگوں اور سازو سامان کے ساتھ منی دیشنگ روم میں داخل ہوئیں یہ پاکستان تھا۔ ایک فرد والی شرط شاید غریبوں پر ہی لاگو ہوتی تھی اور جو مسائل اور اثر و رسوخ رکھتے تھے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

خالہ آمنہ بے تاب ہو کر ماموں زاہد بن کی طرف بڑھنے لگیں تو زینب نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا کہ وہ اتنے لوگوں میں مصروف ہیں، ابھی ملنے کو رہے دیں۔ فلائٹ کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ساجدہ بیگم اپنے پوتے کے ساتھ اوپر اوپر گھوم رہی تھیں۔ کپڑے، بیگ، سامان ایک ایک چیز سے امارت جھلک رہی تھی کہ اچانک جانے کس چیز سے ان کا پاؤں الجھا اور وہ آنا "قانا" منہ کے بل زمین پر آ گئیں۔

چاروں طرف ایک شور مچ گیا۔ جلدی سے ایریورٹ پر موجود ڈاکٹر آیا۔ ساجدہ درد سے چلا رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے آکر بتایا کہ ان کے پاؤں کے ہڈی مکمل طور پر فریکچر ہو گئی ہے اور یہ اگلے چھ ماہ تک چل نہیں سکیں گی۔

ایسوی لینس منگوائی گئی اور اب وہ انہیں اسٹریچر پر ڈال کر ہسپتال لے جا رہے تھے۔

آمنہ خالہ کو اندر بلایا جا رہا تھا۔ ان کا دل ابھی بھی بہن کے لیے دکھی ہو رہا تھا، چونچ رہا جاسکی تھی۔ اندر قدم رکھتے اور زینب کو ہاتھ ہلاتے ان کے کانوں میں مولائی صاحبہ کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"یہ تو بلاوا ہے اس ذات کی طرف سے جو دلوں کے حال باختہی جانتا ہے۔"





عائشہ ناز علی



مکمل ڈیل

”اچھا۔ تو جناب نے بلا آخر قربانی کا بکرا بننے کا پکا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔“ اسد کے شانے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارتے ہوئے وہ مسکرایا۔

”جب گردن کٹنی ہی ہے تو مزید دیر کیوں یار؟ سوچا موسم بہار میں ہی اہتمام کیے دیتے ہیں۔“ وہ بھلا کب چوکنے والا تھا بڑبڑاتا ہوا۔

”چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات۔ آئے گا تو پھر اسی ناچیز کے پاس۔ ٹیوب لائٹ مانگنے۔“ اس نے چھیڑا۔

”تو دوست ہوتے کس لیے ہیں۔“ اسد ڈھٹائی سے بولا۔

”میری جان! تو بھی چھری تلے آجا۔ قسم سے یار! یہ اکیلا پن، بوریٹ سب عائب ہو جائے گی۔“ اسد نے اسے ترغیب دی۔

”مجھے اپنی آزادی بہت پیاری ہے۔ براہ مہربانی اسے ٹوک لگانے کی کوشش نہ کی جائے۔“ شیردل نے اعلانیہ انداز میں کہا۔

”ارے یار! بہت گزاری آزادی اب سنجیدہ ہو جا۔“ اسد کے انداز سے لگتا تھا کہ اس کی شادی کرا کے ہی دم لے لگے۔

”بدکوتا ہے تو شادی کے نام پر؟ کرنی تو ہے نا تو نے شادی۔“

”تو میرے پیچھے مت بڑ۔ اپنی خیر مناسی الوقت تو یہ سی ڈی لگا جو گھنٹہ بھر سے گود میں رکھے بیٹھا ہے۔“ اس نے بات اڑائی۔

”تعریف بہت سنی ہے میں نے اس موصوف کی اسد نے گوروں کیٹے ہوئے کہا۔

”سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتے ہیں ہم، جب تک آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔“ شیردل نے مسکراتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”کینے! تو نے کبھی نہیں سدھرنا۔“ اسد نے کش کھینچ کر اسے مارا۔ جسے شیردل نے نہایت مہارت سے سے بچ کر لیا تھا۔

”پرسوں میچ ہے۔ تیاری کیسی ہے؟“ اسد نے پوچھا اور ساتھ ہی سی ڈی بھی ملے کر دی۔

”دیکھ لینا آکر۔“ شیردل نے کشن سر کے نیچے رکھا اور راز ہو گیا۔



شیردل کا میچ تھا۔ گالف کلب میں میچ دیکھنے والوں کی تعداد اچھی خاصی تھی، تقریباً ساری ہی سیٹیں فل تھیں۔

”تم نے دیر کروادی۔ میچ شروع ہو چکا ہے۔“ فیصل نے ایک خالی کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا مگر نگاہیں بدستور گالف کورس کے کھلاڑیوں پر جمی تھیں۔

”مس تو نہیں ہوا ہے نا۔ ابھی تو خاصا کھیل رہتا ہے۔“ فیصل کی ناراضی اور ایکسٹنشنٹ کی پروانہ کرتے ہوئے وہ لا پرواہی سے بولی فیصل نے اسے گھورا۔ جواب میں اس نے فیصل کو نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ماہنامہ کرن 66



”وہ دیکھو۔۔۔ وہ نمبر گیارہ“ کھیلنے والا لڑکا شیردل سے اسے پچھلے دو سالوں سے کال ف کھیلے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ اس سے زیادہ اچھا کھلاڑی میری نظروں سے آج تک نہیں گزرا۔“ نینال نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔

”تمہیں تو جگہ ڈنڈا کھیلنے والا بھی بیسٹ پلیئر لگتا ہے۔“ اس نے نینال کی بات کو مذاق میں اڑا دیا۔

”وہ ہر شیج جیتتا ہے اور آئی ایم شور۔ اس کی کینٹ ٹرائفز سے بھری ہوئی ہوگی۔“ نینال نے وثوق سے کہا۔ جواب میں اس نے صرف یہ کیا کہ اپنے سر پر رکھے سیاہ گالز اپنی آنکھوں پر چڑھا کر رشت سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گئی گویا وہ یہاں بیٹھ دیکھنے کے لیے نہیں صرف نشست پر آرام کرنے کے لیے آئی ہو۔

ہر اچھے شاٹ پر نینال بھی دوسرے تماش بینوں کی طرح تالیاں بجا بجا کر کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کرتی رہی مگر وہ اسی طرح غصے بیٹھی رہی۔ کھیل ختم ہونے کے بعد پہلی پوزیشن پر شیردل کا نام پکارا گیا۔

”بس۔“ نینال نے خوشی کا اظہار کیا۔  
”آئی ٹولڈ یو۔ دیکھا۔“ نینال نے غریب انداز سے اسے دیکھا۔

”ٹرائی وہ جیتا ہے اور خوش تم ہو رہی ہو۔ سب ٹھیک تو ہے نا؟ ابھی اسد بھائی سے صرف مٹکتی ہوئی ہے۔“ اس نے ذرا سا گلا کھنکارتے ہوئے بظاہر سنجیدگی سے معنی خیز انداز میں کہا، مگر اس کی سنجیدگی کے پیچھے چھپی شونی کو نینال جانتی تھی۔

”اگر اسد کے نام پر دل گھینٹاں نہ بجاتا تو شیردل بھی برا نہیں تھا۔“ وہ بھلا کہاں باز آنے والی تھی۔  
”ہوں اسد سے کہنا بڑے گا کہ خالی خولی مٹکتی نہیں محترمہ کی ”رخصتی“ کا انتظام کر کے آئے۔“ اس نے بہن کو گھور آنکھوں سے دیکھا۔

”تین جانوں تمہاری احسان مند رہوں گی۔ اس ”میدیل“ سے تو جان چھوٹے گی میری سچی۔ دواؤں، امراض اور مریضوں کے بارے میں پڑھ پڑھ کر میں خود

کو ایک میڈل سمجھنے لگی ہوں۔“ وہ فوراً ”جیل“ کے پچھوٹے پھوٹنے بیٹھ گئی۔ روشا نے ہنس پڑی۔  
”تو مت لیتی نا کچھ اور لائن چوز کر لیتیں۔“

”تمہارے تایا جی کی وجہ سے لینا پڑا اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ تمہاری دیکھا دیکھی انہیں شوق چرایا تھا۔“ وہ اس پر چڑھ دوڑی۔

”چلو اچھا ہے تاپے چارے اسد کی مرہم پی کرے گی ہی ہو جایا کرے گی۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

”کیا مطلب؟“ نینال اس کی بات نہیں سمجھی اور حیرت سے پوچھنے لگی۔

”ظاہر ہے تم سے شادی کرنے والا غریب صحیح مسلم کیسے رہ سکتا ہے۔ تایا جان نے دور کی سوچی ہے۔ روشا نے اسے چھیڑا۔

”دیکھ لوں گی تمہیں بھی چھٹنے دو کوئی مرغا۔“ وائٹ کچکا کر بولی روشا نے ہنسنے لگی۔

”چلو شیردل سے ملواتی ہوں۔ اسد بھی وہیں جمع گھٹنے میں پھنسا ہوا ہے۔“ نینال نے دور ہی سے لڑکیوں کے غول میں گھرے اسد کو دیکھا۔

”اپنے ہونے والے منگیتر صاحب کو بلائے کے بہانے ہیں صاف صاف کہتی کیوں نہیں کہ ”خطرہ“ محسوس ہو رہا ہے۔ ویسے خاصی اسٹارٹ لڑکیاں ہیں تمہاری کالونی کی۔“ اس نے پھر چھیڑا۔ جواباً نینال نے اسے گھورا۔

”جی نہیں۔۔۔ میں شیردل کو دیکھ رہی ہوں۔“ وہ فوراً پینتر بدل گئی۔

”تم لڑکیاں کتنی کریزی ہوتی ہو سلیب بونی کے پیچھے مجھے تو آج تک یہ لوجک سمجھ میں نہیں آئی۔“ اس نے شیردل سے آؤگراف لیتی ہوئی لڑکیوں کو دیکھا جو کہ ایک دوسرے پر تقریباً ”گر رہی تھیں۔“

”تم تو ہو ہی بورنگ۔“ وہ چڑ کر بولی اور اسد کو دیکھ کر زور سے ہاتھ ہلایا اسد کی نظر اس پر پڑ چکی تھی اس نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا۔ پھر قریب کھڑے ہوئے شیر دل کے کان میں کچھ کہا اور خواتین اور لڑکیوں کے

درمیان سے بمشکل راستہ بنا تا ہوا ان کی طرف آگیا۔  
”ہیلو گرلز۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔

”تم دیاں کیا کر رہے تھے؟ آؤگراف تو شیردل سے لے رہی تھیں لڑکیاں۔“ وہ چھوٹے ہی اس پر پل پڑی روشا نے بمشکل اپنی ہنسی دبا لی۔

”بھئی۔۔۔ ویسے ہی گھڑا تھا۔“ اسد بڑبڑا کر بولا۔

”ویسے کیوں تم اس کے باڈی گارڈ لگے ہو یا اس کے ملنے والی آنٹیوں اور باجیوں پر نمبر لگا رہے تھے کہ فلاں میلے نمبر آئیں اور آکر آؤگراف لے جائیں۔“ وہ گھما جانے والی نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ اسد بے چارہ کو سنا اپنی جان کی امان طلب کرنے میں خشوع و خضوع سے مصروف ہو گیا۔ روشا نے کاجی چاہا کہ وہ تھق لگا کر ہنس دے مگر چیویشن ایسی نہیں تھی۔

”کم آن نینال! کیوں بات کا بنگلڑ بنا رہی ہو۔ ویسے بھی وہ لڑکیاں اسد کے لیے نہیں کسی اور کے لیے وہاں کھڑی تھیں کیوں اسد؟“ اس نے اسد کی جان خلاصی کراتے ہوئے مداخلت کی۔

”بالکل بالکل۔“ اسد نے فوراً ”لداوی پارٹی کی طرف داری کی۔“

”تھینکس۔۔۔ ورنہ آج تو بغیر تیر تلواریں کے شہید ہو گیا تھا۔“ اس نے روشا نے کے کان میں سرگوشی کی۔  
”اس لو کے ایک مسلمان ہی دوسرے مسلمان کے کام آتا ہے۔“ اس نے بھی ویسے ہی جواب دیا۔  
”کیا کھسر پھسر کر رہے ہو دونوں؟“ وہ مشکوک نظروں سے دونوں کو دیکھنے لگی۔

”تمہاری تعریف کر رہا تھا اسد۔“ وہ مسکراہٹ دیا کر سنجیدگی سے بولی۔

”وہ دیکھو۔۔۔ تمہارے شیردل صاحب ادھر ہی آ رہے ہیں۔“ اس کے دوبارہ حملہ آور ہونے سے پہلے ہی اس نے دوسری سمت اشارہ کیا۔ نینال نے اس کی انگلیوں کے تعاقب میں دیکھا۔ شیردل اپنی تمام تر وجاہتوں سمیت بہت مضبوطی سے قدم اٹھاتا ان لوگوں کی طرف آ رہا تھا۔ سن گلاسز کے پیچھے سے اس نے بنظر غائر اسد کے قریب کھڑی ہوئی روشا نے کاجازہ

لیا۔ نینال کو تو وہ اچھی طرح سے جانتا تھا۔ روشا نے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی۔ صاف چمکدار گلابی رنگت، بالکل سیاہ چمکدار لمبے بال جو کہ لمبیٹھیں میں کئے ہوئے تھے اور کندھے سے نیچے تک تھے سرو قد اور بے حد متناسب جسم جیسے سانچے میں ڈھلا ہو۔ سیاہ چمکدار روشن آنکھیں، مسکراتے ہوئے گلابی ہونٹ، چھوٹی سی ہیکھی ناک۔ گانوں پر پڑتے ڈھیل۔ اس کے پورے چہرے پر سب سے خوب صورت چیز اس کی مسکراہٹ تھی۔ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر عجیب قسم کی ہمکنش اور گھراؤ تھا۔ شخصیت میں عجیب سی کشش تھی۔ وہ جیسے جیسے اس کے قریب آ رہا تھا وہ اور زیادہ واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں بھی بے حد نازک اور حسین تھے۔ بہت ہی ترتیب وار اور دلکش حسن تھا۔ مگر کچھ الگ اور عجیب سا تھا اس میں وہ اسد کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی پوری گفتگو میں اس نے روشا نے کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔ یا تو اسے مسکرائے کی عادت تھی یا پھر وہ اسد کی باتوں پر مسکرا رہی تھی۔ اسد کی باتوں پر شاید ہی کوئی سنجیدہ رہتا ہو۔

ادب خانہ ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ہدایا

**سای حور لکھی**

راجہ جی جلیبی

نیت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ فون نمبر 32735021

37 ایڈ بلاک، کراچی



”ہیلو۔“ وہ قریب پہنچ کر خوشدلی سے بولا۔ مخاطب وہ دونوں لڑکیوں سے تھا۔  
”ہائے کیسے ہیں شیردل بھائی؟“ انہیں بھی لڑائی پوسٹ پونڈ کرتے ہوئے خوش دلی سے بولی۔  
”تمہارے سامنے ہوں۔“ وہ بڑی ادا سے مسکرایا۔

”یہ روشانی ہے۔ میری فرسٹ کزن میری سسٹر۔ اور روشنی! شیردل سے تو تمہارا تعارف میں کراہی چکی ہوں۔“ انہیں نے ان کا تعارف کرایا۔ کچھ دیر وہ لوگ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر انہیں نے روشانی کے اشارہ کرنے پر اس سے معذرت کی اور آگے بڑھ گئی۔

”مت گھور اسے۔ تیرے ٹائپ کی نہیں ہے اور سوچنا بھی مت۔ لیفٹنٹ جنرل شہباز کی بیٹی ہے۔“ شیردل کی نظروں کے تعاقب میں اس نے اس کے لئے لینے والے انداز میں تنبیہ کی۔

”سو واٹ؟ اتنی خوب صورت لڑکی کو چھوڑ دینا کفرانِ نعمت ہوگی۔“ وہ عجیب انداز میں بولا۔  
”جنرل صاحب نے تیرا کورٹ مارشل کر دینا ہے ساتھ میں میرا بھی۔“ اس نے اسے ڈر لیا۔

”کم آن۔ تو تو محبت کر کے اور شادی سے پہلے ہی گیلڈر بن گیا ہے۔“ شیردل نے طنز کیا۔  
”مجھے گیلڈر بننا قبول ہے میرے بھائی۔ مگر انہیں کی جھاڑ کھانا نہیں سمجھے۔ تو اس لڑکی کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا۔“ اس نے کہاں اثر ہونے والا تھا۔

”کیوں؟ ٹیکس لگتا ہے کیا؟“ وہ ابھڑ چھا کر بولا۔  
”اے۔۔۔ وہ تیرے دام میں آنے والی لڑکی نہیں ہے۔ میں بچپن سے جانتا ہوں اسے۔“ اس نے کہا۔  
”اچھا۔ گڈ تو مجھے بھی اس کے بارے میں بتانا۔“ وہ اس کے کاندھے پر بازو ٹکا کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

”وہ بے حد قابل اور عزت لڑکی ہے۔ شہباز انکل کی جان اس میں بند ہے۔ جس طرح دیو کی جان توتے میں بند ہوتی ہے۔“ اس نے بتایا اسی وقت اس

کے موبائل پر مہیج ٹون بجی۔ اس نے جیب سے موبائل نکال کر ان باکس چیک کیا۔ پھر زیر لب مسکراتے ہوئے مہیج ٹائپ کرنے لگا۔  
”اب بک بھی چکو۔“ شیردل کو غصہ آ گیا۔  
”اے صبریار! انہیں کامیج ہے۔ ابھی اگر وہ

پلے نہیں کیا تو خود پہنچ جائے گی۔ پھر میرے ساتھ ساتھ تو بھی گیا۔“ اس نے جلدی جلدی کچھ ٹائپ کر کے سینڈ کر دیا شیردل نے گہری سانس لیتے ہوئے اس کے شانوں پر سے ہاتھ ہٹا کر پیٹ کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونس لیے۔  
”مارورو کی گولڈ میڈلسٹ ہے۔ بچپن سے ٹائپ کرتی آئی ہے ہر کلاس میں۔ آٹھویں کلاس میں میرے ساتھ ہی تھی۔“ اس نے ”منقطع رابطہ“ جوڑے ہوئے بتایا ”مگر وہ تو تجھ سے چھوٹی لگتی ہے۔ تجھ سے کیا مجھ سے بھی چھوٹی لگتی ہے۔“

شیردل نے کہا۔  
”ہاں تو عمر میں تو چھوٹی ہی ہے۔ ہیں۔ اے کیا بولا تو۔“ اس نے چونک کر کہا۔  
”کیا ہم دونوں کی عمروں میں بیس سال کا فرق ہے؟“ وہ اس پر چڑھ دوڑا۔ شیردل ہنسنے لگا۔  
”یہاں چھٹیوں پر آئی ہے؟“ شیردل نے استفسار کیا۔

”اس کی پیدائش بیس میں ہوئی تھی۔ بدر کی ڈنٹا ہو گئی تھی اس وقت یہ بہت چھوٹی تھی۔ فادر نے کسی انگریز عورت سے شادی کر لی شہباز انکل اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ روشانی نے میٹرک کے بعد کے تعلیمی سفر کے بعد پائل ہی کو گھر بنا لیا۔ وہ صرف چھٹیوں میں گھر آتی تھی۔ ہرمیدان کو مار لیتا جیسا اس کے لیے حلوہ تھا۔ میرے ساتھ صرف تین سال بڑھی ہے۔ تینوں کلاسز میں اس سے زیادہ لائق اور قابل اسٹوڈنٹ کوئی نہیں تھا۔ وہ بے حد ذہین تھی۔ بہت بولڈ بہت کھری مگر کبھی میں نے اس میں غرور نہیں دیکھا۔ ہم لڑکے اس کی بے حد عزت کرتے تھے اس سے فلرٹ کرنے کی جرات کسی کی نہیں ہوتی تھی۔

حالانکہ وہ سب سے نارمل بی بیو کرتی تھی مگر اس کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ کسی کی ہمت نہ بڑتی اس سے فالتو بات کرنے کی بھی وہ ہماری کلاس کی موٹ رہسپکٹڈ لڑکی تھی اور سب سے کم عمر بھی۔ ہم سب اس سے بڑے تھے اور جہاں تک اس کی ذہنی پچھرونی کا تعلق ہے تو بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال۔“ اس بار وہ شرمندہ شرمندہ سے لہجے میں بولا۔

”راہنی حد تک تو تو نے بالکل ٹھیک ہی کہا۔ تو تو ہے ہی سدا کا ٹالاق۔“ شیردل نے ہنس کر اس کا مذاق اڑایا۔  
”اس نے اس کی گھر پر دھول رسید کی۔ دونوں ہنسنے لگی۔

”دیے میں روشانی شیر علی سے ایک بار اور ملاقات کرنا چاہوں گا۔“ شیردل نے کہا۔  
”وہ تیرے ٹائپ کی نہیں ہے۔ پہلی بار میں چپ کر دے گی۔“ اس نے اس کے کاندھے پر چھکی دیتے ہوئے پرکارتے ہوئے کہا۔

”میں شیردل ہوں بیٹا۔ مجھے آج تک کسی لڑکی نے انکار کرنے کی جرات ہی نہیں کی۔“ شیردل کے انداز میں غور تھا۔

”مرضی ہے تیری۔ تجھے خود ہی سننے کا شوق ہے؟“ وہ اس کی طرف دیکھ کر ہنس کر بولی۔  
”اس نے کاندھے اچکائے شیر دل کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔



وہ پیر گئی سی جینز اور سفید ڈھیلے ڈھالے کرتے میں لمبوس تھی۔ اپنی کینیوں تک فولڈ تھیں۔ گریبان کے پورے بٹن بند تھے صرف اوپری بٹن کھلا ہوا تھا۔ بالوں کی ہائی پونی تھی اور وہ ٹریک پر جاگنگ کر رہی تھی۔ شیردل ابھی ابھی ٹریک پر آیا تھا اور اس کی نظر دور سے ہی روشانی پر پڑی تھی۔ اس کے لبوں پر بڑی خوب صورت سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے ٹریک پر جاگنگ شروع کر دی اور کچھ ہی لمحوں میں روشانی کے برابر جا پہنچا۔

”ہیلو۔“ شیردل نے اس کے شانہ بشانہ جاگنگ

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

# سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے ہال آگاتا ہے
- بالوں کو مشورہ اور چمکا دیتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت - 120/- روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جزی بوتلوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تقریبی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں یا کسی دھڑے میں دستیاب نہیں، کراچی میں دفنی خرید جاسکتا ہے۔ ایک بوتل کی قیمت صرف 120/- روپے ہے۔ دوسرے شہروں کے لئے آڈر بھی کر دیتے ہیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے 300/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے 400/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے 800/- روپے

نوٹ: اس میں ذاک خرق اور بٹنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجئے گئے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53۔ اورنگزیب مارکیٹ، یکم طور، ایم اے جناح روڈ، کراچی  
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی بیوٹی آئل ان جگہوں سے حاصل کریں  
بیوٹی بکس، 53۔ اورنگزیب مارکیٹ، یکم طور، ایم اے جناح روڈ، کراچی  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔  
فون نمبر: 32735021



کرتے کرتے کہا روشا نے گردن موڑ کر اسے سرسری سا دیکھا اور ہیلو کا جواب دیتے ہوئے نارمل انداز میں جاگنگ کرتی رہی۔

”لگتا ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔“ شیردل نے کہا۔

”ٹھیک فرمایا۔ میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔“ پتا نہیں روشا نے پہچان چکی تھی یا واقعی اسے پہچان نہیں سکی تھی شیردل نے وہ جملہ تکلفاً کہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ روشا نے کی طرف سے ایسا کورا جواب آئے گا۔ لختہ بھر کو تو وہ چپ سا ہو گیا۔ مگر ہمت نہ ہاری حالانکہ اس کے ساتھ ایسا زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ کسی لڑکی نے پہلی ملاقات کے بعد اس کو پہچاننے سے انکار کیا ہو۔ وہ نجل سا ہو گیا تھا۔

”کل ہماری گالف کلب میں ملاقات ہوئی تھی۔“ اس نے کچھ نجل سا ہو کر کہا۔

”اوسے لیس۔“ روشا نے سر ہلایا۔

”اتنی کمزور یادداشت لگتی نہیں ہے آپ کی؟“ اس نے کچھ مشکوک نظروں سے روشا کو دیکھا۔

”یادداشت کمزور نہیں ہے میری مگر یاد رکھنے کی اور

بہت سی قابل ذکر اور ضروری باتیں ہیں میرے پاس۔“ روشا نے مسکرا کر نرمی سے اسے جو تارا۔

شیردل کا چہرہ سن ہو گیا۔

”آپ یہاں روزانہ جاگنگ کرنے آتے ہیں؟“

روشا نے سادہ سے لہجے میں پوچھا۔

”جی ہاں۔ مگر آپ کو یہاں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔“ شیردل نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”جی میں یہاں کافی عرصے بعد آئی ہوں۔“ اس نے

بتایا۔ اس کا راؤنڈ پورا ہو چکا تھا وہ ستارے کو رکھی تھی۔

شیردل نے منہل وار پتی روشا نے کو گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ کل والے حلیے سے یکسر مختلف لگ رہی تھی۔ مگر اسے اعتراف کرنا پڑا کہ وہ اس حلیے میں بھی

بے حد پرکشش لگ رہی تھی۔ روشا نے کو اس کا دیکھنا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر وہ چپ چاپ پانی پیتی رہی۔

”میرا راؤنڈ پورا ہو گیا ہے تو ایکسکیوزی۔“ وہ

خٹک انداز میں بولی۔

”میرا راؤنڈ بھی پورا ہو گیا ہے چلیے ساتھ ساتھ ہی چلتے ہیں۔ کچھ باتیں بھی ہو جائیں گی۔“ شیردل بولا۔

یارگ لوگوں سے بھرا تھا کچھ لوگ جاگنگ ٹریک پر تھے کچھ گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے کچھ یوگھی ہوا خوری کر رہے تھے۔ وہ ٹھہر کر پانی پی رہی تھی۔ شیردل سے بے نیاز وہ ادھر ادھر لوگوں پر بھی نظر ڈال دیتی۔ شیردل کو لگا کہ وہ جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر رہی ہے۔

”کچھ بات کرنی تھی آپ کو؟“ وہ بول کا ڈھکن بند کرتی ہوئی براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ رہی تھی۔

”کرنی تو ہیں باتیں۔ مگر آپ کچھ جلدی میں لگ رہی ہیں۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”جلدی میں تو نہیں ہوں البتہ بلا جواز یہاں ٹھہرنے کا مقصد بھی کوئی نہیں“ وہ خالی بول کر رہی ڈسٹ بن میں پھینکتی ہوئی بولی اور پھر بارک میں موجود لوگوں کو سرسری سا دیکھنے لگی۔

”ہم اجنبی ہیں۔ کیا باتیں کر سکتے ہیں؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”دو ملاقاتیں ہوئی ہیں ہماری۔“ شیردل نے جیسے اسے بتلایا۔

”صرف علیک سلیک۔“ اس نے فوراً ”صحیح کی بات بلاشبہ بہت حاضر جواب تھی۔“

”جو جان پہچان بڑھانا چاہتے ہیں علیک سلیک ان کے لیے پہلا قدم ہوتا ہے۔“ شیردل بھلا کب ہار ماننے والا تھا۔

”جی مگر جو میل جول بڑھانا چاہیں۔“ وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

”اگر میں اسی طرح ہر ایک سے ”علیک سلیک“ کرتی رہوں تو آدمی سے زیادہ دنیا میں میرے میل ملاقاتی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔ شیردل اس کی مسکراہٹ کی دلدل میں اترنے لگا تھا۔ اس نے رہنمائی کی قید سے اپنے بالوں کو آزاد کیا۔ سبک ہوا کے

جھوٹوں سے اس کے دُشمنی بال بکھرنے لگے۔ ”اگر یہ جھوٹوں کے کسی اشتہار میں ماؤنٹنگ کرے تو بہت کامیاب ہو۔“ اس کی خوب صورت زلفوں کو دیکھ کر بے ساختہ اس نے سوچا۔

”یہ تو بہت انٹلسٹنگ ہے۔“ وہ کچھ جڑ بڑھوا۔

”نہیں یہ میرے ذاتی خیالات ہیں۔ میں نے کسی کی انٹلسٹ کرنے کے خیال سے کچھ نہیں کہا۔ میں سوچل نہیں ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”حالانکہ سوشل ورکر تو ہیں آپ۔“ شیردل ہر جہت بولا۔

”خاصی معلومات اکٹھی کرنی ہیں ایک ہی دن میں“ وہ بولی۔

”سرسری سی بس“ شیردل مسکرایا۔

”تو اپنی معلومات میں اضافہ کر لیں کہ میں سوشل ورکر نہیں ہوں۔ وہ محض جاب ہے میری اور اس کا معاوضہ ملتا ہے مجھے۔“ وہ ٹھہرنے لہجے میں کہنے لگی۔

”اور نمبر دو بات یہ کہ مجھے اپنے ارد گرد جھگھٹا

اٹھا کرنے کا شوق نہیں ہے۔ بائے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر معنی خیر انداز میں بولی اور

شیردل پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ چند لمحے کو یوں پتھر اُگیا جیسے بچے اسے ”فریز“ بول کر چلے گئے ہوں۔ وہ گیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس کے قدم بہت مضبوطی سے زمین پر پڑ رہے تھے۔

”لعنت ہو شیردل۔ ایک لڑکی سے بے عزت ہو گئے۔“ اس نے حواس کو قابو میں کرتے ہوئے خود کلامی کی۔

”کیا ہوا بھائی؟ اکیلے ہی اکیلے باتیں؟ خیر تو ہے؟“ اسد کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”تو کب مرا؟“ شیردل نے جھنجھلا کر پوچھا۔

”ٹھیک اسی وقت جب روشا نے کے ہاتھوں تو بے عزتی کروا رہا تھا۔ بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔“ اسد نے باہر جاتی ہوئی روشا نے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے ان دونوں کو دور سے ہی باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔

”تو زیادہ قیاس آرائیاں مت کر۔ چل مجھے ناشتا کروا۔“ شیردل نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

”ارے۔ یار! ابھی تو آیا ہوں۔ جاگنگ تو کر لینے دے۔“ وہ منمنایا۔

”وہ تو شادی کے بعد تجھے نہیں نے ویسے بھی کرواتے ہی رہتا ہے بیس گھنٹے۔“ شیردل بولا۔ اسد یقیناً ”دوسرے گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا جیسی ان دونوں کی نظریں اس پر نہیں پڑی تھیں۔ مگر اسد دور ہی سے ان دونوں کو دیکھ چکا تھا۔ جب تک وہ ان کے پاس پہنچا تھا روشا نے جاچکی تھی اور شیردل کے چہرے سے اس نے ان دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو کا اندازہ لگا لیا تھا۔

\*\*\*

روشا نے جس وقت گھر میں داخل ہوئی تھی لیفٹنٹ جنرل شہباز شیر علی کو فون پر کسی سے بات کرتے دیکھا تو سلام کرتی ہوئی فریج کے پاس پہنچ گئی۔ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر اس نے گلاس میں انڈیلا اور گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگی۔ مگر وقتاً فوقتاً اس کی نگاہیں تاپا کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ اندازہ لگاتا چاہ رہی تھی کہ فون پر وہ کس سے باتیں کر رہے ہیں۔

اتنے میں ملازم نے آکر ناشتے کا پوچھا۔

”انا اور تاپا جان نے ناشتا کر لیا؟“ اس نے پوچھا۔

”جی نہیں۔۔۔ وہ دونوں آپ کے ساتھ ہی ناشتا کریں گے۔“ ملازم مودبانہ لہجے میں جواب دینے کے ساتھ ہی خالی گلاس بھی اٹھانے لگا۔

”میں دس منٹ میں فریش ہو کر آتی ہوں۔ تم ناشتا لگاؤ۔“ اس نے اٹھتے ہوئے شہباز پر پھر ایک نظر ڈالی۔

وہ ہنوز مصروف تھے۔ وہ ان کا چہرہ پڑھتے ہوئے اوپر جانے والے زینے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا اور فیصلہ دونوں کے کمرے اور تھے۔

جب غسل کر کے وہ نیچے آئی تو اس کے تاپا اور انا میز پر موجود تھے۔ وہ دونوں کچھ بات کر رہے تھے اس



نے خوش دلی سے دونوں کو سلام کیا اور ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔  
”روشنی! جاگنگ کرنے جاتی ہو تو نینل کو بھی لے جایا کرو۔“ انا نے کہا۔

”اے سوتے سے اٹھانے میں اور پارک تک لے جانے کی کوشش میں جاگنگ ہم صبح نہیں ایلونگ میں کر سکیں گے انا۔“ وہ مسکرائی اور ابلا ہوا اندھا چھیلنے لگی۔

”مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ شہباز نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ بیگم شہباز نے جوس گلاس میں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

”ہوں۔ کہیے۔“ وہ بولی شہباز نے کن آنکھوں سے بیگم شہباز کی طرف دیکھا۔ پھر زرا سا کھنکھار کر گویا ہوئے۔

”یا مین تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ صبح اسی کافون تھا۔“ وہ دھیرے سے بولے نہ وہ چونکی نہ ہی غصہ ہوئی۔ بس ناشتا کرتی رہی۔

”دراصل کل رات کو بھی آیا تھا۔“ اب کی دفعہ وہ ہچکچا کر بولے۔

”ویسے جو گنگ کرنے کا مزہ ہی اور ہے۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں انا۔ نینل کو بھی کل سے لے جاؤں گی ساتھ۔“ اس نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

”روشنی۔“ شہباز نے قدرے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

”اور آپ نے کس خوشی میں اتنے دنوں سے مارنگ واک نہیں کی۔ کل صبح سے ہم چاروں جایا کریں گے صحت پر اور ذہن پر اچھا اثر پڑتا ہے۔“

اسے جیسے اس موضوع سے زیادہ اہم کچھ لگ ہی نہیں رہا تھا۔

”روشنی۔ میں کچھ کہہ رہا ہوں۔“ اس بار وہ قدرے جھلجھلکے۔

”نینل بہت لیزی ہوتی جا رہی ہے انا۔ اسے صبح سویرے اٹھایا کریں۔ آج پھر چھٹی کر لی اس نے کالج سے اس طرح تو بن چکی وہ ڈاکٹر۔“ وہ اب دوسرا

مسئلہ نکال کر بیٹھ گئی تھی۔ دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو جیسے بے بسی سے دیکھا۔ پھر ایک دوسرے سے نظریں چرائیں۔

”وہ شرمندہ ہے۔ تم سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔“ اس بار بیگم شہباز بولیں۔ اس کی قوت برداشت جیسے یکدم جواب دے گئی۔

”معافی۔ مالی فٹ۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی نمک دانی میز پر دے ماری لمحہ بھر کو میز پر سناٹا چھا گیا۔ وہ ایسے تو بھی رد عمل ظاہر نہیں کرتی تھی۔

”آم ساری۔“ وہ گہرے گہرے سانس لیتی ہوئی بولی اور جوس کا گلاس ایک ہی سانس میں پی گئی۔

”ویسے آپ کس معافی کی بات کر رہی ہیں انا۔ جس شخص کو میں جانتی نہیں جس سے میرا کوئی تعلق نہیں، معافی کا کیا قصہ ہے؟“ وہ خود کو ریلکس کرتے ہوئے بولی۔ شہباز نے لب بچھتے ہوئے بیوی کو دیکھا۔

”ایک بار اس کی بات سن لو تو۔“ شہباز بولے۔

”نہیں تایا جان! ابھی نہیں۔ میرے ماں باپ مر چکے ہیں۔ میرے ماں باپ آپ دونوں ہیں نینل میری بہن ہے۔ یہی میری فیملی ہے، میرا دنیا میں آپ

تینوں کے سوا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ جس شخص کا نام آپ نے لیا تھا وہ میرے لیے کبھی تھا ہی نہیں۔

اب میں سکون سے ناشتا کر لوں؟“ وہ قطعی لہجے میں کہتے ہوئے جیسے ان سے اجازت طلب کر رہی تھی۔

دونوں میاں بیوی چپ ہو گئے۔ اسی وقت نینل میڈیٹیشن پھلانگتے ہوئے نیچے اترتی نظر آئی مخصوص لاپرواہی کے ساتھ سب کو مشترکہ گڈ مارنگ کہہ کر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

”تم نے چھٹی کسی خوشی میں کی؟“ روشنائے نے اس کی کلاس لی۔

”یار موڈ نہیں تھا۔“ وہ ایک سیب اٹھا کر دانتوں سے کترنے لگی۔

”جی۔ ہو چکا اس کا میڈیکل۔“ اس نے بیگم شہباز کو دیکھ کر کہا۔

”تم ہی کچھ سمجھاؤ اسے۔“ انہوں نے سارا بوجھ

اس پر ڈال دیا۔  
”سجیدہ ہو جاؤ تم۔“ ایگز مز قریب ہیں۔“ روشنائے نے اسے جھڑکا۔

”ہو جائے گی تیاری۔“ آدھی تو کر لی ہے۔“ اس نے جان چھڑائی۔

”تایا جان! مجھے ذرا کام سے جانا ہے۔“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”کیس نہیں جانا ہے۔ تم چھٹیوں پر آئی ہو اور میری منتی کی تیاری کروانے آئی ہو۔ ہمیں آج بہت سارے کام ہیں کیونکہ شام کو فنکشن ہے۔“ ان کے بجائے نینل نے گلا پھاڑ کر کہا۔

”یاد ہے یاد ہے۔ مجھے صرف دو گھنٹے چاہیں۔ آج کا بورا دن تمہارے نام ہے بس تھوڑی سی دیر کی بات ہے تم مجھے صرف دو گھنٹے دے دو۔“ آئی سوئیں اس کے بعد تمہارے پاس سے ہلوں گی بھی نہیں۔ بس

تھوڑی دیر کا کام ہے۔“ اس نے نینل کے رخسار پکڑ کر مروڑے۔ بے چاری کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ یہ

روشنائے کا پیار کرنے کا انداز تھا۔ ایسے جب بھی نینل پر بہت زیادہ پیار آتا تھا وہ یہی کرتی تھی۔

”اوکے اوکے۔ مگر صرف دو گھنٹے۔“ نینل نے اسے وارننگ دی۔

”کہاں جا رہی ہو بیٹا؟“ بیگم شہباز نے پوچھا۔

”انا! آئیٹل کام سے ہی جا رہی ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”مگر تم تو چھٹیوں پر آئی ہو۔ تمہارے دفتر والے یہاں بھی چین سے نہیں نہیں چھوڑ رہے ہیں؟“

سر شہباز نے ناگواری سے خفگی کا اظہار کیا۔

”اب کیا کریں۔ کام تو کام ہے، کرنا ہی پڑتا ہے۔ مجھے یوں بھی پاکستان آنا تھا اللہ نے سبب بنا دیا۔ سوچا اچھا موقع ہے، کام بھی نمٹا لوں۔“ اس نے مسکرا کر

محبت سے انہیں دیکھا۔

”اوکے مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ اوپر جانے والے زینے کی طرف مڑی۔

”دو گھنٹے یاد رکھنا اور موبائل آف مت کرنا۔“

نینل نے تیز آواز میں اسے یاد دہانی کرائی۔ اس نے ملے بغیر بازو اوپر کر کے انگلیاں گھمایں۔ وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔ نینل، اوکے کا اشارہ ملتے ہی پھر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ روشنائے اپنے بیڈ روم میں جا چکی تھی۔ شہباز ناشتا کرنے کے بجائے نجانے کن سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بیگم شہباز نے ان کا شانہ بلایا تو وہ چونکے۔

”کن خیالوں میں کھو گئے؟“ وہ پوچھ رہی تھیں۔

نینل بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”سوچ رہا تھا کہ یا مین، بہت بد نصیب نکلا۔“ بیروں کی قدر نہ کی اور خود بھی گھائے کا سودا کر بیٹھا۔ ان دونوں کو سدا کا درد دے

بیٹھا۔ سب سے زیادہ نقصان روشنائے نے اٹھایا ہے اس سارے قصبے میں۔“ وہ گہری سانس لہوں سے

خارج کرتے ہوئے بولے۔ نینل خاموشی سے بریڈ پر ہٹو لگانے لگی۔

”ہوں۔ بد نصیبی ہی تو ہے اس کی۔ اور کیا نام دیں؟ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ روشنائے نے خود کو ضائع نہیں کیا۔ بہت باہمت بچی ہے۔“ بیگم شہباز نے گہری

سانس سینے سے خارج کرتے ہوئے کہا۔

”واقعی۔ مجھے فخر ہے روشنائے پر۔ پورا خاندان سب ملے جلنے والے تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔“ میرا تو

سر فخر سے بلند کر دیا ہے اس نے۔“ جنرل شہباز نے کہا۔ ان کے لہجے میں روشنائے کا ذکر کرتے ہوئے خود بخود ایک فخر ایک محبت کا سیلاب سا اٹھ آیا تھا۔

”خدا اس کے نصیب بھی بہت اچھے کرے۔“

بیگم شہباز نے دعا دی۔

”آپ اس سے ایک بار پھر بات کرنے کی کوشش تو کریں۔ وہ دونوں پروپونل ابھی تک راہ دیکھ رہے

ہیں۔ میں نے انہیں ابھی کوئی صاف جواب نہیں دیا۔“ لیفٹننٹ جنرل شہباز نے بیوی سے کہا۔

”مجھے رشتے بار بار نہیں ملتے۔ اسے کنوینس کرنے کی کوشش تو کریں۔“

”میں نے پہلے بھی بہت کوشش کی تھی۔ ایک بار

پھر کر لوں گی۔ مگر وہ سنتے ہی بدک جاتی ہے۔ شادی کے



نام سے ہی خار کھاتی ہے۔ "بیگم شہناز کے لہجے میں اس بار بے بسی تھی۔

"کو شش میں اگر نیت اور ارادے کی مضبوطی اور خلوص شامل ہو جائے تو بات بن جاتی ہے آپ کو شش کریں۔" انہوں نے متانت سے کہا۔

"دہرے رشتے ہیں میرے اس کے ساتھ آپ کو کیا میرے خلوص پر شک ہے؟" وہ شکوہ کنٹاں ہوئیں۔

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔" بھی میں نے یہ کب کہا۔ مجھے آپ کے خلوص پر بالکل بھی شک نہیں ہے۔ وہ جتنی بھری ہے اتنی آپ کی بھی ہے۔" انہوں نے بیوی کی بات کاٹتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔" نینال کی منگنی سے فارغ ہو جائیں تو بات کرتی ہوں۔" انہوں نے کہتے کہتے چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا۔ نینال بھی کسی سوچ میں گم تھی اور شہباز بھی جانے کیا سوچ رہے تھے۔



وہ دو کے بجائے ساڑھے چار گھنٹوں کے بعد گھر پہنچی تھی۔ نینال بالکل تیار اس کے انتظار میں مودی دیکھ کر وقت گزار رہی تھی۔ جس وقت وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی تو نینال نے اس کے سلام کا جواب دینے کی بجائے سر کے نیچے رکھا ہوا کٹن کچھنچ کر اسے دے مارا تھا۔

"ارے رے۔۔۔ یہ کیا سلام کا جواب دینے کا کوئی نیا اسٹائل ہے؟" اگر وہ فوراً ایک طرف نہ ہو جاتی تو کٹن سیدھا اس کے منہ پر لگتا۔

"تم ٹائم ویکو تم نے دو گھنٹے مانگے تھے مجھ سے۔" نینال غرائی۔

"اب میں کیا کرتی وہ منسٹر ایڈیٹ مجھے ٹائم دے کر مزے سے گھر بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔ میں گھنٹہ بھر تو اس کا انتظار کرتی رہی پھر مینٹنگ میں اتنا وقت لگ گیا۔" اس نے معذرت کرنے کے ساتھ وضاحت کی۔

"اچھا کیا اس نے تمہارے ساتھ بالکل۔" نینال

منہ پھلا کر بولی۔

"جناب! ہم بھی بخشنے والے نہیں تھے۔ خوب کلاس لی ان کی کہ سارا ناشتا ہضم کرا دیا۔ مذاق تھوڑی ہیں ہم۔ ان سے بھی "لو بچی" کرسی ہے ہماری۔" وہ قرضی کالر جھاڑتے ہوئے بولی۔

"اب اپنے منہ میاں مٹھو بننا بند کرو اور چلو۔" نینال پر رتی برابر بھی اس کی بات کا اثر نہ ہوا تھا۔ اسے تو اپنی منگنی کے جوڑے کی فکر تھی۔

"چلو" میں تو تیار ہوں۔" وہ ڈریسنگ نیبل پر سے برش اٹھاتے ہوئے بولی اور پونی کھول کر بال برش کرنے لگی۔

"منہ تو دھو لو کم از کم۔" نینال نے کہا۔

"دھلا دھلایا ہے بالکل۔ چلو اب۔" نینال کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے اس نے لب گلوڑ اٹھا کر ہونٹوں پر لگایا اور پھر دھک بن کر کرتے ہوئے اسے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

وہ نینال سے دو "اڑھائی برس ہی بڑی تھی۔ مگر نینال کے مقابلے میں بے حد پیچور اور سنجیدہ مزاج کی تھی۔ جبکہ نینال کے مزاج میں پچینا بہت تھا۔ شاید یہ اس لاڈ پیار کا نتیجہ تھا جو اسے اس کے والدین سے ملا تھا۔ جبکہ روشنائی کی عمر کا زیادہ تر حصہ ہاسٹلز میں گزرا تھا۔ باوجود اس کے کہ شہباز اور بیگم شہباز اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ ہاسٹل میں رہنے کا فیصلہ سو فیصد اس کا اپنا تھا۔ بیگم شہباز کو اس کا ہاسٹل میں رہنا پسند نہ تھا مگر اس کی ضد کے سامنے مجبور تھیں۔ وہ نویں جماعت کے بعد سے ہاسٹل میں رہنے لگی تھی۔ شہباز کے گھر وہ صرف چھٹیوں میں رہنے کے لیے آتی تھی۔ اس لیے بھی اس کا مزاج دو سری لڑکیوں سے کچھ مختلف تھا۔

جس ڈیزائنوں کے پاس نینال کا سوٹ تھا، پہلے انہوں نے وہ سوٹ وہاں سے لیا۔ اس کے بعد جیولر کے پاس گئیں۔ پھر روشنائی نے اسے حسب وعدہ لٹج کرانے کے لیے ایک ریٹورنٹ کا رخ کیا۔ یہ ریٹورنٹ نینال کا پسندیدہ تھا۔ لٹج کے دوران وہ دونوں

جوڑے اور جیولری پر تبصرہ کرتی رہیں۔ پھر روشنائی نے اسے پارلر ڈراپ کیا۔ اس وعدے کے ساتھ کہ وہ ایک گھنٹے کے بعد اسی پارلر میں خود بھی تیار ہونے آجائے گی۔ نینال کی منطلق تھی۔ "بھئی دلہن کی اکلوتی بہن کو ڈھنگ سے تیار ہونا چاہیے۔" آخر آل مودی بنے گی، تصاویر بنیں گی۔ شکل تو اچھی لگنی چاہیے۔" روشنائی واپس گھر آگئی تھی تاکہ کچھ دیر آرام کر لے اور پھر تازہ دم ہو کر پارلر کے لیے روانہ ہو

منگنی کی تقریب شہباز کے بچکلے پر ہی تھی۔ ان کا لان خاصا بڑا تھا، تقریب کے انتظامات روشنائی نے ان کے ساتھ مل کر سنبھالے تھے۔ لان کی سجاوٹ، اسٹیج وغیرہ کی بناوٹ، نینال کے سرسالیوں کے سواگت کے انتظامات، مہمانوں کی تمام تر ذمہ داری اسی پر تھی۔ پریل اور اسکن شیڈز کے اسٹائلش سے کرتے اور پانچاھے میں ملبوس وہ بے حد مصروف تھی۔ کبھی ادھر سے کوئی اسے کسی کام کے لیے بلا لیتا تو کبھی ادھر سے کوئی اس سے کچھ پوچھ رہا ہوتا۔ نینال کی باقی کزنز بھی استقبالیہ "عملے" میں پیش پیش تھیں۔

وہ بیگم شہباز کے ساتھ ہی کھڑی مسکرا مسکرا کر مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی۔ زیادہ لوگ مدعو نہیں تھے۔ صرف بہت ہی قریبی رشتہ دار اور احباب مدعو تھے۔ اسد کے گھر سے بہت ہی مختصر افراد آئے تھے، کیونکہ اسد کے زیادہ تر رشتہ دار دوسرے شہروں میں رہتے تھے۔

"ہیلو کیسی ہیں آپ؟" شیردل بلیک گھر کے پینٹ، کوٹ اور پریل گھر کی شرٹ پہنے بہت تازہ دم لگ رہا تھا۔

"بہت اچھی ہوں۔" اس نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، جس کے ساتھ وہ دوسرے مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی۔

"مگر آج تو آپ ضرورت سے زیادہ اچھی لگ رہی ہیں۔" وہ شوخی سے بولا۔

"اس کو مہلہ منٹ کے لیے تھینکیں، مگر میں ہمیشہ اچھی لگتی ہوں۔" جواب اس کی توقع سے بالکل مختلف تھا۔ مہارت سے کیے گئے میک اپ، خوب صورت سے ہیئر اسٹائل کے ساتھ بی بی سنوری وہ اسے بے حد مغرور اور خود پسند لگی۔

"انتی خود پسندی۔" وہ تشدد رہ گیا۔ بیگم شہباز دوسری مہمان خواتین کی طرف متوجہ تھیں، لہذا ان دونوں کی باتیں نہ سن سکیں۔ روشنائی نے مسکرا کر ہاتھ کے اشارے سے اسے آگے بڑھنے کے لیے کہا اور خود دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ شیر دل نے خفت کے ساتھ اس پر ایک نظر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

"گنتی یارا اپنی بے عزتی کرائے گا بیٹے۔" اسد کے کان گدھے کے تھے اسے اس سے دو قدم آگے ہونے اور "دولہا" بننے کے باوجود اس نے ان دونوں کے مکالمات سن لیے تھے۔

"اس لڑکی سے بے عزتی کرانے کا بھی اپنا ایک مزا ہے یار۔" وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔

"وقت ہے۔ سدھرجا۔ بڑے بڑے چاروں شانے جت ہو گئے ہیں اس کے ہاتھ سے۔" اسد نے اسٹیج کی طرف جاتے جاتے آہستگی سے کہا۔

"فی الحال تو تو اپنی خیر منا بیٹا۔۔۔ وہ سامنے اسٹیج پر تیری "ہتھکڑی" براجمان ہے۔ شیردل نے دلہن کی نینال کی طرف اشارہ کیا۔

"ویسے اگر تو روشنائی کے لیے سنجیدہ سے تو بات آگے بڑھائی جاسکتی ہے۔" اسد نے تجویز پیش کی۔

"فی الحال تو اپنی خیر منا بکرے۔ تیری ہونے والی تھی ہی دیکھ رہی ہے۔" شیردل نے اس کے کان کھینچے۔ اسد، نینال کے پاس رکھی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک ہا ہو کا طوفان شروع ہو چکا تھا۔ دونوں طرف کے "گروپس" شرارتیں کر رہے تھے۔ شیردل بھی پیش پیش تھا۔ روشنائی دوسری خواتین کے ساتھ ذرا بڑے کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے اطمینان سے بیٹھی لڑکوں اور لڑکیوں کی شرارتوں پر مسکرا رہی تھی۔ شیر



دل کی نظریں بار بار اس کی طرف بھٹک جاتیں۔ وہ اس سے بے خبر سارے بے گلے کو بہت مزے سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ بہت لطف اٹھا رہی ہے۔

پورے فنکشن میں وہ صرف انگوٹھی پہنانے کی رسم میں ہی اسٹیج پر نظر آئی تھی۔ شیردل نے اسے مہمانوں کے ساتھ ہی مصروف دیکھا تھا یا پھر اگر وہ فاسخ ہوتی تو کسی نہ کسی کرسی پر بیٹھی نظر آتی۔ کھانے کے وقت بھی وہ مہمانوں کی خاطر داری میں ہی مصروف نظر آتی تھی۔

”آپ دو سہول کو ہی کھلاتی رہیں گی یا خود بھی کچھ کھائیں گی؟“ شیردل اس کی پشت پر خلی پلٹ لیے کھڑا تھا۔

”فی الحال تو آپ کی پلٹ بھی خالی ہے۔“ اس نے شیردل کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی پلٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ سب ہمارے مہمان ہیں۔ فی الحال تو آداب میزبانی ہمیں نبھانا ہے۔ آپ کچھ پیچھے ہٹیں۔“ اس نے اخلاق سے مسکرا کر کہا۔

”میں تو سمجھ رہا تھا کہ کہیں آج بھی آپ ناچنے کو پہچاننے سے انکار نہ کریں۔ مگر صد شکر۔“ شیردل نے دوسری خالی پلٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کہ آپ نے پہچان لیا۔“ وہ اس کا طنز سمجھ گئی تھی مگر نظر انداز کر گئی۔

”آپ کھانا پیچھے مہمان ہیں ہمارے آپ۔“ اس نے کہا۔

”آپ ساتھ دیں تو۔“ شیردل نے بات جان بوجھ کر ادھوری پھوڑ دی۔

”جلے جناب! مہمان کی تو مانی پڑے گی۔ یوں بھی کچھ بھوک محسوس ہو رہی ہے۔“ اس نے بریانی پلٹ میں نکالتے ہوئے کہا۔ شیردل اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔

”اب بنی ہے ثابت۔“ وہ مسکرایا۔ روشنائی نے

گردن موڑ کر اسے دیکھا اور کھل کر مسکرا دی۔ تو تو مگر افرے اسی بل ان کی تصویر کو کمرے میں قید کر لیا۔ ان دونوں کو خبر بھی نہ ہوئی۔

”اگلی ملاقات کی توقع کب رکھوں؟“ شیردل نے بریانی اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے پوچھا۔

”اگلی ملاقات کا اتنا انتظار کیوں ہے آپ کو؟ جبکہ یہ ملاقات تو ابھی جاری ہے۔“ اس نے بات اڑائی۔

”آپ بہت عجیب ہیں؟“ شیردل بے اختیار کہہ اٹھا۔

”کیوں؟ کیا میرے سر پر سنگ ہیں؟“ وہ بائیں ابرو اٹھا کر بظاہر سادہ لہجے میں بولی۔

”نہیں۔“ آئی مین ٹو سے دھڑ۔ ”وہ ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک لڑکی روشنائی کے پاس آکر اسے بیگم شہباز کا پیغام دینے لگی کہ وہ اسے اسٹیج پر بلا رہی ہیں۔ وہ شیردل سے معذرت کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی اور شیردل کی نظریں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔



وہ جس وقت تھکی ماندی اپنے کمرے میں آئی تھی تو وال کلاک ساڑھے بارہ بج رہا تھا۔ وہ سیدھی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ پانی فرصت میں اس نے تمام

میک اپ، زیور اور بھاری لباس سے پیچھا چھڑایا۔ سفید رنگ کے بالکل ڈھیلے ڈھالے کرتے اور ٹوڑ

پاسٹھاے میں ملبوس وہ کھلے بالوں کو تولیے میں لپیٹے جب باہر نکلی تو اس کے موبائل کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے موبائل فون کو اٹھا کر نمبر

چیک کیا۔ نمبر کو پڑھتے ہی اس کی صبح پیدائشی پر شکلیں پڑ گئیں۔ ”ڈسکسٹنگ“ اس نے جھلا کر فون ہی آف کر دیا۔

”میرا موبائل نمبر کہاں سے ملا؟“ وہ سوچنے لگی۔ ساتھ ساتھ تولیے سے بالوں کو آزاد بھی کیا۔

”تایا جان یا انا۔“ بے باسل۔ ”اس نے خود ہی اندازہ لگا لیا۔

”مجھے ان سے بات کرنا پڑے گی۔ دس اس ٹوچ۔“

اس کا موڈ بری طرح آف ہو چکا تھا۔ اس نے کوفت بھرے انداز میں بالوں کو سلجھایا اور تھکے ہوئے جسم کو بستر پر گر لیا۔ کچھ دیر پہلے والی خوشگوار رات ختم ہو چکی تھی۔ اب جانتے میں اب کچھ ایسا آچکا تھا جس نے اسے پھر سے ڈسٹرب کر دیا تھا۔

رات بے سکوئی میں گزری تھی لہذا صبح وہ دیر سے جاگی تھی۔ جس وقت فریش ہو کر نیچے آئی تھی بیگم شہباز کی وی لاؤنج میں کوئی نیوز چینل دیکھتی ہوئی ملیں۔ اسے دیکھ کر مسکرا میں۔

”آج بہت دیر تک سوئیں۔ تھک گئی تھیں؟ کل تم نے سب کچھ سنبھال جو رکھا تھا۔“ انہوں نے مسکرا کر محبت سے اسے دیکھا۔ وہ ان کے پاس جا کر صوفے پر سکرسٹ کر لیٹ گئی اور سران کی گود میں رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

”میری سسرالی خواتین کہہ رہی تھیں کہ روشنائی نے بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ روشنائی میرا بیٹا ہی ہے۔ سب تمہاری کل بہت تعریفیں کر رہے تھے۔“ وہ اس کے گھنیرے بالوں میں انگلیاں چلاتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔

”تایا جان چلے گئے؟“ اس نے پوچھا۔

”کب کے اب تو ان کی ریٹائرمنٹ بھی قریب ہے۔ بس چند ماہ ہی رہ گئے ہیں۔ ارے۔ تم نے تو ناشتا بھی نہیں کیا ہو گا۔“ عبدل۔ ”انہیں باتوں کے دوران خیال آیا تو انہوں نے ملازم کو آواز لگائی۔

”جی بیگم صاحبہ؟“ بوتل کے جن کی طرح عبدل حاضر ہوا۔

”روشنائی کے لیے ناشتے آؤ اور فیملی بل کی کو بھی جگاؤ۔“ انہوں نے آرڈر دیا۔ عبدل چلا گیا۔

”تایا جان ریٹائرمنٹ کے بعد کیا کریں گے انا؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ مکان تو آرمی والوں کی ملکیت ہے۔ انہیں رہنا پڑے گا۔“ اس نے ان کا چہرہ دیکھا۔

”تمہارے تایا اور میں نے سوچا ہے کہ اسی دوران

فیملی کی شادی کر دی جائے۔ ایک ہی تو سال رہ گیا ہے۔ شادی کے بعد وہ فاسٹل کر کے ہاؤس جاب کر لے۔ اسد اور اس کے پیرنس سے ہم نے بات کر لی تھی۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں۔“ انہوں نے بتایا۔

”ڈشس گریٹ۔ چلیں اچھا ہے۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور ریہوٹ لے کر چینل بدلنے لگی۔

”پھر ہم نے تمہاری بھی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا ہے۔ اس فرض کو بھی تو نبھانا ہے نا۔ تمہاری بھی شادی فیملی کے ساتھ کر کے ہم دونوں بے فکر ہو کر اپنے گاؤں والی حویلی چلے جائیں گے۔ بس باقی کے دن وہیں اطمینان سے گزارنا چاہتے ہیں۔“ وہ آہستہ آہستہ مطلب کی بات پر آ رہی تھیں۔

”میرا انٹرویو آ رہا ہے انا۔ لیکن پرانا ہے۔“ اس نے ایک غیر ملکی چینل پر خود کو دیکھا تو یونگ روک دی۔

”ماشاء اللہ تم نے اتنی چھوٹی عمر میں جو مقام پایا ہے وہ بہت ہی کم لوگوں کا نصیب ہوتا ہے۔“ بیگم شہباز نے متا بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پھر لی وی اسکرین پر نظریں جمادیں۔

”تمہارے تایا اور میں چاہتے ہیں کہ اب تم بھی شادی کر لو۔“ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگیں۔

”بیٹیاں بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہیں اور اپنے گھروں میں آباد ہی اچھی لگتی ہیں۔ تم اپنے کیریئر کی پیک پر ہو۔ اشارتک میں نہیں۔ اب تمہارے پاس کوئی ہمانہ نہیں ہے۔ جو یو یو زل تمہارے لیے پچھلے سال آئے تھے وہ اب بھی تمہارے منتظر ہیں۔ تم نے پچھلی بار انکار کر دیا تھا اب مت کرنا۔ دونوں گھرانے بہت اچھے ہیں۔ ہمارے دیکھے بھالے لوگ ہیں۔“ وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔ یہ سب وہ باتیں تھیں جو وہ پچھلے دو سالوں سے اس سے کر رہی تھیں۔ الفاظ تبدیل ہو جاتے تھے انداز بدلتا رہتا تھا ”وقفہ“ کم زیادہ ہوتا رہتا تھا مگر عادی رہتا تھا۔

”میں نے ابھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا۔“ اس نے چینل بدل دیا۔



”تو اب سوچو۔ اگر تمہیں کوئی پسند ہے تو۔“  
انہوں نے پوچھنا چاہا۔  
”نہیں مجھے کوئی پسند نہیں ہے۔“ اس نے تیزی سے ان کی بات کاٹی۔  
”ماضی کے زخموں سے کھرنڈ نوچتی رہتی ہو؟“ انہیں بھرنے نہیں دیتیں۔ جو ہو کر گزر گیا اسے کیوں تھامے ہوئے ہو؟ جانے دو۔“ وہ اس کا ہاتھ نرمی سے اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولیں۔

”بہت کوشش کرتی ہوں انا۔ اسی لیے خود کو اتنا مصروف رکھا ہوا ہے۔ چوبیس میں سے بیس گھنٹے کام کرتی ہوں۔ اگر نہ کروں تو دماغ کی رگیں پھٹ جائیں۔ مگر جب بھی تمہاری ملتی ہے تو۔“ وہ لب کانٹے لگی۔

”تمہارا دکھ مجھے جیتے جی مارتا ہے روشنی۔ خدا کی قسم تم مجھے نینال سے زیادہ عزیز ہو۔ مگر۔“ وہ یکدم ہی روئے لگیں۔

”فار گاڈ سیک انا۔ یہ مت کریں مجھے تکلیف ہوتی ہے۔“ اس نے ان کے گالوں پر پھسلنے والے موتیوں کو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کر لیا۔  
”آپ کی محبت پر مجھے کوئی شک نہیں ہے۔ آپ تو میری ماں ہیں۔“ وہ محبت سے بولی۔

”تو کیوں اپنی ماں کی بات نہیں مان لیتیں؟ شادی کر لو روشنائی۔ زندگی میں تبدیلی آئے گی تو ماضی کے کانٹے نہیں چبھیں گے۔ دھیان بٹ جائے گا۔ جو حل تم نے نکالا ہے وہ حل نہیں ہے روشنی ہے تمہاری۔ تمہارے اپنے ساتھ۔ آج جوان ہو تو اتنا کام کر لیتی ہو جب بڑھاپا آئے گا تب کیا کرو گی؟ جتنا کام آج کر سکتی ہو کل اتنا نہیں کر پاؤ گی۔ انسانی جسم کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ تم فطری تقاضوں کو ختم نہیں کر سکتیں۔ صرف کسی حد تک روک سکتی ہو۔ زندگی یہی کچھ سکھاتی ہے بیٹا کہ ماضی پر رونے کے بجائے حال کو بہتر بنایا جائے۔ کیا خبر۔ شادی کر لینے سے تم ماضی کے عذابوں سے بچ سکتے ہو۔“ انہوں نے سمجھایا اور کافی دیر تک سمجھاتی رہیں۔ ان کی باتوں

میں لوجک تھی اور کچھ سچی خیر خواہی اور اچھی نیت۔  
بھی کارکردگی میں تیزی پیدا کر دی تھی۔  
”میں سوچوں گی۔“ اس نے صرف ایک جملہ کہلا عبدل ناشتا وہیں لے آیا تھا۔ نینال کا ابھی اور سوئے کا ارادہ تھا۔ وہ ناشتا کرتے ہوئے گرمی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔



”مالی گڈ نیس۔۔۔ اوسم۔۔۔ یہ دیکھو اگر کسی آرٹ گیلری میں رکھوا دی جائے تو سب بس اسی کو دیکھیں۔“ نینال منگنی کی وہ تصویریں دیکھ رہی تھی جو اسد نے کاپی کر کر اسے بھجوائی تھیں۔  
”دکھاؤ۔“ روشنائی نے اشتیاق کے ساتھ اس کے ہاتھ سے تصویر لے لی۔

”گڈ گاڈ۔“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔  
تصویر میں وہ اور شیردل قریب قریب کھڑے تھے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب دونوں کھانے کی میز کے پاس کھڑے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پلیٹیں تھیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ تصویر میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بے حد ہم آہنگ نظر آ رہے تھے۔ روشنائی کی لپ اسٹک اور جوڑے میں موجود پریل فلر شیردل کی شرٹ اور کوٹ میں لگے رومال کے رنگ سے (جو کہ گلاب کی طرح سے لگ رہا تھا) اس قدر ہم آہنگ تھے کہ جیسے دونوں نے باقاعدہ طور پر مشورے کے بعد یہ میچنگ کی ہو۔ دونوں اس قدر مکمل اور خوب صورت لگ رہے تھے جیسے ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہوں۔

”اچھی ہے۔“ اس نے تصویر نیچے رکھتے ہوئے دوسری تصویروں کو دیکھنا شروع کر دیا۔  
”صرف اچھی۔“ وہ چلائی۔

”اور ہاں۔ اس رات تو شیردل بڑا پیچھے پیچھے تھے محترمہ کے۔“ اس نے مشکوک نظروں سے روشنائی کو دیکھا۔

”تمہیں کیا پتا؟ تم تو دلہن بنی بیٹھی تھیں؟“ وہ

مسکرائی۔  
”ہاں۔ مگر دلہن بننے کے بعد انسان اندھا یا کانٹا نہیں ہو جاتا۔ میرے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے یہ بات نوٹ کی ہے محترمہ۔“ اس نے روشنائی کو جاکر لیا۔  
”چکر کیا ہے؟“ وہ اس کے سر ہو گئی۔

”کوئی چکر نہیں ہے وہ اس رات تمہارے سر ہاں مہمانوں میں سے تھا، میں دوسرے مہمانوں کی طرح اسے بھی ڈیل کر رہی تھی۔ اب دیکھنے والوں کی نظریں اور سوچنے والوں کے دماغ تو میں اپنے بس میں نہیں کر سکتی تا اور تم یہ فضول باتیں چھوڑو۔ جانتی ہو انا کہہ رہی تھیں کہ تمہاری شادی بھی جلدی کر دیں گے۔ خوش ہو جاؤ تم۔“ اس نے بات بدلی۔

”روشنی! تم بھی اس بار کسی پر ”وکٹری“ کا نشان بننا ہی دو یا ر! کتنا مزہ آئے گا۔ سوچو۔ میرے بھی دل کے اربابان پورے ہو جائیں گے۔“ وہ منہ بسور کر بولی۔  
”تم لوگوں کو اس ایک موضوع کے سوا کچھ اور سوچنا ہی نہیں۔“ وہ سچ سچ جھنجھلا گئی۔

”میری جان! زندگی کا اہم ترین موضوع ہی یہ ہے۔ اگر یہ موضوع نہ ہو تو سچو دنیا ”ترقی“ کیسے کرے۔“ وہ مسخرے پن سے بولی اور انتہائی جھلاہٹ کے باوجود روشنائی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس نے اہم اٹھا کر اسے دے مارا۔



کتنی دیر سے وہ اس تصویر کو بغیر پلکیں جھپکے دیکھے جا رہا تھا۔ روشنائی کا سائیڈ پوز تھا۔ اس کے رخسار کا ڈھیل اس کی مسکراہٹ سے نمایاں ہو رہا تھا۔ شیردل کا قد اس سے لمبا تھا۔ وہ اپنے لائے قد کے باوجود اس کے سینے تک پہنچ رہی تھی۔ وہ اسے آنکھیں اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔ صراحتی وار گردن ذرا سی انخمی ہوئی تھی۔ دونوں مرمرس ہاتھوں میں سفید رنگ کی پلیٹ تھائی ہوئی تھی۔ پریل شیڈ کی لپ اسٹک سے سجے لب اوہ کھلے تھے اور سفید موتی ایسے دانت نظر آ رہے تھے۔

آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ مسکراہٹ سے بو جھل پلکیں اور زیادہ نمایاں اور خوب صورت ہو رہی تھیں۔ وہ جیسے اس کے سحر میں گرفتار سا ہوتا چلا جا رہا تھا۔  
”وہ فہم نہیں ہے۔۔۔“ اسد نے مووی پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس کی محبت توڑی۔  
”کون؟“ وہ چونکا اور اس کی طرف دیکھا۔ ڈی وی ڈی پلیئر پر منگنی کی مووی لگی ہوئی تھی۔  
”ڈاکٹر فہم۔۔۔“ اس نے کہتے ہوئے ٹی وی کا الیوم کم کیا۔

”ہوں۔۔۔ وہ مجرد ڈاکٹر فہم کی بات کر رہے ہو؟ وہ تو تمہارا شاید دور کا کوئی کزن وغیرہ لگتا ہے نا؟“ وہ دوبارہ تصویر پر نظریں جمایا تھا۔  
”ہوں۔ اس کا پرنسپل روشنائی کے لیے آیا ہے۔“ اس نے سر سری سا بتایا۔

”اچھا“ شیردل چونکا اس نے ٹی وی اسکرین پر محرک لوگوں کے درمیان چلتی پھرتی روشنائی کو دیکھا۔

”پھر کیا بنا؟“ وہ دلچسپی سے پوچھنے لگا۔  
”پتا نہیں۔ مجھے تو نینال نے بتایا تھا کل فون پر روشنائی کے لیے پہلے بھی کافی رشتے آئے ہیں مگر وہ کہیں بھی باہی نہیں بھر رہی۔ فہم کے لیے بھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کہیں اور انوالو ہے؟“ نینال نے کیوں اس نے پوچھ لیا۔

”نینال کے بقول تو بالکل بھی نہیں۔ بس شاید وہ ابھی کچھ ڈسائیڈ نہیں کر پا رہی ہے۔“ اسد نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

”ہمارا پل کیسا رہے گا؟“ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے ہم پھوڑا۔

”واٹ؟“ اسد اچھل پڑا۔  
”کیا کا تم نے؟“ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

”میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ سکون سے بولا۔



”تم سنجیدہ ہو؟“ اسد نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ شادی کے نام سے بدکنے والا آج خود اپنے منہ سے اپنی شادی کی بات کر رہا تھا۔

”موصوفہ۔“ اس نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔ ”سوچ لو۔ یہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں ہے۔ تم ذرا رنگین مزاج ہو اور روشنائی کا مزاج الگ ہے، بلکہ اس کی ہسٹری بھی۔ کچھ ٹریجڈی ہے اس کی لائف میں بھی۔“ اسد نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

”میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔“ اسد کی بات کے جواب میں اس نے صرف یہی کہا تھا۔

”اوہ۔“ اسد نے گہری سانس لی۔ وہ جان چکا تھا کہ شیردل جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ اس کی بہت ساری لڑکیوں کے ساتھ دوستی تھی اور وہ دوستی میں ”حدود و قیود“ کی پابندی نہیں کرتا تھا مگر اس نے کبھی کسی لڑکی سے محبت کا دعوا نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی کو محبت کا فریب دیا تھا۔ وہ بہت کھلے عام سب کرتا تھا۔ اسد سے اس کی دوستی بہت پرانی تھی۔ کینڈ کالج میں دونوں کا وقت اکٹھا گزرا تھا، پھر ٹرننگ کے وقت بھی دونوں ساتھ تھے۔ اس کے بعد دونوں مختلف جگہوں پر پوسٹڈ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مسلسل رابطے میں ہی تھے۔ وہ شیردل کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ وہ دھوکے باز اور جھوٹا نہیں تھا۔

”تو نیک کام میں دیر کیسی؟ تم انکل سے بات کرو۔ مجھ سے جتنا ہو سکا میں اس کیس میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“ اس نے پورے خلوص سے کہا۔ شیردل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسکرین پر روشنائی کا فلو زاپ دیکھ رہا تھا۔



شہباز اپنی اسٹڈی میں کسی فائل کے مطالعے میں ڈوبے ہوئے تھے جب وہ کافی کا کپ لیے اندر داخل ہوئی۔ آہٹ سن کر وہ جو کئے اور بانی فوکل گلاسز کے اوپر سے دیکھا۔ اسے دیکھ کر مسکرائے۔

”تم تک میرے احساسات کیسے پہنچ جاتے ہیں میں حیران ہو جاتا ہوں کبھی کبھی۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ ”مجھے کافی کی طلب ہو رہی تھی۔“ وہ بولے۔

”اور کافی حاضر۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”بڑی ہیں؟“ اس نے کپ ان کے قریب رکھی تپائی پر رکھ دیا۔

”کچھ خاص نہیں۔ تم کیا کر رہی تھیں؟“ انہوں نے فائل بند کر دی۔

”کچھ خاص نہیں۔“ اس نے انہی کے انداز میں جواب دیا اور ان کے قریب رکھی کر سی پر بیٹھ گئی۔

”سوچا آپ کے لیے کافی بنا دوں اور کچھ کپ شپ بھی لگالوں، پھر نجانے کتنے عرصے بعد اس طرح سے ملنا اور بیٹھنا نصیب ہو؟“ وہ بولی اور دائیں ہاتھ کی شادیت کی انگلی میں پڑے واٹ گولڈ کے چھلے سے کھیلنے لگی۔

”ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔ تم نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے بڑی محنت کی ہے ورنہ میں کہتا کہ چھوڑ دو جواب اور ہمارے پاس ہی آجاؤ۔ مگر یہ خود غرضی ہو گی۔“

انہوں نے بانی فوکل گلاسز اتارتے ہوئے کہا۔ وہ چپ رہی۔

”تمہاری انا نے تم سے کچھ بات کی؟“ انہوں نے مطلوبہ موضوع چھیڑ دیا۔ وہ تجاہل برت گئی۔

”بہت باتیں کرتی ہیں وہ تو۔“ وہ ہنسی۔

”تمہاری شادی سے متعلق۔“ انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ چپ رہی۔

”تمہارے لیے بہت ہی اچھے پروپوزلز موجود ہیں روشنی۔ اتنے اچھے رشتوں کو ٹھکراتا بھی کفران نعمت ہے۔ آج ایک اور رشتہ آگیا ہے۔“ وہ ذرا سار کے روشنائی خاموش بیٹھی رنگ سے کھیلتی رہی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

”شیردل کو پہچانتی ہو؟ اسد کا دوست ہے، اس کا باپ میرا بھی بہت اچھا دوست ہے۔ بہت اچھی فیملی ہے۔ میں جانتا ہوں۔“ انہوں نے زیادہ تمہید باندھنی مناسب نہ سمجھی۔ یوں بھی وہ زیادہ تمہید پر یقین نہیں

کرتے تھے۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم واپس جانے سے پہلے کوئی فیصلہ کر لو۔ ورنہ تمہارے جانے میں ابھی کتنے دن باقی ہیں؟“ وہ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”صرف چھ روز۔“ اس نے جواب دیا۔

”روشنائی! تم جانے سے پہلے کوئی فیصلہ کر لو۔ میں تمہارے لیے بہت فکر مند رہتا ہوں بیٹے۔“ وہ کہہ رہے تھے اور روشنائی جانتی تھی کہ وہ غلط نہیں کہہ رہے۔

”ذاتی طور پر مجھے فائدہ بہت پسند ہے۔ مختصر فیملی، برائٹ فیوچر اور خاصا سنجیدہ مزاج بھی۔ شیردل بھی اچھا لڑکا ہے، مگر میرے خیال میں اس کا اور تمہارا مزاج نہیں ملتا۔“ وہ پرسوج انداز میں کہہ رہے تھے۔

”باقی دونوں پروپوزل بھی اچھے ہیں اور خاص وقت سے تمہارے جواب کے منتظر بھی۔“ وہ کہتے رکھے۔

انہیں یکدم احساس ہوا کہ روشنائی کا دھیان ان کی باتوں پر نہیں ہے۔

”تایا جان! ان کی کال آئی تھی میرے موبائل پر۔“ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو مسلتے ہوئے کہا۔ شہباز نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ انہیں اس کی بے چینی کا سبب پتا چل گیا تھا۔ انہوں نے کوئی سوال منہ سے نہیں کیا۔ ان کا سوال ان کی آنکھوں میں تھا۔

”میں نے فون آف کر دیا تھا۔ پھر اس نمبر کو فون پر بلا کر دیا۔“ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

”آپ نے انہیں میرا نمبر کیوں دیا؟“ اب کی بار اس کے لہجے میں اور آنکھوں میں شکایت تھی۔

”وہ تمہارا۔“ انہوں نے کہنا چاہا۔

”میں جانتی ہوں۔ وہ کون ہیں۔“ اس نے درشتی سے ان کی بات کاٹی۔ کرب کی ایک شدید لہر اس کے دل سے اٹھی اور اس کے وجود کو پیٹ میں لے لیا۔

”میری ماں کے قاتل ہیں وہ۔۔۔ بس یہی ایک پہچان رہ گئی ہے۔ یہی ایک تعلق۔ ایک رشتہ وہ گیا ہے۔ بانی سب برسوں پہلے ختم ہو گیا تھا۔“ اس کے

ہونٹوں سے لفظ نہیں تیر نکل رہے تھے۔ زہر میں بجھے ہوئے تیر شہباز چپ سے ہو گئے۔

”وہ تم سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔“ شہباز نے چند لمحوں بعد دھیرے سے کہا۔

”معافی اس شخص کو کبھی نہیں ملے گی تایا جان۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”روشنی۔“ انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔

”میری ماں نے حد حسین تھیں۔ تایا جان! جب وہ ہنسی تھیں تو مجھے لگتا تھا کہ پوری دنیا ساری کائنات جگمگا اٹھی ہے۔ مجھے ان کی ہنسی سے زیادہ کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ مجھے اس چہرے سے زیادہ خوب صورت کچھ بھی نہیں لگتا تھا۔ آپ کو پتا ہے۔ جب وہ سو جاتی تھیں یا نماز پڑھ رہی ہوتی تو میں جیکے جیکے ان کا چہرہ دیکھتی رہتی تھی۔ ایسا چہرہ۔ جیسے دیکھ کر دل ہی نہ بھرے اس شخص نے لمحوں میں چٹکیوں میں منوں مٹی تلے دیا۔“

اس کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی۔ شہباز نے بہت دنوں بعد اس کی یہ کیفیت پھر سے دیکھی تھی۔

”جو اس نے کیا وہ بہت ہی غلط تھا۔ مگر جو صوفیہ نے کیا وہ بھی غلط تھا۔ یا مین اس کا قاتل نہیں۔“

انہوں نے کہنا چاہا مگر روشنائی نے ان کی بات کاٹ دی۔ بہت بے دردی سے بہت غصے سے بہت تکلیف دہ انداز سے۔

”بے قاتل ہے۔ تایا جان! وہ ہم ماں بیٹی کا قاتل ہے۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں شہباز نے بمشکل اپنی آنکھوں کی کمی کو اندر دھکیلا۔ وہ کچھ لمحے خاموش رہی۔

”تمہاری ان وحشتوں کا علاج شادی ہے بیٹا۔ دو سرا کوئی حل مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔“ انہوں نے کچھ دیر بعد کہا۔

”سوچوں گی تایا جان۔ اور پرامس اس بار کوئی فائل جواب دے ہی دوں گی آپ بس اس شخص کو منع کر دیں کہ وہ میرا نام بھی اپنی زبان پر نہ لائے۔ میرا



اس سے کوئی واسطہ نہیں۔" وہ جیسے تھک کر بولی اس کے بعد وہ وہاں رکی نہیں۔ تیزی سے اٹھ کر اسٹڈی سے باہر نکل گئی۔ شہباز نے اپنی آنکھوں میں آنی نمی کو انگلیوں کی پوروں سے وہیں جذب کر لیا۔

\*\*\*

وہ بیگم شہباز کو جتا کر کلب آگئی تھی۔ کلب میں زندگی کے ہنگامے زوروں پر تھے۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ کر لوگوں کو دیکھنے لگی۔ کلب میں الگ ہی دنیا آباد تھی۔ وہ جوس کا گلاس ہاتھ میں لیے جب چپ یوں سب کو دیکھ رہی تھی، جیسے لی دی پر کوئی قلم چل رہی ہو۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے اب واپس چلے جانا چاہیے۔ فرصت و فراغت کے لمحے اسے اس نہیں تھے۔ وہ فراغت و فرصت کے لمحوں میں درد کے اس دریا میں ڈوبنے لگتی تھی کہ اس کی سانسیں بند ہونے لگتی تھیں۔

"ہیلو۔" شیردل کی آواز پر وہ بری طرح چونکی وہ بیک جینز اور گرے فگر کی ٹی شرٹ میں نکھر نکھر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے تو وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتی ہی رہی۔ وہ بہت ہی گہری سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس قدر کہ شیردل کی اچانک آمد نے اس کے ذہن کو جھٹکادیا تھا اور چند لمحے تو اسے نارمل ہونے میں لگے تھے۔

"آریو آل رائٹ؟" شیردل کے لمبے میں تشویش تھی۔ آج اس لمحے وہ اسے بہت بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ "ہی۔۔۔ آئی ایم" اب وہ پوری طرح سے خود پر قابو پا چکی تھی۔ شیردل نے اس کی آنکھوں میں عجیب سا خالی پن دیکھا تھا۔ "لہکسکیوزی۔" وہ جوس کا گلاس لے کر وہاں سے اٹھ گئی۔ گلاس میں جوس جوں کا توں تھا۔ وہ صرف ہاتھ میں لے کر بیٹھی تھی۔ وہ تبولہ کھیل رہا تھا جب اچانک ہی اپنے کسی دوست سے باتیں کرتے کرتے اس کی نظر روشنائے پر ریزی تھی۔ وہ ایک طرف جوس کا گلاس لیے بیٹھی تھی۔ سی گرین فگر کے لباس میں ملبوس چپ چاپ کھوئی

کھوئی سی۔ پہلی نظر ڈالنے پر اس پر کسی مجھے کا گمان ہوتا تھا۔ وہ سارے ہنگاموں سے ہٹ کر ایسی جگہ بیٹھی تھی جہاں روشنی قدرے مدہم تھی اور یہ گوشہ تقریباً خالی تھا۔ شیردل کو اس کی آنکھوں میں کچھ غیر معمولی لگا تھا۔ وہ خود کو روک نہیں پایا اور اس کے پاس چلا آیا۔

"روشنائے! آپ ڈسٹرب لگ رہی ہیں۔ اپنی پراہم وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

"میں کچھ دیر اکیلے رہنا چاہتی ہوں شیردل، پلیز۔" وہ بدلتی سی بولی شیردل کو اس کا لہجہ ہی نہیں اس کا چہرہ بھی برف کی طرح لگا تھا۔ سخت اور ٹھنڈا۔

"اوکے" کہہ کر وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ اب وہ کاؤنٹر کے پاس رکھے ایک خالی اسٹول پر براجمان تھی۔ وہ گرد و پیش سے بے نیاز نظر آرہی تھی۔ جوس کا گلاس اب بھی ویسے ہی اس کے سامنے دھرا ہوا تھا۔ شیردل کی نگاہیں مسلسل اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ وہ مسلسل اس کو ہی سوچ رہا تھا۔ ایسا کیا ہو گیا کہ وہ اتنی ڈسٹرب ہے؟ یہ سوال وہ اپنے آپ سے بہت بار دہرا چکا تھا۔ پھر اس نے فیصلہ سے مدد لینے کا فیصلہ کر لیا۔

\*\*\*

"تم تو ایک ہفتے بعد جانے والی تھیں۔ کیا ہو گیا؟" سب کا اس کی صورت دیکھ رہے تھے۔ "بس وہاں آفس میں کچھ ایمر جنسی ہو گئی ہے، اسی لیے جلدی بلایا ہے۔" سلمان کی پینک کرتے کرتے وہ ان سب سے نظر جھرا کر بولی۔

"کیا فائدہ چھٹیاں لینے کا؟ وہاں تمہارے علاوہ بھی اور آفیسرز ہیں۔ سارا یونیورسٹی تمہارے دم سے ہی تو چل رہا ہے۔" فیصلہ کا موڈ سخت آف تھا۔

"اب کیا کہہ سکتی ہوں۔" وہ زبردستی مسکرائی "اور وہ جو رشتے آئے ہیں ان کو کیا جواب دوں؟" بیگم شہباز نے خفگی سے پوچھا۔

"آپ کو جو ٹھیک لگے وہ کیجیے مگر آپ ایک بات

ان سے کہہ دیجیے گا، جس کو بھی ہاں کریں گی۔ کہ شادی کے بعد میں جاب چھوڑ دوں گی۔" اس نے بغیر اس کے اعلان کیا۔ اس کی اس بات پر متیوں ہی چونکے۔ "مگر بیٹا! اپنے کیریئر کے اس موڑ پر تم جاب چھوڑ دو گی؟ یہ احقانہ فیصلہ ہے۔" شہباز نے اس کی بات کاٹی۔

"تایا جان! میں فی الحال جاب نہیں چھوڑ رہی ہوں، یہ فیصلہ میں نے سوچ سمجھ کر ہی کیا ہے۔ آپ ان سب کو یہ بات بلکہ یہ میسج پنچا دیں ان لوگوں کا جو بھی جواب ہو آپ مجھے بتا دیجیے گا اور ان میں سے جسے آپ میرے لیے چنیں گے، وہی مجھے قبول ہو گا۔ مگر فیصلہ کرنے سے پہلے آپ لوگ میرا یہ میسج ان تک پہنچا دیجیے گا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیجیے گا کہ میری نہ ہی کوئی جائیداد ہے اور نہ ہی لمبا چوڑا بینک بیلنس۔ جو سے وہ یہی محتوا ہے اور بس۔" اس نے متانت و سنجیدگی سے کہا ان لوگوں کو اس کی یہ بات یا یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس نے راتوں رات اپنی نکت بک کرائی تھی اور آج رات کو اس کی فلاٹ تھی اور صبح اس نے ان سب کو مطلع کیا تھا۔

"تم بہت عجیب ہوتی جا رہی ہو۔" فیصلہ نے تنہائی میں اس سے کہا۔

"دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ عجیب لوگ موجود ہیں فیصلہ۔" وہ مبہم مسکرائی۔ "کم از کم شیردل سے تو مل کر جاؤ۔" وہ بولی۔

"کیوں؟ اس سے کیوں مل کر جاؤں؟" اس نے تنک کر پوچھا۔

"مرتا ہے وہ تم پر اور تمہارے خیرے ہی ختم نہیں ہوتے۔" فیصلہ نے خفگی سے کہا۔

"میرے علاوہ بھی بہت سوں پر مرتا ہے۔ ذہن نشین کر لو۔"

"وہ لڑکیوں کے پیچھے نہیں جاتا ہے لڑکیاں خود اس کے پیچھے مرتی ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ اور وہ بے چارہ ان لڑکیوں کا دل نہیں توڑتا چاہتا۔۔۔ ہے نا؟" روشنائے نے درمیان میں ہی

اس کی بات کاٹی اور ٹکڑا جوڑا۔

"میں نے گھاس نہیں ڈالی اور نہ ہی اس کی ڈالی ہوئی گھاس کھائی" اس لیے وہ رشتہ لے کر آیا۔ وہ طنزیہ انداز میں بولی "کہ بیوی تو پاؤں کی جوتی ہوتی ہے، شادی ہو گئی تو پھر کر بھی کیا سکتی ہے؟" وہ اس کے بارے میں بے حد برے گمان رکھتی تھی۔ فیصلہ حیران سی اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ "اسے کوئی محبت و جت نہیں ہوتی ہے، صرف بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اس کی مردانہ انا کو چوٹ جو پہنچی ہے۔" اس کی زبان زہر اگل رہی تھی۔

"وہ ایسا نہیں ہے روشنائے وہ یہاں رہتا ہے، ہم اسے برسوں سے جانتے ہیں، اسد اس کا بچپن کا دوست ہے۔ تمہارے لیے جب اس کا رشتہ آیا تھا تب میری اسد سے بہت تفصیلاً بات چیت ہوئی تھی شیردل کے بارے میں۔" فیصلہ نے لاشعوری طور پر شیردل کا دفاع کرنا چاہا۔

"فیصلہ! تم بہت معصوم ہو۔ تم نے اپنے ارد گرد کی لگی بندھی دنیا کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ میں آدھی سے زیادہ دنیا گھوم چکی ہوں۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی ہیں میری۔ یہ جو شیردل کے بارے میں میرے انکشافات ہیں نا۔۔۔ یہ یونہی نہیں ہیں۔" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

"تم پہلے ہی سے ذہن بنا لو گی تو کیسے اس کی اچھائیوں کو قبول کرو گی؟ گنجائش رکھ کر سوچو گی تو بات بنے گی۔ تم اس کے بارے میں اس قدر نیگٹو مت ہو۔" فیصلہ نے اسے سمجھایا۔ شاید وہ خود بھی چاہتی تھی کہ اس کی شادی شیردل سے ہو۔ وہ اسے ذاتی طور پر پسند تھا اور اس منگنی والی تصویر کو تو دیکھ کر وہ خدا ہی ہو گئی تھی۔ اس کے نزدیک یہ "پہل" بہترین تھا۔ وہ اسے سمجھا نہیں سکتی تھی کیونکہ فیصلہ کی شیردل کے لیے پسندیدگی سے وہ واقف تھی۔

"اچھا اچھا۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ تایا جان اور انا کس کے نام کی پرچی نکالتے ہیں۔" اس نے اس لا حاصل بحث کو سمیٹا۔ فیصلہ نے



روشانے کی باتیں ”سنس“ کر کے شیردل تک پہنچائی تھیں۔ جب سے استغنی والی بات پر وہ قدرے اطمینان سے بولا تھا۔

”اگر وہ یہ نہ بھی کہتی تو میں خود اس سے کہہ دیتا کہ جب چھوڑ دے شادی کے بعد مجھے اس کی ضرورت ہے، اس کے کماے ہوئے ڈالرز اور بنائے ہوئے کانٹیکٹس کی نہیں۔“

”نینال کی اتنی ساری باتوں کے جواب میں وہ صرف اتنا ہی بولا تھا۔

”شیردل! کیا تمہیں اس کی خوب صورتی نے متاثر کیا تھا؟“ نینال نے پوچھا ”ہاں۔۔۔ وہ بلاشبہ بے حد خوب صورت ہے اتنی۔ کہ اس سے زیادہ حسین لڑکی میری نظروں سے آج تک نہیں گزری۔“ وہ بے حد وقار اور متانت سے بولا تھا، مگر اس کا انداز اور لہجہ ناقابل فہم تھا۔

شیردل کے حق میں دوٹ زیادہ تھے۔ سب سے زیادہ تو نینال پر زور تھی اور ماں باپ کو متاثر نہیں لگی ہوئی تھی۔ جبکہ بیگم شہباز اور شہباز کو فہم پسند تھا۔ مگر روشن نے کا پیغام بہر حال انہوں نے چاروں گھرانوں تک پہنچا دیا تھا۔ ان میں سے دو رشتے تو استغنی والی بات سن کر ہی واپس پلٹ گئے تھے۔ ان میں فہم والا رشتہ بھی تھا۔ جبکہ شیردل اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا تھا۔ دوسرا رشتہ بھی اچھا تھا۔ لڑکا بنک میں اچھی پوسٹ پر تھا اور اسی شہر میں تھا۔ مگر اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ زیادہ تھا۔ چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ لڑکے نے روشن نے کوئی وی میں دکھا تھا اور پسند کر بیٹھا تھا۔ کسی طرح اسے پتا چل گیا تھا کہ روشن نے لیفٹننٹ جنرل شہباز کی بیٹی ہے۔ وہ ان تک پہنچ گیا تھا۔ لڑکا سلجھا ہوا اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اسے روشن نے کے جواب چھوڑنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر بیگم شہباز اس رشتے پر راضی نہیں تھیں۔ چھ بہنوں کے اکیلے کماؤ بھائی پر ٹکس قدر بوجھ ہو گا۔ انہیں اچھی طرح اندازہ تھا۔ انہوں نے شہباز کے مشورے اور ہائی سے شیردل کا رشتہ قبول کر لیا۔ نینال کے تو پیر ہی زمین پر

نہیں ٹک رہے تھے۔ اس نے فوراً ہی روشن نے کو فون کھڑا کیا۔

”سارے کے سارے لاپچی نکلے اور وہ چھ بہنوں کے اکلوتے بھائی بھی اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ پریشا شیردل کے نام کی نکلی ہے۔ اب تم بھی جلدی جلدی ریزائن دے کر وطن آنے والی فلائٹ پکڑ لو۔“ یہ پر جوش انداز میں بول رہی تھی۔ روشن نے خلاف توقع بے حد خاموشی سے اس کی ساری باتیں سن رہی تھی۔ ”شیردل نے کچھ اور تو نہیں کہا؟“ بہت لمبی سی بات کے بعد اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔

”جناب! اب تو وہ آپ سے ملنے کے بعد ہی کہیں گے سنیں گے۔“ وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ روشن نے کا سرد انداز اسے محسوس ہی نہیں ہوا۔ ”تم مجھے شیردل کا نمبر دے۔ مجھے اس سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔ جواب میں نینال نے ایک خاصی طویل چھیڑ خالی کے بعد اسے شیردل کا موبائل نمبر اور گھر کا نمبر بھی دے دیا۔ فون بند کرنے کے بعد روشن نے وہیں کھڑی کچھ سوچے لگی وہ شش و پنج میں تھی۔

اس نے کافی سوچ و بچار کے بعد اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے موبائل نمبر پر کال کی تھی۔ کچھ دیر بیل بجتی رہی پھر دوسری طرف سے شیردل کی نیند میں بھری ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو مس جی کون؟“ اس کی بھاری مخمور آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”میں۔۔۔ روشن نے بول رہی ہوں۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے کہا۔ شیردل کی نیند بھک سے غائب ہو گئی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی یہاں آدھی رات ہو رہی تھی، امریکہ میں دن ہو گا۔ اس نے سوچا۔

”زہے نصیب۔۔۔ خوش قسمتی ہے ہماری جو آپ نے ہمیں یاد کیا۔ وہ بھی رات کے اس پہر جب خواب میں یا تو پریاں آتی ہیں یا بھوتنیاں۔۔۔ بے دواے آپ کو ہم کیا نام دیں؟“ وہ شوخ ہو گیا۔

”بھئی بھئی بھوتوں کے خوابوں میں بھی پریاں آجاتی ہیں۔“ وہ ہر جیسے بولی تو وہ کھل کر ہنس پڑا۔ بہت خوب صورت ہنسی تھی۔

”بہت خوب۔“

”آدھی رات کو بھی آپ کو ہنسی آجاتی ہے؟“ اس نے طنز لہجے میں پوچھا ”من چاہا سا لگی ہو پھر اپنا ہوتا مزاج خود بخود خوشگوار ہو جاتا ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”سوری۔ آپ کو نیند سے جگا دیا۔ مگر کیا کریں۔ ہماری ٹائمنگ ہی صحیح نہیں ہوتی۔“ اس نے خود کو قابو کرتے ہوئے نارمل انداز میں جواب دیا۔

”فکر مت کریں میں کچھ دن کی اور بات ہے پھر ہمارا وقت ایک ہو جائے گا۔“ وہ گنیمت لہجے میں بولا۔ روشن نے لہجہ بھر کو چپ سی ہو گئی۔

”کچھ کہیے نا۔“ وہ اس کی خاموشی پر بولا ”ویسے آپ نے فون کیسے کیا؟“ اسے دھیان آیا۔

”آپ تک ناپا جانے نے میری بات تو پہنچادی ہوگی؟“ اس نے قدرے وقفہ کے بعد پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”آپ مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ لوگ کسی نہ کسی وجہ سے کسی سے شادی کرتے ہیں۔ آپ کیوں کر رہے ہیں؟ جبکہ پاکستان میں ہزاروں لڑکیاں ہیں، آپ ان میں سے بہت سوں کو جانتے ہوں گے۔ بہت سی ایسی بھی ہوں گی جو آپ سے محبت کرتی ہوں گی پھر میرا انتخاب کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”ٹھیک کہا آپ نے۔۔۔ یہاں بہت لڑکیاں ہیں۔ ایک سے ایک حسین، مگر آپ جیسی نہیں ملی۔ ہزاروں ہیں مگر روشن نے جیسی کوئی نہیں۔“ وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بول رہا تھا۔

”بہت سی ہیں جو مجھ سے محبت کی دعوے دار ہیں۔ مگر شیردل روشن نے سے محبت کرتا ہے۔“

”بغیر جانے ہی محبت۔۔۔ یہ تو قوی نہیں؟ آپ جانتے ہی کیا ہیں میرے بارے میں؟ میری عمر کا بڑا

حصہ ہاسٹل اور فارن کنگز میں گزرا ہے۔ میں اب بھی دیار غیر میں ہی ہوں۔۔۔ مجھے جانے بغیر میرے بارے میں جانے بغیر۔ آپ نے اپنی زندگی کا فیصلہ کر ڈالا۔ یہ تو ام میچورٹی ہے۔“ وہ بہت سنجیدہ تھی۔

”اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو۔۔۔؟“ وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

”میں نے فیصلے کا اختیار اپنے تایا اور اٹا کو دے دیا تھا۔ یہ فیصلہ انہی کا ہے۔“ اس نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ”تو کیا آپ کا اپنا فیصلہ ان کے فیصلے میں شامل نہیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”یہ میرے فیصلے کا نتیجہ ہے کہ میں آپ سے فون پر بات کر رہی ہوں۔“ اس نے اسی سنجیدگی اور سادگی سے جواب دیا۔ بے ساختہ شیردل خان کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

”آپ خوش ہیں روشن نے؟“ وہ بستر پر نیم دراز ہوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”ہم نہیں۔“ بہت دھیمی سی آواز آئی تھی۔

”روشن نے! میں آپ کو شادی کے بعد اس سوال کا جواب دوں گا، جو آپ نے مجھ سے شروع میں کیا تھا۔“ شیردل بہت اطمینان سے بولا ”آپ اب ریزائن دے کر آجائیں۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔“ اس کا لہجہ گنیمت ہو گیا تھا۔

”شیر! اگر میں ریزائن نہ دوں تو۔۔۔؟“ روشن نے نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے پوچھا ”تو میں ریزائن دے کر آپ کے پاس چلا آؤں گا۔“ وہ ہنسا۔

”میں سنجیدہ ہوں۔“ وہ بولی۔

”یقین کر لیں کہ آپ مسکراتی ہوئی بھی حسین لگتی ہیں اور سنجیدگی میں بھی۔“ وہ پٹری سے اتر گیا تھا۔

”شیردل۔۔۔“ وہ زنج آکر بولی۔

”مگر آپ تو شادی کے بعد ریزائن کرنا چاہتی تھیں۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ مگر اب میرا ارادہ بدل گیا ہے۔ میں فی الحال ریزائن نہیں دے رہی۔“ وہ سرد لہجے میں بولی۔

”آپ اچھی طرح سوچ لیں۔“ وہ پھر بولی۔



کے ساتھ بولی۔ بہت مشکل سے اس نے اپنے لمبے لمبے گزرنے سے روکا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے“ میں بات کرتا ہوں۔ ”وہ ملن گئے۔ روشانی نے تھماتے ذہن کے ساتھ فون بند کر دیا۔ اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

وہ گہری نیند میں تھی کہ یکدم اس کے فون کی گھنٹی ایک قوت سے بجنا شروع ہو گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ اس نے سائیڈ لیپ آن کیا اور ریسٹ وائچ کو اٹھا کر وقت دیکھا۔ رات کے چار بج رہے تھے۔ اس نے سی ایل آئی پر نمبر دیکھا۔ آفس سے فون تھا۔ اس لیے ذہن نے ایمر جنسی کی گھنٹی بجانی شروع کر دی۔ فون ریسو کرتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑنا شروع ہو گیا تھا۔ فون بند کر کے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ لی وہی کے ریموٹ کو اٹھا کر بیوی آن کیا اور مختلف چینل کو ٹیون کرنے لگی۔ پھر ایک نیوز چینل پر آکر وہ رک گئی۔ اسکرین پر جو کچھ دکھایا جا رہا تھا وہ بے حد ہولناک تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ اس نے بستر چھوڑ دیا تھا۔ اسے ایئر بورٹ جانے کی تیاری کرنی تھی۔

نجانے اللہ کا تہرنا تھا یا پھر اس قوم پر آزمائش کی گھڑیاں آگئی تھیں۔ نہایت ہی خوفناک سیلاب تھا علاقوں میں ایسا ہی تہلکہ مچا تھا کہ ہر شخص جو اس کھو بیٹھا۔ وہ اپنی ٹیم کے ساتھ متاثرہ علاقے میں موجود تھی۔ پاکستانی فوج کے جوان بھی سرگرم نظر آ رہے تھے۔ ہزاروں افراد بے گھر ہو چکے تھے۔ عورتوں کے بین کرنے کی صدا میں، معصوم بچوں کے رونے کی آوازیں فضا کو قیامت خیز بنا رہی تھیں۔

اس کی ٹیم کے ممبران سمیت بہت سارے لوگوں نے تعجب سے اسے دیکھا تھا۔ وہ میڈیکل کیمپ میں ڈاکٹر اور نرسوں کی مدد کر رہی تھی۔

”آپ یہ سب نہیں کر سکیں گی۔“ آری ڈاکٹر نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

”میں ایم بی بی ایس ہوں۔“ اس نے ڈاکٹر کی بات کاٹی۔

”اوہ۔ مگر آپ تو یونیسیف۔“ ڈاکٹر نے تعجب

”میں آپ کو ہر صورت قبول کرنے کو تیار ہوں روشانی نے۔ میں کسی بھی قیمت پر آپ کو کھونا نہیں چاہتا۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

”سوچ لیں شیردل۔ میں بہت مشکل لڑکی ہوں۔“ روشانی کا لہجہ ہنوز تھا۔

”کل ہی نکاح کر لیں۔“ اس نے سوال چنا جواب گندم دیا۔ روشانی نے گہری سانس لیتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ شیردل کی گہری سوچ میں گم تھا۔



وہ واپس آکر بے حد مصروف ہو چکی تھی۔ اسی مصروفیت میں اسے وہ خبر ملی جس نے کچھ دیر کے لیے اس کے حواس منجمد کر دیے۔ ”اتنی جلدی۔ اتنی جلدی کیا ہے؟“ وہ ہڑبڑا گئی تھی۔ ”بھئی شیردل کی پوسٹنگ کی خبریں سننے کو مل رہی ہیں۔ اسے کاکول پوسٹنگ کیا جا رہا ہے اور اس کے گھر والے چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے اس کی شادی کر دی جائے۔ ہماری طرف سے تو ساری تیاری مکمل ہے۔ ان کی بھی تیاری ہوگی جیسی تو کہہ رہے ہیں۔ پھر تم نے بھی تو جاب چھوڑ دینی ہے پھر کیا ہوا؟“ شہباز پوچھنے لگے۔

”تایا جان! میں ذہنی طور پر اتنی جلدی شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

”میں زبان دے چکا ہوں روشانی۔“ شہباز نے جیسے کچھ محسوس کر لیا تھا۔

”جی۔ میں آپ کو کچھ سوچ کر بتاتی ہوں۔ ان کو کچھ انتظار کرنے کا کہیے۔ شادی تو کاکول میں بھی ہو سکتی ہے۔ کاکول کوئی پرستان میں تھوڑی ہے۔“ وہ جھلائی۔

”اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے۔ میں ان سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ ہفتہ دس دن بعد کی تاریخ رکھ دیں۔ مگر وہ نکاح کے لیے زور دے رہے ہیں۔“ انہوں نے نیا شوٹا چھوڑا ”تایا جان! نکاح کے لیے اب میں دو دن کی چھٹی لے کر نہیں آسکتی۔“ وہ نہایت برواشت

جواب نہ دیا۔ سب وہاں اپنے اپنے نقصان پر سر پکڑ کر رو رہے تھے۔ اس بچے کی فکر کرنے والا کون تھا۔ ”شیر دل“ روشانی نے اٹھ کر اس کے بازو پر اپنا نازک سنا ہاتھ رکھا۔ وہ چونکا۔

”اسے ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔“ اس نے اشارہ کیا۔ شیردل نے بچے کو گود میں اٹھائے اس کی تقلید کی۔ روشانی نے کیمپ (ڈسپنسری) میں جا کر بچے کے زخموں کو کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح چیک کرنا شروع کر دیا۔ ”کوئی سپرٹس انجری نہیں ہے۔ معمولی سی ٹریٹمنٹ سے ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اس کے زخم صاف کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ بچہ بہت رو رہا تھا۔ مجبوراً اسے اس کو نیند کا انجکشن لگانا پڑا۔

”تم ڈاکٹر بھی ہو؟“ بچے کے سوتے ہی اس نے پوچھا۔ بڑا بے ساختہ انداز تھا۔ سرعت سے کوئی لمحہ گزرا تھا جس نے تکلف۔ کو بے تکلفی میں بدلا تھا۔ ”ہاں۔“ وہ اطمینان سے بچے کے چہرے اور جسم پر سے مٹی اور خون صاف کر رہی تھی۔

”کچھ چھوڑا بھی ہے تم نے۔“ وہ مسکرایا۔ وہ چپ رہی۔

”کتنا پیارا بچہ ہے نا۔ نہ جانے کس کا ہو گا؟“ اس نے بہت پیار سے بچے کی طرف دیکھا۔ سرخی مائل سنہری بال جو اس کی گھنٹی سی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے گھلائی گھلائی سی سفید رنگت بہت قیمتی لگتی تھی۔ ”شکر ہے کوئی سیریس چوٹ نہیں لگی۔“

اس نے شیردل کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلادیا اور دونوں باہر چلے آئے۔ شام بھی گہری ہو رہی تھی۔ ابھی شام ہی تھی اور اندھیرا رات کا سماں پیدا کر رہا تھا۔ لمدادی کیمپوں کے کچھ ممبران رات کے کھانے مینے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ زیادہ تر لوگ جو ”صحیح“ حالت میں تھے وہ بھی فوجیوں اور کارکنوں کی مدد میں لگ گئے تھے۔ وہ بڑھال سی اپنے کیمپ میں جا کر لیٹ گئی۔ تھکن سے اس برا حال تھا۔ کب اس کی آنکھ لگی پتا ہی نہ چلا۔ بہت ہی گہری نیند سے شعور کی طرف سفر کرتے کرتے اسے لگا کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔ پہلے

سے پوچھنا چاہا۔ ”میں نے پریکٹس نہیں کی تھی۔ یونیسیف جوائن کر لیا تھا۔“ وہ غلٹ میں پھر اس کی بات کاٹ کر بولی تھی۔ مریض ٹولیوں کی شکل میں لائے جا رہے تھے اور ایسے کڑے وقت میں اسے ڈاکٹر کا انٹرویو لینا بہت کھل رہا تھا۔ وہ بے حد مصروف تھی۔ وہاں لمدادی کیمپس لگائے گئے تھے۔ جو لوگ ذرا حواسوں میں تھے اور معمولی زخمی تھے وہ بھی اپنی مدد آپ کے تحت کچھ نہ کچھ کرتے نظر آ رہے تھے۔

”روشانی۔“ شیردل کی آواز پر وہ چونکی۔ وہ تھک کر کچھ دیر کے لیے سستانے کو بیٹھی تھی۔ یوں بھی دن ڈھل چکا تھا شام کے اواس سائے پھیل رہے تھے۔ نیم روشنی میں فوجی یونیفارم میں شیردل اسے نظر آیا۔ اس نے پی کیپ نہیں پہنی تھی۔ وہ بہت ہینڈ سم مگر کچھ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ روشانی نے ایک بڑے سے چٹان نما پتھر پر بیٹھی ستا رہی تھی۔

”شیردل۔ آپ کس وقت آئے؟ آپ کے ساتھی تو کب سے یہاں ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہم لوگ پرسوں سے یہاں موجود ہیں۔“ وہ اس کے نزدیک والے بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ ”ہم دو دنوں اور ایک رات سے ادھر ہی تھے۔ اسی وقت میں ساڑھے تین سال کا بچہ جس کے بدن پر لباس کے نام پر صرف چھتھرے ہی رہ گئے تھے اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک انگلی منہ میں ڈالی ہوئی تھی۔ وہ زور زور سے رو رہا تھا۔ اس کی ناک اور ماتھے سے خون نکل رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں بھی زخمی تھیں۔ وہ دونوں چونکے۔ اس نے اٹھ کر بچے کو گود میں لینے کا ارادہ کیا تھا مگر اس سے پہلے ہی شیردل تیر کی طرح اٹھا اور بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ نہایت احتیاط کے ساتھ اور ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ذرا فاصلے پر کچھ لوگ زمین پر لٹے پڑے انداز میں سر پکڑ کر بیٹھے تھے۔

”یہ بچہ کس کا ہے؟“ وہ چلا کر پوچھ رہا تھا۔ کسی نے



اس کا ذہن جاگا اور پھر اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ یکدم ہڑبوا کر اٹھ بیٹھی۔

”ایزی ایزی۔۔۔“ شیردل کی آواز پر اس نے دائیں جانب دیکھا۔ وہ بہت گہری نیند سے جاگی تھی اور چونکہ نیند بھی خاصی بے سکون تھی اس لیے وہ خاصی ہڑبوائی ہوئی تھی۔

”تم کھانا کھائے بغیر سو گئی تھیں۔ سوری۔ میں نے تمہاری نیند خراب کر دی۔ مگر مجبوری تھی۔ اس بیابان میں اگر کھانا ختم ہو جاتا تو صبح کا انتظار کرنا پڑتا۔ کیونکہ میں اس پلیٹ کو کھلا نہیں رکھ سکتا تھا اور ڈھانپ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ یہاں رات کے وقت حشرات الارض وغیرہ نکلتے ہیں۔ لو کھانا کھاؤ۔“ وہ کچھ شرمندہ سا ہو کر وضاحت پیش کرنے لگا۔

”نہیں، کوئی بات نہیں کون سا روٹین ڈنر ہے۔“ اس نے نرمی سے کہا اور بھرے ہوئے بالوں کو ہلٹنے لگی۔ ”اس بچے نے کچھ کھایا؟ اب تک تو وہ جاگ بھی چکا ہو گا۔“ اسے یکدم خیال آیا۔

”ہاں وہ کافی دیر پہلے جاگ گیا تھا۔ میں نے اسے کھانا کھلا کر نیند کی دوا دے دی ہے تاکہ وہ رات بھر آرام سے سو سکے۔“ شیردل نے بتایا۔

”تھینک گاڈ۔“

”تم بہت نرم دل ہو۔“ وہ پہلی بار مسکرائی۔

”تم میری تعریف کر رہی ہو؟“ وہ مصنوعی حیرانگی سے بولا تو روشانی نے اسے گھورا۔ وہ ہولے سے ہنس پڑا۔ کھانے کھانے کے بعد وہ دونوں باہر نکل کر چہل قدمی کرنے لگے۔ ہوا بہت ٹھنڈی تھی۔ اس نے بے اختیار جھرجھری لی۔

”یہاں پر خاصی ٹھنڈ ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے بولی شیردل نے خود پسینی ہوئی سیالیدر کی جیکٹ اتار کر اس کے کندھوں پر ڈال دی۔

”ارے نہیں یہ میں نہیں لے سکتی۔ تمہیں بھی تو سردی لگ رہی ہو گی۔“ اس نے جیکٹ اتار لی چائی۔ ”اتنی نہیں لگ رہی، اس جیکٹ کی ضرورت نہیں زیادہ ہے۔ ہم فوجیوں کو ہر قسم کے موسم کا عادی

بنادیا جاتا ہے۔ موسم ہمیں کچھ نہیں کہتے۔“ وہ بولا۔

بے حد سناٹا تھا۔ شاید کبھی کبھی لوگ سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ کبھی کبھی کسی کی سسکی سنائے کو توڑ دیتی۔ کبھی کسی بچے کے رونے سے ماحول میں ارتعاش پیدا ہوتا۔ کبھی کسی کے کھانسنے سے ماحول کی یکسانیت ختم ہو جاتی۔

”زندگی بہت عجیب ہے۔ بہت دکھ دیتی ہے اور کچھ لوگوں کو اتنا سکھ کہ وہ غم، اندوہ، دکھ، تکلیف کے معنی تک سے نا آشنا ہوتے ہیں۔“ روشانی نے بہت ہولے سے کہا۔ ”ہمارے ملک میں اتنی غموت ہے کہ لوگ اپنی اولاد، اپنے ایمان تک کو بیچ ڈالتے ہیں۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے پیٹ کے لینڈ من کو بھرنے کے لیے اپنی اولادوں کے سودے کر دیے۔ کتنوں نے غیر مسلموں کے ہاتھوں اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر اپنے ایمان بیچ دیے اور مذہب ہی سے نکل گئے۔“ شیردل گہرے رہا تھا۔

”ہاں جب انسان اپنے مقام سے نیچے آتا ہے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ وہ تلخی سے بولی۔ کیسیوں میں گیس لیمپ روشن تھے اور ان کی ناکانی روشنی نے گھپ اندھیرے کو کسی حد تک کم کر دیا تھا۔ ”میرے خیال میں کیمپ میں چلتے ہیں۔ یہاں سانپ وغیرہ خاصی تعداد میں ہوتے ہیں اور آج کل تو بے چاروں کا ٹھکانہ بھی اجڑا ہوا ہے۔ میرے کیمپ میں تو میرے کچھ ساتھی ہیں۔ چلو تمہارے کیمپ میں چلتے ہیں۔“ اسے احساس ہوا کہ وہ کس قدر تھکا ہوا ہو گا۔ کتنی راتوں سے ٹھیک سے سویا نہیں ہو گا۔ یا شاید سویا ہی نہ ہو۔

”تم فوجیوں کی زندگی بہت ٹف ہوتی ہے۔“ اس نے کیمپ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”اگر ہمیں ٹف نہ بنایا جائے تو کس بات کے لیے فوجی کہلائیں؟“ وہ مسکرایا۔

”تم کچھ کہہ رہے تھے۔“ وہ دونوں بنادھیان دیے ایک دوسرے کو تم کہہ کر مخاطب کر رہے تھے اور دونوں کو اس بات کا احساس تک نہ ہوا تھا۔

ماہنامہ کرن 90

”کچھ اچھا موضوع نہیں تھا۔ یہی حال انڈیا کا بھی ہے۔ یعنی اور نجانے کن کن ممالک سے لوگ آکر ان معصوموں کو خرید کر لے جاتے ہیں۔“ وہ تاسف سے کہہ رہا تھا۔

”ہماری این جی اوز میں بھی کافی چیزیں چھپائی جاتی ہیں۔ سیاست وہاں بھی چلتی ہے۔ حقائق کو پوری طرح سے سامنے نہیں لایا جاتا ہے نہ ہی حقائق بنا اوقات اپنی اصل شکل میں سامنے لائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ پرنٹ میڈیا بھی ان کھلے حقائق کو شو کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ جو لکھنا چاہتا ہے اس کو یہ کہہ کر روک دیا جاتا ہے کہ جناب! یہ ہمارے ادارے کی پالیسی میں شامل نہیں ہے۔“ ریش۔۔۔ وہ غصے و جذبات سے سرخ ہو رہی تھی۔

”تم نے یہ ادارہ کیوں چنا؟ اور بھی تو فیلڈز تھیں؟“ شیردل نے پوچھا۔

”میں خود کو بہت زیادہ مصروف رکھنا چاہتی تھی، مجھے یہی فیلڈ بہتر لگی۔“ وہ بے حد اختصار سے بولی۔

”کیوں اتنا مصروف رہنا چاہتی ہو؟ تم اس قدر کام کرتی ہو یہ نارمل نہیں ہے۔“ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”تم شادی کے بعد سب کیسے مینج کر دگی؟“ شیر دل آہستگی سے بولا۔ وہ چپ چاپ اپنی کلائی میں بندھی گھڑی سے کھیلتی رہی۔

”تم خود سے بھاگ رہی ہو روشانی۔ یا پھر کسی اور چیز سے۔ اگر مناسب سمجھو تو مجھے بتاؤ۔ جب دل چاہے۔“ وہ دوستانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”میں کسی چیز سے نہیں بھاگ رہی۔ تم جا کر سو جاؤ۔ مجھے نیند آرہی ہے۔“ وہ بگڑ کر بولی۔

”نیند تمہیں آرہی ہے اور سونے کے لیے مجھے کہہ رہی ہو۔“ شیردل نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ بس خاموشی سے لیٹ گئی۔ شیر دل نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور باہر نکل گیا۔

”گڈ نائٹ۔“ اس نے جاتے جاتے کہا۔ روشانی نے سرورسا اٹھا کر دیکھا۔ وہ جاچکا تھا۔ اس نے تھک

ماہنامہ کرن 91

کر سر نیچے رکھ دیا۔ وہ اپنی نیند پوری کر چکی تھی۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ سر کے نیچے بازوؤں کا تکیہ بنائے کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔

صبح اسے کسی نے جگایا نہیں تھا۔ وہ کسلندی سے اٹھی مگر کچھ دیر یونہی پڑی رہی۔ رات کو نجانے کس پہر اس کی آنکھ کئی تھی۔ وہ ہڑبوا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ یہاں پکنک منانے نہیں آئی تھی بلکہ امدادی کیمپ لگانے آئی تھی۔ وہ جس وقت باہر آئی تھی تو چہل پہل تھی۔ فوجی اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے کارکنان اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے اس کو زخمی بچے کا خیال آیا تو وہ اس سے ملنے چل پڑی۔

”کہاں بھاگی چلی جا رہی ہیں؟“ اس کا ٹانہ ہاشیر دل سے بری طرح ٹکرایا تھا۔

”اؤ۔۔۔ سوری میں نے تمہیں دیکھا نہیں۔۔۔ وہ بچہ اسے دیکھنے جا رہی تھی۔“ وہ سوئی سوئی سی کیفیت میں تھی۔

”اس بچے کی ماں اور باپ مل گئے ہیں خوش قسمتی سے۔“ شیردل نے بتایا۔

”اوہ شکر ہے تیرا ایا رب۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں جوڑے بہت الگ الگ سی لگ رہی تھی۔

”کہاں ہیں اس کے پیرنس؟“ اس نے پوچھا۔

”انہیں دوسرے لوگوں کے ساتھ دوسرے علاقوں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ ہمیں بھی یہ علاقہ خالی کرنا ہے۔ رپورٹ ملی ہے کہ اگلے نو گھنٹوں میں یہاں مزید بارشوں امکان ہے۔ اس ٹوڈیجرس۔ تم بھی تیاری کرو۔ تمہاری ٹیم بھی کچھ دیر میں چلی جائے گی۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”اور تم۔۔۔؟“ وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔ ”ہمیں تو ظاہر ہے آخر میں ہی ٹکنا ہو گا۔ شاید کسی کی زندگی کے امکان باقی ہوں۔“ وہ مبہم مسکرایا۔

”سارا علاقہ تو ڈوب گیا ہے۔ بچا ہی کیا ہے اب؟ کون بچا ہو گا بھلا؟ اور پھر یہاں تم لوگوں کی جانوں کو بھی تو خطرہ ہے۔“ وہ تھکرے لہجے میں بولی۔



”خطرہ تو ہے۔ پر کیا کریں۔ ڈیوٹی از ڈیوٹی۔ جب آرمی جوائن کی تھی مجھی سے سر پر کفن باندھ لیا تھا۔“ وہ سادہ سے کچے میں بولا۔ روشنائی نے دل کر اسے دیکھا۔ اونچا لباؤ وردی میں بلبوس کسی مضبوط ساتبان کی طرح کھڑا تھا۔

”خدا نہ کرے تمہیں کچھ ہو۔“ اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

”میں تمہارا انتظار کروں گی شیردل۔“ وہ آہستگی سے بول کر پلٹ گئی تھی۔ شیردل کے تاثرات دیکھے بغیر وہ جانتی تھی کہ اس کے چہرے پر کیسے تاثرات ہوں گے۔ وہ بے انتہا خوش تھا۔



پندرہ دنوں کے بعد اس کا گروپ واپس چلا گیا تھا مگر وہ نہیں گئی۔ اس نے اپنا استعفیٰ میل کر دیا تھا۔ پھر ٹھیک ایک ماہ بعد وہ روشنائی شیر علی سے روشنائی شیر دل بن کر اس کے ساتھ کاکول کی طرف سفر کر رہی تھی۔

شیردل بے حد خوش تھا اور وہ بہت مطمئن۔ اسے شیردل کے ساتھ آج چوتھا روز تھا۔ یہ چار دن اس کی زندگی کے حسین ترین دن تھے۔ ”زندگی اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے؟“ وہ حیران ہو کر سوچتی۔ شیردل کی فیملی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس کے رشتاؤ والد اور دو عدد بھائی۔ بہن اس کی کوئی نہیں تھی اور بھائی بھی ملک سے باہر جا کر رہتے تھے۔ اس نے شیردل سے اس کی والدہ کے بارے میں پوچھا تو وہ خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی خاموشی بہت پر اسرار سی تھی۔ شیردل کے والد ان کے آبائی گاؤں کی حویلی میں رہتے تھے۔ شیردل اور روشنائی نے انہیں بہت کما کما کہ وہ ان کے ساتھ چل کر رہیں مگر ان کی ناں ہاں میں نہ بدلی۔

”زندگی کے آخری دن میں اپنی مٹی کی خوشبو سوگھتے ہوئے گزارنا چاہتا ہوں تم دونوں کی نئی زندگی شروع ہوئی ہے، لطف اٹھاؤ۔ میں کباب میں بیڑی نہیں بننا چاہتا۔“ وہ شیردل کی طرح خوش مزاج تھے۔

وہ رشتاؤ لیفٹیننٹ جنرل تھے۔ شیردل ان کی ملازمت کے دنوں کے بہت سارے قصے سنا تھا۔ جب وہ دونوں گاؤں آتے تھے تو کتنے مزے کرتے تھے۔ شیر دل کے والد نے اس کے بچپن کے کئی قصے سنائے تھے۔ وہ ان کی باتیں سن سن کر ہنستی رہی تھی۔ مسکراتی رہی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شیردل اپنے والد سے اور اس کے والد اس سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ وہ دونوں آپس میں دوستوں کی طرح محسوس ہوتے تھے۔ عجیب سی بات تھی دونوں میں۔ ان کے رشتے میں۔ شیردل میں اس کے والد کی بہت زیادہ مماثلت تھی۔

کاکول میں انہیں آفیسرز کالونی میں گھر مل گیا تھا۔ یہ جگہ اسے بہت پسند آئی تھی۔ سبزہ ہی سبزہ اور پانی کی خوب صورتی کہ آنکھ سیر نہ ہو۔ وہ سارا دن گھر کے کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی تھی۔ شیردل یہاں آکر بہت مصروف ہو گیا تھا۔ یہاں اس کے کچھ پرانے دوست بھی موجود تھے۔ وہ بھی شادی شدہ تھے۔ انہوں نے نئے شادی شدہ جوڑے کی باری باری دعوت کی تھی۔ آخری دعوت طفل اور اس کی بیگم نے کی تھی۔ وہ بہت دل سے تیار ہوئی تھی۔ شیردل نے اسے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ وہ کبھی نظر بھر کر اسے نہیں دیکھتا تھا۔ بلکہ ایک گہری نظر ڈال کر نظر ہٹا لیتا تھا۔ یہ دعوت انہوں نے کلب میں کی تھی۔ میزبان خاتون نے بہت برجوش انداز میں اس کا استقبال کیا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی مدعو تھے۔

بہت اچھے ماحول میں ڈنر چل رہا تھا جب میزبان خاتون کی کسی بات پر مسکراتے مسکراتے اس کی نظر شیردل پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں کوک کا گلاس تھا جسے وہ پینے کے لیے لیوں تک تو لے آیا تھا مگر اس نے گلاس لیوں سے لگایا نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں کسی دوسری سمت مرکوز تھیں۔ ایسے جیسے کوئی کسی بیٹھو سے چلنے والے کھلونے کے سیل نکال دے تو وہ جس بھی پوزیشن اور اینگل میں ہو اسی وقت رک جاتا ہے۔ وہ بالکل ”فریز“ تھا۔ ”شیردل“ روشنائی نے

چہنگی سے اسے پکارا۔ مگر اس نے نہیں سنا نہ ہی کوئی حرکت کی۔ روشنائی نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ وہ بالکل سانسے والی میز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں ایک اوجیز عمر کی طرح دار عورت سیلوئس بلاؤز اور جارحیت کی ساڑھی میں بلبوس کسی مرد کے ساتھ بیٹھی تھی جو کہ تقریباً اسی کی عمر کا لگ رہا تھا۔ عورت بے حد حسین تھی مگر مرد اس کے مقابلے میں زیادہ خوب صورت تھا۔ وہ عورت بھی شیردل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر کچھ میں نہ آنے والے تاثرات رقم تھے۔ ناقابل فہم خرمرو زبان تھی۔

”شیردل۔“ اس نے میز پر رکھے شیردل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر ذرا سا دباؤ ڈالا۔ وہ یکدم چونکا۔ اس نے اشارے سے پوچھا اسے کیا ہو گیا تھا مگر وہ بجائے کچھ کہنے کے گلاس کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے اپنے میزبان دوست کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ صد شکر کہ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا ورنہ اس کی ٹھنکی ہوئی حالت کے بارے میں سوال ضرور کرتا۔ بالی وقت وہ خود کو نارمل ظاہر کرنا رہا تھا مگر اس کی آنکھوں کے تاثرات بہت عجیب سے ہو گئے تھے۔ روشنائی کو اس کی آنکھوں سے خوف سا محسوس ہوا تھا۔

گھر واپس آکر وہ سیدھا چنچ کر کے سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ روشنائی جب تک لباس وغیرہ تبدیل کر کے آئی وہ آنکھیں موندے لیٹا تھا۔

”شیردل۔“ سو گئے ہیں کیا؟“ اس نے اس کے پہلو میں لیٹتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں بہت گہری نیند میں ہوں۔“ وہ اسی طرح بند آنکھوں کے ساتھ بولا۔

”اچھا جی۔“ تو پھر نیند میں ہی باتیں کر لی جائیں۔“ وہ کھٹکھٹائی۔ اس نے ایک ہاتھ شیردل کے چوڑے سینے پر رکھا اور دوسرا ہاتھ اس کے بھاری ہاتھ پر دھر دیا۔

”مزا آیا تھا۔ اچھی گید رنگ بن گئی۔“ بوریست عیس ہوئی۔ ”وہ آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ کے رویوں کو اپنی شہادت کی انگلی سے چھیڑنے لگی۔

”ہوں۔“ شیردل نے بند آنکھوں کے ساتھ کہا۔ ”کافی پرانے دوست لگتے ہیں آپ کے؟“ اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ کیڈٹ کالج سے ہم سب ساتھ ہیں۔ اسد سے البتہ زیادہ پرانی دوستی ہے۔“ اس نے اس بار آنکھیں کھول کر جواب دیا۔ وہ اب چھت کے پچھلے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ روشنائی اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بہت محبت سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ شیردل اپنے چہرے پر اس کی نگاہوں کو محسوس کر رہا تھا مگر وہ دانستہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ نظریں چرا لے گی۔ اس کا یوں اپنی جانب دیکھنا اور محبت سے اسے پسند تھی۔

”وہ خاتون کون تھیں جنہیں دیکھ کر آپ اپ سیٹ ہو گئے تھے۔“ اس نے ایک دم ہی سوال کیا تھا۔ شیر دل کو اس سوال کی توقع نہیں تھی شاید۔ اس نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔

”کون خاتون؟ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اس نے مرد لہجے میں کہا۔ روشنائی اس کے اس طرح صاف مکر جانے پر حیران ہو گئی۔

”آپ جانتے ہیں کہ مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی۔“ وہ حیران تھی کہ وہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے۔

”روشنائی! سو جاؤ۔ رات بہت ہو گئی ہے۔“ اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے سینے سے ہٹایا اور کروٹ بدل لی۔

”کل چھٹی ہے۔ دیر ہو بھی جائے تو کیا حرج ہے؟“ میرادل باتیں کرنے کو چاہ رہا ہے۔“ اس نے شیردل کو بازو سے پکڑا اور اس کا رخ اپنی جانب موڑا۔

”باتیں صبح ہو جائیں گی۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”شیردل! آپ کی می می کی کوئی تصویر دیکھنے کو نہیں ملی۔“ اسے خیال آیا۔

”روشنائی! میرے سر میں درد ہو رہا ہے پلیز۔“ اب کی بار وہ سخت لہجے میں بولا تھا۔ وہ چپ سی ہو گئی۔

”آپ۔“ میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا ہے شاید۔“ آئی ایم سوری۔“ وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے



packsociety.com



ایک بار اس سے کہا تھا اور وہ نہ بھی کہتا تو بھی اس نے یہی کرنا تھا۔ شیردل اس سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کرتا تھا، البتہ اس سے اس کی مرضی، پسند، فرمائش ضرور پوچھتا تھا۔ عموماً وہ اس کی مرضی کے مطابق ہی کام کرتا تھا۔ اس کی پسند اور فرمائش کو اہمیت دیتا تھا۔ شادی کے بعد اسے لگنے لگا تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے، بے حد حسین پسند۔ وہ اس اپنے کو دیکھتے رہتا چاہتی تھی۔ انہی دنوں اس کی طبیعت بھی خراب ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ خود ڈاکٹر تھی۔ مگر پھر بھی لیڈی ڈاکٹر سے مکمل چیک اپ کروا کر تسلی کر لینا چاہتی تھی۔

\*\*\*

انہی دنوں نینال کی شادی کا غلطہ اٹھا۔ اس نے فون اور ای میلز کر کے اس کی جان کھالی تھی کہ وہ شادی سے ایک ماہ پہلے آکر اس کے ساتھ تیاری کرے۔ اس کو براڈیل ڈریس اسی کی پسند سے منتخب کرتا تھا۔ وہ اس کی چوائس کی دیوانی تھی۔

”مگر پورے ایک ماہ پہلے کیسے آسکتی ہوں؟ شیردل کو چھوڑ کر؟“ اس نے تذبذب کے عالم میں کہا تھا۔ وہ اس وقت فون پر بات کر رہی تھی۔ شیردل لب لباب پر کچھ کام کر رہا تھا۔ لیکن اس کے کان اس کی طرف ہی لگے ہوئے تھے۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ شیر دل کو اتنی لمبی چھٹی نہیں ملے گی اور میں انہیں تنہا چھوڑ کر نہیں آسکتی۔ تم ایسا کرونا کہ ڈریس چوز کر کے مجھے اس کا پرتا دو۔“ اس نے صاف منع کر دیا۔

”تم شیردل کو فون دو۔ تم سے تو بات کرنی بے کار ہے بدل گئی ہو تم۔“ وہ سخت خفا تھی۔ روشنائی نے مسکراتے ہوئے اس پر ہنس کر آن کر دیا۔

”میلو۔۔۔ بھئی سالی صاحبہ! کیوں ہماری بیگم صاحبہ کو تنگ کر رہی ہیں؟“ شیردل نے شوخی سے کہا۔

”بات مت کرو تم مجھ سے کیا جاؤ کر دیا اس لڑکی پر کہ جو شادی ہے پہلے تمہاری شکل تک نہیں دیکھنا

چاہتی تھی اب، اپنی بہن کی شادی میں مہمانوں کی طرح آنے کی بات کر رہی ہے۔“ وہ شیردل پر چڑھ کر دوڑی۔

”بھئی اسے جاؤ نہیں محبت کہتے ہیں اسے۔۔۔ والے سے پوچھ لو بے شک شادی کے بعد تم بھی ایسی ہی ہو جاؤ گی۔ غم نہ کھاؤ۔“ وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

”دیکھو نا شیردل! میرا کتنا بڑا مسئلہ تمہاری بیوی نہیں کر رہی اور مجھے تنگ کر رہی ہے۔ اسے کوئی کام آجائے۔ سچی میری ماں کی چوائس دیکھو نا۔“ وہ مجھے شاپنگ میں ہمیشہ کنفیوژن ہوتی ہے۔ میرے برائڈل ڈریس اور جیوری کا معاملہ ہے۔۔۔ ہیلپ می۔“ وہ روہانسی ہو رہی تھی اور شیردل کے سر سے بڑا جاندار تھمہ نکلا۔ روشنائی بھی مسکرا رہی تھی۔

”بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟“ وہ اس کی حالت کو انجوائے کر رہا تھا۔

”جو مانگو۔“ وہ فوراً بولی۔

”تم میری بیگم کا خیال رکھو گی۔ اسے تنگ بالکل نہیں کرو گی اور روزانہ میری اس سے فون پر بات کرو گی اور جب ہم دونوں آپس میں باتیں کر رہے ہوں تو تم وہاں سے بھاگ جاؤ گی۔ کان لگا کر باتیں نہیں سنو گی۔“

”اوکے اوکے۔۔۔ منظور ہے۔“ وہ فوراً بولی۔

روشنائی نے کچھ کہنا چاہا تو شیردل نے اس کو ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کا کہا۔

”اوکے۔۔۔ تو میں پلین کی ٹکٹ کنفرم کر کے فون کرتا ہوں۔“ شیردل نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

”یہ کیا حرکت تھی؟ میں اتنے دن پہلے نہیں جاسکتی تھی۔“ وہ ناراضی سے بولی۔

”کم آن روشنی! جان۔۔۔ وہ اتنے پیار سے بلا رہی ہے۔ چلی جاؤ ایک مہینے کی تو بات ہے تو ایسے بھی آج کل میں ہم یہاں سے کوچ کر جائیں گے۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے قریب بلایا۔

ماہنامہ کرن 96

”یہا مطلب؟“ وہ اس کے پاس بیٹھتی ہوئی حیرانگی سے پوچھنے لگی۔

”میں نے ٹرانسفر کے لیے آگے بات کی ہے۔ حالانکہ اتنی جلدی مشکل ہے، مگر ہو پ سو۔ ایک آدھ ماہ میں آرڈر زمل جائیں گے۔“ اس نے اپنا مضبوط بازو اس کی کمر کے گرد حائل کرتے ہوئے بتایا۔

”اتنا جانک فیصلہ کیوں؟ آپ نے بتایا تک نہیں؟ اتنی اچھی جگہ تو ہے یہ۔۔۔ مجھے بہت پسند آتی ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی اور حیران بھی تھی۔

”بس مجھے یہ جگہ پور کرنے لگی ہے۔ میں ایک جگہ نکلنے کا عادی بھی نہیں۔ ہم فوجیوں کی زندگی ویسے بھی خانہ بدوشوں کی طرح ہوتی ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”یہی وجہ ہے؟ بس۔۔۔“ اس نے گردن موڑ کر شیر دل کو دیکھا اس کے ذہن کے پردے پر چھم سے ایک حسین اور جاذب چہرہ ابھر آیا۔ وہ یکدم چوکی۔

”اوہ۔۔۔ مہلی یا سبل۔“ اس نے سوچا۔

”بس۔“ شیردل نے اسی کے سے انداز میں جواب دیا۔

”تم تیاری کرو۔۔۔ میں ٹکٹ کا پتا کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور نمبر ہش کرنے لگا۔ وہ آہستگی سے اسے دیکھتی ہوئی انھی دل نجانے کیوں عجیب سا ہو رہا تھا۔ ”شیردل! تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟“ اس نے نجانے کیوں سوال کیا تھا۔ وہ نمبر نہیں کرتے کرتے چونکا اور اسے دیکھا۔

”تم میری زندگی ہو روشنائی شیر علی۔ روح ہو میری میں تمہاری بے حد عزت کرتا ہوں۔“ اس نے عجیب سے انداز میں جواب دیا۔ وہ چند لمحوں تک اس کا چہرہ دیکھتی رہی عجیب جواب تھا۔ وہ اس جملے میں چھپے معنی تلاش کرنے لگی۔

”مجھے نجانے کیوں عجیب سا لگ رہا ہے؟“ ایمر پورٹ پر وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

”کم آن۔۔۔ ایک آرمی آفیسر کی بہادر بیوی یہ کس طرح کی باتیں کر رہی ہے۔۔۔ کچھ دنوں کی بات ہے۔ پھر تو میں بھی وہیں آ جاؤں گا۔“ اس نے مسکرا کر کہا

ماہنامہ کرن 97

تھا۔

”اپنا خیال رکھنا۔ یہ سوچ کر تم میری امانت ہو۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ اس کے لہجے سے زیادہ اس کی آنکھوں میں وارفتگی تھی۔ وہ سن کر بڑبڑائی۔

”اول ہوں۔“ اس نے جزیرہ ہو کر اوہرا دھڑلوگوں کے ہجوم کو دیکھا۔ وہ ہنس پڑا۔

”خدا حافظ۔“ اس نے اس کا نرم دودھیا ہاتھ ہولے سے دیا کر چھوڑ دیا۔

”خدا حافظ۔“ وہ اندر کی طرف بڑھ گئی اور شیردل تب تک اسے دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی نظروں کی حدود میں رہی۔ پھر وہ آہستگی سے پلٹ گیا۔ اسی بل اس کا موبائل بجایا۔ اس نے جیب سے موبائل نکال کر اسکرین دیکھی۔ اس نے نمبر دیکھ کر فوراً ”ایس کا بشن دیا دیا۔“

”جی۔۔۔ جی بابا جان! ابھی ابھی چھوڑا ہے۔ آپ لیٹ ہو گئے۔ جی میں نمبر سینڈ کر دوں گا آپ کو۔“ آپ انکل شہباز کے گھر فون کر لیجئے گا جی جی۔ اس کا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر تھا۔ جی جی میں نے اسے نہیں بتایا مگر اسے شک ہو گیا تھا۔ میں نے بہتر جانا کہ وہ فی الحال چلی جائے اللہ نے بہانہ ہی کر دیا۔ روز آتی ہیں۔ ایک ہی کالونی سے، ظاہر ہے، نظروں آنا کوئی حیران کن بات نہیں۔۔۔ بتا دوں گا بس۔۔۔ جی۔۔۔ اپنا خیال دیکھیے گا۔۔۔ خدا حافظ۔“ اس نے فون بند کر دیا۔ وہ اپنی جیب کی طرف بڑھ رہا تھا مگر اس کے چہرے پر بے حد سنجیدگی تھی۔

\*\*\*

وہاں پہنچ کر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ڈاکٹر سے لائنٹنٹ لی اور دو سرائیکام یہ کیا کہ ایک مشہور ڈیزائنر کے پاس فینل کو لے گئی جہاں اس کے عروسی لباس کا مسئلہ حل ہوا تھا۔ یہاں آکر وہ بہت مصروف ہو گئی تھی کبھی جیور تو کبھی درزی، کبھی کیا تو کبھی کیا۔ مگر اتنی مصروفیات میں بھی وہ شیردل سے بات کرنا نہیں بھولتی تھی۔ رات کو وہ لائٹا اسے ایک مخصوص وقت



پر فون کرتی تھی۔ اس روز اسے رپورٹ ملنی تھی۔ وہ بے حد مسرور تھی۔ رپورٹ پانچویں آئی تھی۔ اس کا شک دور ہو گیا تھا۔ وہ یہ خوشخبری پہلے شیردل کو سناتا چاہتی تھی۔ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی شیردل کا موبائل نمبر ملایا۔ بیل بجتی رہی۔ پھر کچھ دیر بعد کسی نے فون اینڈ کر لیا۔

”ہیلو۔“ کسی عورت کی آواز سن کر وہ لمحہ بھر کو گم سم ہو گئی۔ اس نے بے اختیار ریست و اچ پر نگاہ ڈالی اس وقت تو شیردل گھر پر ہوتا ہے یہ کون ہے؟ کس کی آواز تھی؟ وہ لرز گئی تھی۔

”ہیلو۔ جی کون؟“ بہت خوب صورت آواز تھی۔ اس کے ذہن کی اسکرین پر وہی عورت ابھر آئی۔

”کون ہے؟“ اس نے شیردل کی آواز سنی تھی۔

”پتا نہیں شاید سگنل نہیں آرہے۔“ عورت نے جواب دیا تھا اور اس نے ایک دم سے فون کاٹ دیا۔

اسے جکر آنے لگے تھے۔ (تو کیا شیردل نے مجھے دھوکا دیا۔ اس کا افسوس کسی اور عورت کے ساتھ ہے۔ یا

الٹی۔) اس نے اپنا سر تھام لیا۔ پانچ ماہ سے وہ جس خوب صورت خوابوں کی دنیا میں سانس لے رہی تھی

وہ ایک معمولی ذرے سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اب وہ ڈرائیونگ کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس نے

ڈوبے ذہن کے ساتھ اپنا سر اسٹیرنگ پر گرا دیا۔ ہارن ایک تواتر سے بجنا شروع ہو چکا تھا۔



”آپ نے میری بغیر اجازت میرا فون کیوں اٹھایا“

اس نے جھپٹنے والے انداز میں اس کے ہاتھ سے فون چھینا تھا۔

”سوری تم کمرے میں نہیں تھے میں نے سوچا۔“

وہ شرمندہ سالجہ اور شرمندہ ساچرو اس کے سامنے تھا

”آپ کا میری کسی بھی چیز پر اور مجھ پر بھی کوئی حق نہیں ہے۔ ذہن نشین کر لیجئے۔“ وہ زہریلے لہجے میں

بولتا اور لاگ میں نمبر چیک کرنے لگا۔ روشنائی کی کال

تھی۔ وہ جان چکا تھا۔

”شیردل۔۔۔ مجھے معاف کر دو بیٹے۔“ وہ عورت روتے ہوئے بول رہی تھی۔

”آپ کا بیٹا نہیں ہوں میں۔ صرف اپنے بابا کا

ہوں۔“ وہ اس عورت کی بات کٹتے ہوئے درخت سے بولا۔

”اپنی ماں کو اس طرح سزا مت دو میری جان۔“

میری اولاد ہو۔“ وہ رونے لگیں۔

”مسز فرخندہ جلیل اکبر! ماں کیا ہوتی ہے اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ آپ جانتی ہیں؟“ وہ طنز سے بولا۔

”آپ تب سے ہماری زندگی سے نکل چکی تھیں

جب آپ اپنے پانچ سال کے بیمار بچے کو روکا دیا

مرتے حال میں پھوڑ کر اپنے عاشق کے ساتھ شادی

کے نئے دنیا بسا چکی تھیں۔ ہم سب کے لیے آپ

بچکی ہیں مسز فرخندہ جلیل اکبر۔ ہم تینوں بھائی اور

ہمارا اکلیم باپ آپ کے بغیر جینے کے عادی ہو چکے

ہیں۔ میری بیوی آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں

جانتی۔ وہ بہت پاک ہے۔ بہت معصوم اور وقار ہے۔

میں چاہ کر بھی اسے یہ گھناؤنی حقیقت نہیں بتا سکتا تھا۔

آپ جب تک اس جگہ پر رہیں گی تب تک میرے

لیے ماضی کی اذیتیں اکٹھی کرتی رہیں گی۔ میرے

دوست احباب کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ میرا آپ کے

کیا رشتہ ہے۔۔۔ بار بار میرے سامنے آکر میرا وقت

غراب مت کریں۔ میں اس شکل کو کبھی نہیں دیکھنا

چاہتا۔ کیونکہ میں نے اس سے زیادہ مکروہ اور

بد صورت چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔“

شیردل کے ہوتوں سے زہر نکل رہا تھا۔ فرخندہ

پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس جوان مرد کی شکل دیکھ رہی

تھی۔ وہ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد وہ مضبوط جسم وہ بے

حد حسین چہرہ۔ یہ اس کا بیٹا تھا جو ذرا سے صبر اور

برداشت اور قربانی سے اس کا سائبان بن سکتا تھا۔

ایسے ہی دو ستون اور تھے جنہیں اس عورت کی خود

غرضی نے ڈھادیا تھا۔

”نکل جائیں یہاں سے میں نہیں چاہتا کہ کسی کو ہت

چلے اور میرا سر شرم سے جھک جائے۔ مگر سے بھاگ

چلنے والی بہت سی عورتیں ہوتی ہیں ان کی کچھ اور

مجبوریاں ہوتی ہوں گی۔ مگر مگر سے بھاگ جانے والی

”ماں“ میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“ شیردل ایک ایک لفظ

پر زور سے کر بول رہا تھا۔

”بیویاں بے وقاف ہو سکتی ہیں۔ مگر عورت جب ماں

بن جائے تو وہ نہ عورت رہتی ہے نہ بیوی۔ وہ صرف

ماں ہوتی ہے۔۔۔ جاپے چلی جاپے میرا اور آپ کا

معاملہ قیامت تک یونہی چلے گا اور فیصلہ روز محشر ہو

گا۔ آپ نے قیامت کے قرض چڑھائے ہیں قیامت

کو ہی اتارنا پڑیں گے اینڈ لی آف ناؤ۔ کو گیت

لاسٹ۔۔۔ اس سے پہلے میں خود کو شوٹ کر دوں اور

دوبارہ میرے سامنے غلطی سے بھی آنے کی کوشش

مت کیجئے گا۔ بہت مشکل سے سنبھالا ہے ہم لوگوں

نے خود کو۔“ وہ دھیمے لہجے میں بول رہا تھا مگر اس کا چہرہ

سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں اتنی وحشت زدہ کہ فرخندہ

خوفزدہ ہو گئیں۔ ”میں جارہی ہوں۔ ہو سکے تو تم

سب مجھے معاف کر دینا۔ اپنے بابا سے کتنا مجھے معاف

کر دیں۔ میں آخری بار تم سے مل رہی ہوں شیردل

۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر

رودنی اور پھر وہاں سے چلی گئیں۔

شیردل نے اپنی کم کی طرح چھٹی ہوئی کپٹیوں کو پکڑا

اور دونوں ہاتھوں سے بھینچا اور پھر نجانے کیا ہوا کہ

گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بچوں کی طرح ہچکیوں سے

رونے لگا۔ وہ اتنا بڑا افسر اتنا کامیاب انسان ایک

عورت کے لیے ہوئے گھاؤ کی وجہ سے رو رہا تھا۔ وہ

آج پھر سے پانچ سال کا وہی بچہ بن گیا تھا جو اپنی ماں کا پلو

پکڑ پکڑ کر اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور نور نور سے

رو رہا تھا اور اس عورت نے بڑی بے دردی سے اس

بچے کے ننھے ہاتھوں سے اپنا پلو چھڑایا تھا۔ جھٹکا اتنا

شدید تھا کہ وہ بچہ سنبھل نہ سکا تھا اور برآمدے کی تین

چار میزھیوں پر سے بری طرح گر کر سر پھٹوا بیٹھا تھا۔

اس کی دھڑاں چھینیں اور اس کا خون سے لٹ پٹ چہرہ

بھی اس عورت کے قدموں کی زنجیر نہ بن سکا تھا۔ شاید

اس لیے کہ وہ عورت ایک ہوس زدہ عورت تھی۔

ایک ماں پرست عورت تھی ایک خود غرض عورت

تھی۔ اگر وہ ایک ماں ہوتی تو کبھی بھی اس روز اس سے

وہ دلیر نہ پار کرتی۔



اس کے ذہن نے انگریزی لی۔ پہلے ذہن جاگا اور پھر

شعور کسمسایا۔ اس کے کانوں میں کسی کی باتیں

کرنے کی آوازیں پڑیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر

ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ کسی ہسپتال کا کمرالگ

رہا تھا۔ وہ بیڈ پر دراز تھی اور اس کے اوپر سینے تک

سفید رنگ کی چادر تھی۔ اس کی نظر بیگم شہباز اور

نہیںال پر پڑی۔ وہ دونوں ہولے ہولے کچھ بات کر رہی

تھیں۔ پھر اس نے نگاہیں گھما دیں تو دوسری جانب

شہباز اور سفید گاؤں بننے والی لڑکی ڈاکٹر کھڑی باتیں کر

رہے تھے۔ یہ وہ ڈاکٹر تھی جس نے اس کے پرہیزگشی

ٹیسٹ کیے تھے۔ اسے ہوش میں آنا سب سے پہلے

شہباز نے دیکھا تھا۔ وہ لپک کر اس کے پاس آئے۔

”کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ وہ اس کے سر پر ہاتھ

رکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”اچھی ہوں۔ آپ لوگ؟ میں یہاں کیسے؟“ وہ

پوری طرح شعور میں ابھی نہیں تھی۔

”آپ بے ہوش ہو کر اسٹیرنگ پر گرمی ہوئی

تھیں۔ متواتر ہارن بجنے کی آوازیں سن کر ہمارے کلینک کا

چوکیدار گیٹ سے باہر آیا تو اس نے آپ کو بے ہوش

پایا۔ اس نے مجھے آکر اطلاع دی۔ آپ کو فوری طور پر

ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ میں نے آپ کو ایڈمٹ کر

لیا۔ آپ کے موبائل فون سے آپ کے انکل کو

اطلاع دی گئی تھی۔“ ڈاکٹر نے مختصراً اسے سارا حال

بیان کیا۔

”لیکن روشنی بے ہوش ہوئی کیوں؟“ شہباز نے

الجھے ہوئے انداز میں پوچھا ”ڈونٹ وری۔ ایسی

کنڈیشن میں کچھ خواتین کمزوری کی وجہ سے بے



ہوش ہو جاتی ہیں یا پھر تھکاوٹ کی وجہ سے۔ آپ لوگ ان کا خیال رکھیے۔ اچھے سے کھلائیں پائیں۔ فرونگ کروائیں اور رست کروائیں۔ ان کی صحت تو ماشاء اللہ ٹھیک ہے۔ بس کچھ کمزوری ہے۔ اچھی خوراک اور دودھ کے استعمال سے ان شاء اللہ وہ بھی نہیں رہے گی۔ لیڈی ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔ شہباز اور بیگم شہباز بخور ڈاکٹر کی ہدایات سن رہے تھے۔

”کیا ہم اسے گھر لے جاسکتے ہیں؟“ بیگم شہباز نے پوچھا۔

”بالکل شی از پر فیکٹلی آل رائٹ۔“ ڈاکٹر مسکرائی۔

”تو ٹھیک ہے پھر چلو بیٹا۔“ شہباز بولے۔

”تایا جان! میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ میں کار ڈرائیو کر کے آجاؤں گی۔“ اس نے اپنے اوپر سے چادر ہٹاتے ہوئے کہا۔

”بالکل نہیں۔ آپ ابھی ڈرائیو بالکل نہیں کریں گی۔“ ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ڈاکٹر بول پڑیں۔

”آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی۔“ شہباز بولے۔

”تمہاری کار ڈرائیو لے آئے گا۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔“ انہوں نے کہا اور اپنی بیگم کو اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

”تم اب کھل آرام کرو گی۔ اس حالت میں بار بار کی بے ہوشی اچھی بات نہیں۔ تم نے شیردل کو بتایا؟“ بیگم شہباز اسے اس کے کمرے میں لے آئی تھیں۔

”موقع ہی نہیں ملا۔“ اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی نظریں بھی چرائیں۔ ”بتا دینا اسے پہلی فرصت میں ہی۔ ایسی خوشخبریاں پہلے شوہر کو ہی سنائی جاتی ہیں۔ خیر تمہارا تو معاملہ ہی ذرا ہٹ کر ہو گیا۔“ وہ اس کے قریب والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”بتا دوں گی۔“ اس نے تھکے تھکے انداز میں تنکے سے سر نکادیا ”مجھے نیند کی شادی کے ہنگاموں

میں تمہاری طرف دھیان ہی نہیں رہا۔ حالانکہ تمہارا رنگ مجھے پہلے کی نسبت پیکا لگ رہا تھا اور کچھ کمزور بھی لگ رہی تھیں۔ تمہاری ڈائٹ بھی بگڑ ہو گئی ہے۔ حد ہو گئی۔ مجھے دھیان ہی نہیں رہا۔“ جیسے اپنی کوتاہی اور بے خبری پر کڑھ رہی تھیں۔

”کیوں ٹینشن لے رہی ہیں۔ مجھے بھی کہاں بتا تھا۔“ اس نے ان کو محبت سے دیکھا۔ دھیری دھیری داری تھی ان سے۔

”ارے کیسے ٹینشن نہ لوں۔ اب تم کسی کی امانت ہو۔ تنہا نہیں ہو تم اور اب تو دھیری ذمہ داریاں ہیں تم پر بھی اور ہم پر بھی۔ تم شیردل کی امانت سنبھالنے بیٹھی ہو بیٹی۔ اب اپنا خیال رکھنا اور زیادہ ضروری ہے۔“ وہ

ماں کی طرح اسے سمجھا بھی رہی تھیں اور ڈائٹ بھی رہی تھیں۔ ”اپنی ڈائٹ کا خاص خیال رکھنا ہے۔ اب سمجھ گئی۔“ نیند ابھی سب کا جوس بنا کر لا رہی ہو گی۔

”نہیں پورا پیتا ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

”ٹھیک ہے۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ اسے تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اسی پل اس کے کمرے کا فون بجا۔

”ارے ہاں۔“ وہ میں نہیں بتانا بھول گئی۔ ”بیگم شہباز جاتے جاتے پلٹیں۔ تب تک روشنی فون پر ریسیور اٹھا چکی تھی۔“

”یامین کے فون آتے رہتے ہیں۔ تمہاری بارات والی رات بھی ان دھمکا تھا۔ مگر تمہارے تایا نے اسے تم سے ملنے نہیں دیا۔ آج صبح پھر ان دھمکا تھا یہاں اس نے تو ناک میں دم کر دیا ہے ہمارے ایک ہی بات کی رٹ لگائی ہوئی ہے کہ تم سے بات کرنی ہے۔ صبح تو میں نے جھڑک بھی دیا تھا کہ اب ملنے کے کیا معنی و مطلب؟ اب تو اس کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ خوش ہے اپنے گھر میں۔ اس کا پیچھا کرنا چھوڑ دو۔ مگر وہ اتنا ڈھیٹ

— پیچھے پڑا ہوا ہے کہ تمہارا فون نمبر دوں یا تم سے بات کروا دوں۔“ روشنی! میری صلاح ہے کہ تم اس سے مل کر دو ٹوک بات کر لو۔ شیردل اس کے بارے میں

کچھ نہیں جانتا۔ اگر اس کی کسی حرکت کی وجہ سے تمہاری عائلی زندگی پر خدا نا خواستہ کوئی برا اثر پڑا تو میں جانتی ہوں کہ تمہاری مری ہوئی ماں کو کیا جواب دوں گی؟ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“ وہ اس سے کہہ رہی تھیں اور دونوں میں سے کسی کو یہ خیال تک نہیں تھا کہ ریسیور روشانی کے ہاتھ میں ہے اور ماؤتھ پیس کے ذریعے دوسری طرف شیردل ان کی ساری باتیں حرف حرف سن رہا ہے۔

”جی آپ فکر نہ کریں۔ میں ہینڈل کر لوں گی۔“ اس نے سر دلچسپی میں جواب دیا۔

”ارے فون تو سنو کس کا ہے۔“ اس نے نہیں خیال آیا تو بولیں۔ روشانی نے ریسیور کان سے لگایا۔ مگر ٹونوں کی آواز ہی آئی۔

”کٹ گیا ہے۔ جس کا ہو گا پھر کر لے گا۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”چلو تم آرام کرو اور یہ ایکسٹینشن کی تار نکال دو تاکہ تمہارے آرام میں خلل نہ پڑے۔“ وہ ہدایت دیتی ہوئی بی بی ہرنکل گئیں۔ روشانی آرام وہ حالت میں لیٹ گئی تھی۔ اس کے کانوں میں وہ ہی آواز گونج رہی تھی۔

”بی بی کون۔۔۔؟“ وہ عورت کون تھی؟ مجھے ایک دم سے ایکشن نہیں لینا چاہیے۔ ایک شخص بے وفا تھا۔ ضروری نہیں ہر شخص بے وفا ہو۔ ایک شخص نے پاسداری وفا نہیں کی۔ ضروری نہیں کہ ہر کوئی ایسا ہی کرے۔ اس نے سوچتے ہوئے ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیے۔ دوسری طرف سے چند لمحوں کے بعد اس کے بیٹ مین نے فون ریسیو کیا۔

اس نے سلام کا جواب دینے کے بعد فوراً ”ہی شیردل کا پوچھا۔“

”وہ تو ابھی ابھی باہر نکلے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”اکیلے تھے یا کوئی ساتھ میں تھا؟“ اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

جی اکیلے تھے سر۔“ جواب ملا۔

”اچھا۔ کوئی مہمان آیا تھا کیا آج؟“ اس نے

بظاہر عام سے انداز میں پوچھا تھا مگر اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

”جی ہاں۔ ایک خاتون تشریف لائی تھیں۔ کافی دیر بیٹھی تھیں۔ میں نے چائے وغیرہ دی تھی۔ سر تو آفس سے آج دیر سے آئے تھے وہ خاتون ان سے ملنے آئی تھیں۔“ بیٹ مین نے بتایا۔

”خاتون۔“ اس کا دل لرزا۔

”ہو سکتا ہے مسز علوی ہوں۔ اوپنٹی لمبی سی تھیں سائولی سی؟“ اس نے جان بوجھ کر بات بتائی۔

”جی نہیں۔ لمبی اوپنٹی تو تھیں، مگر بہت خوب صورت اور گوری تھیں۔ بہت زیادہ فیشن ایبل تھیں اور غصہ والی بھی لگ رہی تھیں۔ میں نے سلام کیا تو جواب تک نہیں دیا۔ تیس پینتیس کے لگ بھگ عمر تھی۔ ساڑی پین رکھی تھی۔“ اس نے تفصیلاً بیان دیا۔

”اچھا“ اچھا میں سمجھ گئی۔ تم گھر کا خیال رکھنا۔ میں صاحب کو موبائل پر ٹرائی کرتی ہوں۔“ اس نے ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد اور کچھ ہدایات دینے کے بعد فون بند کر دیا۔ بیٹ مین کے بتائے ہوئے حلیمے اور اس کلب والی عورت کے حلیمے میں بے حد مماثلت تھی۔ (اس رات شیردل کا یوں ٹھنکنا۔۔۔ کچھ ایسی ہی کنڈیشن اس عورت کی بھی تھی۔ وہ مجرب اور اور ان کی فیملی کے ساتھ تھی۔ پھر شیردل کا مجھ سے جھوٹ بولنا۔ اس کا جھلانا۔ یہ سب کیا ہے) اس کے سر میں درد شروع ہو گیا۔ اس نے شیردل کے موبائل پر کال کر لی۔ کچھ دیر بیل بجتی رہی اور پھر شیردل کی آواز اسے سنائی دی۔ مگر یہ کیا۔ اس کی آواز میں نہ پہلے جیسا جوش تھا۔ نہ ہی وہ شدت و بے قراری۔

بہت سپاٹ لہجہ تھا اس کا۔

”میں نے گھر فون کیا تھا، آپ نہیں تھے۔ اس وقت کہاں ہیں؟“ اس نے رکی باتوں کے بعد پوچھا۔

”میں ذرا باہر آیا ہوں۔ تم کیسی ہو؟“ بہت ہی فارمل سا سوال تھا اور سرد انداز۔

”ٹھیک ہوں۔ صنوبر تیار رہا تھا گھر میں مہمان آئے



تھے۔ کون تھا؟ اس نے یونہی پوچھا۔  
 ”ہاں۔ وہ سزا کرام آئی تھیں تم سے ملنے۔ میں نے بتا دیا کہ تم اپنی بہن کی شادی میں گئی ہو۔“ شیردل نے جواب دیا۔ اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ سزا کرام بڑی عمر رسیدہ اور عام سی شکل و صورت کی خاتون تھیں اور شاید ہی زندگی میں بھی انہوں نے ساڑھی استعمال کی ہو۔ وہ انہیں ہمیشہ شلواری قمیص میں ہی دیکھتی تھیں۔ شیردل نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ بے یقینی سے ریسپور کو دیکھتی رہ گئی۔

”تم جھوٹے ہو۔ میں کل آرہی ہوں واپس۔“ اس نے کہہ کر ریسپور نیچے رکھ دیا شیردل کا ری ایکشن کیا ہو گا؟ اس نے کیا سوچا ہو گا؟ اس نے روشنائی کے انداز اور اطلاع پر کتنا جھٹکا کھایا ہو گا اور ملاقات کے بعد اس کا رد عمل کیا ہو گا۔ وہ کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ اس نے آن کی آن فیصلہ کیا تھا۔

”سوری سوری سب گھر میں ختم ہو گئے تھے۔ میں نے عبدل سے کہہ کر منگوائے اسی لیے دیر ہو گئی۔“ نینال کی بروقت آمد اسے بہت کھلی تھی۔

”نینال! میرا ایک کام کرو گی۔ تیا جان سے کہہ کر میری کل کسی بھی وقت کی ٹکٹ بک کروادو۔“ اس نے از حد سنجیدگی سے کہا۔

”کیا۔ کل کی ٹکٹ۔ یا گل ہو کیا؟ اس حالت میں اور اب تو شادی میں دن بھی بس بارہ ہی رہ گئے ہیں۔“ وہ چینی۔

پلیز نینال! یا تو تیا جان سے کہہ کر سیٹ بک کروادو ورنہ میں خود یہ کام کر رہی ہوں۔“ وہ بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ بولی۔

”سب ٹھیک تو ہے نارو شائے؟ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟“ اس نے اس بار بہت سنجیدگی سے بہن کی صورت دیکھی۔

”مسئلہ حل کرنے ہی کے لیے جا رہی ہوں۔ مگر تم کسی سے کچھ مت کہنا۔ پلیز۔“

”مگر مجھے تو بتاؤ۔“ نینال پریشان ہو گئی ”ابھی تو مجھے خود بھی پتا نہیں ہے۔ بس اتنا اور تیا جان سے کہہ دیتا

میں گھر جانا چاہ رہی ہوں۔ مہندی سے پہلے آجکل کی۔“ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔  
 ”اوکے تم جو سوچو۔ میں کہتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر چلی گئی اور وہ سوچنے لگی کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ شیردل بار بار اسے کالیں کر رہا تھا مگر اس کا منہ ہلکا فون آف تھا اور گھر کے نمبر پر فون کرنے سے اسے جواب مل رہا تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ مجبوراً اس نے نینال کو کال کی اور اس سے سوال جواب شروع کر لیے۔

”مجھے خود کچھ پتا نہیں اچانک ہی بولی کہ اسے گھر جانا ہے۔ میں تو خود پریشان ہوں۔ ویسے بھی اس حالت میں بار بار اتنی جلدی جلدی ٹریولنگ اچھی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے اسے ٹریولنگ سے منع کی ہے۔“ نینال نے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے اپنی ساری باتیں انکشاف کیا۔

”کیا مطلب؟ کیسی حالت؟ کیا ہوا ہے اسے؟“ شیردل کے لہجے میں تشویش تھی۔

”آپ کو نہیں پتا؟“ وہ حیران ہو کر پوچھ رہی تھی۔  
 ”پتا ہوتا تو تم سے سوال نہ کرتا۔“ وہ چڑ گیا۔  
 ”جناب! میں خالہ بننے والی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”کیا۔“ شیردل کو لگا کہ جیسے اس نے کچھ اور سن لیا ہے۔

”میں خالہ بننے والی ہوں۔“ اس بار اس نے قدرے زور سے کہا۔

”ادھر رکلی۔ مگر رو شائے نے مجھ سے یہ خبر کیوں چھپائی؟“ وہ شاک ہوا۔

”آپ زیادہ گہرائی میں مت جا کر سوچیں۔ یہ تو بڑی خوشخبری ہے۔“ نینال نے مختصراً اسے ساری باتیں بتا دیں اور شیردل کے پوچھنے پر وقت بھی۔

”اوہ۔ تم نے انکل سے ٹکٹ کے لیے تو نہیں کہا؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں میں ابھی انہیں کہنے ہی والی تھی۔“  
 ”مت کہو۔ میں آج خود آ رہا ہوں تم گھر پر کسی کو

الٹامع مت دینا۔“ اس نے کہا اور چند دوسری باتیں اس سے پوچھنے کے بعد فون بند کر دیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ نینال سے بات چیت کر کے اب وہ بالکل ریلکس تھا۔ شک کے باطل چھٹ چکے تھے اور حقیقت روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ اس نے ایک دو دن چھٹی کی ارضی لکھ کر اپنے افسر کم دست کو دے دی تھی۔ وہ اب جلد از جلد روشنائی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ نینال نے اس کی ساری الجھنیں سلجھا دی تھیں۔

یہ ایک خوب صورت سا پارک تھا۔ اس وقت یہاں خاصی چمک پھل اور رونق تھی۔ وہ دھوپ کا چشمہ لگائے ایک بیچ پر بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہوں کا مرکز وہ دوڑتے بھاگتے بچے تھے جو آزادی سے اپنا بچپنا انجوائے کر رہے تھے۔ وہ بہت حسرت سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ ان بچوں کو دیکھتے دیکھتے وہ ماضی کے ہنڈولے میں جھولنے لگی تھی۔ اس نے اپنا چشمہ اتار کر اپنے برس میں رکھ لیا۔ آنکھوں میں آنی نمی کو اس نے ماضی کے کرب سمیت اندر دھکیلا۔

”روشائے۔“ ایک آواز اس کی سماعت میں اترتی۔ گویا تیزاب اس کے اندر دوڑنے لگا۔ آواز عقب سے آئی تھی اور وہ پلٹے بیجا جان سکتی تھی کہ یہ کس کی آواز ہے۔ اس کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی آئی۔ اس نے گردن موڑ کر اس وجود کو دیکھا۔ جس سے زیادہ نفرت اس نے کسی سے کی ہی نہیں تھی۔ اتنی نفرت کہ جس کے لیے نفرت کا لفظ ہی چھوٹا پڑ جائے۔

”کیسی ہو؟“  
 سوال نے اس کے اندر کلی آگ کو ہوا دی تھی۔

”میں نے یہاں آپ کو اپنا احوال سنائے یا آپ کا احوال دریافت کرنے نہیں بلایا ہے۔ مسٹر یامین شیر علی۔“ وہ لفظ نہیں تھے۔ تم تھے جو یامین شیر علی کی ہستی کو بار بار دھماکوں سے اڑا رہے تھے۔

”بیٹی۔ تم۔“ اس نے کہنا چاہا مگر روشائے نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور ایک جھٹکے

سے کھڑی ہو گئی۔

”چند باتیں ہیں۔ صرف چند باتیں۔ جو میں آپ سے کرنے والی ہوں۔ اور آپ اس کے درمیان میں نہیں بولیں گے۔ ان باتوں کے ختم ہوتے ہی میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ یہ ہماری آخری ملاقات اور آخری بات ہے۔“ وہ دھیسے لہجے میں کہہ رہی تھی مگر روشائے نے شیردل کے الفاظ اور انداز ایسے تھے کہ یامین شیر علی لب بستہ رہ گیا۔

”جب میں پانچ سال کی تھی تب آپ نے میری فرشتہ صفت ماں سے محبت کے نام پر دوسری شادی کرنے کا اجازت نامہ زبردستی حاصل کیا وہ آپ کی محبت میں اتنی اندھی تھیں کہ بغیر پڑھے ہی اجازت نامہ پر دستخط کر دیے بعد میں انہیں پتا چلا کہ ان کے عزیز از جان شوہر نے ان سے اجازت نامے پر نہیں بلکہ دھوکے سے خلع نامے پر دستخط لے لیے تھے۔ کیونکہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتے تھے ایک مالدار اور جیٹ عمر انگریز عورت سے۔ اس کی دولت کی لالچ میں وہ انتہائی سرد اور زہریلے لہجے میں بول رہی تھی۔

”میری بات تو سنو۔“ یامین نے کہنا چاہا۔  
 ”آپ میری بات سنیں۔“ اس نے دھیسے مگر ڈھبناک انداز میں باپ کو وہیں ٹوک دیا۔ یامین شیر علی سسم کر چپ ہو گیا۔ وہ اسی کی اولاد تھی۔ اس کی صورت بالکل ویسی ہی تھی۔ بے حد حسین پرکشش اور تیور بھی ویسے ہی تھے۔ اکھر مغرور سفاک۔ آج اس کا آئینہ اس کے سامنے تھا جس میں سے اپنا ہی عکس دیکھنا تھا۔

”آپ نے میری معصوم ماں سے محبت کر کے شادی کی تھی۔ پھر طلاق بھی دی اور سب

جو کچھ میری ماں کے نام پر تھا۔  
 وہ سب بھی اس سے لے لیا۔ خلع کا ڈرامہ آپ نے اس لیے کھیلا کہ اس طرح سے آپ کو وہ بھاری حق مہر ادا نہیں کرنا پڑتا جو میری ماں کے نام پر تھا۔ اور پہلی بیوی سے چھٹکارا بھی مل رہا تھا۔ سودا برا نہیں تھا۔ پرانی بیوی کے بدلے میں نئی بیوی اور پرانی بچی کے



بدلے میں تھی۔ یہ طرے ہنس مگر اس کی آنکھوں میں ایسی تیرہ رہی تھی کہ یا مین کی زبان گنگ ہو گئی۔

”میری ماں سے سب کچھ چھین لیا تھا آپ کی ہوس ولایع اور خود غرضی نے۔ آپ میرے باپ نہیں تھے صرف گھر میں رہنے والے مہمان تھے ایسا مہمان جس کے آنے پر کوئی خوش نہیں ہوتا۔ میرا اور آپ کا تعلق صرف اتنا ہے کہ میری پیدائش کے سرٹیفکیٹ اور دوسرے کاغذات پر آپ کا نام باپ کے کالم میں لکھا رہا تھا۔ آپ میری ماں کے قاتل ہیں۔“

اس نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

”اس نے خود کسی کی بھی دشمنانہ۔“ یا مین نے بمشکل کہا۔

”دنیا کی نظر میں۔“ یا مین شیر علی کی بات سنا۔

”آپ نے جو زخم انہیں دیا تھا وہ ان کی طاقت سے زیادہ تھا۔ وہ نیم پاگل ہو گئی تھیں۔ موت سے پہلے کے آخری چند ایام جو میں نے ان کے ساتھ گزارے تھے وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ خود کو دلہن کی طرح پور پور سجا کر بیرونی دروازہ کھول کر آپ کے آنے کے انتظار میں رات رات بھر کھڑی رہتی تھیں۔ وہ کھانے پکایا کر میز پر بھر دیتی تھیں۔ انہیں میں تک بھول گئی تھی۔ فون کا ریسیور ہاتھ میں پکڑ کر نجانے کس کس کو کالیں کر کے آپ کے بارے میں گھنٹوں باتیں کرتی رہتی۔ ایک مرتبہ انہوں نے پاکستان فون کیا۔ آپ ہی کے سکے بھائی شہباز شیر علی کو۔ وہ ان سے بھی ہنسکی بہلی باتیں کر رہی تھیں۔ تب تیا جان کو جھٹکا لگا تھا۔ انہوں نے فوراً اپنی سیٹ پیرس کے لیے بک کرائی تھی۔ تیا جان سے باتیں کر کے می نے مجھ سے کہا تھا کہ روشنی۔ میری جان! میں بہت دور جا رہی ہوں۔ می کے جانے کے بعد تم اپنے تیا اور انا کے پاس چلی جانا وہاں فیصل ہو گی۔ وہ تم سے کھیلے گی۔ اور اسی رات انہوں نے ڈھیر ساری نیند کی گولیاں کھالیں۔ مجھے ان کا چہرہ بہت پسند تھا۔ میں گھنٹوں اپنی ماں کا چہرہ

دیکھتی اور تھکتی نہ تھی۔ یہ گویا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس رات آخری بار میں نے کتنی ہی دیر ان کا چہرہ دیکھا تھا۔ اور پھر نجانے کب خود بھی سو گئی تھی۔ کتنے کتنے کی یا مین نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو بمشکل اٹھا کر اس کو دیکھا۔ وہ لبوں کو جھپٹے ہوئے کھڑی تھی۔

آپ نے مجھ سے میری ماں کو چھین لیا۔ وہ میری ماں ہی نہیں میری کل کائنات تھی۔ میری دوست میری بہن میرا باپ میرا بھائی۔ سبھی کچھ۔ اس نے پھر بولنا شروع کر دیا۔

”وہ بے حد خوب صورت تھیں۔ اتنا حسین چہرہ میں نے اپنی زندگی میں پھر دوبارہ نہیں دیکھا۔ وہ وفا کی پتلی تھیں۔ حیا دار اور پاک تھیں۔ جو دل آپ کے ان کے ماتھے پر لگایا تھا وہ اسے سہہ نہ سکیں۔ آپ ان کے قاتل ہیں۔ میں اس دنیا میں صرف اور صرف ایک شخص سے نفرت کرتی ہوں اور میں اس دنیا میں ایک چہرہ پھر کبھی نہیں دیکھنا چاہوں گی۔ حتیٰ کہ روز قیامت بھی نہیں صرف پیچھے کر کے کھڑی ہوں گی۔“ وہ بے حد ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ یا مین شیر علی کا پورا بدن ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔

”پتا ہے آپ نے میرے ساتھ کیا دشمنی کی۔؟“ اس نے یا مین کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔

”میرا بھروسہ دنیا کے ہر فرد سے اٹھا دیا۔ میں نے زندگی کے بیس سال ایسے گزارے جیسے ساٹھ سال کی بڑھیا گزارتی ہے۔ میں نے کتابوں میں پناہ لینی شروع کر دی۔ لوگ کہتے ہیں میں کامیاب عورت ہوں، مگر میں اس کامیابی کی اصل وجہ جانتی ہوں شہباز آپ کے بھائی ہیں مگر میرے لیے وہی میرے باپ ہیں عالیہ میری ماں کی سگی بہن ہے مگر وہ میرے لیے میری مائی نہیں ہے بلکہ سکی ماں کی طرح ہے۔ فیصل میری بہن ہے۔ میرا خاندان یہی ہے۔ مجھے اب مزید کسی رشتے کی ضرورت نہیں۔ خدا حافظ۔ ہمیشہ کے لیے“

جائے اپنی اسی سراب دنیا میں لوٹ جائے۔ ہماری زندگیوں میں کسی یا مین شیر علی کے لیے جگہ نہیں

”وہ بول کر آگے بڑھ گئی۔ چلتے چلتے اس نے ثابت بے دردی سے اپنی آنکھوں میں اٹنے والے آنسوؤں کو ہتھیلی سے رگڑا اور پرس میں سے گلاسز اور کار کی چابی نکال لی۔

یا مین شیر علی وہیں پہنچ پر بیٹھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”تم نے ٹھیک کہا میری بچی وہ سراب ہی تھا حقیقت نہیں۔ جس کنکر کی خاطر میں نے ہیرے کو ٹھکرا دیا تھا وہی کنکر پوری زندگی میں پورے وجود کو لوہان کرنا رہا ہے۔“ وہ بڑبڑاتا رہا تھا اور رو رہا تھا اور اس پاس کھیلنے والے بچے رک کر اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور کچھ لوگ اسے دیوانہ سمجھ کر افسوس کر رہے تھے مگر وہ دیوانہ نہیں تھا وہ تو ناناڑی تھا۔ اس نے جنت کے بجائے دلدل کا انتخاب کیا تھا اور اس دلدل پر بچے سبزے کو ہریالی سمجھ کر اس پر ایک نئی جنت بنانے چلا تھا۔

گھر سے وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کا بہانہ کر کے نکلی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو بھی یا مین کے ساتھ ملاقات کی خبر دے۔ وہ اس قہر کو پاک کرنا چاہتی تھی اور اس نے آج یہ کر ہی دیا۔



گھر پہنچی تو شیردل کو لاؤنچ میں بیٹھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ یا مین سے ہونے والی ملاقات کا ہر ابھی باقی تھا جو شیردل کو دیکھ کر اس کے دل پر اثر کرنے لگا تھا۔ وہ بہت سرد انداز میں اس سے ملی تھی۔ شیردل نے بہت ہی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہو رہے تھے۔

”آپ اچانک کیسے آ گئے؟“ اس نے فیصل کو دیکھتے ہوئے سوال شیردل سے کیا تھا۔ شہباز اور بیگم شہباز نماز ادا کرنے اٹھ کر جا چکے تھے۔ فیصل نے بھی دونوں کو تنہائی فراہم کرتے ہوئے وہاں سے کھسکا مناسب سمجھا۔

”یار! پہلے کچھ کھانے پینے کا پوچھو“ تھک گیا ہوں

آرام و آرام کرو اور پھر انٹرویو لینا۔“ وہ خوشدلی سے مسکرایا۔

”ٹھیک ہے آئیے۔ میرے کمرے میں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”سامان لائے ہیں؟“ اسے یکدم خیال آیا۔

”ہوں۔“ عدیل نے پہلے ہی تمہارے بیڈ روم میں رکھ دیا ہے۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”ابھی تو ڈنر کا وقت قریب ہے۔ ڈنر سے پہلے کچھ کھایا تو بھوک مٹ جائے گی۔“ اسے دھیان آیا۔

”میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔ آپ چل کر چینیج کر لیں۔“ اس نے کہا۔ شیردل اسے بہت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ آف موڈ کے ساتھ بھی وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

”چھوڑو کافی پہلے چل کر میرے کپڑے نکال دو۔“ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے لے کر میڈیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ روشنائی نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ سے چھڑا لیا۔

”سب ہیں گھر میں۔“ وہ ہولے سے بولی اور زینہ چڑھنے لگی۔ کمرے میں پہنچتے ہی شیردل نے دروازہ بند کر دیا اور اسے اپنی مضبوط بانسوں میں لے کر سینے سے لگا لیا۔

”یہاں تو ہمارے سوا کوئی نہیں ہے۔ میں تمہارا کس قدر عادی ہو چکا ہوں۔ جیسے ہیروئن جیسی ہیروئن بننے کا۔“ وہ بول کر خود ہی ہنسنا عام دن ہوتے تو روشنائی معمول کی طرح اس کے سینے پر سر ٹکا کر آنکھیں سکون سے موند لیتی۔ مگر وہ عام سے احساسات سے نہیں گزر رہی تھی۔

”شیردل! آپ یوں اچانک کیوں آئے ہیں؟“ اس نے خود کو اس کے حصار سے نکالتے ہوئے از حد سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیوں؟ تمہیں اچھا نہیں لگا میرا آنا؟“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔

”نہیں۔ اس لیے کہ کل میں خود آ رہی تھی۔“ وہ بے وحشک بولی۔



”مجھے نہیں بتا دیا تھا۔ تم نے پرہیزگشی والی خبر مجھے کیوں نہیں دی؟ اور ہاں۔ تم اس وقت کہاں سے آ رہی تھیں؟ کلینک ٹائمنگ یہ تو نہیں ہوتے۔“

شیردل نے سوال کیا۔

”میں کلینک نہیں گئی تھی۔ کہیں اور گئی تھی۔“ وہ کچھ توقف کے بعد بولی۔

”کہاں؟“ شیردل نے بے ساختہ پوچھا۔

”کسی سے ملنے۔“ وہ اطمینان سے بولی ”کس سے؟“ شیردل نے غور سے اسے دیکھا۔

”اپنے ’کافندی‘ باپ سے ملنے کچھ اوجھار تھے اس پر۔ وہ انار نے ضروری تھے۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر سنگدل سے بولی۔

”کافندی باپ۔“ شیردل کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”ہاں۔ مگر اس شخص کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ ہم دونوں کا ذاتی معاملہ تھا۔ مجھے اس سے آخری مرتبہ ملنا تھا۔ یہ ضروری تھا۔ آپ نہ بھی پوچھتے تو میں آپ کو بتا دیتی کہ سچ کیا تھا میں میاں بیوی کے رشتے میں کسی قسم کی دراڑ کی قائل نہیں کسی قسم کی بے اعتباری کی قائل نہیں۔ شیردل! یامین شیرعلی میری زندگی کا ایک زہریلا ج ہے۔ ایک بھیانک حقیقت۔ مجھے آپ کو آج نہیں توکل یہ سب کچھ بتانا ہی تھا۔“ وہ کہتے کہتے رکی ”میاں بیوی کے درمیان معاملات بالکل فشو ہوئے چاہیں۔ اللہ نے نکاح کا رشتہ اس لیے نہیں بنایا کہ وہ انسان صرف اپنے نفسیاتی اور جسمانی تقاضے ہی ایک دوسرے سے پورے کریں۔ یہ رشتہ تو شروع ہی اعتبار و اعتماد سے ہوتا ہے۔ جس رشتے کی بنیاد ہی ”بھروسہ“ ہو تو وہاں کوئی دھوکے اور جھوٹ کی عمارت کیسے کھڑی کر سکتا ہے۔“

شیردل! جانتے ہو میں نے تم سے شادی کے لیے منع کیوں نہیں کیا؟“ اس نے یکدم کہا۔ شیردل خاموشی سے اسے دیکھا رہا۔

”کیونکہ مجھے لگا تھا کہ جو کچھ تم کرتے ہو کھلے عام

کرتے رہو۔ تمہارے فیروز اور لڑکیوں کے ساتھ جس بھی قسم کے تعلقات تھے وہ سب کے سب کھلے تھے۔ یہ ایک عجیب بات ہے نا۔ کہ میں نے اپنے اچھے اور میچور رشتے ٹھکرا کر تمہارا انتخاب کیا۔“ ہنسی۔

”نہیں، ہمیشہ کہتی تھی کہ تم جو کرتے ہو کھلے عام کرتے ہو۔ تم جھوٹے اور دغا باز نہیں ہو۔ لڑکیاں خود تمہارے پیچھے آتی ہیں تم ان کے پیچھے نہیں جالتے۔“ وہ ذرا دیر کو سستانے کے لیے رکی اور بیڈ پر بیٹھ کر ٹانگیں اوپر کر لیں۔ اس کو بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔

”تم ٹھیک ہو؟“ وہ فکر مند سا اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”ہاں۔“ روشانے نے گردن ہلائی۔

”تم جانتے ہو۔ میں تمہیں ”تم“ کیوں کہتی ہوں۔“ وہ پوچھنے لگی۔ شیردل سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیونکہ اس طرح میں تمہیں خود سے باندھ لیتی ہوں۔ اور ”آپ“ اس لیے کہتی ہوں کہ میں تمہاری بہت زیادہ عزت کرتی ہوں۔“ وہ اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

”تم بہت خوب صورت ہو۔ میری مٹی بھی ہے حد حسین تھیں۔ میں تمہارا چہرہ بھی گھنٹوں دیکھ سکتی ہوں اور میں ان کا چہرہ بھی گھنٹوں دیکھتی رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کی اتر آئی۔

”شیردل! مجھ سے جب بتایا جانے لگا تھا کہ تمہارے بے کلمات میں نے تمہارے بارے میں بہت سوچا تھا۔ تم جو تھے جیسے تھے میرے سامنے تھے۔ اگر شادی کے بعد بھی تم نہ بدلتے اور اپنی انہی آنکھیں دھڑکنے لگتی رہتی تو مجھے بس افسوس ہوتا، مگر میں پھر بھی نباہ کر رہتی۔ اور اگر تم بدل جاتے تو میں تمہاری عزت کرتی اور محبت بھی۔“ اس نے کہتے کہتے نظریں جھکا لیں۔

”میں نے سوچا اگر بظاہر سلفی کھیلنے نظر آنے والے کسی مرد سے شادی کے بعد اگر اس کا کوئی

بھارتیہ“ سامنے آ گیا۔ تو شاید میں ایک پل بھی اس کے ساتھ نہ رہ سکوں اور علیحدگی لے لوں۔ تو زیادہ بہتر کون ہوا؟ وہ جو کھلے عام سب کرتا ہے اور کسی کو دھوکے میں نہیں رکھتا یا پھر وہ جو شرافت اور پارسانی کا نقاب چڑھائے معصوم عورتوں کو دھوکہ دیتا ہے جیسا کہ میرے باپ نے کیا تھا۔ میری ماں کے ساتھ۔ میرے ساتھ۔“ وہ پھر سانس لینے کو رکی۔

”شادی ایک جوا ہی تو ہوتی ہے۔ میں نے وہ بازی تم پر کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں سمجھو میں اپنے مقدر کو آزار ہی تھی۔ میں نے تم سے شادی کے بعد بہت سوچا، بہت دیکھا بھالا۔ تم نے اپنی وہ ساری آنکھیں دھڑکنے شروع کر دی تھیں۔ نجانے کیوں مجھے تم بے حد بر سکون سے لگنے لگے۔ میں آہستہ آہستہ تم سے محبت کرنے لگی۔“ آخری فقرہ بولتے بولتے اس کا لہجہ دیا آمیز ہو گیا تھا۔

”میں نے پرہیزگشی کی خبر ملنے ہی پہلا فون تمہیں کیا تھا۔ مگر کسی عورت نے تمہارا رسل یوز کا موبائل اینڈ کیا تھا۔“ وہ کہتے کہتے شیردل کی طرف دیکھنے لگی۔ شیردل کو یاد آیا کہ فرخندہ نے فون اینڈ کیا تھا۔ جس پر وہ بگڑا تھا۔ پھر دوبارہ اسے کل بیک کرنے کی پوزیشن میں وہ کئی گھنٹوں کے بعد آیا تھا۔

”ہماری شادی شدہ زندگی کو زیادہ وقت نہیں گزرا“ صرف چند ماہ گزرے ہیں شیردل۔ ان چند ماہ میں تم نے مجھ سے تین موقعوں پر جھوٹ بولا۔ کیا مجھے دہرانے اور یاد دہانی کرانے کی ضرورت ہے؟“ اس کا لہجہ دانداز بدل گئے تھے۔ شیردل اب بھی مطمئن سا اسے دیکھ رہا تھا۔

”کون ہے وہ؟“ اس نے سگلتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”بیوی کسی قوم، رنگ، نسل، مذہب سے تعلق رکھے۔ شوہر پر شک کرنا نہیں چھوڑ سکتی۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

”یہ میری بات کا جواب نہیں۔“ وہ برہان کر رہی۔

”جس طرح یامین تمہارا باپ اور تمہاری زندگی

کے بیٹے ہوئے لحوں کا ایک بھیانک رخ ہے۔ اسی طرح وہ عورت فرخندہ بھی میرے گزرے ہوئے کل کا سیاہ باب ہے۔ وہ عورت میری سگی ماں ہے۔“ اس نے آہستگی سے نچلا لب کاٹتے ہوئے بتایا۔

”واٹ۔ ماں۔ مگر وہ تو بہت تنگ ہیں؟“ وہ حیرت سے اچھل پڑی۔ شیردل کی عمر میں اور ان کی عمر میں زیادہ فرق نہیں تھا۔

”وہ اتنی کم عمر نہیں ہیں، بس لگتی ہیں۔ بابا سے البتہ تقریباً“ بیس“ اکیس برس چھوٹی ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”انتا زیادہ عمروں کا فرق۔“ اب اسے سمجھ آئی کہ شیردل کے والد اتنی بڑی عمر کے کیوں لگتے تھے اور اس کی ماں جس کی عمر تیس بیس برس ہی لگتی تھی وہ تو شاید ابھی چالیس بیالیس کی ہی ہوں۔

”عمروں کے تضاد کے علاوہ اور بہت سی باتیں تھیں جو ان دونوں میں اختلاف کا سبب بنی تھیں۔ بابا کا مزاج سنجیدہ اور دھیما تھا، جبکہ میری ماں بہت شوخ طبیعت کی تھی۔ اس کے علاوہ انہیں ڈھیروں دولت، زور، کپڑا جائیداد، بڑی گاڑی ہر چیز چاہیے تھی۔ جبکہ بابا حق حلال کی روزی کمانے والے ایک سپاہی تھے۔ گاؤں کی زمینوں سے آنے والی آمدن اچھی خاصی تھی۔ اگر ماں چاہتی تو اس میں ہی اچھا گزر کر سکتی تھی۔ مگر اس نے یہ نہ کیا۔ جلیل اکبر بابا کا بہت اچھا دوست تھا۔ شکل عام تھی مگر وہ بے حد امیر کبیر تھا۔ شادی شدہ بھی وہ افریقہ میں رہتا تھا اور وہیں بزنس کرتا تھا۔ بابا کی شادی کے بعد وہ تب آیا جب میرے دوسرے نمبر والے بھائی میٹرک کر رہے تھے اور میں ایک سال کا تھا۔ اس نے میری ماں کو دیکھا اور اس کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے ماں کی کمزوری بھانپ لی تھی۔ دوستی کا لحاظ پاس کیے بغیر اس نے ماں کو تحائف کی صورت میں ترغیب دینی شروع کر دی۔ بابا کی ناک کے نیچے سارا کھیل جاری تھا اور بابا انجان تھے۔ پھر ایک بار بڑے بھائی کی نظریں یہ سارا کھیل آ گیا۔ اس روز گھر میں بہت ہنگامہ ہوا تھا۔ بابا کی سوالیہ نظروں



نے بھی ماں کی غیرت و حیا کو نہ جھنجھوڑا۔

میں پانچ سال کا ہو چکا تھا اور ماں سے بہت اٹھیج تھا۔ انہوں نے بابا سے طلاق کا مطالبہ کیا۔ بابا نے میرے بھائیوں نے انہیں بہت روکنے اور سمجھانے کی کوشش کی مگر ان کی آنکھوں پر سونے کی پٹی بندھ چکی تھی۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ مگر وہ منظر جیسے میری آنکھوں میں بس گیا تھا۔ ماں اس آدمی کے ساتھ جا رہی تھی۔ ہم سب کو چھوڑ کر کوئی بھی چیز ان کے قدموں کو روک نہ سکی تھی۔ میں نے ان کا دہریا پکڑ لیا تھا، مگر انہوں نے اپنا پلو چھڑا لیا تھا اور یہ دیکھے بغیر کہ میرا بیڑھیوں سے گر کر بری طرح زخمی ہو گیا ہوں وہ چلی گئیں۔ بابا مجھے لے کر ہسپتال بھاگے۔ یہ دیکھ رہی ہو۔ اس نے اپنی پیشانی پر لگے ایک مندریل پرانے گھاؤ کے نشان کی طرف اشارہ کیا۔

”پانچ سال کے لگے تھے مجھے۔ بابا مجھ سے زیادہ رو رہے تھے۔ وہ نہایت کرب سے کہہ رہا تھا۔ روشنائی درد مشترک کے تکلیف دہ احساس کے ساتھ گنگ اس کی صورت دیکھ رہی تھی اس کے بعد ہم چاروں نے اس عورت کو اپنی زندگی سے نکال دیا۔ یہ واقعہ حولی میں پیش آیا تھا۔ صد شکر۔ اگر کالونی میں پیش آتا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے روشنائی دونوں بھائیوں کو بابا نے پڑھنے کے لیے باہر بھیج دیا، وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہیں سہیل ہو گئے۔ بابا سے اور مجھ سے ملنے کبھی کبھار ہی آتے ہیں۔ مگر بہت ہی کم وقت کے لیے۔ ہم نے سب سے یہی کہا ہوا ہے کہ ہماری ماں مر چکی ہے۔ اور وہ مر ہی چکی ہے۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے آنکھیں موندیں اور پھر کچھ توقف کے بعد آنکھیں کھول دیں۔

”میں بہت چھوٹا تھا۔ مجھے وادی نے پالا ہوسا اور جب بڑا ہوا تو بابا نے آرمی کی فیلڈ ہی میرے لیے جی پی وہ بہت تمناہ گئے تھے۔ وہ بھائیوں کے بعد مجھے نہیں دور کر سکتے تھے روشنائی! ماں کی اس حرکت نے عورت ذات پر سے شادی کے مقدس رشتے پر سے میرا بھروسہ

ماہنامہ کرن 108

میمونہ صدف

اردو سانس

ختم کر دیا تھا۔ مجھے اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ صنف مخالف میری طرف کبھی چلی آتی ہے۔ میں نے لاشعوری طور پر ماں کا انتقام ان لڑکیوں سے لیتا چاہا۔ مگر وہ تو خود ہی بوکی ہی تھیں۔ پھر مجھے تم نظر آئیں۔ تم سے مل کر تمہیں رفتہ رفتہ جاننا شروع کیا۔ دل نے گواہی دی کہ تم کو ہی زندگی کا ساتھی بنانا چاہیے۔ تمہارا مضبوط کردار تمہاری حیا، تمہاری شرافت اور سب سے بڑھ کر تمہاری وفا۔ یہ سب مل کر تمہیں بے حد حسین بنا دیتی ہیں۔ تمہاری اپنی خوبیوں کی وجہ سے میں نے تمہارا انتخاب کیا۔

میں تمہیں ٹھوٹا نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنی ماں کے بارے میں بھی تمہیں بتانے سے ڈرتا تھا۔ ایک عورت کے ایسے گھناؤنے اقدام کے بارے میں تمہیں کیسے بتا دیتا۔ وہ ذرا دیر کو رکا۔

”روشنی! اس دن جب تم نے فون کیا تھا تو وہ مجھ سے میرے گھر پر معافی مانگنے آئی تھیں۔ اس نے بتایا۔ ہم دونوں کے کیس میں بہت سی چیزیں کاسن ہیں۔ تمہاری ماں کا چہرہ تمہیں اس لیے خوب صورت لگتا تھا کہ وہ بے حد وفادار اور سچی تھیں، وہ تمہارے والد سے مخلص تھیں۔ ان کا دل روشن اور اجلا تھا۔ اتنا کہ ان کے چہرے پر اس اجلے پن کی روشنی نظر آتی تھی۔ اس نے گہرا تجزیہ کیا تھا۔ اور تمہارا چہرہ بھی مجھے اسی لیے خوب صورت لگتا ہے شیردل۔ کیونکہ تمہارا اندر خوب صورت ہے۔ یہی خوب صورتی ہے جو مجھے تمہاری طرف کھینچتی ہے۔ وہ بھگی آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔

مطلع صاف ہو چکا تھا۔ شکر کے باؤل چھٹ گئے تھے۔ ہم اپنی اولاد کو بہترین تربیت دیں گے، ہم ان کو وہ اعتماد اور وہ سب کچھ دیں گے جن سے ہم محروم رہے ہیں۔ شیردل نے اس کے نازک سے ہاتھوں کو اپنے گرم ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ دونوں مسکرا رہے تھے اور یہ مسکراہٹیں ثبوت دے رہی تھیں انہوں نے میاں اور بیوی کے رشتے کا پاس رکھنا ہے۔

✽ ✽





”اٹک تو ہے۔۔۔ ستمبر آنے کو ہے مگر اب تک مجال ہے کہ گرمی کا زور ٹوٹا ہو۔۔۔ اور سے میری عقل بھی پوری ساری ہے جو یہ رہی کپڑے پہن کر پیدل نکل گئی۔ مارے گرمی کے برا حال ہو گیا ہے۔ ایک ہمارا زمانہ تھا کہ ستمبر سے ہی سردی زور پکڑنے لگتی تھی مگر اب۔۔۔ خدا یا رحم کر، سب ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ شائستہ بیگم دروازے سے اندر داخل ہوتی تھیں، ہاتھ پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے چادر اتار کر پرے پھینکتی اور ہاتھ میں تھامے سبزی کے تھیلے کو صحن میں بڑے نواڑی پینگ پر بٹھا دیتا۔

”کیا ہوا ماما۔۔۔؟“ طیبہ ماں کی آواز سن کر جھٹ سے پانی کا گلاس تھامے جوں ہی صحن میں آئی، لال سرخ بڑیاں کا چہرہ دیکھتے ہی ہاتھ پیر پھول گئے۔ ”لکسا ہے بی بی لو ہو گیا۔۔۔ بڑا جی گھبرا رہا ہے۔ ہول اٹھ رہے ہیں۔“ پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کرتے ہوئے انہوں نے طیبہ کو تھمادیا۔

”اریدہ کو کہتی ہوں آپ کالی پیچیک کرے اور میں جلدی سے مسکن جبین بنا کر لائی ہوں۔“ ان کی پیشانی کو چھوتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ بھی تپ رہی ہے۔

”ماما! آپ کو تو بخار سا ہو رہا ہے۔“ اس نے قدرے فکر مندی سے ماں کا ہاتھ تھاما۔

”ارے نہیں بس چوک سے پیدل چلتی آئی ہوں نا تو پسینہ چھوٹ گئے تب ہی بدن تنہ لگا ہے۔ بل جمع کرانے گئی تھی پھر سوچا واپسی پر سبزی بھی خرید لوں اسی لیے پیدل ہی چل دی۔“ انہوں نے گویا اسے تسلی دی۔

اریدہ نے شاید صحن سے ملحقہ باورچی خانے سے ساری گفتگو سن لی تھی تبھی بی بی آپریشن اور اسٹیکو پ لیے باہر چلی آئی۔ ماں کے بازو پر آپریشن کا مونیٹر لپٹا اور ایئر بلب سے ہوا بھرنے لگی۔

”بس تھوڑا سا کم ہے۔ پیدل چلی ہیں نا۔ پسینہ بننے کی وجہ سے ڈاؤن ہو گیا ہو گا۔“ بازو کے گرد لپٹے بیگ کو اتارتے ہوئے اس نے سہارا دے کر انہیں

اٹھایا اور اندر کمرے تک لے آئی۔ طیبہ کے کانچ میں اسپورٹس ویک تھا سو اس نے خود سے چھٹی کر لی۔ جبکہ اریدہ ناسازی طبیعت کے باعث آج گھر پر تھی۔

”ماما آپ تو ابھی سے ڈھے گئی ہیں۔ ابھی تو آپ کی بہو آنے میں بڑا وقت بڑا ہے۔“ لیموں پانی کا گلاس ماں کو تھماتی طیبہ نے یونہی انہیں چھیڑا۔ گلاس تھاتے انہوں نے سرد آہ بھری۔

”بہو نے تو جیسے مجھے سخت پریشان کر میری خدمتیں ہی کرنی ہیں۔ بیٹا تو کام کا ہے نہیں، بہو نے کیا کام کر کے رہتا ہے بھلا۔“ ان کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔

”تو بیٹے کو اتنا کھٹو کام چور کس نے بنایا۔؟ آپ نے ماما۔ جب کوئی کام کرنے کے لیے کہو آپ نے ہر شے سے اس کی طرف داری کی کہ وہ بڑھ رہا ہے سو رہا ہے تھکا ہوا ہے بیمار ہے۔ اور خود چل پڑیں کام کرنے دنیا کے سب ہی لڑکے پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھر کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔ میں اور طیبہ نہیں ہیں؟ ہم نے کیا پڑھائی گئے ساتھ ساتھ گھر نہیں سنبھالا۔؟ آپ نے ہی اس کے بے جالاؤ اٹھا اٹھا کر اسے بگاڑا ہے۔“ اریدہ اکثر ہی اس بابت ماں سے الجھتی رہتی تھی۔

”اب کیا کروں۔۔۔ اکلوتا بیٹا ہے میرا سو ہتھیلی کا چھالنا بنا کر رکھا۔“

”ہاں اور وہ واقعتاً“ چھالائی بن گیا جواب آپ کو درد دے گا اور رہتا ہی رہے گا۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی کمرے سے باہر چل دی۔

”ہاں ماما یاد آیا فریجہ باجی کی منہ کے پاؤں میں موج آ گئی ہے۔ باجی کا فون آیا تھا کہ یاد سے فون کر کے ان کی منہ کی خبر گیری کر بیجے گا۔“ طیبہ نے دروازے کی جو کھٹ پر کھڑے کھڑے ہی انہیں مطلع کیا۔ وہ جیسے کسی گرمی موج میں گم تھیں چونک گئیں۔

”فون کروں یا عیادت کے لیے چلی جاؤں۔؟“ اسی شش و پنج میں جھلا انہوں نے طیبہ کی جانب دیکھا

”آپ کی مرضی۔“ اس نے شانے اچکاتے فیملہ ان پر جھوڑا۔

”چل شام کو مجھے یاد کرانا فون کروں گی۔“ تنکے پر سر نکاتے انہوں نے کمر سیدھی کی۔

”موبائل لاؤں۔۔۔؟ ابھی کر لیں۔“ طیبہ نے اٹھتے ہوئے تجویز پیش کی۔

”نہیں موبائل رہنے دے۔۔۔ نہ وہ مجھے استعمال کرنا آیا اور نہ ہی اس پر مجھے کبھی آواز آئی۔ شام کو بی ٹی سی ایل سے ہی کروں گی۔“ دائیں کروٹ لیتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

”دروازہ بھیڑ دینا۔۔۔ کچھ دیر آرام کر لوں۔ بڑی تھکاوٹ ہو گئی ہے۔“ طیبہ سر ہلاتے ہوئے دروازہ بند کر گئی۔



باہر گیٹ سے داخل ہوتے احمد کے ہاتھ سے شارپز پکڑ کر طیبہ جلدی سے آگے بڑھی۔ باورچی خانے کی سلیب پر رکھ کر اس نے جلدی جلدی سانس پین میں سے چائے پیالیوں میں نکالی۔ اتنے مختصر اریدہ نے ایک ایک کر کے کباب نکالے اور انہیں انڈے میں بھجوا کر گرم تیل میں ڈالنے لگی۔ اتنے میں طیبہ نے نمکو اور بسکٹ کے پیکٹ کھول کر انہیں پلٹلوں میں قرینے سے سجا کر زلی کی زینت بنایا۔

”اریدہ جلدی کرو۔“ طیبہ نے کفگیر سے کباب پختی۔ بسن کو دیکھتے ہوئے کہا جو پہلے ہی چلی بھنی بیٹھی تھی۔

”کیا خود فراسنگ پین میں کوڈ جاؤں؟ جلدی ہی کر رہی ہوں۔“ اس نے دانت نکوسے۔

”ہزار بار ماما کو بولا ہے کہ ہمیشہ گھر میں کچھ نہ کچھ رکھا کریں۔ کوئی اچانک آجاتا ہے پھر عین موقع پر اپنے سپوت کو دوڑانی ہیں۔ ہفتہ ہو گیا کہتے کہتے کہ قیصر اور مانڈا بی لادیں کباب اور سو سے بنا کر فریز کر دوں مگر نہیں گئی۔“ وہ سخت غصے میں تھی۔

پارہ تو طیبہ کا بھی چڑھا ہوا تھا مگر وہ خاموش کھڑی سختی رہی۔ اریدہ نے جلدی سے کباب فراہم کر کے پلیٹ میں نکال کر طیبہ کے حوالے کیے جو ٹرائی کھینچی لاؤنج کی جانب بڑھی جہاں مختلف آوازیں گونج رہی تھیں۔

بڑی باجی فریجہ اپنے بچوں اور شوہر کے ہمراہ آئی ہوئی تھیں اور یہ ساری خاطر داری ان کی شان میں کی گئی تھی۔ طیبہ نے چائے سمیت تمام لوازمات سرو کیے۔

”آنٹی! احمد کے ایڈمیشن کا کیا بنا۔۔۔؟“ فریجہ باجی کے شوہر حنیف نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی تو اسلامی (اسلامک) میں ایڈمیشن ہوا ہے۔ ویسے ایپ کام (ایپ کامز) میں بھی ہو گیا تھا مگر وہاں نہیں لیا اس نے۔ کہہ رہا تھا کہ Nust کے CSS میں نام آگیا ہے۔ دیکھیں اب۔“ شائستہ بیگم نے چائے کی چسکی لی تو دونوں بیٹیں جو کونے میں بیٹھیں اپنے بھانجوں کو کھلا رہی تھیں فلک شکاف قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔

”Nust میں CSS۔۔۔؟“ حنیف بھائی اچھٹے سے طیبہ کی جانب دیکھنے لگے تو وہ ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

”ماما CSS کو CSS کہہ رہی ہیں۔ مطلب کمپیوٹر سائنس۔“ حنیف بھائی نے بمشکل اپنی ہنسی دبا لی مبادا سانس کو برانہ لگ جائے۔

”ماما اسلامک اور ایپ کامز ہوتا ہے۔“ اس نے ماں کی تصحیح کراتے ہوئے اسلامک کے ”ک“ اور ایپ کامز کے ”ز“ پر زور دیا تو وہ کھسپائی ہنسی ہنس دیں۔

”کب ٹھیک سے بولنا سیکھیں گی ماما؟“ اریدہ نے مسکراتے ہوئے اپنی بی بی اے پڑھی ماں کو دیکھا جن کے بولنے سے کہیں سے نہ لگتا کہ وہ میٹرک سے آگے بھی پڑھی ہیں۔

شائستہ بیگم جو مزاج کی بے حد سادہ صاف گو صاف دل اور دنیاوی رکھ رکھاؤ کے معاملے میں اتنا ہی تھیں اکثر اولاد کی تنقید کا شکار رہیں۔ بیٹیاں ماں کے برعکس دنیاوی راہ و رسم نبھانے والی امور خانہ



داری میں طلاق تھیں۔ سو اکثر ہی ماں کے لئے لیتی رہتیں۔ یہ کام کرتا ہے۔ وہ کیوں نہ کیا؟ بات اسے کرتا ہے۔ یوں نہیں بولتا۔ مگر شائستہ بیگم کی سادگی تھی کہ جوتی میں آتا عالم بے خبری میں زبان کی نوک پر اور انہیں معلوم بھی نہ ہوتا کہ کب کیا کہہ گئیں۔ بیٹیاں گھورتی رہ جاتیں مگر وہ سادگی میں اپنی ہی جھونک میں بولتی جاتیں۔

شوہر کے انتقال کے بعد گھر کا سارا انتظام و انصرام بیوی کی چادر اوڑھے جس سفید پوشی سے سنبھالا کوئی نہیں جانتا تھا۔ مگر حالات کے تھپیڑے بھی ان کی سادہ لوح طبیعت پہ چنداں اثر انداز نہ ہو سکے۔ مکان کے کرائے اور بنگ میں جمع شدہ رقم سے کیسے تین بیٹیوں اور ایک بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلوائی، ایک بیٹی کی شادی کی اور گھر کے تمام اخراجات سنبھالے یا تو وہ جانتی تھیں یا ان کا خدا۔ پھر بھی کبھی خدا سے شکوہ کتنا نہ ہوئی۔ ہمیشہ صبر کا دامن تھلے رکھا۔



گھر کی حالت زار دیکھ کر وہ دونوں سالوں سے کڑھن کا شکار تھیں۔ بیس سالہ پرانا گھر جس کا رنگ روغن ہوئے بھی نہانہ بیت گیا تھا، فرنیچر سے لے کر برتن تک ہر شے سے بوسیدگی چھلکتی۔ اب ریوڑیشن کا مقاضی تھا۔ سب سے خستہ حالت دروازوں کی بھی جن کی لکڑی کی جو کھٹس دیمک لگنے کے باعث آخری سائیس لے دی تھیں۔ ابھی گئیں کہ گئیں۔ کھڑکیوں کی لکڑی بھی بھر بھرا کر کرنے کے قریب تھی۔ فی الحال تو محض اتنا ہی بجٹ تھا کہ ترکھان کو بلوا کر تمام دروازے کھڑکیاں ٹھیک کرائے جاتے۔

”اگلے سال ہم گھر کا فرنیچر بھی تبدیل کریں گے۔ کتنا اولڈ فیشن فرنیچر ہے ڈرائنگ روم میں۔ میں تو نئے فیشن کے رنگ صوفے لوں گی جس میں بیٹھ کر بندہ اندر ہی دھنس جائے۔ تو اڑی پٹنگ پر بیٹھی اریدہ خیالی پلاؤ پٹائی سب کی تاشیں پھانک رہی تھی۔“

”اور ہاں صحن کے لیے بڑے بڑے کلمے بمعہ

خوب صورت پھولوں والے پودے بھی لوں گی۔“ ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ لیے وہ خلا میں کسی غیر ملکی نقطے کو گھورتے ہوئے بولے چلے جا رہی تھی۔ پرانے بیٹھی شائستہ بیگم نے تاسف سے سر ہلایا۔

”بس کروے شی چلی کی اولاد۔ واپس نشن پر آجا۔ اتنا اونچامت اڑ۔“

”کیوں ماما؟ ہم نے کیا اونچی اڑان بھری۔؟ ہمیں سال سے پرانا فرنیچر بڑا ہوا ہے۔ اب بھی تبدیل نہ کروا میں۔؟“ سائے سیر مٹیوں پر بیٹھی طیبہ نے گود میں رکھی کتاب بند کر کے ماں کو دکھا۔

”ایک تو مجھے یہ ماما مت بولا کہ پرانے زمانے کی بویا پھر ماموں صغیر یاد آئے لگتے ہیں۔ اللہ بخشے انہیں کیسے ہم ماما ماما کرتے ان کی ٹانگوں سے لپکتے تھے۔“ ہزار بار کی سنی رواد میں ان کی قسطھا۔

”اوکے۔ اماں جی! مدد سے پر آئیے نا۔“ طیبہ نے ٹاک سکڑی۔

”مدد کیا۔؟ شکر کرو خدا کا بہت سے لوگوں سے بہتر ہیں ہم باہر نکل کر دیکھو کیسی کیسی حالت زار ہے لوگوں کی۔“ انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے استغفار کیا۔

”ہاں بہت سوہنا گھر ہے نا۔ کبھی میری دوستوں کے گھر جا کر دیکھیں۔ اسٹیم تھری، بحریہ میں کیسے کیسے عالیشان محل کھڑے ہیں۔ جا کر دیکھیں ماما آپ کو بتا لگے کہ گھر کے کتے ہیں؟ ایک ہمارا گھر مرغیوں کا ڈربا ہے۔“ اس نے ٹاک بھول چڑھائے تو اریدہ بھی بچ میں کود پڑی۔

”اور نہیں تو کیا جو بھی مہمان آئے اوپر سے نیچے تک یوں جائزہ لیتا ہے جیسے ہرنے کے کھنڈرات دیکھ رہا ہو۔“

”پھر کہتی ہیں کہ رشتے نہیں آتے۔ لو بھلا کون سی حوریں چھپا رہی ہیں آپ نے اس مرغی خانے میں نہ ہی کوئی اعلا بیک کر اوٹ نہ باپ کا سہارا نہ گیا یہ گھر وہ بھی سونے پہ سما کہ ہے کہاں سے آئیں رشتے۔“

طیبہ استہزائے نہی۔

”وہ اپنے اگلی پے سے میں فرنیچر نہ لے لوں؟“ سینڈرینڈ فرنیچر بھی بہت اچھا، مناسب پیسوں میں دستیاب ہوتا ہے۔“ اریدہ کی بات پر شائستہ بیگم نے سر ہٹ لیا۔

”سارا پیسہ یوں ہی لگا دے گی۔؟ جوڑے گی نہیں تو چیز کیسے بنے گا؟“ اس کی پے مناسب تھی اور وہ کوئی فضول خرچ بھی نہ تھی کہ اللوں قتلوں پر پیسہ لگا دیتی بڑا جوڑ کر پیسہ رکھتی تھی اور مناسب موقع پر خرچ کرتی۔

”ہاں ہاں جیسے گیٹ سے باہر توڑ کے لائن میں کر بستہ کھڑے ہیں کہ جوں آپ اس کا چیز کھل کر س وہ بارات دروازے پر لے آئیں گے۔“ طیبہ نے چلی کٹی سائیں تو اریدہ کی ہنسی پھوٹ گئی۔

”چل دفع ہو۔ جب دیکھوں ماں کی ٹانگ کھینچتی ہو اس کی بات سن کر وہ جی بھر کر بد مزہ ہوئیں گویا کڑی کسلی گولی چباؤالی ہو۔“

”اچھا ماما! وہ فرنیچر والے کو فون کر کے پوچھیں تاکہ بک ریک کب تک رہے جائے گا۔ بن گیا ہے تو بتا رہے ہم خود اٹھوا لیتے ہیں۔“ اریدہ نے ماں کے بگڑتے موڈ کے پیش نظر فوراً بات بدلی۔

”نمبر ملا۔۔۔ میں بات کر لیتی ہوں۔“ بچوں کی سی فطرت تھی۔ نہ رو تھیں نہ ناراض ہوتیں۔ فوراً ہل جاتیں۔

”طیبہ کریڈٹ ہے تو نمبر ملا دے ماما کو۔“ اریدہ نے طیبہ سے کہا تو شائستہ بیگم فوراً بد گئیں۔

”ہرگز نہیں۔ اس نمونے موبائل کو تو میں ہاتھ نہ لگاؤں۔ ذرا جو مجھے اس میں آواز آجائے۔ کیسی فضول ایجاد ہے بھی۔ ساری نسل کو غلام بنا رکھا ہے۔ مجھے تو کوئی سمجھ نہیں لگتی اس کی۔“

”ان پڑھ سے ان پڑھ بندہ بھی اس کو استعمال کر لیتا ہے۔ ایک آپ ہیں۔“ وہ کچھ لمحے بیٹیوں کو دیکھنے لگیں پھر ہان گئیں۔ طیبہ نے کال ملا کر دی۔

”کیا نام ہے اس بندے کا۔؟“ دوسری طرف

نیل جا رہی تھی۔ وہ کلن سے لگائے لگائے ہی نام پوچھ رہی تھیں۔

”خان۔“ طیبہ نے آگے کیا کہا ان کی توجہ ہی نہ رہی۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

”جی یہ خان بلڈرز ہیں۔؟ بیٹا اب فرنیچر بناتے ہیں نا۔“ پیچھے وہ دونوں پیٹ پر ہاتھ رکھے ہنستے ہنستے دوہری ہو رہی تھیں۔ وہ نا بھی میں دوسری جانب کے جانے والے جملے پر غور کرنے لگیں۔

”بائی میں ٹیکسی آلا آصف آں۔ کے ہوئی گیا اے۔“ وہ طیبہ کا ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ وہ نجل سی ہو گئیں۔

”لو بیٹا معاف کرنا۔ غلط نمبر مل گیا۔“ موبائل کلن سے ہٹاتے انہوں نے طیبہ کو گھورا۔

”تو نے ٹیکسی والے کا نمبر ملا دیا۔“ طیبہ ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

”نمبر کو چھوڑیں ماما۔ پہلے یہ تو بتائیں کہ بلڈرز کب سے فرنیچر بناتے لگے۔؟“ وہ دونوں پھر سے قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔ انہیں اب اپنے کے گئے جملے کا احساس ہوا تو وہ خود ہی ہنسنے لگیں۔



اریدہ سو کر اٹھی تو ٹھٹ آئی تھی تھیں۔ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کا نکاح کیا تھا سو اسی خوشی میں ڈھیروں مٹھائی اور زردہ لائی تھیں۔ ان سے علیک سلک کر کے وہ بلور جی خانے میں چلی آئی۔ جائے کا پانی چڑھا کر کینٹ کھول کر دیکھا۔ حسب توقع گھر میں بسکٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔

ایسا ہرگز نہ تھا کہ وہ اتنے مجھے گزروے تھے کہ مہمانوں کی خاطر داری ٹھیک سے نہیں کر سکتے تھے بس ماں کی نسل پسندی اور بھائی کی کالی آڑے آجانی کہ مدتوں گھر میں کچھ آکے نہ رہتا۔

اس نے جلدی سے لوازمات ٹرے میں نکالے اور ابھی صحن کی جانب بڑھی ہی تھی کہ پیر و ہیں ٹھٹ سے گئے۔



”گفت، اریدہ کے لیے بھی کوئی لڑکا دیکھ کر رکھو“  
شریف لوگ ہوں اور کھانا ٹھیک ہو بس۔ میں بہت  
فکر مند رہتی ہوں اس کی طرف سے۔ ”پہلے وہ ماں کی  
ان باتوں پر رنج ہوتی تھی مگر اب اس نے ماں سے الجھنا  
چھوڑ دیا تھا۔ ماں اس کو اب بھی تذلیل محسوس ہوتی  
جب ہر آئے گئے کے سامنے وہ یہی ہنڈیہ باکس کھول  
کر بیٹھ جاتیں۔

”ہاں ہاں ضرور دیکھوں گی۔“ گفت آنٹی کے گول  
مول جواب پر وہ خاموش ہو گئیں۔  
گفت آنٹی کے جلنے کی دیر تھی کہ طیبہ نے ان پر  
چڑھائی کر دی۔

”کیا ضرورت تھی گفت آنٹی سے کچھ کہنے کی۔  
لوگوں کے قریب کی نظر کمزور نہیں ہوتی کہ آپ انہیں  
بتانے بیٹھ جاتی ہیں۔ ہر کسی کو بہت اچھی طرح نظر آتا  
ہے۔ اور وہ کوچھوڑیں یہ گفت آنٹی جن کے سامنے  
آپ دکھڑے رو رہی تھیں انہوں نے بھی آپ کی  
بیٹیوں کے لیے کیوں نہ سوچا۔ اتنا برائنا ساتھ ہے  
آپ کا۔“ اس کا انداز بہت کچھ جتا رہا تھا اور وہ خاموش  
کھڑی سختی رہیں۔ کیا کہیں؟ اتنے رشتے دار جاننے  
والے تھے مگر ان میں سے کسی نے آج تک ان کی کسی  
بیٹی کے لیے سوال نہ کیا تھا۔ بڑی بیٹی بھی انجان لوگوں  
میں ہی بیاہ دی اور اب۔

گفت آنٹی ڈھیروں مٹھائی اور چاول دے کر گئی  
تھیں کہ محلے بھر میں بانٹنے کے بعد بھی بچ جاتے۔ خود  
وہ شوگر کی مریض تھیں، احمد مٹھائی پسند نہ کرتا اور ان  
دونوں کے ارض بلد اور طول بلد تک پھلتے رقبے کے  
پیش نظر وہ ساری مٹھائی اور چاول ان کے سپرد نہیں کر  
سکتی تھیں لہذا کچھ مٹھائی اور چاول اپنے لیے الگ کیے  
اور باقی اوپر کرانے داروں کے لیے نکال لیے۔

”طیبہ چل میرے ساتھ“ اوپر دے آئیں۔ ”طیبہ  
ایک ہی جست بھرتی پلیٹیں اٹھائے ماں کے ساتھ ہوں  
۔ اوپر کا تین کروں کا پورشن انہوں نے ایک فیملی کو  
دے رکھا تھا جن کے چار بچے تھے۔ دونوں میاں بیوی  
بہت ملنسار اور شریف النفس تھے لہذا شائستہ بیگم کو

کبھی ان کی طرف سے کسی قسم کی پریشانی نہ ہوئی۔  
گئے ہاتھوں ان کے بہت سے کام کر دیتے۔  
”ارے آنٹی کیا اریدہ کی بات کی کر دی ہے۔؟“  
شائستہ بیگم نے بڑی گرجوٹی سے پلیٹیں ان کی طرف  
برسائی تھیں۔ ان کی بات پر آنکھوں کی جوت یکدم  
بجھ گئی۔

”اللہ وہ دن بھی لائے گا۔ یہ میری سہیلی دے کر  
گئی ہے۔ اس نے بیٹے کا نکاح کیا ہے۔ کافی زیادہ دے  
کر گئی تھی۔ رکھنے کی جگہ تھی نہیں اور کھائے جانے  
نہیں تھے تو سوچا تمہیں دے آؤں۔“ ماں کی اس  
درجے صاف گوئی پر ساتھ کھڑی طیبہ بے ہوش ہوتے  
ہوئے بچی۔



”اما اس بار عید پر ہم قربانی کریں گے۔  
دواؤں سے کھڑکیاں نئے لگ گئے تھے۔ چلو کچھ تو نیا پین  
آیا تھا۔ وہ خوش تھیں۔ سواگلی فرمائش جھاڑ دی۔  
”مشکل لگ رہا ہے۔“ وہ چاول چنتی جاتیں اور  
بڑھتی ہوئی منگولی کا روٹا روٹی جاتیں۔  
”ہر سال ہم قربانی کرتے ہیں۔ اس بار بھی کریں  
گے نہ۔“ طیبہ نے ہونٹ بچوں کی طرح لٹکا کر بات  
بتائی۔

”کہنا مشکل ہے۔ اریدہ کی تنخواہ بھی اب گھر  
کے خرچے میں لگنے لگی ہے۔ کہاں سے لاؤں پیسے۔“  
”عید پر قدسیہ بھی ادھر ہی ہوگی۔ سوچا تھا اس کی  
دعوت کریں گے مگر۔“ وہ پٹل منہ میں دبائے لب  
کچھ سوچنے لگی۔

”ہو جائے کی دعوت۔ محلے بھر سے ٹھیک ٹھاک  
گوشت آجاتا ہے۔ سب مل کر بنا لیتا ایک دو چیزیں۔“  
”اما! محلے والے تب دیتے تھے جب ہم بھی پانچ  
تھے۔ اس دفعہ ہم نہیں دیں گے تو کوئی ہمیں نہیں  
دے گا۔ رمضان میں بھی ہم کسی بھی بدلے کے لالچ  
کے بغیر افطاریاں بنا کر بھیجتے ہیں کہ کیا خبر آج کسی کے  
گھر افطاری پر کچھ نہ بنا ہو۔“ آج کسی کی طبیعت خراب

”جی وہ بھی آئے ہیں۔“ اپنا اسٹائنلش سا ہیر کرٹ  
اس نے ہاتھوں سے درست کر کے بڑی سادگی سے  
جواب دیا۔

”طیبہ! سووا سمیٹ لو اور بہن سے کچھ کھانے کا  
بھی پوچھا ہے کہ نہیں؟ تین سال بعد آئی ہے۔“ وہ  
دل ہی دل میں اس کی بلا میں لینے لگیں۔

”عید کر کے ہی جاؤ گی نا۔“ طیبہ نے لوازمات میز پر  
رکھتے اس کی جانب پلیٹ بڑھائی۔

”ارادہ تو یہی ہے۔ مہینے کے لیے آئی ہوں تو عید تو  
کر کے ہی جاؤں گی۔“

”وہاں بھی عید پر ایسی ہی رونق ہوتی ہے قدسیہ  
جیسی پاکستان میں ہوتی ہے؟“ شائستہ بیگم نے چنتی کا  
باؤل اس کے آگے رکھا۔

”نہیں وہاں تو رمضان کا نام صرف افطاری کرنا  
ہے اور جب جس کا دل چاہا عید منائی۔ اپنے ملک کی تو  
بات ہی اور ہے، تمہاری ماں کا کچھر۔ وہاں بہت مس  
کرتے ہیں ہم۔“ کانٹے سے شامی کباب کاٹ کر اس  
نے منہ میں رکھتے تفصیلی جواب دیا۔

”یہاں تو لوگوں کی عید کی تیاریاں ایسے چل رہی  
ہیں۔ بازاروں میں مل دھرنے کی جگہ نہیں۔ بندے  
پر بندہ اور بکرے پر بکرا۔ حالانکہ ”برڈ فلو“ کے باعث  
شنا تھا کہ لوگ بکرے نہیں خریدیں گے مگر۔“ سامنے  
ٹھنسی طیبہ کی بیتی باہر نکلتے دیکھ کر وہ ٹھنکیں۔ قدسیہ  
نے سر کی جنبش سے اسے سرزنش بھی کی مگر وہ بھی  
آخر طیبہ تھی۔ سدا کی ڈھیٹ۔

”اما! بکروں کو برڈ فلو کب سے ہونے لگا؟“ ماں کو  
ٹوکے بنا گزار نہ تھا۔

قدسیہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔  
”تو کیا ہوتا ہے انہیں۔؟ کچھ ہوتا تو ہے نہ۔“ وہ  
مخصوصیت سے پوچھنے لگیں۔

”وہ کچھ کا گھوڑا رس ہوتا ہے۔ بڑے غلو مرغیوں میں  
ہوا کرتا ہے۔“ اریدہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی دیں چلی  
آئی۔

”ہاں وہی۔ اب بندے کو کیا پتا کون سی دوا کس

ہو تو وہ کچھ بتانے کی بہت نہ رکھتا ہو۔ اور جہاں جہاں  
سے افطاری آتی ہے نا وہ اسی لیے کہ بدلہ مکنا ہوتا  
ہے۔ ایک رمضان نہ بھجوا کر دیکھیں۔ کوئی نہیں  
بھجوائے گا۔“ اریدہ نے سولہ آنے کی بات کی تھی۔

”جب لالچ نہیں ہوتا تو اس بات کو دہرانے کا فائدہ  
انسان جب کسی کے ساتھ احسان کرتا ہے تو پھر کر  
کے بھول جاتا چاہیے، کہیں پر بیٹھ کر اسے دہراتا نہیں  
چاہیے۔ جتنا نہیں چاہیے ورنہ سب نیکی یوں  
ضائع ہو جاتی ہے جیسے انسان ایک بلغ لگائے اور پھر  
اس میں اپنے ہاتھوں ہی آگ لگا دے۔“

جب ماں ایسی باتیں کرتیں تو دونوں کو یقین ہی نہ  
آتا کہ ان کی بھولی ماں بھی ایسی دانائی کی بات کر سکتی  
ہیں۔

دو روز بعد ان کی رشتے کی بھتیجی نے ’جوا امریکہ میں  
مقیم تھی‘ پاکستان آنا تھا۔ اریدہ اور طیبہ کی بڑی جھمتی  
تھی قدسیہ سے۔ سولہ لڑی تھا کہ وہ کچھ روز رہنے کے  
لیے ان کے ہاں بھی آئے گی۔

”آئے ہائے۔ فٹ پاتھ پر تو جلنے کی جگہ تک  
نہیں۔ ایسا بکروں کا میلہ لگا رکھا ہے کہ بندہ گزرنے  
سے بھی رہا۔ سڑک پر اترو تو گاڑیاں چڑھ دوڑیں اور  
فٹ پاتھ پر بکرے۔ چلنا محال ہو گیا ہے۔“ گیت سے  
اندرا داخل ہوتے، ڈھیروں شاپرز سے لدی پھندی پا  
آواز بلند شائستہ بیگم بولتی چلی آ رہی تھیں۔ لاؤنج میں  
داخل ہوتے ہی خوشی سے چلا انھیں۔

”ایسے۔ قدسیہ میری بچی۔“ شاپرز وہیں چھوٹ  
گئے اور بھتیجی کے لیے ہانڈوا کیے وہ اس کی جانب لپکیں

”بس پھپھو وہ دن ہی ہوئے اور آج آپ کی محبت  
”ہینچ لائی۔“ ان کے گلے لگی قدسیہ کے لب و لہجے  
سے سچی اور مخلص محبت چھلک رہی تھی۔

”بہت اچھا کیا۔ ماشاء اللہ بڑا روپ آگیا ہے  
گوروں کے ملک رہ کر۔ لگتا ہے اب وہو اس آگئی  
ہے وہاں کی۔ اور میاں نہیں آئے؟“ ان کا جوش دیدنی  
تھا۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ تمامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، ندرل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



”اس کی بات میں دم ہے۔“ قدسیہ کے سر اٹھتے ہیں۔  
اس نے فرضی کالر جھاڑے۔  
”بس جی ہم مہدولت کے باعث اس گھر کی گاڑی چل رہی ہے۔“  
”چل اب گاڑیوں کے خواب دیکھ رہی ہے۔“  
شائستہ بیگم برابر والے کمرے سے سوکھا دھنیا ہاتھ میں لیے ہانپتی کانپتی اندر آئیں سوانہیں پوری بات سمجھ نہ آئی تھی۔  
”ماما میرا مطلب تھا۔“ وہ ہکلائی۔  
”بس رہنے دے تیرے سارے مطلب جانچ ہوں۔“ اٹھ کر پانی پلا۔ ”اس کی بات کاٹ کر وہ وہیں برابر والی بیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ طیبہ نے کوڑے سے پانی کا گلاس بھر کر ان کی طرف بڑھایا۔  
”ماما کل بازار جانا ہے فریجہ باجی کی عیدی لینے۔“  
اریدہ نے بڑے محتاط لہجے میں بات کی۔ وہ جانتی تھی کہ بچھلے کچھ عرصے سے ان کا موڈ سخت بگڑا ہوا ہے۔ بجلی پانی بھٹے سے آئے نہ آئیں۔ ڈھیروں بل ضرور آتا تھا۔ شائستہ بیگم نے اسے خوشگین نگاہوں سے گھورا۔

”تم لوگوں کا باب فیکٹریاں نام لگوا کر نہیں گیا تھا۔ شرم حیاتو سے ہی نہیں تا دیدوں میں۔ جب دیکھو خرچے کی بات کریں گی۔“ ان کے تن بدن میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔  
”قریبانی تو ہم کر نہیں رہے کم از کم بندہ ایک سوٹ ہی خرید لے۔ ان کے سسرال والے بھی کیا سوچیں گے۔ ویسے تو کبھی دنا دلانا ہوتا نہیں مگر اگر آپ نے کبھی پوچھا نہیں۔ عید پر تو بندہ بیابانی کی عزت رکھ لے۔ شکر کریں اتنے اچھے سمہ حیا نے ملے ہیں کہ کبھی شکوہ نہیں کیا۔ ہمیشہ سکھی رکھا آپ کی بیٹی کو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ایک عید کے تہوار پر بھی آپ انہیں نہ پوچھیں۔“  
اریدہ اسے شو کے یارقی رہی مگر وہ اب خاموش ہونے والوں میں سے نہ تھی۔  
”عید پر دنا دینی کو کچھ دنا دلانا تو ہوتا ہے۔ کل کو

جانور کو ہوتی ہے؟“  
”بڑا فلو۔ بڑا مطلب پرندہ۔ بکرے میرا نہیں خیال کہ پرندوں میں شمار ہوتے ہیں۔“ طیبہ نے مصنوعی سنجیدگی سے جتایا۔  
شائستہ بیگم سنی ان سنی کرتے سموسے سے لطف اٹھانے لگیں۔  
”ویسے ملا قسم سے آپ کی بی بی اے کی ڈگری چیک کروانا چاہیے۔ وہ بھی جولاہور جیسے شہر میں رہ کر حاصل کی گئی ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ لاہور میں رہی ہیں؟“ طیبہ کی زبان میں مزید کھلی ہوئی۔  
”تولاہور میں رہنے والوں کے پر نکل آتے ہیں یا سینک؟“ طیبہ کی بات پر قدسیہ کو کلی غصہ آیا۔  
”بندہ کچھ تو بدلتا ہے نا۔“  
”شرم کرو کچھ حیا کرو۔“ طیبہ کے ایک دھموکا قدسیہ نے جڑا تو وہ بلبلاتا اٹھی۔  
”انہیں کوئی شرم لحاظ نہیں۔ جودل میں آیا بک رہا۔“ متاسف نگاہوں سے دیکھتیں وہ عصر کی نماز پڑھنے کو اٹھ کھڑی ہوئیں۔

\*\*\*

بقرب عید میں اب ہفتہ ہی رہ گیا تھا۔ گھر کی حرمت بجلی پانی کے بل کی مدد میں خاصا خرچا ہو گیا تھا۔ سواس عید پر قربانی کی قطعاً گنجائش نہ رہی۔ خود ان کا دل بھی خفا تھا مگر حیا نہیں کہ بچیاں اور دلگرفتہ ہوں گی۔  
”اس عید پر فریجہ باجی کی عیدی بھی لے جانا ہے۔“ سووے کی لسٹ بناتے، پستل منہ میں دابے گھری سوچ میں ڈوبی طیبہ کو یکدم مہاد آیا۔  
”کیوں اس کی عیدی کیوں لے کر جاتا ہے۔ اب تو اتنا وقت گزر گیا اس کی شادی کو۔“ قدسیہ وہیں بلورچی خانے کے دروازے میں ہی کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔  
”قریبانی ہم کر نہیں رہے۔ عیدی تو بھجوا دیں۔ ان کی ساس کیا سوچیں گی ایسے ٹپوٹے بچے لوگ ہیں کہ عید پر بھی بیٹی کو نہ پوچھا۔“ کچھ یاد آنے پر وہ پھر سے سووے کی لسٹ میں چند اشیا کا اضافہ کرنے لگی۔



خدا انخواستہ ہم دونوں کے سسرال والے باجی کی سسرال کی طرح اچھے نہ نکلے تو ہمارا جینا حرام ہو گا۔ آپ تو ہمیں گھر سے نکلا کر ہی دم لیں گی۔ ہمارا گھر اجاڑ کر رہیں گی۔ اس کے الفاظ انہیں چابک کی طرح لگے۔

”طیبہ بکواس بند کرو اپنی۔“ قدسیہ نے آگے بڑھ کر اسے سختی سے جھنجھوڑ ڈالا۔

سامنے بیٹھی شائستہ بیگم کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔ اتنی بے وقعت تھیں کہ اولاد نے بے توقیر اتنی باتیں سنا ڈالیں۔ وہ اپنی بیٹیوں کا گھر اجاڑیں گی۔ ایک ماں؟ لڑکھڑاتے قدموں سے انھیں اور اپنے کمرے کی جانب چل دیں۔ اب سننے کو رہ گیا تھا؟ ”کس قدر کمینہ ہو تم طیبہ۔ ماں ہیں تمہاری مگر مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ تم ماں ہو ان کی۔ وہ سادہ دل ہیں۔ نہیں سمجھ سکتیں کہ کیا کیسے کب پریتا ہے۔ کیا بول دیتی ہیں وہ۔ مگر اس کا یہ مطلب ہو گیا کہ تم ماں کی بے عزتی کرنے لگو۔۔۔ طریقے سے بھی سمجھایا جا سکتا تھا۔ کل سے تم لوگوں کی موشگافیاں دیکھ رہی ہوں۔“ غصے سے قدسیہ کا چہرہ دھک اٹھا۔

”پاکستان اور امریکہ میں یہی فرق تو ہے کہ یہاں رشتوں کا لحاظ ہے۔ اگر یہ بھی نہ رہا تو کیا فرق رہ جائے گا۔“

وہ دونوں اضطراری کیفیت میں پہلو بدل کر رہ گئیں۔

اس دن کے بعد سے شائستہ بیگم کو چپ سی لگ گئی۔ ان دونوں کی ہمت ہی نہ ہوتی انہیں مخاطب کرنے کی پشیمانی ہی پشیمانی۔ پچھتاوا ہی پچھتاوا۔

دونوں کو ماں کو لتاڑنے کی بری عادت بڑھ چکی تھی اور شائد وہ بھی سننے کی عادی ہو گئی تھیں۔ مگر اس بار تو حد سے گزر گئیں۔ اب ماں کی غیر معمولی خاموشی انہیں ہولائے دے رہی تھی۔ قدسیہ بھی دو چار روزہ کر جہلم چلی گئی اور جاتے ہی فون کھڑکا۔ اپنے دو در کے لیے اریدہ کا رشتہ مانگا تھا۔ شائستہ بیگم تو نہال ہو گئیں۔ ان کی لاڈلی بیٹی فرشتہ ثابت ہوئی تھی۔ ساری

پرہی، غنچلی بھول بھال ایسی شادیاں تھیں کہ کوئی نہیں۔

”آج تمہاری آخری چاند رات ہے نا۔“ صحن کی پہلی جی والی بلب جلائے وہ کام بننا کر اب ہتھیلی پر پھول بولے بنا رہی تھی۔

”خدا نہ کرے میری آخری چاند رات ہو۔“ اریدہ نے منہ بسور۔

”مطلب ہمارے ساتھ اس گھر میں۔“ وہ لواسی سے اریدہ کی ٹھوڑی چھو کر بولی۔

”اچھا زیادہ جذباتی مت ہو۔ یہ کوئی چاند رات نہیں ہے۔ بقر عید کی چاند رات نہیں ہوتی کیونکہ چاند دس دن پہلے نکل چکا ہوتا ہے۔“ وہ یونہی ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کی غرض سے بولی۔

”عید کی چھٹی رات چاند رات ہی ہوتی ہے۔ سب کہتے ہیں۔“

”سب پاگل ہیں۔“

”ہم سے بڑھ کر کون پاگل ہو گا۔“ دونوں ایک ساتھ ہنسنے لگیں۔

”ج میں تمہارے بغیر ملا کو تنگ کرنے کا مزا نہیں آئے گا۔“ اس کی بھوری آنکھوں میں یکدم شرارت لپکی۔

”خبردار طیبہ۔ ملا کو ستایا۔ قدسیہ کے سامنے اتنی سکی ہوئی کہ ناقابل بیان ہے۔ انہیں عقل دلانے کے لیے یہ سب بکواس ضروری تھی کیا؟“ بہن کو ناصحانہ انداز اڑاتے دیکھ کر اس نے کندھے اچکائے۔

”انہیں سمجھنا چاہیے۔ ایسے زندگی نہیں گزرتی۔ ہمارے بعد کیا کریں گی۔“

”جتنی زندگی گزرنا تھی نا گزر گئی۔ دنیا میں برے لوگ بھی بڑی مہارت سے سردائیو کرتے ہیں نا تو اچھے لوگ سردہ لوگ کیوں سردائیو نہیں کر سکتے۔ دنیا اچھے لوگوں کی وجہ سے چلتی ہے۔ برے لوگوں کی وجہ سے نہیں۔ وہ جیسی ہیں بہتر ہے انہیں دسار رہنے دیا جائے۔ یہ ان کی فطرت ہے اور فطرت نہیں بدلا سکتی۔“ طیبہ خاموشی سے سر جھکائے بہن کو سستی

رہی۔

\*\*\*

عید والے روز وہ صبح سات بجے ہی اٹھ بیٹھی۔ پاورچی خانے سے برتنوں کے کھرنکے کی آواز آرہی تھی۔ یقیناً ”شائستہ بیگم بیٹھا بنا رہی ہوں گی۔“ اریدہ ابھی سوئی پڑی تھی۔ وہ جلدی سے منہ ہاتھ دھوئی بال سیمٹی پاورچی خانے میں چلی آئی۔

”عید مبارک ملا۔“ ان کے گلے میں پیچھے سے ہانپیں ڈالے وہ لپٹ گئی۔ وہ شیر خور ماڈوں کے میں ڈالتے ہوئے چو نکلیں۔

”عید مبارک بیٹا۔“ اسے خود سے لگاتے پیار کیا۔

”مجھ سے ناراض ہیں نا ملا۔“ اسے بری طرح رونا آ گیا۔

”نہیں میں بھلا کیوں ناراض ہوں گی۔“ انداز بے ریا تھا۔

”ہم کتنی بری بیٹیاں ہیں۔“ آئی ایم سوری ملا۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔ انہوں نے اسے اپنے سینے سے بچھین لیا۔ ماں تھیں اور کیا کرتیں۔

”یہ صبح ماں بیٹی کیا پیر بارہی ہیں۔“ اریدہ مندی مندی آنکھوں سے متحیر کھڑی تھی۔ وہ تو ہاتھ بٹانے آئی تھی مگر وہاں کاتو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔

”آج سے طیبہ میرا ہاتھ بٹائے گی۔ یہ تمہاری اس گھر میں آخری عید ہے نا تو تم آرام کرو۔ میری اچھی بیٹی آج کام کرے گی۔“ وہ حیرت سے منہ کھولے ماں کی بات سن رہی تھی۔

”مم۔۔۔ میں۔۔۔ نہیں ملا۔ اریدہ ہے نا۔“ مدد طلب نگاہوں سے اس نے بہن کو دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے لاروائی سے کندھے اچکائی واپس پلٹ گئی۔

”ملا! آج تو عید ہے نا۔ پرسوں سے ہاتھ بٹاؤں گی۔“ دنیا جہاں کی مصیبت چہرے پر سجائے اس نے کھنکھنے کی کی۔

”چل شہناش۔۔۔ اچھی بیٹی ہونے کا ثبوت دے۔“

”آج ماں آرام کرے گی اور اچھی بیٹی کام۔“ وہ دانتوں

میں انگلی دبائے کھنکھنے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی مگر سب بے سود۔ چکن دھوئی وہ کڑاہی کا مسالا تیار کرنے لگی تب ہی باہر صحن میں شور مچا اٹھا۔ لوگوں کے بولنے کی آواز۔ بکرے کی منمنہاٹ۔ عید مبارک کا شور۔ وہ کفگیر ہاتھ میں لیے باہر آئی۔

صحن میں قدسیہ اپنے میاں کے ساتھ بکرے کی رسی پکڑے کھڑی تھی۔

”میں نے سوچا یہ عید اپنی دیورانی کے ساتھ منالوں۔ یہ بکرا تمہاری عیدی ہے۔“ قدسیہ نے پیار سے اریدہ کے بازو میں چٹکی بھری تو وہ جھینپ گئی۔

وہ کفگیر اٹھائے حیرت سے سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ ابھی اسے ڈھیروں کام سمیٹنا تھا۔ تیار ہو کر بکرے سے ملاقات کے بعد سب کے ساتھ مل کر عید منانا تھی۔ شائستہ بیگم کا بیس سالہ پرانا گھر آج عید کی خوشیوں سے مہک رہا تھا۔

\*\*\*

\*\*\*

\*\*\*

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

نظم حلیہ میں

فلاخو جبین

قیمت 400/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی



قاخروہ گل

## حالیہ سال اور دل

اکثر اوقات دانشمند لوگوں اور خواہ مخواہ کے لیکچر دہی اور خود کو عقلمند ظاہر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی خواتین کے منہ سے جینا بھی سنتی آتی تھی کہ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں پہلے تو اس بات پر بھی اتنا غور کرنے کا موقع نہ ملا تھا مگر اب اکثر سوچا کرتی کہ آخر وہ کون سی گاڑی ہوتی جس کے دو پہیے ہوتے ہیں؟

کار، چنگی، بیس، ٹرک، غرضیکہ ہر طرح کے ذرائع

### تکلیف

مواصلات کو ذہن کے خالی ”رن وے“ پر دوڑاتی مگر حسب سابق کچھ بھی اور کبھی بھی سمجھ نہ آتا اور تب وہ گرم سالے میں گرمی پڑی لوگ جیسی ناک پر ہلکا سا کھاتے ہوئے اپنا دھیان کبھی سائیکل اور کبھی موٹر سائیکل کی طرف لاتی تو جی جان سے ان تمام فارغ دانشوروں پر واری صدمے جاتی جو دنیا جہان کے تمام معاملات کو پس پشت ڈال کر بس کسی طرح ازواجیات اور مواصلات کو ایک کرنے پر تلے ہوتے اور ان کے منہ سے ادا کیے گئے اس مواصلاتی بیان پر خراج تحسین پیش کرنے کے لیے وہ بھی پیچھے نہ رہتی اور فوراً ”سے بیشتر فیس بک پر نام سرچ کر کے“ حسب اوقات ”تشریفی کلمات بھی لکھ بیٹھتی۔ کسی کی بہت ہی زیادہ قائل ہوتی تو ان کے نام کے بے نیچ پر ایک نہیں دو مرتبہ لائیک کر کے اپنے تئیں انہیں ”ہدیہ“ ارسال کرنا بھی نہ بھولتی۔

اور پھر یہ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیوں جیسے اور گاڑی بھی کون سی موٹر سائیکل ہو۔ اپنا سر دھستی اور کہنے والے کے وسیع تجربے اور زیرک نظری پر دلو دیتی کہ واقعی موٹر سائیکل ہی ایک ایسی سواری ہے جو بے انتہا ٹریفک کی بھی پروا نہ کرتی۔ رش ہو یا بل کھاتی سڑک یوں سبک خرامی سے گزر جاتی کہ کسی بھی چمکدار گاڑیوں والے ٹریفک میں پھنسے حسرت سے اس موٹر سائیکل سوار کو دیکھا کرتے جو پنجابی قلم کے ہیرو کی طرح دل ہی دل میں خوش مگر بظاہر بے نیازی ظاہر کرتا ہوا ان سے کہیں پہلے اپنی منزل پر جا پہنچتا اور شاید اسی تحقیق کا نتیجہ تھا کہ آج چینا خواب میں خود کو ضمیر کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا دیکھتی رہی تھی۔

مردوں کے برعکس دونوں ٹانگیں ایک طرف کر کے بیٹھی چینا خواب میں بھی اس بات پر مکمل یقین کر چکی تھی کہ ضمیر اس کا شوہر ناچار ان مردوں میں سے ہے جو ہمارے ملکی حالات کی طرح کبھی نہیں بدلتے اور نہ ہی ان کے بدلنے کا کوئی امکان مستقبل قریب میں نظر آتا ہے۔ چینا کی حسرت ہی رہی کہ ضمیر کبھی خواب میں ہی گمروانی سے بول سکے لیکن ”یہ ہونہ سکا اور اب یہ عالم ہے“ کے مصداق اک تو موٹر سائیکل اور پھر ضمیر کے زبانی لفظوں کے جھٹکے۔ انتہائی بد مزہ ہو کر اس سے پہلے کہ وہ ایک مرتبہ پھر کروٹ لیتی بیڈ کے دامن طرف سائیڈ پیمل پر رکھے الارم کلاک نے اسبلی کے فلور ہاؤس پر موجود سیاستدانوں کی طرح جو بولنا شروع کیا تو پھر چپ کرنا



بھول گیا اور تب تک چونکا رہا جب تک چینا نے اسے میوٹ نہ کر دیا۔

ہندی ہندی آنکھوں سے اس نے الارم کلاک کو نظر انداز کرتے ہوئے وال کلاک پر بالکل "نہو" کے ہند سے پر دونوں سویلوں کو ایک ہوتے دیکھا اور کہنیوں پر زور ڈالتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ جمائی لیتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھنے کے بجائے وقت کی بجٹ کرتے ہوئے ساتھ ہی انگڑائی بھی لے ڈالی اور کچھو میں بالوں کو سمیٹ کر انہیں سر کی پشت پر یوں اکٹھا کیا کہ ان پر دھڑا دینے کا گمان ہونے لگا۔ کبھی سوچتی کہ اٹھ جائے اور کبھی ذہن میں خیال آتا کہ اتوار ہونے کا فائدہ اٹھا کر ایک دفعہ پھر لیٹ جائے اور لیٹ جانے کے خیال پر پسندیدگی کی مر لگاتے ہوئے اس نے الارم کلاک پر پورے دو منٹ بعد کا الارم لگایا اور ضمیر کے تکیے کے پاس رکھ کر خود پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگی، لیکن یقیناً "یہ نہ تھی چینا کی قسمت کہ نصیب آرام ہوتا۔"

چند ہی لمحوں بعد الارم ایک بار پھر بول اٹھا کہ لگتا اب سوئے ہوئے حکمرانوں کو بھی جگا کر دم لے گا اور الارم کلاک چونکہ عین ضمیر کے کان کے قریب رکھا گیا تھا اس لیے یوں اچانک آواز سننے پر وہ پورا ہڑبڑا کر اٹھا کہ اس کی بل جل خود چینا کو بھی بد مزہ کر گئی، لیکن چونکہ وہ ایک بار پھر سونے کے ارادے سے لیٹی تھی لہذا کسی بھی قسم کا رد عمل ظاہر کرنے کے بجائے اقوام متحدہ کی طرح چپ چاپ پڑی رہی کہ نہ کچھ دیکھا نہ سنا۔

لیکن ضمیر چونکہ اپنی نیند ایک بار ٹوٹ جانے کے بعد دوبارہ سو نہیں پاتا تھا لہذا چارو ناچار اسے اٹھنا ہی پڑا کہ یہ اس کی چوائس نہیں بلکہ مجبوری تھی۔ کچھ دیر منہ بسور کہ وہیں بیٹھا رہنے کے بعد آخر کار وہ اٹھا اور صبح جاگنے کے بعد روزانہ کیا جانے والا کام آج پھر کرنے لگا کہ بیش کی طرح سلپرز اس کے بیڈ کے ساتھ عین اس جگہ موجود نہ تھے جہاں وہ رات کو اتار کر سویا تھا پاؤں لٹکا کر بیٹھے بیٹھے اس نے گردن موڑ کر ہاتھ روم

کے دائیں دیوار کے ساتھ وہ سلپرز دیکھنا چاہے جو صرف ہاتھ روم ہی کے لیے استعمال ہوا کرتے تھے اور ان کی حدود ہاتھ روم سے لے کر صرف ہاتھ روم تک ہی تھیں، لیکن کچھ بھی تو نہیں بدلتا تھا وہ فٹ میٹ بھی حکومت کے سرکاری خزانے کی طرح ہمیشہ خالی ہی نظر آتا سو اس نے پلیٹ کر چینا کو ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"چینا۔ مم میرے سلپرز آج پھر نن نن میں مل رہے۔"

"اول۔" چینا نے بڑی آواز سے اپنا ہاتھ یوں جھٹکا جیسے اس کا شوہر اسے سلپرز نہیں بلکہ فلم میں ہیرو ہیروئن سے اس کا دل مانگ رہا ہو۔

"چھوڑو نا ضمیر، تنگ نہ کیا کرو نیند آرہی ہے۔" کشن کو خود سے مزید قریب کرتے ہوئے وہ اب بھی آنکھیں کھولنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھی، لیکن ضمیر کے لیے اب ہاتھ روم سے مزید دوری ناممکن تھی۔ اس لیے کشن کو تقریباً "چھینتے ہوئے پھر سے بولا۔"

"آخر حج جاتے کہاں ہیں میرے سلپرز روز رات مم میں؟"

"بیڈ کے نیچے ہوں گے اور کہاں جائیں گے تمہارے سلپرز ہیں کوئی سیاستدان نہیں ہیں کہ رات کے اندھیرے میں ادھر ادھر ملا قاتلوں کے لیے نکل جائیں۔" چینا تملاتی۔

"لیکن میں تنگ تو سوتے ہوئے سس سس سامنے رکھا ہوں پھر؟" کچھ غلطی نہ ہونے کے باوجود ضمیر شرمندہ ہو گیا تھا کہ اس کی وجہ سے چینا کی نیند ڈسٹرب ہو گئی۔ "چینا رکھتی ہے بیڈ کے نیچے اور وہ بھی تمہارے بھلے کے لیے۔"

"مم میرے بھلے کے لیے؟" نا سمجھی کے احسان مندانہ انداز سے ضمیر اپنی نصف متر کو دیکھ رہا تھا۔ "ہاں تو اور کیا؟ ساری رات تمہارا دماغ بھی تمہارے ساتھ سوتا رہتا ہے نا اس لیے چینا تمہارے سلپرز بیڈ کے نیچے پھینک دیتی ہے تاکہ جب صبح جھک کر تم بیڈ کے نیچے سے اپنے سلپرز نکالو تو تمہارے

دماغ میں خون کی گردش تیز ہو کر تمہیں ایکٹو کر دے۔"

"واہ چینا، واہ یعنی ڈاکٹر تو میں ہوں، لیکن تنگ تمہارے آگے تو میری ڈاکٹری بھی بب بب بس ختم ہے۔" ستائشی نظروں سے چینا کو دیکھتے ہوئے اس کی اس نذر غفلندی پر ضمیر کو بے حد ہیار آیا تھا اور پھر یہ کہ چینا اس کا کس قدر خیال رکھتی ہے وہ بی آئی اے کے متنازعہ پائلٹ کی طرح جھوٹے لگا تھا۔ اگر اس وقت اسے ہاتھ روم نہ جانا ہوتا تو یقیناً "وہ اپنے ہیار کا عملی ثبوت چینا کے سامنے ضرور پیش کرتا، لیکن ابھی چونکہ عشق کے امتحان اور بھی تھے اس لیے چینا کی نیند میں خلل ہو جانے کے خیال سے کارپٹ پر بھی ہنچوں کے بل چلتے ہوئے آہستہ آہستہ سے دروازہ کھولا اور نیچے پاؤں ہی اسٹور روم کی طرف چل دیا اس وقت جبکہ اس کا ایک ایک بل قیمتی تھا۔ بلب روشن کرنے کے بجائے اس نے پونہسی سامنے رکھے جالے دان کے ڈنڈے کو ہاتھ میں لیا اور روشن دان سے بڑتی سورج کی چند کرنوں کے نیچے میں جیسے ہی نظر سامنے رکھے چینا کے سلپرز پر پڑی تو انہی کو پاؤں میں اڑس کر واپس کرے میں پلیٹ آیا اور چونکہ سلپرز مل گئے تھے اس لیے جالے دان کو ساتھ لانے کا تکلف نہیں کیا تھا، مگر شومنی قسمت کہ اپنے تئیں نہایت بگڑے ہاتھ سے دروازہ کھولتے ہی اس کی نظریں چینا سے جا ٹکرائیں جو اچانک ہی بلا ارادہ آنکھیں کھول کر اسے نہیں بلکہ اس کے چہرے سے ہوتی پاؤں میں پنے سلپرز کو دیکھ رہی تھی۔ اس لمحے ضمیر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح وہ چینا نام کا یہ دریا عبور کر کے فوراً "سے پہلے ہاتھ روم جائیے لیکن۔"

"ضمیر۔ یہ تم نے چینا کے سلپرز پنے ہوئے ہیں؟" تشویش سے چینا کی آنکھیں شادی شدہ خواتین کی مکرر طرح پھلتی چلی گئی تھیں۔ "نن نن نہیں تو جان بوجھ کر نہیں پنے میں نے یہ تو بس جیسے ہی میں اسٹور روم میں اسے انٹر ہوا ایکس میاؤں کے نیچے آ آ گئے۔"

"کاش چینا تمہیں جاہل کہہ سکتی۔" چینا کے چہرے پر اس قدر دردناک تاثرات تھے کہ ضمیر کو لکھ بھر کے لیے تو خود پر لعنت بھیجنے کا جی چاہا۔

"پ" بھی پچھلی عید پر تمہارے سلپرز لائی تھی وہ نہیں دھوئے سکے اور یہ جو چینا کے بالکل نئے سلپرز ہیں انہیں پہن کر کھلا کر دیا۔ اب بتاؤ انہیں چینا پنے یا کسی سیاسی لیڈر کے جلمے میں اسے مارنے کے لیے کرائے بردے دیا کرے۔" ضمیر زسری کلاس کے بچوں کی طرح منہ لٹکائے اور آنکھیں اٹھائے کھڑا تھا۔ "اسی لیے تو چینا چاہتی ہے کہ تمہارا دماغ ذرا تیز ہو جائے، لیکن تم۔" بغیر کوئی بھی جواب دیے ضمیر کے لیے یوں کھڑے رہنا بھی ممکن نہ تھا۔ اس لیے اپنا ذہن تیز کرنے کی چینا کی تمام تر کوششوں کی حمایت اور حق میں قرار دے پیش کرنے لگا۔

"معاف کرنا چینا، بس ذرا نیند میں تھا نا اس لیے،" ورنہ میں تمہاری کوششوں کا اتنا معترف ہوں کہ جی چاہتا ہے کہ اپنی ڈاکٹری کی ڈگری بھی تمہیں دے دوں۔"

"ہو نہ۔ ایسے ایسے لوگوں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں مل گئی ہیں کہ مجھے تو نفرت ہو گئی ہے اب ان ڈگریوں

**سلاخ حیات**



قیمت - 300/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

32735021



سے گردن جھٹک کر اس نے دوسری طرف کروٹ لی تو ضمیر ایک بار پھر منہ بسور کر اسٹور روم سے چالے دان اٹھانے کو لڑکا کہ اب اس کے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جب بھی کوئی کام کرنے کی جلدی ہو تب ہی کام ہونے میں اس قدر دیر لگتی ہے کہ اس پر اپنا ذاتی نہیں بلکہ سرکاری کام ہونے کا گمان ہوتا ہے آج اتوار کا روز تھا اور ضمیر نے رات سے ہی سوچ رکھا تھا کہ آج کس طرح ”جشن آزادی“ منانا ہے لیکن چیتا نے صبح ہی صبح مارنگ شو کا کام سرانجام دیتے ہوئے اسے یوں بد مزہ کیا کہ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب کم از کم کچھ دیر کے لیے ہی سہی لیکن وہ چیتا کو مخاطب نہیں کرے گا لیکن خیر ایسے ارادے تو شوہر حضرات شاید دن میں کئی مرتبہ کرتے ہوں گے جو سیاست دان کے پر فریب وعدوں کی طرح محض دھوش خطابت میں ہی ہو جاتے ہوں اور تب ضمیر کا دل بلک ہی تو اٹھا تھا جب واش روم میں شیو کرتے وقت سامنے موجود دھندلا شیشہ اسے بھیگتا ہونے پر بھند محسوس ہوا اور چارو ناچار اسے ایک مرتبہ پھر گردن واش روم سے باہر نکال کر چیتا کو آواز دینی پڑی۔

”چیتا چچ چیتا۔“  
لفظوں کے گیسر لگتے ضمیر کو ایک آنکھ کی جھری سے دیکھ کر منہ بسورتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں ضمیر کو جانے کیا کہا کہ چہرے کے تاثرات کسی تو ناچشم قرض دار کی طرح ایک دم بگڑنے لگے مگر پھر بھی وہ بدستور لیٹی رہی اور آنکھیں بند کر کے اتوار کی خوب صورت صبح کی بے مثال نیند کو ضائع ہو جانے پر آج کے دن کو یوم سوگ کے طور پر منانے پر غور کرنے لگی۔

”تنت تہ تم نے سنا نہیں۔ میں کتنا دودو دیر سے بلارہا ہوں۔“

منہ پر شیو فوم لگائے ضمیر اب باقاعدہ اس کے سرہانے موجود تھا سو چارو ناچار اسے اٹھنا ہی پڑا۔  
”ضمیر کیا تم بھی نا ہر وقت چیتا پر لفظوں کی فائرنگ

ٹرکروپ کے کرتے رہتے ہو۔“

”کتنی دفعہ مم مم میں نے کہا ہے کہ مالک کے مکان سے کہو کہ ہاں ہمیں شیشہ بدلوا دے منہ تو غلط نہیں آتا۔“ فائرنگ کرنے کے الزام کو ٹیکر نہ انداز کرتے ہوئے گویا اس نے ایک الگ ہی ایف ٹی آر ورجن کردادی تھی۔

”دونت وری ضمیر شیشہ بدلوانے سے کچھ بھی ہونے والا نہیں۔“

لا پرواہی سے بیڈ کے ساتھ پشت نکاتے ہوئے اس نے کہا لیکن ضمیر کے چہرے پر کلاس کی آخری پانچ بیٹھے تالاق سے بچے جیسے تاثرات دیکھ کر حملہ پورا کرنا ضروری سمجھا۔

”تمہارے منہ پر بچے ساڑھے چھ ہر شیشے ساڑھے چھ ہی رہیں گے پونے تین نہیں بنے والے۔“

”جھا اچھا زیادہ بے باب باتیں نہ بناؤ اور جاؤ کوئی اور شیشہ لا دو کم از کم میرا منہ تہ تہ تو نظر آئے۔“ ہمیشہ کی طرح ایک سمجھدار شوہر کا کردار نبھاتے ہوئے ضمیر نے چیتا کو امریکا کے منصب پر فائز کرتے ہوئے خود پاکستان میں ہی رہنا مناسب خیال کیا اور اس کی ہر کی ہوئی بات پر ”کھانا سنا معاف“ کا انداز اپناتے ہوئے ایک نیا بیان جاری کر ڈالا جس پر آخر کار چیتا کو بستر سے نکلنا ہی پڑا۔

”سکون سے سونے کی تو چیتا کی حسرت ہی رہے گی۔“ وہ بیروالی۔

”درانج جلدی آتا۔“

بیڈ سے اٹھ کر دروازے تک جاتی۔ چیتا نے پلٹ کر پھر اسے نہ دیکھا۔

”ویسے ضمیر کہوں گی تو نہیں لیکن کاش چیتا تمہیں کھڑوس کہہ سکتی۔“

ضمیر بھی اس وقت جواباً ”کہنا تو بہت کچھ چاہتا تھا لیکن مفاہمتی پالیسی نے اس کے منہ پر اپنی غرض کا کالا سا لگا دیا سو اس نے منہ بھی کھولا کو شش بھی کی لیکن الفاظ بیرونی قرضوں کی طرح نہ ادا ہوئے شوہر ٹانگ

ماہنامہ کرن 124

## پیارے بچوں کے لئے پیاری پیاری کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 2 مارک مفت

قیمت 300/- روپے

ڈاک خرچ 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

کی اس حالت پر چیتا پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے نکل کر دروازہ یوں زور سے بند کر کے گئی کہ ضمیر ایسا سماجیے کوئی عام شہری گاڑی کے کاغذات نہ ہونے پر ٹریفک پولیس کے سامنے سہم جاتا ہے۔ اس کی ووری کے رعب سے نہیں بلکہ اس سے ملنے والے مالی روگ سے۔

\*\*\*

دیکھی ہے ایک لقمہ پرانی تو یوں لگا جیسے کہ کوئی کام کیا ہے ثواب کا انور میری نظر کو یہ کس کی نظر لگی گو بھی کا پھول مجھ کو لگے ہے گلاب کا

(انور مسعود)

خالہ نے تصور میں خود کو کسی خورو اور نوجوان دو شہرہ کی روپ میں دیکھتے ہوئے نیند سے آنکھیں کھولیں اور اسی ترنگ میں پشتو فلموں کی ہیروئنوں کی طرح انگڑائی لینے کے بعد وائیں سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہینڈ مسر کو اٹھا کر خواہنا چروہ دیکھا تو اپنی ہی نظر پر نظربند کا سا گمان ہوا۔ بجلی کی سی سرعت سے کہنیوں کے بل ذرا سرک کر بائیں سائیڈ ٹیبل پر رکھا دو سرا ہینڈ مر اٹھا کر پہلے والے کو تکیے پر رکھا اور اس میں چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ نتیجہ وہاں بھی حسب توقع نظر نہ آنے پر فوراً ”کبیل کو اپنے ساتھ ہی کارٹ تک ٹھیکٹ کر لے جاتی خالہ اب ڈرننگ ٹیبل کے بڑے سے آئینے کے سامنے موجود ٹھیس اور ہر زاویے کے ساتھ خود کو دیکھتے جا رہی تھیں مگر چہرے کے تاثرات اس ست کام والی سے بڑھ کر ہرگز نہیں تھے جو کام کی زیادتی دیکھ کر خود کو زبردستی لو بلڈ پریشر کا مریض ظاہر کرنے کی کوشش میں پچھلے خربوزے جیسی شکل بنائے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ خالہ اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرتی ہوئی یوں پریشان تھیں جیسے ممکنہ ہونے سے پہلے ٹوٹ گئی ہو۔ ”تمیں اتنی اتنی کی ہوں تو نہیں پھرنا نہیں آئینے میں اتنی بڑی کیسے لگتا ہوں۔“ خود کلامی کرتے ہوئے آواز میں اس قدر نمی تھی کہ اگر خالہ غور کرتیں

ماہنامہ کرن 125



تو سامنے موجود آئینہ نم محسوس ہوتا۔  
 ”ابھی تو خدا جانے کس کس نے اس بچپنے پر مرثیہ لکھا ہے۔“  
 ”یہ بال۔“ خالہ نے کندھوں پر بکھرے بالوں کو اپنی انگلی پر لپیٹتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے انہیں سنوارا۔  
 ”چتا نہیں، کون کہاں ان بالوں کو سنوارنے کے لیے بے تاب ہو رہا ہوگا۔“  
 خالہ نے زبردستی شرمائی کی کوشش تو ضرور کی مگر ان بعض اداکاروں کی طرح بری طرح ناکام رہیں جن کا اب شرم کے آنے اور جانے سے دور دور تک نہ کوئی واسطہ باقی رہا اور نہ واقفیت!  
 اوہر چیتا گھر کے مختلف حصوں میں موجود شیشوں میں ضمیر کا منہ ڈھونڈنے کی کوشش میں ہلکان درازوں سے ہیڈ مرر تک نکال کر دیکھ لینے کے بعد آخر خالہ کے کمرے میں بڑے ہی آکٹا ہٹ بھرے انداز میں داخل ہوئی تب تک خالہ واش روم جا چکی تھیں البتہ کسی ضدی بچے کی طرح ان کی ٹانگوں سے لپٹ جانے والا کبل کابریٹ پر دھرتا دینے کے انداز میں دھرا ہوا تھا۔  
 چیتا نے بھی کبل کو دیکھ لینے کے باوجود اٹھا کر اسے اس کے ٹھکانے پر پہنچانے کے بجائے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اور خالہ کے ڈرننگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ جہاں ایک بار پھر اسے اپنا سامنے نظر آیا تو وہ زچ ہو گئی۔  
 ”توبہ ہے، کیسا نکما منہ ہے ضمیر کا۔ مجال ہے جو کسی ایک بھی شیشے میں مجھے نظر آیا ہو تو منہ نہ ہوا فٹے منہ ہو گیا۔“  
 ”چیتا۔“  
 غیر متوقع طور پر اسے عقب سے خالہ کی آواز آئی تو خیال آیا کہ اس وقت وہ اپنے نہیں خالہ کے کمرے میں کھڑی ہوئی ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو خالہ واش روم سے نکل کر اسی کی طرف متوجہ پائی گئیں بکھرے ہوئے بالوں کو دیکھ کر ہلکا خیال جو ذہن میں اترا وہ تو یہی

تھا کہ شاید واش روم میں جنوب۔ مگر منہ کے سامنے سے نکرا کر کراچی تک پہنچنے والی تیز ترین ہوائیں واش روم کی کھڑکی سے خالہ سے بھی آکر لائی تھیں۔ یہ بال انہی ہوائوں کے متاثرین میں شامل ہیں۔ چیتا دل تو بہت چاہا کہ ان سے اس بارے میں پوچھتی کہ آخر اس زلف پریشان کاؤنڈہ دار کون ہے، لیکن دل کو بسلا کر بات برائے بات کر ڈالی۔  
 ”خالہ، تم نے چیتا سے کچھ کہا؟“  
 ”خالہ! میں تمہیں دیکھنے میں خالہ لگ رہی ہوں؟“ ابھی تو آئینے کے بولے گئے سچ کا صدمہ کم نہیں ہوا تھا کہ چیتا نے بھی اپنا حصہ ڈال کر انہیں جلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔  
 ”نہیں۔ دیکھنے میں تو تم تو بال لگ رہی ہو، لیکن ظاہر ہے چیتا کے گی تو نہیں۔“ چیتا کا واضح اشارہ ان کے بالوں کی طرف تھا جو آنسو گیس کھائے مظاہرین کی طرح منتشر نظر آ رہے تھے۔  
 ”تمہارا دلغ تو زبان کی طرح ہر وقت آؤٹ آف پیٹرول ہی رہتا ہے۔“ خالہ نے آگے بڑھ کر ڈرننگ ٹیبل کے دراز سے ہیڈ ہیڈ نکال کر بالوں کو یوں بے دردی اور مضبوطی سے جکڑا کہ ان پر واقعی گمان ہوا کہ بال بال قرضے میں ہی جکڑا ہوا ہے۔  
 ”خالہ آؤٹ آف پیٹرول نہیں، آؤٹ آف کنٹرول۔“ چیتا نے بے زاری سے صبح کی گھر خالہ بھی بھلا کب ہار ماننے والی تھیں۔ ٹاک شوز میں موجود سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کی طرح اپنی غلط بات کو بھی درست ثابت کرنے کے لیے فوراً ”کوئی دلیل ڈھونڈ لائیں۔“  
 ”ارے واہ، پیٹرول بھی تو آؤٹ ہو جاتا ہے کہ نہیں؟“ یقینی جیت کا تاثر لیے خالہ نے پوچھا تو چیتا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔  
 ”ہاں ہو تو جاتا ہے۔“  
 ”تو بھلا بتاؤ میں نے کچھ غلط کہا؟“ فاتحانہ انداز میں ابرو چھڑا کر مسکراتے ہوئے خالہ نے پوچھا تو چیتا جل ہی گئی۔

”کاش چیتا تمہیں جاہل کہہ سکتی۔“  
 ”کیا۔؟“ خالہ نے غصے میں چیتا کو دیکھا تو وہ حقیقتاً ”سہم گئی۔“  
 ”نہیں نہیں، میرا مطلب تھا کاش چیتا تمہیں جاہل کہہ سکتی مگر خود سوچو خالہ، کہا تو نہیں نا۔“  
 ”نہیں کہا تو اچھا ہی کیا۔“ خالہ نے اس کی معذرت فراخ دلی سے قبول کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ اس نے کچھ نہیں کہا۔  
 ”کرتی تو چیتا ہمیشہ اچھا ہی ہے، لیکن لوگوں کو پتا نہیں کیوں برا لگ جاتا ہے۔“ کندھے اچکاتے ہوئے چیتا نے بڑی سنجیدگی سے اس بات پر غور کرنا بھی شروع ہی کیا تھا کہ باہر سے سبزی والے چاچا کی طرح ضمیر کے منہ سے اپنے نام کی پکاریں دہائیوں کے روپ میں اس تک پہنچیں۔  
 ”چیتا چیتا۔ اب ناشتا تو دے دو، شش شش شیو تو میں کر بھی چکا ہوں۔“  
 ”ارے واہ ضمیر نے شیو کر لیا۔“ چیتا نے خوشی سے چپکتے ہوئے کہا۔  
 ”آؤ خالہ چائے پیتے ہیں۔“  
 ”لیکن صبح صبح پائے کھائے گا کون؟“ خالہ نے حیرت سے آنکھوں کو زبردستی گول کر کے پھیلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔  
 ”چیتا تو چائے پیتے کا کہہ رہی تھی کہ آؤ چیتا کے ساتھ چلو۔“  
 ”کیوں؟ تمہیں اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیا؟“ جہاں کہیں بھی کام کرنے کا ذرا سا بھی شائبہ نظر آئے خالہ اکثر اوقات ہی وہاں جانے سے بدکتی پائی جاتی تھیں۔  
 ”تو اور کیا اب تو حالات ایسے ہیں کہ ڈاکو بھی اکیلے جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔“ چیتا نے لہجے میں خواہ مخواہ ہی سنسنی بھری جو ایسی کامیاب ہوئی کہ خالہ حقیقتاً حیران رہ گئیں۔  
 ”یعنی اب ڈاکو بھی کیس اکیلے نہیں جاتے؟“  
 خالہ کے سوال پر چیتا نے بڑے روہم سے یوں ہاں

میں گردن ہلائی جیسے رکشے میں بیٹھنے کے دوران ناہموار سڑک کے باعث جھٹکے لگ رہے ہوں۔  
 ”میں بھی سوچا کرتی تھی کہ وہ سیاہ شیشوں والی گاڑی میں کیوں ہوتے ہیں؟ اور ان کے آگے پیچھے اتنی گاڑیاں کیوں ہوتی ہیں؟“  
 ”نہ سوچا کرو خالہ اتنا۔ کہیں لوگ تمہیں دانشور ہی نہ سمجھ لیں۔“ خالہ کی سوچ کے انداز پر چیتا نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔  
 ”ہم لوگ اگر کہیں ایک بھی اصلی والے دانشور کو سمجھ لیتے نا تو آج ڈاکو بھی اکیلے جاتے ہوئے نہ ڈرا کرتے۔“  
 خالہ جو کہ اب تک دانشور بننے سے بال بال بچی ہوئی تھیں انہیں ایسی معنی خیز بات کرتے دیکھ کر چیتا فوراً ”کبل پر سے پھلانگ کر کمرے سے باہر نکل گئی کہ مبادا خالہ اس بال برابر فرق کو باتوں ہی باتوں میں عبور نہ کر جائیں۔“



”First drive of my brand new ferrari feeling excited!“  
 اپنے ڈیمک ٹاپ کمپیوٹر کے سامنے رکھی کرسی پر ایک پاؤں گود میں رکھے اوہ کھلی آنکھوں سے فیس بک پر اپنا آج کا اسٹیٹس اپ لوڈ کرتے ہوئے علی نے منہ پر ہاتھ رکھنے کا تکلف کیے بغیر بڑی بے تکلفی سے جھانکی لی ہی تھی کہ دروازہ ایک دم یوں جھٹکے کے ساتھ کھلا کہ علی کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں اسے لگا کہ ضمیر اس کے کمرے میں داخل نہیں ہوا بلکہ کسی بیرونی ہاتھ نے اسے کمرے کا دروازہ کھولنے کے بعد اندر پھینک دیا ہے۔ یہی نہیں داخل ہونے یا پھینکے جانے کے متنازعہ عمل کے بعد جیسے ہی دونوں کی نظریں ملیں تو تاثرات دونوں کے ایک ہی جیسے تھے یعنی ناقابل یقین!  
 ”ضمیر بھائی، سمجھ یہ نہیں آ رہا کہ آپ کمرے میں اپنی مرضی سے آئے ہیں یا پھینکے گئے ہیں؟“ نظریں



ان پر حملے علی کی کوشش تھی کہ ان کے قریب آنے سے پہلے پہلے یا تو لاگ آف ہو جائے یا کم از کم اسکرین ہی کو چھوٹا کر دے جب ہی اس کی کیفیت ایسی ہی تھی جیسی میٹرک کا طالب علم نقل کرتے ہوئے استاد کی نظر میں آجائے اور اس کے خود تک پہنچنے سے پہلے تمام ثبوت مٹایا چھپا کر چاہتا ہو۔

”میں ان سے سان ہوں یا کیلے کا چھ چھ چھ لگاؤ؟ جو کوئی بھی اٹھا کے پھینک دے۔“ ضمیر نے یقینی طور پر برا متایا، لیکن علی چونکہ اب تک فیس بک کے ہوم پیج کو منہماز کر چکا تھا اس لیے اعتماد سے ان کے برائے کو نظر انداز کیا۔

”مجھے کیا پتا ضمیر بھائی اپنے آپ کا تو انسان کو خود پتا ہونا چاہیے نا۔“

”ہاں تہہ تہہ تمہیں کیا کسی کا پتا ہوگا تم کسی وقت اس کم سے یوٹر کی جان چھوڑو تب نا مجھے تو یہ کمپیوٹر ٹرینڈ تمہاری نئی نویلی دلہن لگتا ہے جب دیکھو اس کے کس تس ساتھ کمرے میں بند۔“

یہ جاننے کے بعد کہ علی پر اب تک ان کے اذمان یا کیلے کا چھلکا ہونے پر بھی شک ہے ضمیر بھائی غصے میں گویا خود کو آگ لگانے والے تھے اور رہی سہی کسر علی کی دلی دلی مسکراہٹ نے نکال دی۔

”وہیے ضمیر بھائی کیا یہ بہتر نہیں کہ اب بب بب تہہ تہہ کرنے کے بجائے لکھ کر بات کر لیا کریں۔“

”میں تہہ تہہ تم سے کمپیوٹر کی بات کر رہا ہوں اور تمہیں غصہ تھا کہ جون جولائی کے درجہ حرارت کی طرح کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔“

اور اس لمحے علی نے دل ہی دل میں دل بھر کے اس لمحے کو سراہا تھا جب اس نے ضمیر بھائی کی طرف سے فیس بک پر فرینڈ ریکونسٹ کو اجنبی قرار دے کر ریجیکٹ کرتے ہوئے انتظامیہ کو رپورٹ تک کر دیا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ ضمیر بھائی جیسے لوگ ہر اسٹینڈس کو عین دوستوں کے کھٹکس کے درمیان لکھنے والے کے بارے میں کوئی نہ کوئی ایسا شگوفہ ضرور چھوڑ دیتے ہیں جسے ڈیلیٹ کرنے میں ہی عزت ہوتی

ہے، لیکن تب کوئی کیا کرے جب اسی شگوفے کھنٹ کے صدقے پائی سب اسٹینڈس کو چھوڑ کر لے فالو اور لائک کرنے لگیں۔

”اوہو ضمیر بھائی، آپ بھی تو مارشل لاء کی طرح اچانک ہی نازل ہو جاتے ہیں نا۔ دروازہ بجالیے تو میں اس وقت داش روم میں ہوں۔“

”ویسے یار بب بب بہت افسوس ہے تم پر۔“ جتنا تم کھانا کھاتے ہو کم از کم اس کا تو حق ادا کر دیا کرو۔“ چند قدم چل کر آگے بڑھتے ہوئے ضمیر بھائی نے اس کے بے ترتیب کمرے کا جائزہ لیا جسے دیکھ کر کھانے ہی ہوتا تھا کہ شاید پولیس اس کمرے کی تلاشی لے گئی ہے۔ پھیلاوے میں اپنی مثال آپ۔

”آپ کو حق چاہیے نا؟“ کرسی سے اٹھ کر علی نے ضمیر بھائی سے ذرا فاصلے پر دن کلاس کے کچے کی طرف ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور اس کے یوں کہنے پر تو گویا ضمیر بھائی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

”ہاں بالکل حق چاہیے۔“

”تو مظاہرے کریں دھڑا دیں، احتجاج کریں اور کچھ نہیں تو بھوک ہڑتال ہی کر ڈالیں۔ اس کے بغیر حق نہیں ملے گا۔“ کندھے اچکا کر مفت مشورہ دیتے ہوئے اس نے ضمیر بھائی کو ترمیم آمیز نظروں سے دیکھا جن کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے بھنا ہوا قیصر خلیفہ سے نان کے ساتھ کھاتے کھاتے ایک دم وانتول میں کوئی تپکی سی نوک وار ہڈی آگئی ہو۔ اس بد مزگی کا رد عمل یعنی طور پر علی کو بھگتنا پڑتا اگر اسی دوران چپنا کمرے میں داخل نہ ہوتی۔

ضمیر بھائی کے صوتی تاثرات یورپ کے موسم کی طرح لمحہ بھر میں بدل گئے تھے۔

”نن نن نہیں میرے یار، میرے ہوتے بھلا تمہیں بھوک ہارے ہڑتال کرنے کی کیا ضرورت ہے میں جو ہوں۔“

”دیکھا علی، ضمیر کو چپنا سے بھی کہیں زیادہ خیال رہتا ہے تمہارا۔“ چپنا نے پار بھری نظروں سے دانت چیتے ضمیر کو دیکھا تو علی جو اصل صورت حال سے

دانت تھا ان کی شوہرانہ کیفیت پر دل ہی دل میں خوب ہنس رہا تھا۔

”واقعی آبی، میں بھی کبھی کبھار آپ کی قسمت پر رشک کرتا ہوں کہ ضمیر بھائی ہیں تو آپ کے شوہر لیکن خوبیاں ساری ساموں والی ہیں۔“

”بب بس میں نے کبھی ان خوبیوں پر غور نہیں کیا۔“ آنکھوں پر لگے نظروں کے چشمے کو شہادت کی انگلی سے ذرا اوپر کرتے ہوئے ضمیر بھائی بمشکل اپنے ذہن کی گاڑی کو آخری گیسرے پہلے میں لائے تھے۔

”غور کرنا بھلا بھی نہیں ہے، ورنہ لوگ پتھر باریں گے۔“

دل کی ہنسی آخر علی کے ہونٹوں تک آہی گئی تھی اور تب ہی ضمیر کو لگا جیسے اس کی بے عزتی کرنے کی رسم ایک بار پھر ادا کی جا رہی ہو۔

”یہ تم دیکھ رہی ہونا، کیسے بب بب بات کرتا ہے مجھ سے۔“

”ہاں بالکل، چپنا بہت اچھی طرح جانتی ہے کہ علی بہت ہی محبت سے بات کرتا ہے تمہارے ساتھ۔“ یوں محبت بھرے انداز میں چپنا کے علی کو دیکھنے پر ضمیر تلملا ہی تو گیا تھا اور تب ہی اسے یاد آیا کہ آج اس نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا ہے۔

”آج ناشتے میں یہی محبت کھلاؤ گی یا نن نن ناشتا ہی رات میں ملے گا۔“

”ارے تو چپنا ناشتے ہی کے لیے تو بلانے آئی تھی نا، لیکن ضمیر تم بھی نا، کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دینا ہونہ۔“ ”نوا“ ہی چپنا کا منہ بن گیا تھا، لیکن یہ کوئی بڑی بات اس لیے نہیں تھی کہ اتحادی جماعتوں کی طرح ضمیر اور اس کے روٹھے اور منانے کا سلسلہ تو چلتا ہی رہتا کہ بات بات پر منہ بنانا تو یوں بھی چپنا کا مشغلہ سا بننا جا رہا تھا۔

اپنی زوجہ کے تعارف میں کہا اک شخص نے دال سے ان کا معترف ہوں، زبانی نہیں چائے بھی اچھی بناتی ہیں میری بیکم مگر منہ بنانے میں تو ان کا کوئی بھی ثانی نہیں

\*\*\*

آج اتوار تھا اور چپنا نے گھر کے تمام ممبران سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اس اتوار کو ان سب کے لیے روٹین کے ناشتے کے بجائے چاننیز بریک فاسٹ بنائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ کھانے کی میز کے ارد گرد اپنی کرسیاں سنبھالے ضمیر بھائی اور خالایوں بے باکی سے ناشتا آنے کا انتظار کر رہے تھے گویا بارات پہنچنے کے بعد دلہن کے آنے کا انتظار ہو۔ ناشتہ کیوں کہ متوقع طور پر چاننیز تھا اس لیے تمام چھری کاٹے پہلے سے موجود تھے تاکہ لمحہ بھر بھی ضائع نہ ہو۔

ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر تھک جانے اور ناشتے کے انتظار میں آکٹا جانے کے بعد اس سے پہلے کہ وہ سب ہی چپنا کو پکارنے لگتے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چپنا پن سے برآمد ہونے کے بعد ان سب کے سامنے ناشتا سرو کرتی پائی گئی۔ چہرے کا جوش و خروش جیتے ہوئے کھلاڑیوں کی طرح قابل دید تھا۔

”آج چپنا نے تم سب کے لیے خاص طور پر سنڈے کا ناشتا بنایا ہے۔“ اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے اس نے اوارے کی طرف سے گویا خیرہ پیش کش کا اعلان کیا تھا۔

”ڈنڈے کا۔؟“ خالہ جو اس غیر متوقع ناشتے کی فوج سے ہی دلبرداشتہ ہو گئی تھیں غور سے سن لینے کا تکلف کیے بغیر ہی بول اٹھیں۔

”لیکن ہمارا تو کوئی قصور نہیں نا۔!“

”ہاں ہاں، قصور تو قصوری مٹیچی والوں کا ہے۔“ ناشتے کے متاثرین میں سر فرست علی کا منہ بھی بگڑا بگڑا سا لگ رہا تھا، لیکن چپنا کو ہمارے حکمرانوں کی طرح سب کچھ نظر آنے کے باوجود بھی جانے کیوں ”سب اچھا ہے“ کا تاثر مل رہا تھا۔ جی ان دونوں کا انداز یہاں گرجہ بہت خوب نہیں بھی تھا مگر اس نے خوب ہی سمجھ کر خوب تر انداز میں جواب دینا مناسب سمجھا۔

”نہیں بھی اپنی ملکہ ترنم نور جہاں۔“ قصور تو ان کا بھی



تھاپید اجو ہیں ہوئی تھیں۔

”یہی تو ہم کہہ رہے نا آلی کہ اگر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہمارا قصور میں کوئی حصہ نہیں ہے تو یہ سزا یافتہ قید نما ناشتا ہمارا کیسے ہو سکتا ہے؟“ علی جو چائیز بریک فاسٹ کی امید لیے ڈائننگ ٹیبل تک پہنچا تھا اب امید ٹوٹی تو رو دینے کو تھا اور تب یقینی طور پر ضمیر بھائی کی آواز کانوں میں بڑتے ہی سب کو ان کے زندہ ہونے کا یقین ہوا، ورنہ علی تو کہنے تیس سوچ چکا تھا کہ شاید وہ ناشتے کا اس قدر غیر متوقع میک اور ہونے کا صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے بیٹھے بیٹھے آرام فرما چکے ہیں۔

”ویسے چیتا سچ سچ برب بتاؤ کہ کیا یہ واقعی ناشتا ہے یا انڈوں نے تمہارے خلاف ہپ پلیٹ میں دھرتا دیا ہوا ہے۔“

”اودہ یعنی تم اس دکھ نما حیرت میں منہ پر خیراتی ایکسپریشن دے کر بیٹھے ہوئے تھے؟“ جن پر تکیہ تھا جب وہی پتے ہوا دینے لگے تو چیتا کا دل چاہا ان پتوں کو نیچے سمیت موڑ دے۔ چیتا کی اتنی درگی کوششوں کے بعد عمل میں آنے والے اس ناشتے کے نام پر بنے انڈوں کے ہجوم اور چیتا کی شکل پر ترس کھلنے کے انداز میں خالہ نے تھوڑا سا چکھنا ضرور، لیکن پھر فوراً ہی یکے بعد دیگرے دو گلاس پانی حلق سے آواز نکالنے کے ساتھ پینے کے بعد بولیں۔

”چیتا تمک مرچ تو توبہ اتنا بار ڈے۔ کہیں کرارا کرنے کے لیے شام کا اخبار تو کھول کر نہیں ڈال دیا اس میں؟“

”چیتا کی محنت کی تو کسی کو بردا ہی نہیں ہے۔“ چیتا کے یوں منہ لٹکانے پر ضمیر کو بے ساختہ ہنسی آگئی تھی۔

”اپنے پیارے اور لاڈلے سے بھائی کو ہی دیکھ لو، چکھنے سے گھنٹہ ڈیرھ پہلے ہی جج جج جس کے منہ پر لوڈ شینڈلک ہو گئی ہے۔“ ضمیر کی براہ راست نشاندہی پر چیتا نے الزام کی تصدیق کے لیے علی کی طرف رخ موڑا تو ضمیر کی بات پر یقین آگیا۔

”ہونہ۔“ علی نے ضمیر بھائی کو دیکھ کر سر جھٹکا اور چیتا کی طرف متوجہ ہوا۔

”آلی، آپ تو آج ہمیں چائینز کھلانے والی تھیں نا۔“ درمیان میں ناشتا رکھے وہ سب یوں افسردگی سے اپنی اپنی ہلشوں کو دیکھے جارہے تھے کہ لگتا تھا ناشتے کی میز پر نہیں بلکہ کہیں قفل کے قتم پر بیٹھے ہوں اور پھر ان میٹوں کے ایک دوسرے پر کیے گئے زبانی جملوں میں خالہ حسب توقع حصہ نہ ڈالتیں یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ جب ہی نور سے کرسی پیچھے کی طرف کھسکاتے ہوئے بات کرتے کرتے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”لو بھئی، یہاں تو کھسانی ملی دنہ نوچے والی بات ہو گئی۔“

”خالہ دنہ نہیں کھیا۔“ چیتا نے حسب عادت جل کر اصلاح کی تاکام کوشش کی یہ جاننے کے باوجود خالہ اپنی غلط بات کو بھی بعض کالم نگاروں کی طرح دلیل سے درست ثابت کرنے کے فن میں مولا ہیں اس سے رہانہ جاتا اور ہمیشہ بول پڑتی۔

”کھیا؟“ خالہ پہلے حیران ہوئیں اور پھر اگلے ہی بل سنبھل گئیں۔

”ہمارے بھئی کے کھے مرہ پڑے ہیں کہ نہیں؟“ چیتا نے مایوسی سے ہاں میں گردن ہلائی۔

”تو بھلا اب ملی مرہ کھے کو تھوڑی نوچے گی؟“ کوئی نوچے گی نا جو کم از کم زندہ تو ہے کہ نہیں۔

”ہاں ہے تو۔“ چیتا نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”لیکن خالہ آپ اٹھ کیوں گئیں؟“ علی نے انہیں کچھ کھائے بغیر ابدول کتنا محسوس کیا تو چھ لیا۔

”تم لوگ کھاؤ مجھے تورات کو بچ کرنے کے بعد سے ویسے ڈی ہو رہی ہے۔“ بات کرنے کے ساتھ خالہ کے منہ کا زاویہ کچھ ایسا بنا جسے عام طور پر ریل گاڑی کا واش روم استعمال کرتے ہوئے مسافروں کا بننا ہے۔

”خالہ ویسے ڈی نن نہیں ہوتا۔ ایسی لٹی کتے ہیں۔“

اس مرتبہ چونکہ خالہ نے ایک ایسی جملی

علامت پر لفظی کاشب خون مارا تھا جس کا تعلق ضمیر بھائی کے رد فیشن سے تھا اس لیے اس مرتبہ درنگی کا پرچم بھی انہوں نے ہی بلند کیا۔ لیکن خالہ یہ بھلا کب بدانت کیا تھیں۔

”نہیں بھی ہو رہی ہے؟“ براہ راست سوال کا رخ ضمیر بھائی کی طرف تھا انہوں نے فوراً ”نہی میں گردن ہلاتے ہوئے کندھے اچکا دیے۔“

”مجھے ہو رہی ہے تو مجھے ہی پتا ہے تاکہ وہ پے ڈی ہو رہی ہے یا ایسی لٹی۔“ یہ ایسی لٹی یا ایسی لٹی خالہ کو کیسے کیسے ہو رہی ہے کب سے ہو رہی ہے وہ کیا محسوس کر رہی ہیں؟ ان تمام تفصیلی علامات کے سننے سے بحالینے بر علی، ضمیر بھائی اور چیتا نے دل ہی دل میں فن پر مجبئی بیل کو دل کی اتھاہ گھرائیوں سے سلام پیش کیا تھا۔ چیتا فوراً ”اٹھی اور لپک کر فون کی طرف بڑھتی ہوئے حیرانی سے خود کلامی کی۔“

”تا نہیں کس کا فون ہے؟“

”ہمارا اپنا فون ہے آلی، بھول کیوں جاتی ہیں ہمیشہ فون آنے پر؟“ ناشتے کے صدمے کے زیر اثر علی چڑ کر بولا اور خود فون اٹھا لیا۔

”بس جی، آج سے آزادی ختم! علی اطلاع انداز میں پکارا۔“

”تمہاری شادی ہو رہی ہے کیا۔“ خالہ نے ملی کے خواب میں چھپھڑے ہونے کی تصدیق کی۔

”عاشق انکل کا فون تھا، اوپر والے پورشن میں کرائے دار آرہے ہیں۔“ علی نے تفصیلی بیان جاری کیا۔

”ڈاؤ علی، جتنی ت ت تم خوشخبریاں سناتے ہونا نہیں تو کسی گنگ گنگ گا تکی وارڈ کی آیا ہونا چاہیے۔“

ضمیر بھائی نے موقع مناسب دیکھتے ہوئے گرتی بلکہ پھسلتی ہوئی عینک کو ایک بار پھر ناک رکھوالی کا قریضہ سوچتے ہوئے اس کا ادھار دیا۔

”چیتا اٹھو جلدی جلدی گھر کی کلیننگ کرلو، میں بھی اپنا ڈریس ایچھنج کر لوں۔“

”ڈریس بے فک چھنج نہ کریں۔ وہ اپنے گھر رہنے کے لیے آرہے ہیں آپ کا سو نمبر کرنے نہیں آرہے خالہ ڈونٹ ورس۔“ خالہ کی کرنٹ لگی پھرتیاں دیکھ کر چیتا نے ہمیشہ کی طرح اصلاحی پروگرام جاری رکھا۔

”چیتا، تم سے آلی سی تو لارج (Large) ہوں خواہ خواہ ہر وقت خالہ خالہ نہ کہا کرو لوگ کہیں گے خدا نا خواستہ پتا نہیں میں کتنی گریٹ ہوں۔“

بات کر کے ہونہ کے انداز میں گردن جھٹکتے ہوئے خالہ اپنے کمرے کی طرف مڑیں تو وہ تینوں دوسرے کامنہ دیکھتے رہ گئے۔

”کاش، چیتا انہیں جابل کہہ سکتی۔“ ایک گھرا سانس ٹھنڈی آدین کر چیتا کے منہ سے نکلا۔

”کہہ دیں آلی کہہ دیں۔ ہماری طرف سے بھی کہہ دیں۔“ علی نے اجازت طلبہ جاری کرنے کے بعد ایک بار پھر ڈائننگ ٹیبل کی طرف دیکھا جہاں ناشتا

دھرتا دیے مظاہرین کی طرح کسی دادرسی کرنے والا کا شہر تھا۔



مرد ہونی چاہیے، خاتون ہونا چاہیے اب گرا نمر کا تھی قانون ہونا چاہیے صرف محنت کیا ہے انور کامیابی کے لیے

کوئی اوپر سے بھی ٹیلی فون ہونا چاہیے ”پڑھائی اور پڑھائی اور پڑھائی۔“ یہ بھی تھی زیادتی ہے اور پھر جتنا بھی پڑھو جس کا اوپر سے ٹیلی فون آجائے اسے چاہے سو تک کتنی نہ آئے، لیکن نمبر سو

میں سے سو بھی مل سکتے ہیں۔ ”تاہم میں چوڑی معاشیات کی کتاب کو اس نے سوتیلی ماں کی نظروں سے دیکھا اور سامنے رکھے میز پر یوں بٹا جیسے کتاب کی مدد سے کوئی مکھی ماری ہو۔“

سو پڑھ پڑھ کر جب اسے معاشیات کی کتاب پر معاشیات نظر آنے لگے تو جی بھلانے کو جیب سے موبائل نکال کر میڈ فون لگایا اور اپنی پسندیدہ

ماہنامہ کرن 131

ماہنامہ کرن 130



”آخر وہ لے کر کیوں گئی میں مم مم مم میرا ٹیٹھہ؟“ جینا مارکٹ جانے سے پہلے ان سے پیسے لے گئی تھی مگر اس وقت سے انہیں اپنے دل کی رفتار میں ترقی کی مانند ہم محسوس ہو رہی تھی اور اسی بات کا تصدیق کے لیے وہ اپنے دل کی دھڑکن کی تصدیق کرنا چاہتے تھے، لیکن شو مئی قسمت کہ آج خالہ وہ بازار نما اٹھیا رہی لے گئی تھیں جو ڈاکٹرز کی شناختی مدت ہوا کرتا ہے بعض جگہوں میں تو ڈاکٹر اور

”ضمیر بھائی اور اتنے پیار سے بات۔ آخر کس  
ساتھ۔“ چارو تاجار علی گواپنا موبائل اور ہیڈ فون  
ب میں ڈال کر آواز کے تعاقب میں جانا ہی پڑا اور پھر  
راجا اس کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔  
ضمیر بھائی راجا کے ہاتھ کی انگشت شہادت سے عنک

”تنت تمہاری چننا؟“ اس سے پہلے کہ چننا خود کوئی اعتراض کرتی، ضمیر بھائی سرکاری وکیل کے لاپس میں سامنے تھے۔

”بس جی، مبارک یاد ہو ضمیر بھائی! چند انے آپ کو بھائی چھوڑ اپنا لیا بنا لیا ہے۔ ریڈی میڈ اولاد کی بہت مبارک یاد، اب تو آپ جیسوں کی بھی عزت کرنی پڑے گی۔“ علی نے ضمیر بھائی کے سامنے سر جھکا کر خود



کو ”میم“ کے انداز میں کھڑا رکھا، لیکن تب تک چند اکا غصہ یوں ظاہر ہوا کہ علی کو اس کی آنکھوں میں کاہل کے بجائے لپ اسٹک لگی محسوس ہوئی۔

”ٹھیک ہے بلغ آپ کا؟ میرے اپنے ہیں اباماتی“  
پیدائشی اور قانونی اور حقیقی۔“

”تمہارے ذاتی ہیں تو کیا ہم سب نے اپنا ٹھیکے پر لیے ہوئے ہیں؟“ علی تو یوں بھی برحتہ گوتھا اور فقروں کی ڈیوڑھی نشین جہاں سے آٹومٹک اسی میل کی طرح خود بخود جواب پر آمد ہوتے جاتے۔

”مہم مانند نہ کرنا چندا“ یہ پیدائشی طور پر  
موسلا دھار چول واقع ہوا ہے اس کے توہپ ہپ ہپ  
پیدا ہونے پر نرس نے مٹھائی نہیں اس کے منہ کو بند  
کرنے کے لیے ٹیپ مانگی تھ تھ تھ۔“ اور اس سے  
سہلے کہ علی ضمیر بھائی کو کوئی کرار اس جواب دیتا اپنی  
گیس اور کپڑے کے تھیلوں میں چھپا کوئی شخص  
لوکھڑائی چال کے ساتھ اندر داخل ہونا نظر آیا اور  
انہیں سوچنے سمجھنے کا موقع دیے بغیر سامان ان کے  
سامنے لا ڈھیر کیا سنگ دل لوگوں کے خون کی طرح  
سفید دھوئی کرتے بر تشویش ناک حالت میں موجود  
گلزنی افغانستان کی حکومت کی طرح ڈول رہی تھی جسے  
اتار کر ہاتھ میں لے کر سر کو کھجاتے ہوئے وہ وہاں اپنی  
کیس کے اوپر ہی بیٹھ کر سانس بحال کرنے لگا۔

”ایا لگا دی تھی کہاں اتنی دیر؟“ چنانچہ اس نور  
نیت اور مولا جٹ کے مکسچر نما شخص کو ایسا کہہ کر  
غیر بغائی اور خاص طور پر علی کے حواسوں پر بجلی  
گرا دی تھی۔ وہ دونوں کسی رخ سے بھی باپ اور بیٹی  
نہیں لگ رہے تھے۔

”اوپری‘ تو ان شر والوں کی چالاکیاں نہیں  
 باتی۔“ سرپر حسب ضرورت کھجالینے کے بعد علی اور  
 عمیر کو قلم میں موجود ایک سٹراز جتنی اہمیت دیتے ہوئے  
 سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد وہ چندا کی طرف متوجہ

”لیکن ہوا کیا؟“

”او ہونا کیا تھا۔ سونو کی والدہ بیٹھ کر ہمارے ساتھ آیا ہے تے کراہے مانگ رہا ہے میرا تیرا۔“ منہ سونو ہوئے لیا ضمیر بھائی کی طرف مڑے۔

”کیوں جی، کرایہ تن پہ تقسیم ہونا چاہیے کہ  
نہیں؟ خیر توں ای بتاؤ۔“ علی کے بجائے ضمیر بھائی  
کی طرف متوجہ ہونے پر ضمیر بھائی کا دل چاہا کہ ان  
تینوں کا نیم دائرہ بنا کر خود درمیان میں لڈی ڈالیں کہ  
انہوں نے اس قدر عقل مند اور اہم سمجھا کیونکہ خود  
جیتا بھی ان دونوں کی موجودگی میں زیادہ تر علی کو  
اہمیت دیا کرتی۔ سو جواب دینے کے لیے ضمیر بھائی  
بولنے کی ہی تنگ دود میں تھے مگر کیا کرتے الفاظ کا  
ہٹ دھرم کرایہ دار بنے باہر نکلنے پر تیار ہی نہیں  
ہو رہے تھے اور اسی دور ان خود ابا دودا بول پڑے  
”چل رہیں دے یار اتنی دیر میں تے جازوی  
چلتے ہیں۔“

”ابا! ہمیں اب چاہیے چلتا۔“ چند اے کے سامنے رکھے اپنی کیس کا ہینڈل پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف سرخ کیا۔

تھے؟“ علی کی بات پر لپانے پہلی مرتبہ غور سے لے دیکھا۔

”واہ اوے پتری“ تو تے بڑا مخولیا ہے۔ کیا بات

”نہیں سمجھ آئی؟ پھر کروں؟“ علی نے فری آنز پیش کی مگر ضمیر بھائی نے آنکھوں اور ابروؤں کے عجیب و غریب اشاروں کے ساتھ بات کرتے ہوئے ابا کو آخر نظر انداز کرنے پر مجبور کر دیا۔

”نن نن نہیں رہے دو“ تم جاؤ اور کچھ  
ادھوری بات کے خاتمے پر پھر اشارے علی کو سمجھا  
تھے کہ وہ یقیناً ”ابا اور چندا کی مہمان نوازی اس کے  
ہاتھوں سے کروانا چاہتے ہیں جیسی مسکراتے ہوئے  
دونوں کو دیکھتے ہوئے یکن کی طرف بڑھ گیا۔

”آپ بیٹھیں، رہا یلینز“ ضمیر بھائی کے ہمراہ آپ

منوفوں پر آکر بیٹھ چکے تھے اور ابھی مسکراہٹوں کا جاولہ  
 ہونا شروع ہوا ہی تھا کہ علی ٹرے میں چائے کے دو کپ  
 لیے ان کے سامنے بھی موجود تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے  
 رشتہ دیکھنے والی ٹیم کے سامنے عام طور پر چائے کی ترائلی  
 لے جانے والی لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ  
 شراباٹ گھبراہٹ کی جگہ یہاں دلیری اور ہوشیاری  
 تھی۔

”پتہ ہی“ ویسے اس کی ضرورت تو نہیں تھی۔ ”ایا  
نے رسماً“ کہتے ہوئے کپ اٹھانا چاہا مگر علی نے فوراً  
بڑے پیچھے کر لیا۔

”چلیں کوئی بات نہیں جی، پھر سہی کیوں ضمیر بھائی؟“ مگر اس سے پہلے کہ ضمیر بھائی کوئی جواب دیتے پہانے خود اٹھ کر علی کے ہاتھ سے رے جھپٹنے کے انداز میں لیا اور اپنا کپ لے کر دو سرا چندا کے سامنے رکھتے ہوئے چلا گئے۔

”سہیں“ میرا مطلب تھا کہ اب چلو پی پو لیتے  
ہیں۔“ بات کر کے اپا نے ایک گھونٹ لینے کے لیے  
گپ منہ کو لگایا ہی تھا کہ چندا نے اپنا کپ برا سامنے  
بناتے ہوئے واپس رکھ دیا۔

”مٹھ ٹھنڈی؟“ ضمیر بھائی نے انکو اڑی کرتی نظروں سے علی کو دیکھا جو خود ان تینوں سے کہیں زیادہ حیران دکھائی دے رہا تھا۔

”ٹھنڈی کیسے؟ ابھی چار گھنٹے پہلے ہی تو آپ نے بنائی تھی تب تو منہ جلار ہی تھی۔ اسے ٹھنڈی آخر کر کون گیا؟“ حیرت کے ساتھ سوچتے ہوئے علی نے ضمیر سے معصومانہ سوال کیا جس کا جواب دینے کے لیے ضمیر بھائی نے کوششیں عین کر دی تھیں مگر ان کے کاماب ہونے سے پہلے ہی چند اٹھ کھڑی ہوئی۔

یقیناً "یہ سگوارا نہیں تھا کہ ان کے مہمان کچھ کھائے  
بھیے بغیر بی گھر سے چلے جائیں اسی لیے کمال پھرتی سے  
خود اٹھ کر کھانا لے کر آئے۔" لیکن غصہ بھائی کو

دیے۔  
 ”لے کیسے اپنے گھر۔ آپ یہ۔“ ضمیر بھائی نے  
 ”جیس“ کہنے کے عمل سے گزرنے کے دوران انہیں  
 ہاتھ کے اشارے سے ہی جوس پینے کا کہا تو ایا نے مال  
 غنیمت جانتے ہوئے جوس کا ڈبلیا اور انہیں مزید کچھ  
 بھی کہنے سے روک دیا۔

”تو رہیں دے، نہ تجھ کے مارے ہو یہی پی ٹی لیتے ہیں۔“ ابانے اسٹرا کی مدد سے ایک ہی سانس میں جو پینا شروع کیا تو ایسے کہ ڈبے کے اندر سے بھی آوازیں آنے لگیں۔ ڈبے کے اندر ہوتے اس احتجاج نے خود چند اکو بھی شرمندہ کر دیا تھا سو نظریں چر آ کر لفظ چباتے ہوئے اطلاعی انداز اپنایا۔

”ابا جوس ہو گیا ہے ختم اس لیے پلیز چھوڑ دیں ابا۔“

”چھوڑو! ابانے جس حیرت اور غصے سے چندا کو دیکھا تو اسے لگا جیسے اباجس کے ڈبے کے اندر ہوئی شرل شرل کی وجہ سے کچھ غلط سمجھ بیٹھے ہیں کہ شاید اس نے اباکو ڈانسیس یہ دنیا ہی چھوڑنے کو کہہ دیا ہو۔“

”یہ ڈبا چھوڑ دوں؟“ تے یہ جو جوس ڈبے کی دواہوں پر لگا تھا اور یہ جو کونوں میں بچا تھا، اوکیا یہ مختوم سخت ملا تھا دکان سے؟“ ان کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے چندا نے عملی قدم اٹھاتے ہوئے ان کے ہاتھ سے ڈبالے کر ٹیبل پر پٹا تو اسٹرا سے جوس کا ایک قطرہ رے میں جاگرا اس وقت لبا کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لائق تھے۔ انتہائی دکھ سے چندا کو دیکھا۔

”کراویا نا ضلع!“ ”جواباً“ ایک مرتبہ پھر خاموشی سے چند ان کو لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

”آبی آجائیں تو ہم چکر لگائیں گے آپ کے گھر کا۔“ علی نے یوں خاموشی سے انہیں اپنے دس سدھارتے دیکھا تو خود ہی کہہ دیا جس پر ابانے چند اور چند انے ابا کو یوں دیکھا جیسے سیڑھیاں اترتے ہوئے انھانے میں دو سیڑھیاں پھٹا ٹک گئے ہوں چہرے کی



نے یقینی پر قابو پاتے ہوئے اوپر کی طرف بڑھتے قدم کو روک کر چند آنے نیچے کھڑے علی اور ضمیر بھائی کو ذمائی میزبانوں کی نظر سے دیکھا۔

”ہمارا گھر کوئی موت کا کنواں نہیں ہے جو لگائیں گے آپ چکر۔“

”دل تے آنے کی ضرورت ہی کوئی نہیں، پر اگر ضرور آنا ہی ہے تو فیروزی اک واری سوچ لو اور نہ ہی آوے میرا بی۔“

چند ابا کی باتوں پر شرمندہ سی محسوس تو ہوئی، لیکن سرکاری بیوی کے نیو زائیکو کی طرح اسے وہی بیان دینا بولنا تھا جس سے سرکار خوش ہو، جیسی بغیر کچھ کے اس نے ابا کی تھلید میں قدم بڑھا دیے جو ایک ہاتھ ریٹنگ پر رکھے گنگناتے ہوئے اوپر کی طرف دواں دواں تھے۔

چل چلے دنیا دی اوس کمرے جتنے خرچہ نہ خرچے دی ذات ہو دے نظر سے او جھل ہو جانے پر ضمیر بھائی نے سامنے رکھے ابا کے سلمان پر لات مارتے ہوئے غصے سے علی کو دیکھا۔

”بب بے بوڑھے جیز کو لعنت کیوں کہتے ہیں، تمہیں دیکھ کر سب سمجھ م م م میں آگیا ہے۔“ گردن کو ہونہ کے انداز میں جھٹکا دیتے ضمیر بھائی کی عینک اس بغیر پیشگی اطلاع کے جھٹکے کی تاب نہ لاتے ہوئے پھر سے ٹاک کی آخری حد پر بھی جسے اس کی اصل جگہ پر پہنچانے کے بعد ضمیر بھائی باہر نکلنے کے ساتھ بدبو داتے گئے۔

”سیلابی بانی میں موجود سس سس ساتیوں کی طرح کیسی کیسی چیزیں آجاتی ہیں جیز میں۔“ کسی بھی قسم کا جواب دیے بغیر علی بڑے سکون سے ادا کا در کی طرح تمام باتوں کے جواب میں صرف مسکراہٹ سے کام لیتے ہوئے خود کو ان سے زیادہ عقل مند اور مذہب ثابت کر رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ مرکز نگاہ اب تک وہی میزبانی تھیں جہاں سے چل کر چندا اس کی

نظروں سے او جھل ہوئی تھی۔

\*\*\*

قلم و چار ایسے ہی لگاتار ہوں جیوں میں مرے احباب میں اس سے میری تو قیر بڑھتی ہے کبھی لکھنے لکھانے کی تو کہیں نوبت نہیں آتی میں نا اڑا اڑا لیتا ہوں ضرورت جب بھی پڑتی ہے آج اتوار کا دن ہونے کی نسبت سے ضمیر بھائی کو خیال آیا کہ کیوں نا اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے جایا جائے اور نہ صرف ملنے جایا جائے بلکہ اہتمام کے ساتھ جایا جائے جیسی انہوں نے شلواری قمیص پہننے کے ارادے سے وارڈ روب سے ہینگریا مگر قسمت ایسی کہ نہ تو شلواری میں ازار بند تھا اور نہ ہی وارڈ روب کے مخصوص کمرے میں موجود اور بالفرض اگر ازار بند مل بھی جاتا تو وہ ڈالتے کس سے۔ اسی تلاش میں پہلے تو انہوں نے چینا کی مدد نہ لینے کا سوچتے ہوئے خود کوشش کی مگر ضمیر بھائی کو تو سامنے کھڑا ہی نظر نہ آئے یہ ازار بند بھلا کیسے ملے گا جیسی جھنجھلا کر ازار بند کی تلاش میں مزید چھاپے مارنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اعلا حکام یعنی چینا سے رابطہ کرنے کا ایک اصولی موقف اپنایا اور عین وقت پر پہنچنے کا ناممکن ارادہ لے کر تیز قدموں سے لاؤنج میں داخل ہوئے تو خالہ صوفے پر بڑے مزے اور سکون سے لیٹتے ہوئے باپ کا رن کا بڑا سا باؤل اپنے پیٹ پر رکھے ہوئے تھیں اور بیوی دیکھنے کے ساتھ ساتھ کھانے کا بھی شغل جاری تھا۔ البتہ ہنسنے سے پہلے حفاظتی تدبیر کے طور پر وہ ایک ہاتھ سے باؤل کو پکڑ بھی لیتی تھیں تاکہ ہماری فلموں کے معیار کی طرح ایک دم گر نہ جائے۔ دائیں ہاتھ پر رکھے دوسرے صوفے پر چینا دونوں پاؤں صوفے پر رکھ کر ایک ہاتھ سے نمکون میں لیے ہوئے تھی اسی دوران علی بھی بیرونی دروازے سے اندر آتے ہوئے ضمیر بھائی کے یوں غور و خوض کرنے کے انداز پر غور کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ آخر ایسا کیا ہوا ہے کہ ضمیر بھائی کے

چہرے پر تپتی کے تاثرات نظر آ رہے تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا یا پوچھتا خود ضمیر بھائی نے ہی اس راز سے پردہ اٹھا دیا۔

”چینا! آج چھ چھ چھٹی والے دن کیسا سلوک کر رہی ہو تم میرے ساتھ؟“

”بالکل ویسا ہی نا جیسا الیکشن ہارے ہوئے امیدوار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔“ علی اور خاموش رہتا یہ انتہائی ناقابل یقین بات تھی لہذا چینا کو بیوی ڈرامے میں حد سے زیادہ مصروف دیکھ کر علی نے خود ہی جواب اس لیے دیا تاکہ ضمیر بھائی انہیں لا جواب خیال نہ کریں۔ ”چینا! بڑے اٹھماک سے لی وی دیکھتی چینا کو ضمیر بھائی نے پوری قوت سے لٹکا کر۔

”اپنی اوقات کا تو بندے کو خود پتا ہوتا ہے ضمیر بھائی! پھر بھی آپ خواہ مخواہ ٹرائیاں مار رہے ہیں۔“ ایک مرتبہ پھر ہمیشہ کی طرح دل جلاتا جواب سن کر اب ضمیر بھائی کی برداشت بے وفا صنم کی طرح بغیر پیشگی نوٹس کے ساتھ چھوڑ گئی تھی سو تیز قدموں سے چلتے ہوئے عین اس کی پشت پر آکھڑے ہوئے۔

”کتی دیر سے بب بلا رہا ہوں تمہیں۔“ ان کی اچانک آواز پر چینا بیٹھی۔ گھبرا بلکہ ہڑبڑا گئی لیکن پھر ڈرامے میں مداخلت ہوتی دیکھ کر حلق تک کڑوا ہوتا محسوس ہوا۔

”چینا کو کیا پتا، کتنی دیر سے بلا رہے ہو۔“ ٹائم نوٹ کر لیتا تھا نا۔

”ضمیر! تم نے صرف یہ پوچھنے کے لیے ہمیں کرپٹ کیا ہے؟“ پیٹ پر رکھے باپ کا رکن کے باؤل کو اٹھا کر میز پر رکھنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھی تھیں۔

”خالہ کرپٹ نہیں انٹریٹ ہوتا ہے۔“ علی نے درستی کرنی چاہی مگر ہمیشہ کی طرح غلطی ثابت ہوئی۔

”کرپٹ بھی کبھی انٹریٹ ہوتا ہے بھلا؟“ انہوں نے علی سے سوال کیا اور حسب پسند نفی میں جواب بھی وصول کیا تو مسکرا دیں۔

”مجھ سے زیادہ تو خالہ ہی چچ چچا کو یہ ڈرامے اچھے لگتے ہیں۔“ ضمیر بھائی نے چینا کی شکایت لگائی۔

”تو کیوں نا لگیں روز نے جو ہوتے ہیں۔“ چینا نے بھی اپنا دفاع کچھ اس انداز میں کیا کہ واضح طور پر ڈراموں کو ضمیر بھائی پر فوقیت دے گئی۔

”ایک ہی ڈرامہ ساری زندگی دیکھنا بھی تو سزا ہی ہے نا ضمیر۔“ خالہ کا واضح اشارہ ضمیر کی طرف تھا۔

”خالہ آپ تو ایک طرف مگر چینا تہہ تم اچھا نہیں کر رہی اپنے م م م مجازی خدا کے ساتھ۔“

”ہاں تو مجازی خدا بھی تو چینا کی وجہ سے بنے ہوتا ہے تو ہر بندہ تمہیں انسان بنو انسان بنو ہی کہا کرتا تھا۔“ چینا نے خفگی سے چیخ بولا تو اس بار خالہ ضمیر بھائی کی حمایت کرنے لگیں۔

”ہم کب اسے حیوان بنو حیوان بنو کہتے تھے بھی۔“

”دیکھا نا خالہ، جب سے یہ فف فف فضول ڈرامے دیکھنے لگی ہے ہر وقت مجھے نیچا دکھاتی رہتی ہے۔“

”کیوں ضمیر؟ کتا تم خود سے نیچے نہیں دیکھ سکتے؟“ خالہ کی باتیں ضمیر کو اگر کتنی کی طرح مدھم مدھم سلگاتے ہوئے یقیناً پوری طرح جلا دیتا چاہتی تھیں اور اپنی خالہ کو چینا کی حمایت میں بولتے دیکھ کر ضمیر بھائی کو غصہ آیا تو سامنے رکھے ریموٹ سے لی وی بند کر دیا۔

”ضمیر خبردار جو تم نے لی وی بند کیا، چینا کے ابا نے دیا تھا۔“ چینا ہماری پولیس کی طرح دو قعدہ ہو جانے کے بعد حرکت میں آئی تھی۔

”ہاں ہاں۔ بب بب بے کار ہے چینا کی طرح۔“ ضمیر بھائی نے چینا کا انداز اپنایا۔

”ارے کار ہی لینی تھی تو ضمیر پہلے بولتے اب تو شادی ہو گئی۔“ لی وی بند ہونے کے بعد اب خالہ کا مکمل دھیان ان دونوں کی طرف تھا جو مختلف چینلز کی طرح اب براہ راست لڑ رہے تھے۔

”جی ہاں، میں تو ہمہ پہنچتا رہا ہوں شش شش شادی کر کے۔“

”تو نہ کرتے نا؟ کتنے ہی رشتے تھے میری آپنی کے۔“ علی نے بھائی ہونے کا ثبوت دیا۔



”مجھے قسمت والے تھے سب ہی جو بے بے بچ گئے۔“ ضمیر بھائی کا دل چاہ رہا تھا کہ مار تنگ شوڑ کی جذباتی میزبانوں کی نقالی کرتے ہوئے اور کچھ نہیں تو آنکھ میں اپنی ہی انگلی چھو کر ایک دفعہ کھل کے رو لیں تاکہ بچائی فلموں کی ہیروئنز کی مانند بھاری دل کچھ تو ہلکا ہو۔ کہاں تو ایک بیوی کے ساتھ نہ صرف سالا بلکہ خالہ بھی اس تو تو میں میں کے فرنیچر میں سہقت لے جانا چاہتے تھے۔

”قسمت والے تو ضمیر بھائی آپ ہیں جنہیں یہ ملیں۔“

”اور کیا چیتا تو کتنوں کو مل کے بھی نہیں ملی۔“ چہرے پر مسکینی طاری کرتے ہوئے چیتا نے علی کی بات کو آگے بڑھایا اور بات کر کے پھر علی کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے ریلنگ ونگ میں ایک پہلوان اپنے دوسرے ساتھی پہلوان کو کیا کرتا ہے فرق صرف یہ تھا کہ یہاں ہاتھ کے بجائے ابرو استعمال کیے گئے تھے۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں اسی لیے تو مجھ تک تک کو بھوکا بے تیل بنانا چاہتی ہے بھلا کوئی چھٹی والے دن بھی شش شوہر کو یوں نظر انداز کرتا ہے۔“ چیتا نے حیرت بھری نظروں سے ضمیر بھائی کو موسلا دھار بولتے دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہ رہا کیونکہ ضمیر بھائی کا تعلق شوہر حضرات کی اس قوم سے تھا جو بیویوں کو امریکا کے برابر درجہ دیتے ہوئے خود اپنے آپ کو ترقی پذیر ملکوں جتنی حیثیت دیتے ہیں، لیکن اب ان کا یوں خود کو ایسی طاقت سمجھنا چیتا کے لیے پریشان کن تھا اسی لیے خالہ سے رجوع کیا۔

”خالہ آپ نے تو کہا تھا کہ ضمیر زبان نہیں چلاتا۔“

”دکان کیوں نہیں چلاتا بھی؟ اس کی ڈاکٹری کی دکان تو بہت اچھی چلتی ہے۔“ پاپ کارن منہ میں ڈالتے ہوئے خالہ نے چیتا کا بیان رو کیا تو ضمیر بھائی

انہیں اپنا ہمدرد جان کر فوراً بولے۔

”ضمیر بھائی کھانے پینے آنے جانے سونے جانے حتیٰ کہ مم مم مم میرے وارڈ روم میں ازار بند ہونے تک کی اسے کوئی پروا نہیں ہے۔“

”چیتا نے تم سے شادی کی ہے ضمیر، تمہیں کو نہیں لیا۔“ سمجھے؟“ خالہ کے بجائے علی کو سیل پر ٹیکسٹ کرتے دیکھ کر چیتا خود بولی اور ساتھ ہی صوفے سے کھنکھاتا علی کو دے مارا جس کا واحد مقصد اسے پیادہ لانا تھا کہ وہ اس وقت اپنی کلاس کی پچھلی سیٹ پر نہیں بلکہ محاذ کی شکل اختیار کیے لائن میں موجود ہے جہاں اس کے برقی پیغامات کے بجائے صوتی اثرات کی زیادہ ضرورت ہے۔

”اب بتا چلا کہ شش شش شادی پر ٹھسا ٹھسا کر لڈو اس لیے کھلائے تھے تاکہ بالی تمام عمر کی کڑواہٹ ہنسی خوشی بے بے برداشت کر لیں۔“ کھنکھاتے سے لڑکھڑاتے ہوئے علی کو دیکھ کر ضمیر بھائی نے وہ پرانا وقت یاد کیا جب علی بڑے خوشامد انداز میں انہیں ”تھوڑا سا اور“ ”تھوڑا سا اور“ کہہ کر تنہا ایک گلو لڈویوں کھلا گیا تھا کہ اگلے کئی روز تک وہ لڈویوں کو دیکھتا تو دور ان کا نام سن کر بھی سہم جایا کرتے۔

”جی نہیں۔ لڈویوں کے اوپر سے اگر چھپکی نہ گھوم گئی ہوتی تو بھلا کسے شوق تھا انہیں ضائع کرنے کا۔“ علی نے کھراچ بول کر ضمیر بھائی کے توتے اڑا دیے تھے۔

”اور آپ؟“ آپ بے فکر ہو کر جواب دیں، میں بھی انہیں لڑائیوں والے ٹیکسٹ کر رہا ہوں تاکہ انہیں بتا چلے کہ ہم کوئی عام لوگ نہیں۔“ ایک بار پھر علی بڑے زور و شور سے انگلیوں اور انگوٹھوں کی مدد سے موبائل وار کرنے لگا۔ وہ دو اور ضمیر ایک خالہ کو ترس آنے لگا تھا سو ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولیں۔

”غلطی تمہاری اپنی ہے ضمیر۔“

”ہاں تو میں نے کب اور کس سے کہا کہ چیتا کسی اور کی ہے۔“

”شادی پر تو تمہارا جو تا بھی چھپایا گیا کہ سائن آؤٹ ہو جاؤ، لیکن تم لاگ ان ہی رہے اور ٹائم آؤٹ ہو گیا۔“ خالہ نے دلی ہمدردی ظاہر کی۔

”تنت تبت تب ایسا ہوا ہو گا خالہ، لیکن اب نن نن نہیں ہو گا۔“

”لےجے کو مکمل طور پر سنجیدہ اور بار بار عیب بناتے ہوئے ضمیر نے کہا تو چیتا اور خالہ کے ساتھ ساتھ علی بھی موبائل چھوڑ کر انہیں دیکھنے لگا جو ہاتھ میں ریموٹ لیے وہاں سے جارہے تھے کہ چیتا بے تابی سے ان کی طرف ہلکی۔“

”رک۔“ ضمیر پلیر کو۔ چیتا کی بات تو سنو۔“ اور تب ضمیر بھائی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہیں محسوس ہوا کہ چیتا ان سے اس قدر محبت کرتی ہے کہ یوں ان کے ناراض ہو کر جانے پر کسی بے قراری اور بے خودی کے عالم میں انہیں روک رہی ہے۔ دل کی تویہ حالت تھی کہ اس وقت چیتا کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتے تھے مگر چونکہ ذرا آخر تو کھانا تھا تاکہ چیتا کی محبت مزید کھل کر خاص طور پر علی کے سامنے آشکار ہو سکے اس لیے وہاں ابرو اٹھا کر نیم مسکراہٹ کے ساتھ حیرت زدہ علی کو دیکھا اور فاتحانہ انداز اپناتے ہوئے پیچھے مڑ کر چیتا کو دیکھنے کے بجائے وہیں رک کر بولے۔

”سس سس سوری مت کہنا چیتا، میں معاف نہیں کروں گا۔“ ضمیر بھائی کو محسوس ہوا کہ خولان کی آواز نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ اور بھلا وہ یہ چاہتے بھی کب تھے وہ تو بس اب پیچھے مڑ کر چیتا کو پیار بھری نظر سے دیکھ کر اسے بتانا چاہتے تھے کہ وہ تو ساری عمر اس کے لیے رک سکتے ہیں۔

”تو سوری کہہ کون رہا ہے تمہیں۔ جہاں جاتا ہے جاؤ اور بے شک واپس نہ آؤ لیکن یہ چیتا کا ریموٹ دے جاؤ۔“

چیتا کے الفاظ تھے کہ بجٹ۔ سارے اوسان خطا کر کے تمام امیدوں پر جو پانی پھیرا تو ضمیر بھائی نے انتہائی غصے کے عالم میں ریموٹ صوفے پر پھینکا اور خود

باہر نکلتے ہوئے کسی غمگین گلے کے الفاظ سوچتے لگے۔

”کاش چیتا ضمیر کو انتہائی بدتمیز کہہ سکتی۔“ ہونہ۔“ ایک بار پھر خالہ نے سابقہ پوزیشن سنبھالی اور چیتا کی وی پر اپنا پسندیدہ چینل آن کر کے دیکھنے لگی جہاں ڈرامے میں ایک ایسی عورت کی کہانی دکھائی جا رہی تھی جو شوہر کو حقیقی معنوں میں مجازی خدا کا درجہ دے کر چیتا کی پسندیدہ ترین اسٹوری بن چکی تھی۔



سارے گھر کی سیٹنگ کرتے کرتے ابا جھٹکنے لگے تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کچن میں چلے آئے اور چائے بنانے کا ارادہ کرتے ہوئے پہلے تو پانی ٹاپ کراہنے کے لیے چڑھایا اور اسی دوران کینٹش سے ایلو مونیئم فوائل میں تہ در تہ لپٹائی بیگ کھول کر کپ میں رکھا اس پر کھولتا ہوا پانی ڈال کر پیوں سے چند لمحے دبا لے کے بعد پی بیگ کو دیوار پر نصب ہینڈ ڈرائنگز کی مدد سے خشک کر کے دوبارہ اسی فوائل میں لپیٹ کر واپس رکھا اور فریج سے ڈرامہ نکال کر اس کی مدد سے چند قطرے دودھ کے پی بیگ میں ڈالے، ڈرامہ پھر سے مضبوطی سے بند کر کے ابھی فریج میں رکھا ہی تھا کہ منہ لٹکائے چندا کو اندر آتا دیکھا تو اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”کیوں پتہ لگتا ہے چاہے چاہے پتہ لگتا ہے۔“

”ہاں ابا۔ چاہ رہا۔ تو ہے دل میرا۔“ گردن جھکائی چند اوپن کرسی ٹھیسٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

”بس تے قیر دکھ لے تیرے ابا کو پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ تو نے چاہ پتہ لگتا ہے۔“ اپنی قابلیت ثابت کرتے ہوئے مسکرائے اور کپ لے کر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

”یعنی آپ نے ہنادی ہے پہلے ہی؟“ چندا حیرت سے خوش ہوئی تھی مگر یہ خوشی







مصباح علی

حشر علی

”یہ بھی نہیں، یہ بھی نہیں، یہ“  
وہ کپڑوں کی لمبائی کھولے استری شدہ شرٹس کو  
تیزی سے اوڑھ اوڑھ کر رہا تھا۔ آخر کار ایک شخص سیٹی  
شرٹ پسند آئی جو بلیک جینز پر جپتی بھی بہت تھی  
اس نے وہ نکالی اور آنے کے سامنے خود پر لگا کر خوب  
تحقیدی نگاہوں سے جائزہ لیا۔  
”ہول، زبردست“

جب دل سے گواہی آئی تو فوراً ”زیب تن کرلی۔  
بہت سارے فوم چھڑکار سٹ وائچ، موبائل اور بایک کی  
چالی کاغذیں ہونے کے بعد والٹ چیک کیا اور ڈریسنگ  
ٹیمبل پر سے شخ و شنگ رنگ کی ٹوپی اٹھائی اور فخر سے  
سر پر رکھ کر گردن کسی ترانے کی دھن پر دھنستے ہوئے  
تیزی سے میڑھیاں پھلانگتا نیچے آگیا۔

”تم روز ایک ہی ٹوپی دھرے دن ڈھلتے ہی نکل  
جاتے ہو، میرے یار میری خدمات کسی دن کام آئیں  
گی۔ یہ ٹوپی مجھے دو ایسی زبردست ڈیزائن کروں گا کہ  
سارے حیران رہ جائیں گے اور لائیو کوریج پر الگ جاؤ  
گے۔“ برہان عقب سے ابھرتی آواز پر مڑا وہاں سبحان  
آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی ٹوپی تول رہا تھا۔ اس  
سے پہلے برہان کی ناگواری زبان میں در آئی وہ پھر بول  
پڑا۔

”بھیا! اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔“  
وہ بولتا ہوا چند قدم آگے ہوا اور ہاتھ بڑھا کر اس کی  
ٹوپی اتار لی۔ اب ٹوپی اس کی انگلی کے اکلوتے ستون پر  
گھوم رہی تھی۔ ساتھ ساتھ برہان کی غصیلی نگاہیں  
بھی۔

”اب دیکھو نا، تم نے یہ ٹوپی پہنی ہی ہے تو عام سی  
گول ٹوپی ہی کیوں جو ہر دوسرے کے سر پر ہو، میرا  
مطلب ہے یہ نکلون بھی ہو سکتی ہے، جناح کب میں  
بھی چلے گی، پھر رنگوں کا کٹ ورک بھی بن سکتا ہے  
شیشے پینٹس لگانے سے رونق برہم جائے گی۔ اور ہاں  
پکڑی شیمپریس یا پھپھانہنگ۔“  
ابھی اس کا ذریعہ داغ جانے کیا کیا آئیڈیاز نکال  
برہان نے دانت پیستے ہوئے اپنی ٹوپی تھپتی۔

”تمہیں میری ٹوپی سے کیا تکلیف ہے، اوہر وہ۔“  
”تکلیف تمہاری ٹوپی سے نہیں بھیا، بلکہ اس کے  
سامنے ہونے پر ہے۔“

اس نے ایک بار پھر آگے بڑھ کر ٹوپی پکڑنے کی سعی  
کی مگر برہان کی تنبیہی نگاہوں نے ایسا کرنے سے  
اسے باز رکھا۔

”دیکھو نا یار، جو کچھ تم کرتے پھر رہے ہو اسے  
چھوڑو اور میرے ساتھ مل جاؤ، ہم دونوں بھائی مل کر  
فیشن کی دنیا میں انقلاب برپا کریں گے، ہر طرف ہمارا  
چرچا ہوگا، فیشن کی دنیا میں تھلک مچا دیں گے۔“ وہ کھلی  
آنکھوں سے کھلبلی بچاتے خواب دیکھ رہا تھا جب برہان  
نے اسے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”بھیا جی تم کیا جانو میرے کام کی اہمیت۔“ دیکھنا  
میں دنیا کو بدل کر رکھ دوں گا۔ ہر چیز بدل جائے گی، ہر  
سٹیم میں سچج ہوگا۔ مگر تم ہونہ۔“ ڈیزائنر کی  
اولاد ہی بنے رہنا۔

”اوہ بخت۔ زبان سنبھال کے۔“  
اباواسٹ میں ہاتھ اڑے کچھ دیر پہلے ہی صحن میں



نکلے تھے اور باری باری اپنے دونوں سپوتوں کے خیالات معمول کی طرح سن رہے تھے مگر جب حرف ان کی غیرت پر آیا تو ان صرف چلا اٹھے بلکہ جیب سے ہاتھ نکال کر انگلی بھی اٹھائی۔

”یہ کس شخص پر والے کا ذکر کر رہے ہو تم؟ خبردار۔ یہ بالکل میری اور جائز اولاد ہے“ سمجھو۔

”میاں جی ابھی تک جائز ناجائز کی صفائیاں دے رہے ہو اور میں نے کتنی دیر پہلے تمہیں قہر اور کرپلے لانے کو کہا تھا۔ بیٹے تو تمہارے کسی کام کے ہیں نہیں ایک خبیث کوفشن میں انقلاب برپا کرنے کا بخار چڑھا ہے تو دوسرے کو ہر چیز صاف ہستی سے بدلنے کا زکام۔ اور ایک وہ پھوڑا کم بخت ہے جس نے پکے پکائے آلو بیگن میں پیکی بھنڈیاں ڈال کر شور بپا چھوڑ دیا۔ جانے کون کون سے چھینٹ دیکھ کر ہمارے معدے آڑا رہا ہے راشن کا نقصان ایک طرف“

دواؤں کا بجٹ الگ۔ اور تم یہاں کھڑے جائز ناجائز کی تقریر بھاڑ رہے ہو میاں! میں پوچھتی ہوں رات میں کچھ کھانا ہے یا بیگن، بھنڈی کا سوپ ہی پیو گے۔“

ساجدہ بیگم کلن کے پیچھے دوڑنا اڑتی بالکل لڑا کا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا نچا کر صلو اتنی ساری تھیں برہان کو ہر معاملے میں بولنے کی عادت تھی سو مجبور تھا۔

”اماں! ہمیشہ بنیاد پرست ہی رہی رہتا بیگن کے ساتھ آلو ہی پکیں گے کرپلوں میں قہر ہی ٹھوسے گا وقت بدل گیا ہے پر آپ نہ بدلتا۔“

”بیٹاؤ میں تجھے بڑا آیا۔“ وہ اسے جھڑک کر بولیں تو اس نے بھی فوراً ”لجہ بدل کر“ ان کے کندھوں پر ہاتھ جماتے ہوئے منتر ابدلا۔

”میری پیاری اماں! دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے اب آلو بیگن سے باہر آجائیں۔“

”پرے ہٹ کھٹو کیس گے؟“ انہوں نے اتنی زور سے کندھے جھٹکے کہ برہان کے دونوں ہاتھ پھسل کر نیچے آ گئے۔

”نہ یہ مولیٰ دنیا کون سی آگے بڑھ گئی کون سا

اسٹیشن چھوٹ گیا تمہارا جو ہر وقت تبدیلی تبدیلی کا شور مچاتے ہو تیرے منہ پر ایسا جھانپٹر ماروں گی یہ منہ آگے کے بجائے پیچھے لگ جائے گا اور خوب میل جائے گی تیری برصغلی۔ پولیس والے سے لاٹھی کھا کر بھی کہنے کو چین میں پڑا“ اچھے بھلے ماتھے کو آلو میں بدلوا کر آگیا پر بھوت نہ نکلا تبدیلی کا۔“

وہ مسلسل اسے کوستے ہوئے دو دن پہلے کا واقعہ یاد دلوا گئیں۔ جب کلج میں احتجاجی دھرنے پر لاٹھی چارج ہوا اور ایک سولی برہان کے ماتھے کا ٹکڑی بنی۔ مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی برہان تھا۔ دلیل کے ساتھ اپنے مسئلہ کو کھا کر خوش سے بولا۔

”اماں ایک نہیں ہزار کھالیں گے مگر اس نظام کو بدل کر دم لیں گے کل کا سورج ہمارا ہو گا دیکھنا تو سنی“

ابھی اس خون میں پڑا دم ہے بڑا جوش ہے۔ وہ اپنا زور بازو دکھاتے ہوئے دہلیز پار کر گیا اور اس کی جرات پر لبا عینک کی اوٹ سے دیکھتے رہ گئے اور جیسے ہی ساجدہ بیگم کے بگڑے زاویوں پر نظر پڑی تو برسنے لگے۔

”اسی لیے کہتا ہوں مت بڑھاتا“ انہیں دکان پر میرے ساتھ بھیجا کر تاکہ دو جمع دو کا پتا چلے قانس بھیج دے رکھ رکھ کر بخار زکام ہی چڑھے گا۔“

”میاں! تم ہمیشہ مجھے ہی الزام دیتا۔“ وہ ساجدہ بیگم ہی کیا جو ہر بات پر چپ ہو جاتیں اور جب نظر ساس پر گئی تو مزید آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ غالباً وہ ہر معاملے سے بے نیاز سیڑھیوں کے اسٹیپ پر موڑھا رکھے ہمسائیوں سے مشترکہ دیوار پر لٹکی جانے لگا غور سے دیکھنے میں سرگڑاں تھیں۔

”بی جی وہاں کیا جھانک رہی ہیں اگر گریس تو اس عمر میں یہ ہڈیاں نہیں جڑیں گی۔“

”لا حول ولا قوہ الا باللہ میں کیوں جھانکوں کسی کے گھر۔“ وہ دیوار چھوڑے سیخ والا ہاتھ کانوں کو لگاتے ہوئے مڑیں۔

”تو پھر کیا ان کے جالے صاف کر رہی تھیں یا پھر

ہمسائیوں کی مرغیوں کے انڈے گن رہی تھیں۔“

والی کا ہاتھ چھونے ہی سجان تیزی سے آگے بڑھا اور بٹنے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑ کر اترنے میں مدد کی۔ انہوں نے بھی پوتے کے سامنے چوری پکڑی جانے پر کسمسائے ہوئے صفائی پیش کی۔

”بیٹا میں تو حق ہمسائیلی ادا کر رہی تھی ہمارے رب اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے اپنے ہمسائے کی خبر گیری رکھو“ ان کے کھانے پینے کا دھیان رکھو مگر ناجی۔“

وہ نیچے اتر کر سیخ کے والے مسلسل گراتی ہوئی بولیں۔ ”تمہارے ابا نے دیوار میں ہی اتنی اونچی اونچی کھڑی کر لیں کہ مجھے بے چاری کو سیڑھیوں کے اوپر موڑھا رکھ کر دھیان رکھنا پڑتا ہے حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ اپنی دیوار میں پڑوسی کی دیوار سے اونچی نہ اٹھاؤ۔“

”فرمان تو یقیناً“ بی جی، مگر ہمسائیوں کی دھوپ رکنے کے ڈر سے ان کے لڑائی جھگڑے میں چسکا لینے کے لیے نہیں کہ پہلے دل بجا کر کلن لگا کر سن گن لے لو اور پھر سارے محلے میں دیبا کی طرح پھیلاتے پھرو۔“

ساجدہ بیگم پہلے ہی بیٹوں کی حرکتوں سے چڑی تھیں اوپر سے ساس کی یہ ناک جھانک کی عادت وہ اپنی ساری کوفت نکال کر چن چن میں چلی گئیں۔ اور بریڈر لاتے ہوئے سارا پھیلاوا سمیٹ رہی تھیں جو کچھ دیر پہلے ان کا ٹھکانا سپوت بکھیر کر گیا تھا۔ بی جی بھی انہی کی ساس تھیں جب تخت پر آرام سے بیٹھ گئیں پھولی ہوئی سائیں بھال ہوئیں۔ دم میں کچھ غم کم ہوا تو پاٹ دار آواز میں استفسار کیا۔

”اے سو والی! میں نے کون سی خبریں میڈیا پر چلا دیں یا دیبا کی طرح پھیلا میں! بیٹا ناؤرا مجھے۔“

”بی جی بس آپ رہنے دیں۔“ ساجدہ نے ناگوار سا جواب دیتے ہوئے گردن جھٹکی اور پھر لمحہ تاخیر سے ہی بچن کی کھڑکی میں آکر یاد دہانی کروائی۔

”کل آپ ہی ساتھ کی ماں کو بتا رہی تھیں کہ ساتھ

والی کو پھر اس کے شوہر نے پٹکا۔“

”بیٹاؤ! تو کون سا جرم کر دیا؟ اب ہمسائے میں کوئی پیٹ رہا ہے تو دیکھیں بھی ٹاٹ۔ کہ کیا ہوا۔ کل کھان پولیس آجائے کم از کم بندہ گولی تو دے سکے کس نے کس کو کتنا مارا۔ تجھے کیا معلوم بڑا اجر ہے گواہی دینے کا۔“

”اے ٹاٹ! آکھٹے کرنے کا آپ کو بڑا شوق ہے خواہ اس شوق کے پیچھے جان سے ہاتھ دھولیں۔“

غالباً ”ساجدہ کا دوسرا جملہ ان کی سماعت سے نہیں گزرا تھا اسی لیے وہ ہنس کر اپنی کھٹکتی آواز میں بولیں۔“

”تمہارے شوق سے یاد آیا“ آج ان کے ہاں قربانی کے جانور پر لڑائی ہو رہی تھی، یقین مانو ایسا زبردست لڑ رہے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے دوسری ہو گئیں اور پوپلے گالوں سے پانی کی پھوار بھی برسی۔

”مجھے لگتا ہے بکرا ہی لیں گے کیوں کہ بیوی تو اپنے سوقفست ہنٹوالی لگ نہیں رہی تھی۔“

وہ اپنی قیاس آرائی کرتے ہوئے بیٹے کی جانب متوجہ ہوئیں جو واسکٹ میں ہاتھ ڈالے تیزی سے باہر کی جانب لپکے۔ غالباً ”اس لیے کہ اب اماں ہمسائیوں کی قربانی سے اپنے گھر کی طرف رخ موڑیں گی اور لبا سا اسلامی لیکچر دے کر پورا تیل خریدنے کا آرڈر دے ڈالیں گی اور ایاز میاں خرچے کے نام سے ہی دہل جاتے تھے ہاتھ پیر پھول جاتے ٹھنڈے پینے شروع ہو جاتے گمری جی کی آواز ان کی چال سے تیز نکلی۔“

”وہ ایاز میاں! تم نے کوئی قربانی کا جانور و انور دیکھا بھی ہے یا نہیں۔“

”بی جی۔ فی الحال تو میں کرپلے لینے جا رہا ہوں۔“

ان کے صاف جواب پر بی جی نے ایسے ناک چڑھائی جیسے کرپلے کا سارا انڈو پانی ناک میں گھل گیا ہو۔

”کیوں میاں! عید پر کرپلے کاٹنے کا ارادہ ہے۔“

”لو خدا کا نام لیں بی جی جانے دیں اب انہیں۔“



پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔" ساجدہ بیگم کچن صاف کرتے ہوئے اچھی خاصی آگ آگئی تھیں اوپر سے بی جی کے مباحثے وہ کیلے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتی ہوئی باہر نکل آئیں۔

"آجائے گا قربانی کا جانور بھی پہلے آج کے کھانے کا انتظام تو کر لیں۔ اچھی بھلی پی پکائی ہڈیا کا اس باورچی کی اولاد نے ناس مار دیا۔"

ساجدہ کا ملال اپنی جگہ مگر عزت کے معاملے میں وہ پھر سے انگلی سے تنبیہ کرنے لگے۔

"میں پھر سے کہہ رہا ہوں وہ میری اولاد ہے بیگم۔"

"پتا ہے، جیسی تو ایسے نکلے۔" ساجدہ نے گرن جھٹکی اور بی جی کے برابر بیٹھ گئیں۔

"تو نہ کرتیں نا ایسی تربیت اللہ نے اولاد تو تمہیں خوب دی، تین تین بیٹے مگر جمال کیا جو کسی ایک کو بھی ہدایت پر چلاتیں ایک سے بڑھ کر ایک نمونہ بنایا تم نے۔"

بی جی تسبیح کے دانے کے ساتھ ساتھ تیر ہو رہا تھا اور اس براہ راست نشر زنی پر وہ بیٹھے بیٹھے اچھلس۔

"تو تار بھلا! اس سب میں میرا کیا قصور ہو رہا ہے کھلا پلا کر جوان کر دیا اب اگر داغوں میں خناس بھر جائے تو بھی میں ہی قصور وار نقصان بھی میرا کریں مجرم بن کے کھڑے میں۔" وہ بی جی کی آواز میں بین کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی انگشت پر دوپٹا لپیٹے زور زور سے آنکھیں ملنے لگیں۔ سبحان تو بہت دیر پہلے ہی کمرے میں جا چکا تھا اور میاں ٹافٹ نکلنے کے لیے برتولنے لگے غالباً انہیں اندازہ تھا کہ یہ طوفان اب چھٹنے والا نہیں۔

\*\*\*

یہ تو اس گھرانے کے معمول کا دن تھا۔ ایاز میاں کے کاروباری آدمی تھے اور اچھا خاصا کما کرتے تھے بلکہ کمائی سے اپنی محبت تھی کہ رقم جمع ہونے کے بجائے

دو جمع ہیں ہو جائے اور وہ بھی ان کے بیٹوں اور تجوریوں میں۔ مگر ان کے بیٹے ذرا بھی ان پر نہ تھے تینوں کے تین عجیب خلیقاتی بلکہ تخریباتی سوچ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ بڑے بیٹے سبحان نے ایف۔ اے کے بعد پڑھائی کو خیر باد کہا اور فیشن ڈیزائننگ کا بھوت سوار ہو گیا۔ وہ فیشن کی دنیا میں انقلاب برپا کر دینا چاہتا تھا اور اسی انقلابی سوچ کی بناء پر کتنی بار اماں سے مار کھائی۔ اکثر ہی ان کے ان کے کپڑے خاموشی سے الماری سے نکالتا اور عجیب و غریب وہابیات سے شلوار قمیض کے نمونے کاٹ دیتا۔ ابھی چند مہینے پہلے کی بات تھی۔ ابانے اپنے کسی دوست کی شادی کے لیے دو اعلا سوٹ سلوائے، کلف اسٹری کروا کر الماری میں رکھے گئے اور صاحب زادے نے موقع پا کر ہی اماں کی بری کے بنارسی غرارے کے بنچے بنائے اور کلف بین کٹ کر ان کے سوٹ پر مختلف انداز سے جگہ جگہ لگا دیے اور جب عین شادی والے دن یہ سر پر اتران کے سامنے لایا گیا تو نہ پوچھو جو پٹائی ابانے سبحان کی کی۔ ناقابل بیان زبان استعمال ہوئی اماں کو غرارہ کٹ جانے کا دکھ اپنی جگہ۔ مگر وہ کیا کہتے ہیں عشق کے امتحان اور بھی ہیں سو کچھ دن ٹکڑ کر کے بعد پھر معمول پر آگیا۔ حد تو تب ہوئی جب بی جی کے عید کے سلسلے سلائے جوڑے کی آستین غائب کر کے رنگ پر لگی ڈوریاں لٹکائیں اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مختلف جگہ سے کاٹ کر دو سرے کپڑے کی فرل لگا دی۔ انتساب کچھ تب ہوا جب اماں کسی رشتے دار کی عیادت کو گئی تھیں اور بی جی وہاں کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ اور جب پتا چلا اور جو چھتر ریڈ ہوئی یقیناً "چنچیں پڑوسیوں نے بھی سنی ہوں گی۔ اماں کے لیے اک سبحان ہی روٹا نہیں تھا بلکہ اس سے چھوٹا ارمان جس کا ہر ارمان راشن پر یا جوج ماہوج کی طرح ٹوٹا تھا۔ وہ بہت غور سے کوکٹ شوز دیکھا اور پھر حربہ آزمائی اپنی مرضی سے کرتا تھا۔ کبھی کیلے سبب کی بھیجا ہوتا تو کبھی کبھی گاجر کا سوپ۔ ایک دن اس نے میٹھا کدو اور ناریل کا جوس

پاکر اماں کو پلا دیا۔ پہلے تو انہیں ایمر جنسی میں داخل کروانا بڑا جب دو دن بعد وہ بہتر ہوئیں اور گھر آئیں تو ارمان کئی دن تک گرم اینٹ سے اپنی سیکائی کرنا پڑا گیا۔

اور سب سے چھوٹے برہان نے کالج میں قدم رکھا وہ ہر چیز پلٹنے کے درپے ہو گیا۔ اسے دنیا کا ہر نظام ہی غلط لگنے لگا۔ ایسی تبدیلی مغز میں بھری کہ مار پیٹ کے بعد بھی نکلنے کا نام نہ لے۔ پارٹی اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا سیکرٹری بن گیا۔ اور نعرے بازی پر زور۔ بسا اوقات تو بیٹھے بیٹھے ایسے اوچے نعرے مارتا کہ اماں بیٹھی ہوئی دبل جاتیں۔ تسبیح پڑھتے پڑھتے داری کی زبان دانتوں تلے دب جاتی پہلے پہل تو سمجھا گیا کسی آسیب کا اثر ہے مگر پھر سمجھ آئی گئی کہ یہ تبدیلی کا بھوت ہے جو شاید ہی نکلے۔ وہ صرف گلا پھاڑ کر نعرے مارتا یا پھر گھنٹوں جرج کرتا مگر راشن اور گھر کی چیزوں کا نقصان نہیں کرتا تھا اسی لیے اس سے اماں کو خاص مسئلہ نہیں تھا البتہ بی جی سارا دن اسلامی درس دیتے ہوئے اچھے بیٹھے تنقید کرتی رہتیں۔ حالانکہ سن گن لینے کی اتنی عادت تھی جہاں دو فرد کھڑے دیکھے تیسری خود مل جاتیں، فلم ڈرامہ کوئی چھوڑتی نہ تھیں مگر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے توبہ استغفار کا ورد جاری رکھتیں اور ہر سین پر فوٹی لگاتیں۔

ایاز میاں صبح کے گئے رات کو آتے کاروباری مسائل مہنگائی کا رونا، ملکی سیاست پر بحث کرتے اور دھڑی کے بجائے چڑی دینے بلکہ دو سرے کی چڑی آتار لینے کی سوچتے رہتے۔ ہاں اگر معاملہ شوبازی کا آجاتا تو دل پر ہاتھ رکھ کر خرچہ کر ہی لیتے تھے اور جب ساجدہ بیگم کو خرچہ دیتے تو دس بار گن کر دیتے اور تب تک جائز خرچ کی نصیحت کرتے رہتے جب تک اماں چلا کر نہ بولتیں۔

"میاں مجھے بھی اچھی طرح پتا ہے کہاں اور کب خرچ کرنا ہے، کبھی یہ درس اپنے سپوتوں کو بھی دے دیا کرو۔" وہ ان کی نصیحتوں اور رونے سے تنگ آ گئی تھیں۔ وہ تو اکثر ہی چڑ کر کہتیں۔

"یہ میرا چھوٹا سا گھر نہیں بلکہ پورا پاکستان ہے، مکمل جمہوریت ہے، ہر کوئی اپنی الاپ رہا ہے، اک میں ہی ہوں بد نصیب جو عوام کی طرح پس رہی ہوں، چکی کے پائوں میں۔"

یہ تو اس خاندان کی معمول کی زندگی کی صرف ایک جھلک تھی۔ بسا اوقات تو اس سے بڑے بڑے واقعات رونما ہو جاتے تھے۔

\*\*\*

آج کل جو مسئلہ زیر بحث تھا وہ عید الاضحیٰ کے لیے جانور کا تھا۔ گھر میں بہت بحث و تکرار کے بعد ایاز میاں نے ایک بیل میں حصہ ڈال لیا۔ اور بیل بھی اپنے گیٹ کے باہر ماندھا غالباً "بڑا جانور بندھنے سے گیٹ کی رونق بھی بڑھ گئی اور محلے داروں پر رعب بھی پڑ گیا۔

اماں تو مرے دل سے ایک حصے پر راضی ہو ہی گئیں مگر بیٹے اور خاص کر تبدیلی کے علمبردار کو خاصا اختلاف ہوا۔

"یہ کیا صرف ایک قربانی؟ آخر باتوں پر بھی فرض ہے، اور پھر ہمیشہ بیل میں حصہ ہی کیوں ڈالا جائے؟ اب وقت بدل گیا ہے تبدیلی آگئی ہے! میں تو اپنی قربانی خود لاؤں گا۔" اس نے ناصرف کہا بلکہ اپنے ڈائری جیب خرچ میں سے ایک دوپٹا نکال کر بھی ہمارا لے آیا۔

"آمین! یہ کیا لے آئے تم۔" بکرے کی حالت دیکھ کر نہ صرف اماں نے دانتوں میں انگلی چبا لی بلکہ بی جی کا منہ بھی کھلا رہ گیا۔

"ماں نظر ٹیسٹ کروائیں، یہ بکرا ہے، بکرا۔" وہ تلملا گیا۔

"کیا نظر لگ گئی ہے اسے یا پھر یو گینڈا؟" تھوہیا سے اٹھالایا۔

پیش تو دیکھ، کیسا اندر دھنسا رہا ہے! اماں کے طنز پر بکرے کی "میں" میں "شروع" ہو گئی غالباً "تو ہین پسند نہیں آتی تھی۔ بی جی نے اسے پچکار تے ہوئے اپنے قریب کیا اور ہو کو بھی نصیحت کرنا نہ بھولیں۔



”بہو رانی اللہ نیت دیکھتا ہے پیت نہیں۔ اور ویسے بھی چھوٹے جانور کی چانپیں بہت نرم اور لذیذ بنتی ہیں ایسا کرنا وہ میرے لیے رکھ دیتا۔“

”ہرگز نہیں بالکل نہیں۔ میں اس کا سارا گوشت اپنی پارٹی ممبرز میں تقسیم کروں گا۔ اب تبدیلی آگئی ہے فریزر بھرے نہیں ہوں گا۔“

یہ دعوائے کیلے برہان کا نہیں تھا بلکہ ایامیاں نے پہلے دن ہی سب سے اچھا گوشت اپنی تاجر انجمن میں بانٹنے کا اعلامیہ جاری کر دیا تھا۔ جب کہ ارمان کو ہنر آزمائی کے لیے بہت سا گوشت چاہیے تھا۔ بھلے پکنے کے بعد اسے چیل کوئے ہی کھا میں جب کہ سبحان گوشت مقبول ماڈلز کے گھر بھجوانا چاہتا تھا۔ غالباً مستقبل قریب میں وہ اس کے تیار کردہ ڈر سرز کی پبلیٹی مفت میں کروں۔ اور آرڈر آنے لگیں۔ سلی جی کو نرم پوٹوں کی فکر تھی۔ سب کی الپ اپنی اپنی جگہ مگر امان مطمئن تھیں۔ غالباً انہیں خود پر یقین تھا کہ گوشت سب کی نظروں سے کیسے اوچھل کرنا ہے۔ اور کہاں چھپانا ہے اسی لیے خاموش رہیں۔

آج وہ دن بھی آگیا جس کی بحث کئی دن سے چل رہی تھی۔ سب لوگ تیار ہو کر نماز کی ادائیگی کے بعد قصابی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ قصابی تو دن چڑھے تنگ نہ آیا۔ البتہ برہان ہانپتا کا تپتا اندر آیا۔

”اماں! اماں! وہ نیل مارچ کے لیے نکل دوڑا۔ اور سب جیسے دار مار چر بنے اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔“

”نکس۔ کیا۔“ اماں کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

”کیا بکواس کر رہا ہے تو۔“

”جج کہہ رہا ہوں اماں!“

وہ شہ رگ پکڑ کر لوٹا۔

”اماں وہ رسی تڑوا کر بھاگ گیا اور بابا سبحان کو پیٹ رہے ہیں۔“

”تو بھلا اس میں سبحان کا کیا قصور سب کیا دھرا تیری دلدی کا ہے۔ سارا دن لوچی آواز میں لی۔ وی پر

خبریں سنتی ہیں اور ساتھ وہ تیرا فائدہ دہ بکرا۔“ انہوں نے ایک دھمو کا خبر رساں کی کمر پر جڑا۔

”وہ کم بخت ہر وقت اس کے ساتھ بیٹھا رہتا۔ کل میں نے خود کھا تھا۔ وہ مذاکرات کرنے عمل کے پاس گیا تھا یقیناً“ اسی منحوس نے کوئی پٹی پر دھالی ہوئی بھی وہ باغی ہو کر بھاگ گیا۔“

”نہیں، نہیں اماں۔ میرے بکرے کو کچھ مت کہنا“ اس کا کوئی قصور نہیں۔“ وہ اپنا کندھا سہلاتے ہوئے قدرے پرے ہٹ کر کھڑا ہوا غالباً دوبارہ ایک نہ ہو جائے۔

”وہ جو خود کو بہت بڑا ڈیزائنر سمجھتا ہے“ یہ سب اسی کی کارستانی ہے اس نے آپ کے شادی والے دوپٹے پر ڈھیروں ٹھکرو ہار اور رنگ برنگے پھول جڑے اور سہرے ڈوریوں سے اسے باندھ کر ایک واک کروانے جا رہا تھا۔ وہ بے چارہ تو دھاندلی کا شور مچاتا بھاگا سوچ رہا ہو گا آیا تو قریابی کے لیے تھا اور کرشادی رہے ہیں۔ تب ہی تو بابا سبحان کی کمر تالیاں بجا رہے ہیں۔“

اس نے خوب مزے لے لے کر پوری روداد سنائی اور اماں وانت کچکچاتی ہاتھ ملتی رہ گئیں۔ جب کہ بی بی جی بیٹے رہا تھ رکھے ہل رہی تھیں ساتھ ساتھ زور شور سے چیخ کرتے ہوئے نیل کے لیے ہدایت کی دے مارا گ رہی تھیں جو رنگ لے آئیں۔

خیر اللہ اللہ کر کے وہ لمحہ بھی آگیا جس کا انتظار تھا۔ یعنی گوشت کی تقسیم کل سب نے اماں کے ارادوں کو ملایا میٹ کیا اور اپنا اپنا گوشت سمیٹ لیا اور گوشت شاپروں میں ڈال کر ساتھ پرچیاں بھی چسپاں کیں۔ گوشت بانٹنے کی ڈیوٹی تینوں لڑکوں کی لگائی گئی۔

وہ تینوں بابا کی پرانی سی سوزی میں گوشت ٹب بائٹی میں پیچھے رکھے لے جا رہے تھے سبحان نے گوشت دو تین مشہور ماڈلز کے ہاں پہنچانا تھا۔ جب کے بڑے بڑے شاپر زایا کے ملنے والے بڑے دکان داروں کے تھے۔ برہان نے اپنے بکرے کی طرف کسی کو دیکھنے بھی نہیں دیا تھا اس نے سارا گوشت اپنی پارٹی فیڈریشن

کے لیے رکھا تھا۔ جب کہ ارمان کا حصہ کھر میں تھا جس پر جا کر تجربے کرنے تھے۔



گاڑی بہت سے ہجوم میں پھنسی کھڑی تھی۔ اور تینوں بھائی آگاہٹ و بے زاری سے اوھر اوھر دیکھ رہے تھے۔ اور سبحان تو بہت دیر سے ایک ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ یقیناً کسی گہری سوچ میں ڈوبا تھا۔ ویسے تو وہ اکثر ہی سڑک پر سوچوں میں ڈوبا رہتا تھا۔ غالباً لوگوں کے لباس دیکھ کر نت نئے ڈیزائن ذہن میں آتے تھے۔ یا پھر بڑے بڑے پلے بورڈز پر لباس دیکھ کر خود سے رد بدل کرنے کا سوچتا رہتا تھا۔ مگر آج اس کی نگاہیں نہ پلے بورڈز پر تھیں نہ ہی لوگوں کے لباس پر بلکہ سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھی اک کم عمر عورت پر تھیں۔ جس نے گدلے کھونچ زدہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور گود میں ایک چھوٹا سا بچہ اٹھا رکھا تھا۔ بچے کے ہاتھ میں کوئی گلا سڑا پھل تھا جو وہ مزے لے کر کھا رہا تھا۔ پھل کا جوس انگلیوں سے بہہ کر گئی تک جاتا اور وہ پھل چھوڑ کر جوس چائے لگاتے انہیں دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ برہان کے کئی بار پکارنے پر بھی وہ نہ چونکا۔ تو اس نے اسے بازو سے پکڑ کر ہلایا۔

”کیا ہو گیا کہاں گم ہو گئے۔“

”یار وہ سامنے۔“ اس نے بغیر گردن ہلانے گم آواز میں آنکھوں کے اشارے سے بتایا۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں ان دونوں نے دیکھا تو یک جاں ہو گئے۔

”کیا دیکھیں۔ وہاں تو کچھ خاص نہیں ہے۔ بس ایک عورت اور بچہ ہے۔“

”ان کے کپڑے۔ یار ان کے پاس کپڑے نہیں۔“

”تو تم ڈیزائن کرو ان کے لیے۔“ ارمان نے اس کے سنجیدہ انداز کو چٹکیوں میں اڑا دیا۔

”کاش! کاش! میں ان کے لیے ڈیزائن کرتا۔ یار میں نے کتنے کپڑے برباد کیے اور مار بھی کھائی کاش!

میں وہ کپڑا ایسے لوگوں کو دیتا۔ جن کا بدن ڈھک جاتا۔ آج عید کا دن ہے کیا ان کی عید نہیں ہے۔ اس کی آواز ڈوبے ڈوبے کیس دور سے آرہی تھی اور کان میں صبح سننے والی تلاوت۔

”بے شک وہ سوال نہیں کرتے مگر ان کی شکلیں اور حلیے واضح کرتے ہیں۔“ وہ آنکھیں قدرے چھوٹی کرتے ہوئے برہان اور ارمان کو باری باری دیکھنے لگا اور پھر برہان سے بولا۔

”یار تم تبدیلی کا نشان بنے پھرتے ہو یہ کیسی تبدیلی ہے کہ آج بھی ہم اپنے بھرے ہوئے ساتھیوں کو بھرنے جا رہے ہیں صرف اپنے مفاہ کے لیے حالانکہ آج کا دن تو خاص انہی کے لیے اتارا گیا ہے پھر بھی۔ یہ کیسی تبدیلی ہم چاہتے ہیں کردار اور عمل میں تو کر نہیں سکتے نظام میں بھلا کیا لائیں گے۔“

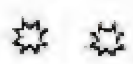
”مگر اب نہیں۔“

برہان جو اس کی تقریر سے سکتے میں آگیا تھا ایک سخت جوش سے بولا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اور شب میں سے اپنی فیڈریشن کے شاپر ز میں سے ایک بڑا شاپر نکالا اور جیب میں سے عیدی وہ لے جا کر اس عورت کو تھمادیا اور بچے کو جیب میں سے چاکلیٹ نکال کر دی۔ بچہ مسکرایا تھا۔ اور اس کی فطری مسکراہٹ میں ہی اصل حیت تھی۔

”تبدیلی آئے گی نہیں آگئی ہے۔“ اس کے گاڑی میں دوبارہ بیٹھتے ہی ارمان نے نعوں لگایا۔

”مگر عمل اور کردار تبدیل ہو جائیں تو سب کچھ خود بخود بدل جاتا ہے۔“

ارمان کے کمشنس کی تائید باقی دونوں نے سہل کر کی اور بابا کی پروا کیے بغیر گاڑی کا رخ آگے ڈیڑھ کے کیمب کی جانب موڑ دیا۔ غالباً گوشت ان میں تقسیم کر کے انہی کے ساتھ عید منانے کے لیے۔





## سورہ کا کون سا حصہ

ٹن ٹن۔ ٹلخ ٹلخ۔ چل چل۔ آگے لگ  
لوئے اوھر سے آگے لگ۔ ٹن ٹن۔ ٹن ٹن۔ ٹن ٹن۔  
منہ سے عجیب و غریب سی جیسی آوازیں۔ سورہ کے  
کان میں بڑی تودہ اچھل پڑی۔  
”اٹھ کر! بس ہو گیا حتم دودھ اب پیجیے بھاگ جا۔  
ابا نے تجھے اس طرح پیالے کو منہ لگائے دیکھا تو تین  
دن تک اس کا غصہ نہیں جانا کہ کام کا نہ کلج کا اور  
دسمن اناج کا۔ اٹھ شابش اٹھ۔“  
اس نے منہ سے کہتے ہوئے ہاتھ سے بھی اسے  
دھکیلا، مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ گردن موڑے  
دودھ کو دیکھنے لگا جس میں ابھی دودھ تھا۔  
”اف توبہ کرم خان اتنی جان اور دل گیری سے  
چھوٹا۔ چل اسے بھی پکڑ لیتی ہوں۔“  
وہ ہڑلنگ کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے دوسرے  
ہاتھ میں پیالا پکڑا اور تیزی سے گردے قدموں چھیر  
پکچن سے نکل کر پچھواڑے آگئی جہاں ان دنوں کما کی  
رہائش تھی۔ وہ بستر وغیرہ درست کرنے لگی۔ کہا اس  
کی غلٹ سے بے نیاز دودھ کی جانب متوجہ تھا۔  
”سورہ۔ سورہ کہاں چلی گئی تو؟“ ابا برآمدے میں  
کھڑا اونچی آواز میں پکار رہا تھا اور اسے بخوبی اندازہ ہوا  
کہ وہ غصے میں ہے۔ اس نے بلا ضرورت بڑی لکڑی  
شائے پر دھری اور آگئی۔ ابا کو یہ نہ چلے وہ کہا کے پیچھے  
گئی تھی۔  
”کیوں آوازیں دے رہا ہے ابا! میں نے کہاں جانا  
ہے۔“ وہ مصنوعی مٹن و مصوف انداز میں بولی۔  
”لوئے جانے کی بجائی لوزر امیر حال دیکھ تو۔“  
”ہائے ابا۔“ وہ لکڑی پھینک تیر کی طرح ابا کے سر

ماہنامہ کرن 150

بھی بری طرح چھل چکی ہے۔ سورہ منہ اور آنکھیں  
پوری طرح کھولے داستان سن رہی تھی۔  
”چپ نہیں ماں نے کیا کھا کر پیدا کیا۔“ ابا نے پھر ماں  
بیٹے کو گالی دی۔  
”اؤں ہوں ابا! زبان نہ گندی کر۔“  
”ہاں اس نے مجھے سارا گندا کر دیا تو اتنی طرف دار  
نی۔“ ابا جل بھن گیا۔ ”چل پانی ڈال دے کو سا کو سا ہی  
چاہیے۔“ سورہ نے پانی ڈالا اور سالن گرم کرنے اندر  
چلی گئی پھر دھیان آنے پر اٹھ قدموں پلٹی۔

”اس چنکبوری کے کالے پتر نے تو آج مجھے  
شمر میں ڈبوئی دیتا تھا۔ بس میری قسمت کہ زندہ آگیا  
ہوں۔“ ابا نے صافہ امار کر چار پالی پر پھینک دیا۔  
”مگر مانی ڈال دے اور پیڑے نکال دے۔ دودھ  
میں ہلدی بھی ڈال دے اور ایک پتھر گرم کرنے کو رکھ  
دے ٹکڑے کے لیے۔“ ابا نے کوڑے پر بڑے زور کی  
لگی ہے۔ ”سورہ نے تیزی سے پلٹ کر لکڑی پر بھائی  
اور بڑے تیلے میں پانی بھر کر اٹھنے رکھ دیا پھر بڑی بکے  
سے پیڑے اور گرم کھیں لے آئی۔ چھوٹی سی باشت  
بھر لمبی جلتی سرخ لکڑی کو ڈنڈا مارا تو وہ چھوٹے چھوٹے  
ٹکڑوں میں بدل گئی۔ اسے فرش پر ایک فٹ تک گول  
بچھا کر دودھ کی پیلی رکھ دی۔

”ایسے کرتب کرتے چلتا ہے جیسے سرکس میں ہو  
سب سیدھے سیدھے گھر کی طرف منہ کر کے چلتے  
ہیں۔ یہ بے غیرت شواہچھلا نکلیں مارتا شیرھا میڑھا چلتا  
ہے۔ اوھر چوہدری زمان کی زمینوں کے پاس سر کا بنا  
کنزور تھا۔ گر گیا۔ اور پھر جو شور ڈالا اس نے۔ سہلے تو  
دل چاہا بے غیرت کو ڈوبنے دوں پھر اوھر ٹالی والا شفیق  
آ رہا تھا اس نے ہمت دکھائی۔ میری ٹانگیں سمجھنے کی  
تھیں بے غیرت نے۔ سارا جسم مل گیا میرا جوڑ  
جوڑ۔ ہائے“ باتیں کرتے ہاتھ ہلاتے پتا چلا کہنی





”اس بے غیرت کو کیا ہوتا ہے۔ آ رہا ہو گا شفیق کے ساتھ اباجنا تا ہوا غسل خانے میں گھس گیا۔“

\*\*\*

ساری رات ابالے ہائے کرتے سویا۔ ہر کوٹ پر ابکی ہائے اور چارپائی کی چوں چوں۔ سوہ بھی سکون سے نہ سو سکی۔ اذانوں سے بہت پہلے ہی اٹھ کر کالے کو دیکھنے چلی گئی۔ رات شفیق حکیم سے بی کر والا تھا اور کالے نے بھی رات جب جب آواز لگائی دروازے سے بھری ہوئی تھی۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ حکیم نے لکڑی کی ہتھیلوں سے جوڑ کر سیدھی رکھی تھی مگر صبح جب اس نے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اس کا دل بھرتا ہوا کالے کے قریب بیٹھ گئی۔

”بہت چوٹ لگی ہے نا۔ تو تو سیدھا چلتا کیوں نہیں۔ اباکو سب سے زیادہ شکایتیں سمجھ ہی سے ہیں۔ ذرا جو نچلا بیٹھ جائے اور اب کیسی بے بسی ہے۔ تو باز کیوں نہیں آتا۔“

کالے نے نگاہیں اٹھا کر سوہ کا چہرہ دیکھا۔ سوہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہاں بے بسی، تکلیف، افسوس اور نجانے کیسی کیسی کیفیت تھی۔ سوہ نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے نیالے میں بھر لیا۔

”اب دروازے پر نہ آئے گا میرے لاڈلے! چل ابھی اب اسٹے گا تو حکیم والی دوائی دیتا ہے تجھے۔ تھوڑی دیر میں درد بھاگ جائے گا ایسے۔“ اس نے چٹکی بجاتی۔ ”تو آرام سے بیٹھ تو میں کھانے پینے کا بندوبست کروں۔“ اس نے احتیاط سے اس کا پیڑیچہ رکھنا چاہا مگر جانے انجانے میں پتا نہیں کہاں درد کا طوفان اٹھا۔ کالے کی چیخ و پکار نے سارے احاطے میں شور ڈال دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی سب چلانے لگے۔ سوہ نے کالے کو تھکا مگر وہ کھڑا ہونا چاہتا تھا۔

”لوئے کیا ہوا چور گھس گیا کیا اندر۔“ اباجنا تا ہوا اندھا دھند باڑے میں داخل ہوا۔ منہ سے مغلظات کا طوفان۔

”لوئے تو یہاں کیا کر رہی ہے۔“

”ابا! میں کالے کے پاس آئی تھی اسے بہت تکلیف ہے۔“ دروازے سے چیخا تو یہ سب بھی ڈر گئے ہیں۔ اوئے چپ کوفہ یہ میں ہوں سوہ۔ اباس ہٹ گیا۔“

سوہ نے ابا کو وضاحت دی پھر ان سب کو ڈانٹ کر چپ کروایا پھر بلبل جلانے لگی۔ روشنی پھیلنے ہی سب کے سب خاموش ہو گئے۔ روشنی میں سوہ کا ملائم نرم چہرہ اور ابکی آواز سب کے لیے طمانیت کا باعث تھی۔ ”اوئے صبح سے پہلے صبح کر دی۔ ابھی تو آنکھ لگی تھی۔“ ابا اپنے مخصوص انداز میں دھاڑا۔ سوہ پھر کالے کی جانب متوجہ ہوئی جو اباکا چہرہ کے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی بے چارگی۔

”لوئے میں کوئی تیرا دشمن تھا۔“ اباکالے کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ پہلے خاموش نگاہوں سے اباکا چہرہ دیکھنے لگا پھر ذرا سامنے آگے کر اپنا منہ اباکے شانے پر رکھ دیا۔ سوہ کی پٹلیں پھر ہٹ گئیں۔ وہ باہر نکل گئی۔

\*\*\*

اگلے پندرہ دن میں بہر حال یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ کلا لنگرا ہو گیا ہے مگر اس نے ٹھٹھا بیٹھنا سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ چاروں پیر زمین پر جھٹا مگر چال نے اب ذرا سا لہرا نا شروع کر دیا تھا۔ کلا بہت اونچی کاٹھی کا تھا۔ ابکی اس سے بہت توقعات تھیں۔ کم از کم تیس ہزار کمال تھا۔ جو اب کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ اسٹھ جانوروں کے ربوڑ میں جن پر اباکے سال بھر کے خرچ کے نکلنے کی امید تھی ان میں ایک کلا بھی تھا اور اب شاید عید کے بعد شہر والے قصائی کو کم داموں میں بیچنا پڑتا۔ اباکو بہت دکھ تھا۔ اس سال کے خرچے بہت زیادہ تھے اور سال کے آخر میں جب منافع کا وقت آیا تو ایک ماہ کے اندر ربوڑ میں نقصان یہ نقصان ہو گئے۔ ایک بکری چار بچے پیدا کرتے ہوئے مر گئی بچے بھی ساتھ۔ ابھی اس صدمے سے ابھرے نہیں پائے تھے کہ عید سے محض مہینے پہلے رات کے وقت چور باڑے میں گھسے اور کم از کم ڈیڑھ لاکھ مالیت کے چھ بکرے لے گئے۔ ابانے ان

ماہنامہ کرن 152

دنوں اپنی چارپائی وہیں احاطے میں رکھی تھی مگر اسے بھی کچھ ہوش نہ رہا تھا۔ صبح تڑکے جاگنے والا اب اسٹھ آٹھ بجے تک سوتا رہا۔ جانوروں کے چلانے پر جب سوہ وہاں پہنچی تو کندی جھول رہی تھی اور بٹے نیچے بکری غائب۔

ابا بے سدھ ساری احتیاطی تدابیر بے سوہ وہ کھڑے کھڑے سب جان گئی اباکو بے ہوشی والی کوئی شے سنگھائی گئی تھی اور بکروں کو بھی کہ شام میں روڈ پر بہت دور لہراتا بکرا ملا۔ وہ نیم جان تھا۔ جیسے بس مرنے کو ہو مگر نہیں وہ نیند میں تھا نشے والی نیند۔ کھوتی سے کھرا نکلا گیا۔ اللہ جانے چور کون تھے کہاں سے آئے تھے گئے گاؤں کے تھے یا باہر کہیں سے لوہ لگا کر آئے تھے جو بھی تھا پوری پلاننگ اور کامیاب رہے۔ کھرا میں روڈ پر جھٹ۔

”یہاں سے جی جانوروں کو شہ زور ٹرک میں چڑھایا گیا۔ بس اب آگے یا تو ادھر گئے یا ادھر اور جلدی میں یا کسی بھی اور وجہ سے یہ اکیلا بکرا رہ گیا۔ وہ میں روڈ کے نزدیکی باڑے سے ایک گائے بھی لے گئے تھے۔“ اباکا مرہ قدموں گھر لوٹ آیا۔ یہ تیار دھان کے کھیت میں آگ لگ جانے والی مثال تھی۔

افسوس کے لیے سارا گھوس اکٹھا تھا۔

”اس پورے سال میں جس شے کو تھ لگایا برباد ہو گئی۔ ہر اچھی خاصی چیز خراب ہو گئی۔ پہلے اللہ بخشے عمران چلا گیا۔ یہ جوان جہان بھرا۔ بھر جاکے بعد اسنے چتر کی طرح چلا پھر چوئی بیٹا لیا۔ یہ مزے کی حیاتی بن گئی۔ بیٹی نظروں کے سامنے۔ تین ہندوں کا گھر ہستی اور خوشی وہ نمنا چار دن کی خوشی لایا۔ مجھ بڑھے کے ہوتے۔“ ابکی آواز زندہ گئی۔ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”بجائے اس کے میں اس گندھوں چڑھ جاتا اس نے بڑھے دارے مجھ سے کام لے لیا۔ پھر اگلی خوشی سے امیدیں باندھ لیں تو وہ نمائی بھی چار سانس لے واپس آئے کے پیچھے۔ مجھ ہی سے کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔ اللہ ناراض لگتا ہے۔“ بلند بولتے بولتے ابکی آواز سر گوش میں ڈھل گئی۔ سوہ کی سسکی نکلی۔ حاجرہ اماں

ماہنامہ کرن 153

نے سوہ کو گلے لگایا اور وہ بھی رو پڑی۔ انیس برس کی عمر ہو گئی۔ عدت کے دوران پیدا ہونے والی بچی بھی فوت ہو گئی۔ اب ایک اکیلی وہ دوسرا اباکا اور اتنے سارے ڈھور ڈگر۔ سارا سال جانور چراتے پالتے سنبھالتے اور عید قربان پر اچھے دام ملتے تو ضرورتیں پوری کی جاتیں۔

”مسوئے کو بھی ہاتھ لگایا تو مٹی ہو گئی۔“ ابکی خود کلامی جاری تھی۔

”ایسے نہیں کہتے اسحاق۔“ مولوی صاحب بولنا شروع ہوئے۔

”اللہ کی مصلحت۔ اس کی چیز تھی۔ دینے والا بھی وہ لینے والا بھی۔ توبہ استغفار کرو اگر لگتا ہے اللہ ناراض ہے مگر یہ سن لو۔ سب ہی سن لو اللہ ناراض ہوتا نہیں۔ ناراضی برابر والے سے ہوتی ہے اور اس کی برابری کرنے والا دوسرا کوئی ہے نہیں۔ وہ تو بس آزماتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ اس کے وحدہ لا شریک ہونے کو دل سے بھی مانتا ہے یا بس مسلمان ہونے کو ڈنڈے کے زور پر یاد رکھے ہوئے ہے۔ ان سب کو بھی تو دیکھ جن کے پورے پورے ربوڑ سیلاب میں بہہ گئے۔ دو نفل شکرانہ پڑھ کر رب سے کہہ دے کہ شکر میرے مالک کسی بہت بڑے نقصان سے یہ بھلا۔ اور آئندہ کے لیے توبہ۔ بس۔“

سب لوگ بڑی عقیدت سے سن رہے تھے اباکا دل بھی ٹھہر رہا تھا۔ سوہ کے رونے میں اور شدت آگئی۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ تب کہ موبع پا کر اس کی چارپائی کے نزدیک خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کے پیروں کو چھو رہا تھا۔ سوہ نے اس کے چہرے پر نگاہ کی اور پھر شدت سے رونے لگی جو خالی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

\*\*\*

”دل کے اندر جیسے کسی نے تیز چھری اتاری بھائی اسحاق! شام ڈھلے حاجرہ اماں کے صحن میں آکر بیٹھی تھی۔“



”جی بات تو یہ ہے کہ عمران کو کسی بھولا ہی نہیں۔“ ابابھی چونکا اور سوہ بھی۔

”نیک شریف بھروسہ جو ابابھی۔ یہاں چھپے مجھے نہیں لگتا کبھی کسی کو اس سے کوئی شکایت ہوئی ہو۔ کتنی مرتبہ تو میرا سبزی کا ٹھکانا اٹھالیتا تھا۔“ وہ پر ملاں چہرے کے ساتھ اسے یاد کر رہی تھی۔ سوہ زمین پر چوکی رکھ کر بیٹھی تھی۔ آڑی ترچی لکیریں مٹی پر تنکے سے کھینچی رہی۔ لبا حق با کرنے لگا۔

”کتے ہیں مردوں کو یاد کرنے کا بھی ٹیم ہوتا ہے۔ اب ہر وقت کیا دکھ پھلوڑنے بیٹھ جاؤ۔ اب تم باپ بیٹی اپنے کام دھندوں میں اچھے میں نے آکر نیا سیال ڈال دیا مگر بس وہ دن سے وہ نظروں کے آگے آکر کھڑا ہے۔“ سوہ بری طرح چونکی۔

”ہر طریقے سے نظر آجاتا ہے۔ اسکول جاتا ہوا۔ موٹر سائیکل پر گزرتا اور جب دو لمبا ہوتا۔ کوئی کوئی ہی اتنا چٹا ہے۔“ وہ سامنے دیوار پر یوں نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ جیسے اسے ابھی بھی یہ مناظر واضح دکھائی دیتے ہوں۔ سوہ نے لمبی سانس لی۔

”ہاں کوئی کوئی دو لمبا بن کر اتنا چٹا ہے۔“ وہ خود اندر والے کمرے میں دو لمبا بن رہی تھی۔ جب اس کے تیار ہو کر کھن میں آنے کی خبر ملی۔ وہ اپنی تیاری وہیں چھوڑ کر کھاکی تھی۔ دروازے کی جھری سے اسے دیکھنے لگی۔ تو جیسے گرد پیش کو بھول بیٹھی۔ نوٹوں کے باروں میں چھپا ہوا تھا وہ سیار دوستوں کے مذاق پر یا تو چپ رہتا۔ یا کوئی جملہ کہہ دیتا۔ کبھی خوش مزاجی سے تھکے بھی لگا لیتا۔ شرماتا تو نہیں رہتا تھا مگر ایک سرخی اور چمک سوہ کو دور ہی سے دکھتی تھی۔ جب عمران تھا تو اسے کوئی ضرورت ہی نہیں تھی کہ وہ کسی سے اس کے بارے میں بات کرتی۔ اور جب وہ نہیں رہا تو کوئی اس سے عمران کی باتیں کرتا ہی نہیں تھا۔ مبادا وہ دکھی ہو۔ کبھی وہ رو دے۔ صبر و ضبط کی طنائیں چھوٹ جائیں۔ مگر پتا نہیں آج اہل حاجہ کو کیا ہو گیا۔ اندر آئی اور چھوٹے ہی شروع ہو گئی۔

”اور عمران ہی کیا سوہ جیسی موہنی اور روپ والی

دلن بھی کوئی نہیں دیکھی میں نے۔“ جن تارے کی جوڑی تھی جن تارے کی ہاں اہل۔ جن بدلاں دی اوٹ میں چھپ گیا تے تارہ ٹوٹ کے اللہ جانے کہاں گرا۔“ اس کا دل سسکا۔

”یہ نہیں ہے کہ عمران زیادہ یاد آتا ہے سوہ کو دیکھوں تو عمران آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور عمران کو سوچوں تو سوہ۔ رب سوہ نے سٹی ساتھی کی جوڑی ایسی بنائی ہوتی ہے کہ اکیلے تو کوئی یاد آتا ہی نہیں۔ ایک کا نام لو تو وہ سرا بھی کھٹ نظروں کے سامنے۔“

”یہ چپ رہتی ہے۔“ ہاتھ سے سوہ کی جانب اشارہ کیا۔ ”نظر ہی نہیں آتی۔ مگر ہے تو ناں۔ کل جب سب کے بچے بیچ بیچ کر روئی تو میرے کانوں سے وہ آواز جاتی نہیں۔ مجھے دھیان آنے لگا۔ رونے کا موقع ہی بن گیا خوا خواہ لیکن عمران کو رونے کے لیے موقع تھوڑی دھونڈتی ہوگی۔“ سوہ کی پلکیں برسے لگیں۔

”اس کے خالی کان ہاتھ۔ یہ بد رنگے کپڑے۔ آج ماں زندہ ہوتی تو دل پر ہاتھ پڑتا اور تو بھالی اسحاق۔“ جیسے تو کچھ بتا ہی نہیں ہوتا اپنے ڈھوروں کے علاوہ۔“ سوہ نے ایک بار پھر اچھ کر اہل حاجہ کو دکھا۔ یہ بے موقع قصہ اور تمہید کا مقصد؟ اہل حاجہ نے جیسے آنکھیں پڑھ لیں۔ ذرا سا چونک کر اپنی گود میں چھپا کر رکھا اشار پلٹ دیا۔ گلابی جارح کا گھری پیس جوڑا۔ ایک خوشی و تارنگ۔

”دیکھ دھیے ایوہ ہونے کی سچ میں کوئی عمر طے نہیں ہوتی۔ جب اللہ کا حکم ہو تو بس۔ لیکن سننے اور دھننے کی ایک عمر اور وقت ہوتا ہے۔ ہوتی جو تو چار بچوں کی ماں چالیس سے اوپر تو کبھی یہ جوڑا نہ لاتی۔ مگر تیرے ساتھ کی تو ابھی بیابا ہی نہیں گئیں۔ بس کل میرے دل کو لگ گئی۔ یہ میری پتی کا سب سے اچھا جوڑا ہے۔ عید کے دن اس کو پنہنا۔ اپنے باپ کے گھر عزت سے بیٹھی ہے۔ اچھا کھایا پیا کر۔ پنا اوڑھا کر سمجھی۔“ سوہ کا حیران چہرہ غم کی تصویر بن گیا۔

ماہنامہ کرن 154

اس کے پاس بہت سارے جملے تھے۔ جواب۔ جوان۔ ایک لمبی کہانی اور بحث، لیکن وہ کچھ نہ بول سکی۔ اس نے آنسوؤں کو پسے دیا تھا۔ ابابھی ساری بات سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ پہلے ہی بدھا تھا مگر اچانک سو سال کا قبر سے بھاگا بایا لگنے لگا۔ یہ نرا کتیں۔ باتیں۔ احساسات۔

وہ ٹھنڈی سانس بھر کے اپنے صاف سے آنکھیں رگڑنے لگا۔

ماں حاجہ گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کے ہائے وائے کرتی بشکل انھی۔ ساکت اور سوچوں میں غم سوہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور دلیز پار کر گئی۔



ابا اپنے جانور لے کر شہر نہیں جاتا تھا۔ سالہا سال سے قریبی شہر کے چند افراد اس کے مستقل گاہک تھے۔ جو آنکھیں بند کر کے جانور لے لیتے۔ شہر جانے میں بہت سے مسائل تھے۔ پہلے عمران اور سوہ چھوٹے تھے۔ پھر بڑے ہو گئے۔ دونوں صورتوں میں انہیں اکیلے گھر میں چھوڑنا مشکل تھا۔ پھر ابا اپنے گول دائرے میں خوشی خوشی گھومنے کی فطرت والا آدمی تھا۔ جب گھر بیٹھے بہت زیادہ مشقت اٹھائے بنا کام ہو سکتا ہے تو دور دور پھرنا چہ معنی۔ اپنی سوچ میں کافی حد تک درست بھی تھا۔ جب اسے شہروں میں جا کر رہنے اور جانور بیچنے والوں سے زیادہ سولت اور فائدہ مل جاتا تھا تو پھر اپنی مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ چار سال پہلے عمران کی فرمائش پر ابا لاہور شہر کی منڈی بائیس بکرے لے کر گیا۔ دو بھار ہو کر مر گئے۔ دو بکرے نو سرباز لے گئے۔ باقی کھانا پانی، رہائش کرایہ اور دھننے چندے دینے کے بعد اتنا کم منافع ہاتھ آیا کہ سال بھر کا خرچ بھی پورا نہیں پڑا۔ اتنا نقصان ہو گیا۔ عمران شرمندہ ہو گیا۔



”ماسی کی محبت پر مجھے رتی برابر شک نہیں ہے کرم خان۔ سننے والے بھی بہترے اور بولنے والے بھی

اور دیکھنے والی بھی دنیا۔ مگر نظر کسی کسی کو ہی آتا۔ اہل حاجہ کیا کبھی میرے پاس پہننے اور دھننے کو اب کچھ رہا نہیں۔ دیکھ یہ دیکھ ذرا۔“ اس نے سفید کاٹن کے کور والا کڑھالی سے سجا کپڑا اٹھایا اور وزنی بکس کو تمام تر طاقت لگا کے اٹھا کر پلنگ پر رکھ دیا۔ دوپٹے کے پلو سے بندھی چابیوں کے گچھے سے ایک چھوٹی چابی شناخت کی اور بکس کو کھول لیا۔ اندر بڑے ہی سلیقے طریقے سے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ تہہ در تہہ۔ ڈنگرڈ میں اور کچھ شہرڈ کے اندر۔ تقریباً ”تمام ہی کپڑے وہ کئی بار پہن چکی تھی۔ مگر وہ آج بھی نئے لگتے تھے۔ ان کی چمک دمک ماند نہیں پڑی تھی۔ اس نے گلابی کلدانی سے سجا جوڑا اٹھایا اور خود سے لگا کر کرم خان کی جانب دیکھنے لگی۔

”شادی کے بعد سلاہی جوڑا پہنا تھا۔ اور یہ میروں کورے دیکھے والا اتنا بھاری جوڑا پورے پنڈ میں کسی لڑکی کے لیے آج تک نہ آیا۔ پتا نہیں عمران کہاں سے خرید کر لایا تھا۔“

سوہ کا چہرہ بادوں سے لپٹ کر گل رنگ ہو گیا۔ کرم خان نے بھی دلچسپی سے اسے دیکھا۔ او اس لمول سوہ کا یہ روپ بالکل بدل لایا تھا۔

سوہ جوڑا خود سے لگائے اسی پلنگ پر آکر بیٹھ گئی۔ جہاں کرم خان پورے استحقاق سے بیٹھا تھا۔

”جب شادی ہو گئی تو۔ میں نے اپنے ہاتھ کی کڑھالی والے سوٹ کو ہاتھ نہ لگایا۔“ وہ دوبارہ بولنے لگی۔ ”میں نے تجھے بتایا تھا ناں۔ جینز کے کپڑے میں نے خود بنائے تھے۔ بری کے اکیس جوڑے اس نے خود پتا نہیں کون کون سی جگہ سے خریدے تھے۔ سارے کپڑے اتنے شاندار اتنے منگے تھے کہ مجھے اپنی طرف کے کپڑے ہلکے لگنے لگے۔ سوہ یکدم چپ ہو گئی۔ لمول چہرے پر یاد چمکنے لگی۔

”ایک روز کہنے لگا۔ کہاں ہیں وہ تیرے کشیدہ کاری کے نمونے کیا سارے برباد کر دیے۔ ایک بھی پہننے کے قابل نہیں رہا۔“

”اللہ نہ کرے جو برباد ہوں۔ تمہیں پسند نہیں تھے

ماہنامہ کرن 155



تو جسے میں سب سے نیچے رکھ دیے ہیں۔  
 ”سے تو فتنہ نہ ہو تو۔ بھلی کہیں کی۔ وہ زور سے بننے  
 اگلے۔ اوچھے مذاق کرنے اور مذاق اڑانے کے فرق کا بھی  
 نہیں بتا۔ لہذا گل خانی میں تو مجھے چھپ چھپ کے دکھتا  
 تھا گل بولے بناتے ہوئے۔ میں تو خوش ہوتا تھا اور  
 شرمندہ بھی کہ میں تو خالی پیسے خرچ کر سکتا ہوں۔  
 تیرے جیسی لگن جذبے اور محبت کہاں سے لائیں۔ وہ  
 بول رہا تھا۔ میں سن رہی تھی اسے میرا حیران چہرہ دیکھ  
 کر بہت مڑا آ رہا تھا۔ پھر میرے ساتھ اٹھا۔ جسے کی تہ  
 میں پڑے میرے ہاتھوں سے بنے کپڑوں کی ہنص  
 کھولیں اور خود ہی ٹنگیوں میں لگا کر الماری میں  
 سجادیے۔ ہر روز ایک نیا سوٹ پہنوں میں۔ حکم دے  
 دیا۔“

پورا قصہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ مسکراتا چہرہ اور  
 جھگڑاتی آنکھیں دھیرے دھیرے غم ناک اور مدھم  
 ہوتی چلی گئیں۔ اب ایک بار پھر سوہ کا وہی اداس بے  
 رنگ خالی ویران آنکھوں والا چہرہ کرم خان کے ساتھ  
 تھا۔ جس سے اس کی آشنائی تھی۔

”اور اہل حاجرہ کہتی ہے کہ۔“ تھوڑی دیر پہلے  
 والا آواز کا جلتی رنگ معدوم ہو گیا۔ اب وہی ہلکا دم بھجا  
 ہوا الجھہ تھا۔

”دنیا بڑی لڑکی کو زندہ رہنے کا طریقہ صحیح طرح بتاتی  
 ہی نہیں کرے۔ چھپو کی شادی میں ذرا شوخ  
 کپڑے پہن کر چلی گئی تھی۔ میں نے سوچا شادی تو  
 شادی ہوتی ہے گوئی کے کپڑے تب ہی اچھے لگتے  
 ہیں۔ تب تو سب نے تعریف کی اور احد میں پنڈ کے ہر  
 گھر میں ایک ہی قصہ تھا۔ سوہ اتنی جلدی مرے شوہر  
 کا غم بھول گئی۔ بھلی بیویاں تو سر میں مٹی ڈال کر بیٹھتی  
 ہیں۔ ویاہ کے لیے سوہنے کپڑے نہیں۔ انہیں تو لفظ  
 ویاہ کے معنی بھول جاتے ہیں۔ ہاتھوں میں چوڑی کا  
 سوال ہی کیا۔“

پھر بیواری کے بیٹوں کے ویاہ میں ساوے کاٹن کے  
 جوڑے میں دھلے منہ کے ساتھ چلی گئی تو سب نے کہا  
 نحوست ڈال دی۔ دکھ اپنی جگہ مگر دوسروں کی

خوشیوں کا تو خیال کرنا چاہیے ناں۔ نہ مجھے دوسروں  
 کے پاس بیٹھنے دیا نہ ڈھونڈنے کے نزدیک۔ الگ جگہ  
 بیٹھی تو بھی سب ہی گھوریں۔ دنیا والے کے ہاتھوں  
 لکھ کر دے دیں ناں کہ مجھے کسے رہنا ہے۔ لوگ  
 عقیدوں پر نہیں بلا تے۔ منحوس کہتے ہیں۔ نیکی بھرم  
 گئی میری۔ شیم پیدا ہوئی بچاری۔“  
 سوہ کو پتا ہی نہ چلا اور گل سے آنسوؤں کا مار غلہ  
 گیا۔ کرم خان نے بے چینی سے پسلو بدلا۔ وہ شاید  
 اسے چپ رہنے کی تلقین کرنا چاہتا تھا کہ نہ سوئے  
 کیونکہ اس کا رونا اسے تکلیف دے رہا ہے۔ لیکن  
 سوہ کا دھیان نہ تھا۔ وہ اب بچکیوں سے روئے گی  
 تھی۔

”سنے باپ کے گھر میں چپ چاپ رہتی ہوں  
 کرنا۔ لوگوں سے ملنا چھوڑ چکی ہوں۔ دروازے  
 نہیں جاتی کہ لوگ باتیں کرتے ہیں۔ نماز پڑھ کے  
 دل ٹھنڈا رکھتی ہوں اور قرآن پڑھ کے مرنے والے کو  
 بخش دیتی ہوں۔ چپ رہوں تو دنیا کو نحوست لگتی ہے۔  
 بولوں تو کہتے ہیں مجھے کوئی غم نہیں۔ اہل حاجرہ کو کیا  
 کموں میرے پاس کپڑوں کی کمی نہیں مگر دنیا کا دل  
 بہت تنگ ہے۔“

وہ اٹھ کر کپڑے دوبارہ سلپتے سے اندر چلے گئی  
 - کسی نہ کسی کپڑے کو ہاتھ لگاتی تو ٹھنک کر رک جاتی  
 ہر ٹانگے سے یادیں جڑی تھیں۔

اس نے رنگ بند کر کے تالا ڈال دیا۔ چابی پلوئی  
 کس دی۔

اہل حاجرہ کا دیا گلابی جارحٹ کا سوٹ بھی اندر  
 جا چکا تھا۔ کرم خان پلنگ سے اتر آیا تھا۔ وہ سوہ کے  
 نزدیک آکھڑا ہوا۔ سوہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا  
 اور دھیرے سے گل پر ہاتھ پھیرا۔

”میں بھی تو اس دنیا کو تیرے میرے رشتے کی خبر نہیں  
 کرم خان اور نہ اس پر بھی حد لگاؤں گے سب جائز  
 کہہ دیں گے۔ ناجائز کہہ دیں گے مگر تو فکر نہ کر۔ تو  
 میرے رنگ کے بھڑکیلے کپڑے تھوڑا ہے تو تو میرا  
 سنگی ساتھی ہے۔ میرے دکھ درد کو سننے والا۔ کہ مجھے

بھی تالا ڈال کر چابی سامنے لوں۔ اس اتنی بڑی دنیا میں تو  
 واحد ہے کرنا۔ جس سے اب میں دل کی باتیں کہتی ہوں  
 اور تو سنتا بھی ہے۔“

”جل باہر آجا! شام ہونے کو ہے۔“ اور ابانے آکر  
 بس اتنی مہلت دینی ہوئی ہے کہ ہاتھ دھونے تک روٹی  
 لگ جائے۔ وہ برآمدے میں چولہے کے پاس آکر بیٹھ  
 گئی۔ وہ سبزی چھالی اور خیرین تلاش رہی تھی اور کما  
 کی نگاہیں بھی برتن ٹٹول رہی تھیں۔

”مجھے پتا ہے تو بھی بھوکا ہے۔ ذرا دو منٹ صبر  
 کر لے۔“ سوہ جان گئی۔

”اور تو ہی تو ہے کرم خان! جسے میں نے عمران کی  
 ساری باتیں بتائیں۔ وہ بھی جوتانے والی تھیں اور نہ  
 بتانے والی بھی۔ اور اپنی گڑیا بیٹی کی باتیں۔ عمران کو گھر  
 سے کام کے لیے بھیجا تھا مجھے پتا ہی نہ چلا میں گھر میں  
 زونیا ہانڈی کرتی رہ گئی اور وہ نجائے کدھر چلا گیا۔ مجھے  
 گڑیا میری بے ہوش بے خبری میں آواز بھی سنائے  
 بغیر واپس چلی گئی۔ لیکن کرم۔ مجھے میں کہیں نہ  
 جانے دوں۔ ایک مل کے لیے بھی اپنی نظروں سے دور  
 نہ کر دوں۔ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو وہ دہل گئی۔

”تو میں تو کہیں کی بھی نہ رہوں۔“ وہ دھیرے  
 دھیرے کہہ رہی تھی۔ ”دنیا میں ہر انسان کے لیے کوئی  
 تو ہونا چاہیے جو اس کی سنتا ہو۔ اس کا درد بانٹتا ہو ہے  
 ناں کرنا۔“

سوہ نے پیالے میں مہندی گھول رکھی تھی۔ اس  
 کے ہاتھ میں بہت خوب صورت سرخ کپڑے پہ  
 ستارے نکلے تھے۔ ابانے کالے کو چھوڑ کر باقی چوہ  
 بکرے الگ باندھ دیے تھے سوہ ہر سال کی طرح  
 انہیں تیار کرنے احاطے میں آگئی۔ ہاتھ پر تاج  
 باندھے سینگوں پر سرخ رنگ پھیر دیا اور کمر اور پیٹ  
 پر مہندی سے چاند تارے اور عید مبارک بڑی ہی  
 خوب صورتی سے لکھ ڈالا۔ پیروں میں کڑے جن کے  
 اندر ٹھنکرو تھے کہ اس کے پیچھے پیچھے۔

”ابا کی نظروں سے بچ کر رہا کر مجھے! ایک تو انوکھا  
 اوپر سے تیری حرکتیں۔ وہ اس سے باتوں میں مگن  
 تھی۔“ کیا تو نے بھی مہندی لگائی ہے نہ تو کوئی لڑکی  
 ہے۔“ کہا کی نگاہیں مہندی کے کٹورے پر تھیں۔

”یہ تو بس ان کو لگے گی جن کی قربانی ہوتی ہے۔  
 اور یہ سب کالے کلوٹے لال پیسے۔ تو تو گورا چٹا ہے  
 دودھ ملائی جیسا۔“ سوہ نے اس کے گدگدی کرنی  
 چاہی۔ وہ بھی سوہ کے چہرے کے ہر رنگ سے  
 واقف تھا۔ وہ کب خوش ہے کب اداس ہے کب روٹی  
 رہی کب تک جاگتی رہی۔ اور وہ اس سے کتنی محبت  
 کرتی ہے۔ عمران کے جانے کے بعد جب وہ بیوگی  
 کے دن کاٹ رہی تھی۔ جب وہ ہر مل آنے والے بچے  
 کو سوچا کرتی تھی اور جب تخلیق کی تکلیف اور بے  
 ہوشی کے بعد اسے پتا لگا کہ بیٹی مر گئی ہے۔ کہانے  
 اس کی زندگی میں قدم رکھا اور گرا پر پسی نظر ڈالتے ہی  
 وہ اس کی محبت کا شکار ہو گئی تھی۔

سوہ ہاتھ جھاڑ کر مڑی۔ وہ جانتا تھا سوہ اب کیا  
 کرنے والی ہے۔ کہانے بازی لینے کی کوشش کی اور  
 اس کے بازو سے گل رگڑنے لگا۔ ٹانگوں میں سر دینے  
 لگا۔ وہ یہی کر سکتا تھا۔ آخر تو آٹھ ماہ کا ایک دنہ تھا۔  
 اسے ایسا اظہار محبت ہی آتا تھا۔

\*\*\*

”یہ بادام میوے اس کے بجائے ان سب میں سے  
 کسی ایک کو بھی کھلائی تو اوجھے خالص دام مل جاتے۔“  
 ابانے بہت دن بعد آج کما کو دکھا تھا۔ وہ آٹھ ماہ کا تھا  
 اور عمر سے دگنا لگتا تھا۔ سفید سفید بدن پیچھے چربی سے  
 برچکی۔ شیمپو سے دھلا دھلایا۔ کمر پر سرخ بنارس  
 کپڑے کا کمر بند۔ گلے میں رنگ برنگی مالا میں۔ پیروں  
 میں ٹھنکرو اور سرخ موزے جو گھٹنوں تک تھے تلا  
 لگے۔

”ہا ہا ہا۔ تو اس کے نوالے گنتا ہے۔“ سوہ کوئی  
 صدمہ ہوا۔

”اوے اتنی خاطر میں تو میری کرتی تو سارا ہڈیوں کا



دروکل جاتا۔ صبح شام اوپر سے بادام۔ اور تو نے تو اسے گاجر کا مرہ بھی کھلایا تھا ناں۔

”ہاں کس (ابا کو کیسے بتا؟)“

”یہ جو گز گز کے بال رکھے ہیں ناں اس میں بھنسی تھی گاجر بھی۔ اور تو نے مرہ کب بنایا تھا؟“

”وہ گزری سردی میں۔“ سوہہ کو بولنا پڑا۔

”اور مجھے کہا کہ خراب ہو گیا تھا پھینک دیا ہے۔“

ابا نے کڑے تیوروں سے گھورا۔

”ابا! جب مجھے سبب کا بتادیا تو گاجر کا اسے دے دیا۔“ سوہہ نے وجہ بتائی۔

”چھا اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تو نے سبب کا مرہ اسے نہ دیا ہو۔“

”تو ابا! یہ گھر کا فرد ہے حصہ تو اسے بھی ملے گا۔“

سوہہ برا مان گئی۔

”تو ادھر ہا رو میٹرے میں دشمن ہیں۔ بکریوں کو دیتی تو دودھ ہی بڑھ جاتا۔ اتنا قرضہ ہے میرے اور۔“ ابا

کی روپلٹ گئی۔ دھیان حساب کتاب میں الجھ گیا۔

”توبہ ابا۔“ سوہہ برا مان گئی۔ بڑبڑانے لگی پھر

دفعتا ”دھیان آیا کہ ہاں ابا پر قرضہ تو تھا۔ عمران کا

انتقال سوہہ بس کے حادثے میں زخمی ہوا تھا کیے بعد

دیگرے تین آپریشن ہوئے مگر سر کی چوٹ گہری تھی۔

جانبر نہ ہو سکا۔ ابا نے بھتیجے کو بچانے کی سر توڑ کوشش

کی اور پھر قرض کا بوجھ سوہہ نے بڑے آپریشن سے

بچی کو جنم دیا ابا پر مزید قرضہ۔ قرض خواہ اب مطالبہ

کر رہے تھے۔ ابا کا سارا دھیان اپنے جانوروں پر تھا۔

عید میں اب کچھ ہی روز باقی تھے مگر ابا کے حساب

کتاب سے پیسے بہت کم تھے۔ اس کی پریشانی بروقتی

جاری تھی۔ بچیس ذی القعد وکیل صاحب بہت

اچھے داموں تین بکرے لے گئے۔ ابا کا موڈ بہت

خوشگوار تھا۔ سوہہ نے بہت دنوں سے مچلتا سوال

پوچھا۔

”ابا! تم نے ابھی تک اس بار کی قربانی کے لیے جانور

الگ نہیں کیا۔“

”اس بات میں اس سال قربانی نہیں کر رہا۔“ ابا

بہت دنوں سے اس سوال کا مختصر تھا۔ سو فوراً جواب دیا۔

”نہ کیا۔“ وہ دھونچکی رہ گئی۔

”کیا کہ رہے ہو ابا۔ ہمیشہ تو کی اب اس بات کیا

ہو گیا ہے۔“

”مجھ پر بہت قرضہ ہے سوہہ۔ عمران جیسے جوان

جہان کی موت۔ میں بڑھا۔ اور ادھر تو بالکل اکیلی۔

مجھے تیرے لیے بھی کچھ کرنا ہے۔“ ابا کی آواز میں

شرمندگی ٹلال عزم بہت کچھ تھا۔

”ایک قربانی کرنے کی راہ میں اتنے روٹے۔

بس ایک بکرا۔ ہر کام میں رکاوٹ ہے ابا۔ کیسی

باتیں کرتے ہو۔“

”مجھ پر بہت قرضہ ہے سوہہ! اور اس سال میرے

پاس بچے بھی نہیں ہیں کہ اگلے سال تیار ہو جائیں گے۔

مجھے خریدنے پڑیں گے۔ میں دور تک سوچ رہا ہوں

دھیسے۔“ ابا نے غڈھال لہجے میں کہا۔

”بھرا ابا!۔“ حیرت کم ہی نہ ہوتی تھی۔

”تو ابا! قرضہ تو اللہ کرے عید کے چاند سے پہلے اتر

ہی جائے گا اور ہم ابھی آج اس وقت قرض دار ہیں۔

اللہ خیر رکھے تو چاند رات تک سب جانور بک جائیں

گے تو ہم پر قربانی واجب ہو جائے گی ابا۔ تم بھلے

مولوی سے پوچھ لو۔“ سوہہ بحث پر اتر آئی۔

”سوہہ بحث نہ کر۔ میرا دماغ پک گیا ہے اور

انگلیاں گھس گئی ہیں پیسے جوڑ جوڑ۔ ادھر ادھر ایسے

ویسے۔“ ابا جھنجھلا گیا۔ صافہ جھاڑا اور پیر میں جوتا

اڑتے بڑبڑاتے باہر کو نکلا۔ سوہہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

\*\*\*

سوہہ کا رو رو کر راحال ہو گیا تھا۔ وہ سنبھالے نہیں

سنبھل رہی تھی ممتا تو وہ عمران کے جانے اور گڑیا کے

جانے پر بھی نہیں روئی تھی۔ عمران کے فوت ہونے پر

وہ سکتے میں چلی گئی تھی اور گڑیا کی وفات پر وہ سب کی

نصیحت موجب منہ میں کپڑا ٹھونس روٹا دیا۔ مگر اس

وقت اس کا روٹا بلکنا سب کے لیے ناقابل برداشت

کہہ کر کا دونی سرگود میں رکھے روٹی جاتی تھی وہ ابا کے ساتھ کبھی باہر چرنے نہیں گیا تھا بلکہ وہ تو بکریوں کے لے احاطے میں بھی بہت کم جاتا تھا۔ سوہہ اسے مل کر کے لیے بھی خود سے جدا نہیں کرتی تھی اس کی زندگی میں اچھل کود کم تھی۔ بلکہ وہ باہر نکلنے سے ہی گھبراتا تھا۔ درحقیقت وہ ایک ست الودود ڈل نکلا نہ یہ تھا جو کھا کھا کے پھیل گیا تھا۔ چلنا نہ بھرتھا۔

”او کڑیے! بس کر رو رو مرنے تو نے۔“ ابا کے

لے جانوروں کو لگنے والی چوٹیں عام بات تھیں مگر ابا

کے اس جانور تھے اور یہ کہتا تھا۔ سوہہ کا کرم خان۔

”ہائے میرا شہزادہ۔ نظر لگ گئی۔ ہائے کل ہی

ابا تو اس کے مرے گن رہا تھا۔“ سوہہ مچلی۔ ابا

بظنوں میں منہ دینے لگا۔ کرا کی بھری جوانی ابا کو لپٹاتی

تھی۔ مارکیٹ میں رکھتا تو عمر اور صحت کے حساب سے

نیم ہزار بھی مل سکتے تھے۔ مگر فرش پر سیدھی

دی درانتی کرا کے کھرے کے اندر تک گھس کے چیر

گئی تھی۔ کھر دھسے میں تقسیم۔ اور خون بھل بھل

بے لگا اور سے اس کی میں میں حکیم جی نے مرہم لگا کر

پٹی باندھی اور گارنٹی دی کہ ہفتے کے اندر بھاگنے لگے گا۔

مگر سوہہ کے جیسے دل پر آئے چل گئے۔ اس نے

نہی کر کہا کو بٹھایا اور خود زمین پر بیٹھ کے زور و شور سے

لانے لگی پھر اس نے ابا کے سامنے بہت پکا منہ بنا دیا

کہا کہ دودھ پلایا۔ مرہ کھانے کو دیا اور بادام بھی۔

\*\*\*

کرا کی مکمل صحت یابی آٹھ دن میں ہوئی اور یہ نو

ذی الحج کی رات تھی جب وہ معمولی سا بھی لڑکھڑائے بنا

سوہہ کے پیچھے پھرنے لگا تھا۔ سوہہ کی جان میں جان آئی

۔ اتنے دن سے اس نے کرا کی تیمارداری میں کوئی کسر

نہیں اٹھار بھی تھی۔ اس کی اپنی عید کی تیاری بھی کچھ

غافل نہ تھی اور اسے تیاری کرنی بھی کیا تھی۔ بس

بکری کی زیورہ نہ کوئی امید نہ خوشی۔ اس نے اپنے

لبستا ”نئے سوٹ کو استری کر کے رکھ لیا تھا ابا کا پچھلی

مید کا سوٹ ہی اس نے بکسے سے نکال دھو کر لٹکا دیا۔

کرا کو اس نے ہار پھول پہنا دیے۔ یونہی چیزیں اٹھاتے رکھتے اس نے پٹی کے نیچے سے چھریاں ٹوکے ٹھریاں اور دوسرے لوازمات بھی نکال لیے احتیاط سے سلمان سنبھال کر احاطے میں آگئی۔ ابا بہت شاداں و فرحاں فرصت سے چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں مسواک تھی۔

”ابا! وہ تیزی سے آگے آئی۔ ابا کا بہت دنوں بعد

پر سکون چہرہ اسے بھی پر سکون کر گیا۔

”ابا! اب اپنا جانور ادھر صحن میں لے آ۔ اسے ہار

پھول ڈال دوں۔ سانی والی دے دوں۔“

”میں نے پہلے ہی کہا تھا میں اس سال قربانی نہیں

کر رہا، میری گنجائش نہیں ہے۔“ ابا کی طمانیت میں

زور بھر فرق نہ آیا۔

”کیا۔“ سوہہ نے اونچی آواز میں حیرت سے کہا ”ابا

۔ اب تو مجھے پورا فائدہ ہو گیا۔ تو نے تین بکریاں بھی

بچیں اور ابا۔“ وہ ہکا گئی۔

”او میں نے فائدہ تو حاصل کیا پر بھیلے! میرا

نقصان بہت زیادہ ہوا ہے۔ وہ کب پورا ہوں۔“

”بھرا ابا۔“ وہ ابا کی قطعیت کے سامنے بے بس

ہونے لگی۔

”اوئے زیادہ بحث نہ کر۔ اب مجھے گوشت مل جائے

گا کھانے پکانے کو۔ سارا پنڈ پڑا ہے پیچھے۔ بنالینا نمکین

بوتیاں۔ میں بازار جا رہا ہوں سویاں اور دوسرا سودا لانا

ہے کہ نہیں۔“ ابا کو بروقت بہانہ سوچھا۔

”بابا بات تو سن۔ ابا۔ ایک بکرا ہی کر لیتے ہیں۔“

اس نے حل نکالا۔

”نہیں نہیں۔“ ابا تیزی سے نفی میں سر ہلانے

لگا۔

”میں نے پورے سال کا حساب کتاب لگایا ہے

۔ عید کے بعد میں نے دو اور بکریاں گئی ہیں۔ میرا بڑا

حساب کتاب ہے۔ ساری کسریں نکالنی ہیں۔“

”ابا! بس ایک بکرا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں

بولی۔

”میں نے ایک بار کہہ جو دیا تو اتنی ضد کیوں



کر رہی ہے؟" اباس کی صلح جو فطرت سے واقف تھا، حیرت سے پوچھنے لگا۔

"یہاں بیٹھ۔" ابانے شانوں سے تھام کر اسے چارپائی پر بٹھایا اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"وہ اباس۔ وہ۔ عمران۔" اس کی آواز وجہ کے شروع ہوتے ہی بھرا گئی۔

"ہاں ہاں بول۔" ابانے ہمت دی۔

"وہ جو بکھرے چوری ہو گئے ان میں سے وہ بھور اور سفید عمران نے اپنے نام کی قربانی کے لیے پسند کیا تھا۔

اور پتا نہیں اباس جو بڑے کتے ہیں مرنے والے کو پہلے سے پتا لگ جاتا ہے کہ میں نے اب نہیں رہنا تو ابالیے

ہی وہ ایک دن بیٹھے بیٹھے کہنے لگا تھا بھی میرے نام کی ہی قربانی ہے خوب کھلا پلا کر موٹا گھڑا کر کے قربانی دینا

مگا۔ سوہ یا دیر کھنا! میری نام کی ہی قربانی کرنی ہے۔ میں ہنس پڑی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا۔ کہ تو اباس یہ

وصیت ہوئی تال۔ اب وہ تو مرنا جو گے چور لے گئے پر اباس عمران کے نام کی قربانی کرنا چاہتی ہوں میرا

دل۔ اباس۔" وہ رو پڑی۔ دونوں کے درمیان خاموشی بولنے لگی۔ بہت دیر بعد ابابولا۔

"پہلے کہتی جھلی۔ پر بات یہ ہے کہ میرے اگلے سادہ کا بھروسہ نہیں۔ تو ابو حردینا میں کلی میں تیرے لیے

زمن خریدنا چاہتا ہوں تو ایسا کر۔" اباس گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

"تو ایسا کر ایہ اپنے کالے کولے جا۔ صبح اس کی قربانی کر لیں گے عمران کے نام سے۔ ٹھیک ہے۔"

وہ بہت جوش بھرے انداز میں حل بتانے لگا۔ سوہ نے اچھے سے اباس کی شکل دیکھی۔

"پر اباس۔ وہ تو ناجائز ہے تو لنگڑا ہو گیا تھا۔" "تو میری جھلی دھی۔" ابانے ناک سے کھسی

جھاڑی۔ "وہ لنگڑا تو ہے پر اس کی قربانی جائز ہے یہ دیکھ۔" اباس جیسے ٹٹولنے لگا۔

"یہ مولوی صاحب سے میں نے اس وقت سے لے لیا تھا۔ جب وہ سر میں گرا تھا۔" ابانے رانا تہہ لگا

بوسیدہ کاغذ سوہ کی جانب بڑھایا۔ اس نے نا مہجی کے

عالم میں کاغذ کی تہہ کھولی۔

"جو جانور تین پاؤں سے چلتا ہے اور چوہا نہیں رکھتا ہی نہیں یا چوہا پاؤں رکھتا تو ہے مگر اس سے

میں سکتا یعنی چلنے میں اس سے سہارا نہیں لیتا۔ اس کی قربانی درست نہیں۔ اگر چاروں پاؤں سے چلتا ہے

اور ایک پاؤں میں کچھ لنگ ہے تو اس کی قربانی درست ہے۔" (ترمذی ابو داؤد)

"تو اس کا مطلب ہے کہ۔" سوہ نے گرجن مبرا کالے کو دکھا دیا بالکل سیدھا کھڑا تھا۔

"میں نے اس کے دام کالی کم رکھے ہیں۔ کچھ لوگ عید کی شام اور دو سرے دن بھی جانور لیتے ہیں۔ مولوی

کا کاغذ جیب میں ہے شفیق کہہ رہا تھا نقل جانے گا۔ پر تو دل چھوٹا نہ کر۔ میں انہیں منع کرتا ہوں۔

جالتے اندر ویڑے میں۔" اباس اپنی بات مکمل کر کے صافہ جماتا ہر نکلا۔

"میں ذرا سووالے آؤں۔ اوئے بندہ بات حال کیا کرے۔ اب یہ کوئی مسئلہ ہے۔ پہلے کہہ دینی

جھلی!" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے باہر نکل گیا۔

سوہ سکون اور بے چینی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ گھر کے اندر آئی۔ اس نے قربانی کے سلمان میں سے

ایک رسی نکالی۔ سرخ ستارے نکالتا جیسے بیرون کے زیور۔ پیالے میں مندی گھول لے۔ رات کا آکا

گوندھنا پائی تھا۔ "پہلے اپنے کام کر لوں تو پھر۔" وہ کما سے مخاطب تھی۔

"اور تجھ سے بچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ ہاں ہاں مان لیا اب تو بھلا چنگا ہے پر احتیاط کرنی پڑتی ہے۔" کالے

میں میں کر کے یقین دلایا کہ وہ اب ٹھیک ہے۔ سوہ نے برہہ کرنی دی لگایا۔ رنگ برنگے ٹاپے

لگاتے اچھلتے پروگرام۔ یہ سب منظر اب آنکھوں کو چبھتے تھے وہ خاموشی سے اسکرین دیکھتی رہی۔ کئی

چیز مسلسل دھیان پر دستک دے رہی تھی۔ جھلی عید

عمران ساتھ تھا۔ اور ایک اکیلا عمران اس کے لیے سارا شہر تھا۔ ساری رونق ساری ہنسی ساری خوشی۔

اور اب وہ نہیں تھا سارا شہر خوشی کے رنگ میں رنگا مگر دل کا سناٹا۔ اسے رونا آ رہا تھا۔ مگر وہ رونا نہیں چاہتی

تھی۔ وہ ٹی وی سے آتی آوازوں کی جانب متوجہ ہو گئی۔ آریا کو بہت تفصیل و جزیات کے ساتھ بتایا جا رہا تھا۔

"قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجہ قبولیت پالیتا ہے۔ لہذا تم خوش دلی

کے ساتھ قربانی کرو۔" مہمان نے فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم سنایا۔ سوہ اٹھی اور کالے کو زیور پہنانے

لگی۔ تاج ماتھا۔ ٹھنکرو پٹی اور سرخ موزے۔ کما مسلسل میں میں کر رہا تھا۔ اسے سوہ کا۔ کالے کے

ساتھ انشتات اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ "اپنی سب سے پسندیدہ چیز راہ خدا میں دینا۔ بے

عیب، خوب صورت، تو اتنا تندرست، وہ جو آپ کسی اور کو نہ دے سکتے ہوں۔" مہمان نے ام المومنین

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان سنایا۔ سوہ جو کی۔ وہ خالی نگاہوں سے کالے کو ٹھکنے لگی جواتنے

شکھار کا عادی نہیں تھا۔ سرخ رہا تھا پیر جھٹک رہا تھا۔ سوہ کسی معمول کی طرح اٹھی۔ اس نے کالے کی رسی

کھول دی۔ وہ جست لگا کر باڑے کی سمت بھاگا۔ کما خوش ہو گیا۔

"میں میں میں۔" ہاں کما تو۔ تو کل دو لہا کی طرح تیار رہنا سوہ نے گہری نگاہ سے اسے دیکھا۔ قربانی کی

حکمت بتاتی عالم دین کی آواز آئی۔ "ایسی چیز جس کو کھونے کا احساس آنکھوں کو بھر

دے۔" لکچر جیر دے۔ دل بند کر دے۔ حلق خشک ہو جائے اور محض تصور سے پیٹ میں گرجیں پڑنے

لگیں۔" سوہ کی آنکھوں کے آگے عمران کے مختلف انداز

آنے لگے اور وہ منہ می گڑیا جس کی بس اسے اک جھٹک یاد تھی۔

"وہ دینے والا ہے اور جو چیز دیتا ہے وہ لینے کا بھی حق دار ہوتا ہے اور دنیا کی ہر چیز دنیا ہی میں چھوڑ جانے کے لیے ہوتی ہے۔ آپ ہنس کر دیں یا رو کر دیں۔ تو جب

دینا ہی ہے تو خوشی خوشی کیوں نہیں۔" ٹی وی سے مسلسل آواز آرہی تھی۔

سوہ نے اپنی بغل میں منہ دیتے کما کو پکار کر اپنے سامنے سیدھا کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح تیار تھا۔ بس اک

کی تھی۔ مندی کا پیالا پکڑا اور سفید بے داغ اونی ڈھیر پر چاند تارا دو سری جانب عید مبارک لکھ دیا۔

"اپنی سب سے پیاری چیز۔" سوہ نے جھک اس کی پیشانی چوم لی۔ آنکھ سے آنسو بہ نکلا۔

"اب اتنا تو محبت میں ہو ہی جاتا ہے نا۔"

خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



دیکھ زوہ محبت

قیمت - 300 روپے

کتاب خانہ ڈائجسٹ 37 - اردو بازار گرجی - فون نمبر 32735021



## فرحانہ ناز ملک



عقیدت کی اماں جیلہ اور عقیدت کو لیے مستقل طور پر لاہور شفٹ ہو گئی ہیں کیونکہ عقیدت کا میڈیکل کانفرنس ایڈمیشن ہو گیا ہے۔ عقیدت ایک کم اعتماد اور نہایت دلی لڑکی ہے۔ اسے لوگوں کا سامنا کرنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ عقیدت کی بہن تحریم اور بھائی شہزاد عقیدت سے نفرت کی حد تک لائق رہتے ہیں اور اماں سے بھی ملنا گوارہ نہیں کرتے۔ دونوں اماں کو ماں سمجھنے کے روادار نہیں۔ تحریم کا شوہر لوہس ڈاکٹر ہے اور تحریم اس پر باندھی لگا کر ہے کہ وہ عقیدت کی کسی بھی طرح سے مدد نہیں کرے گا۔ اور نہ ہی اس کی اماں کے گھر جائے گا۔ وعدہ کر لینے کے باوجود لوہس بہنوں کا کام کرتا ہے۔

منعمان کے والد زکریا آفندی ایک امیر کبیر صنعت کار ہیں۔ وہ اپنی بیوی فائزہ کے ساتھ نہایت ناروا سلوک روا کرتے ہیں۔ دونوں کے تعلقات کبھی بھی اچھے نہیں رہے۔ ان دونوں کی خراب زندگی کا اثر منعمان پر شدت سے پڑا ہے۔ دونوں میاں بیوی نے اپنے اختلافات کی وجہ سے منعمان کو مکمل طور پر انہماک رکھا۔ جس کی وجہ سے وہ ایک neglected انسان بن چکا ہے۔ منعمان ایک شاندار شخصیت کا حامل نوجوان ہے لیکن اس میں حساسیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور وہ ماں باپ سے بے زار ہے۔ ان سے جذباتی طور پر بہت دور ہے۔ اور اپنی شخصیت کی کمی کا پتہ دار ماں باپ کو ٹھہراتا ہے۔ فائزہ شوہر کی بے رخی کی وجہ سے ذہنی مریض بن چکی ہیں۔ منعمان ماں کے علاج کے لیے امیں لاہور لے جانا چاہ رہا ہے۔ جبکہ زکریا آفندی فائزہ کے لاہور جانے پر ایک عرصہ ہوا باندھی لگا چکے ہیں۔ غوری منسل میں تین پورشنز ہیں۔ گری بی بہت دیکھی رہتی ہیں۔ اور غوری منزل کی تینوں بیویوں مارے باندھے ان کا خیال رکھتی ہیں۔ آج کل نورین سلمان کی بیٹی کشف کسی غلط چکر میں ہے۔ جس کی وجہ سے گھر میں پریشانی ہے۔ جبکہ جب سلمان جوبلی دی



نند کی لاہوری اینڈ اولڈ بکس سنٹر  
صدر بازار ہری پور ہزارہ جلد ساز  
منعمان کی شہزادہ طاہر محمود





جینٹل پرائیونگر ہے سنعان سے ملاقات کے بعد سنعان کو بہت شدت سے سوچنے لگی ہے۔

عالم صاحب معروف جاگیردار ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں طلال اور جلال، طلال سے عمر میں کئی سال چھوٹا اور مفلوج و محتاج ہے۔ وہ پیدا کنی ایسا ہے۔ اور عالم صاحب کے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے کہ ان کے بعد اس کا کیا ہوگا۔ عالم صاحب کسی پچھتاوے کے زیر اثر ہیں۔ آج کل اپنی جائیدادوں بیٹوں میں تقسیم کرنے کے کام پر لگے ہوئے ہیں۔ طلال کو جائیداد کی یہ تقسیم باپ اور بھائی کے خلاف کر رہی ہے۔ جلال اس کی اور اس کی بیوی سحر کی نظروں میں کاسخ کی مانند جہنما ہے۔

فرد نیویارک میں ذاتی کاروبار چلاتا ہے اور خوشحال ہے۔ فدا پاکستان سے نیویارک ایک ٹریڈی کے نتیجے میں عاید سوتلی ماں کے مظالم نے اسے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نیویارک میں اس کی ملاقات صاحب سے ہوئی ہے۔ صاحب ایک خوش مزاج اور حسین لڑکی ہے۔ اور وہ فرد پر مر مٹی ہے۔ فرد بھی اس سے متاثر ہے مگر اظہار نہیں کر پاتا۔ فرد ماہ اپنے بھائی کے ہمراہ گاؤں جاتی ہے۔ اور شہباز زبانی پہلے سے شادی شدہ جاگیردار کو دل دے آتی ہے۔ شہباز سے ملاقات کی خواہش میں وہ اپنی بھانجی یا سہیلی کے گھر رہنے جا رہی ہے۔ کیونکہ شہباز یا سہیلی کے شوہر بھی کسی دوست ہوتا ہے اور فرد ماہ کو امید ہوتی ہے شاید شہباز وہاں اس کے بھائی کے گھر آجائے۔ فرد ماہ فطرتاً "خاصی خود غرض" اکھڑ مزاج اور مطلب پرست لڑکی ہے۔ اس کی وجہ سے یا سہیلی سمیت تینوں بھائیوں نے مشکل حالات دیکھے ہیں۔

عقیدت کا جگہ جانے لگی ہے۔ اس میں اعتماد پیدا ہونے لگا ہے۔ کالج میں اس کی ماں رجا وغیرہ سے دوستی ہو جاتی ہے اور کالج میں ہی ایک لڑکا حسن ضیاء اس میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔

(اب آپ آگے پڑھئے)

## آٹھویں قسط

اس رات کسی شادی کا گمان ہو رہا تھا۔ ہر طرف رنگ و بو کا ایسا سیلاب کہ آنکھیں خیر ہو جاتیں۔ مسالوں کے نام پر خاندان کے خاندان اٹھ چلے آ رہے تھے۔ اس کا انھیال، دوھیال سبب۔ فردا کی قیمتی فراک پہنے کسی شہزادی کی طرح وہ سب کی محبتیں بنو رہے تھے۔ ڈیڈی اپنے پسندیدہ ڈنر سوٹ میں ملبوس اسے ہمیشہ کے زیادہ پیٹ سم لگ رہے تھے۔

شوخی رنگوں کے امتزاج کی سازھی اور سلیقے سے کیے گئے میک اپ میں می محفل کی جان بنی ہوئی تھیں۔ ان کی چمک دار اور شفاف جلد کے حامل روشن چہرے پر روشنیاں پھیل رہی تھیں۔ نظریں ٹھہر گئی تھیں۔ انہیں ہمانے سے نکتے ڈیڈی کا دل یقیناً "سیر نہیں ہو رہا تھا۔ یہ سب اپنے آپ میں بہت مہل اور خوش کن تھا۔ اس کی عمر تب بہت چھوٹی تھی۔ شاید چار سال یا شاید پانچ۔ مگر پھر بھی وہ محسوس کر سکتی تھی وہ دنیا کی خوش قسمت ترین بچی تھی۔ اس کے می ڈیڈی دنیا کے بہترین می ڈیڈی تھے۔ وہ می کی آنکھ کا تارا تھی تو ڈیڈی کے جینے کی وجہ۔ ڈیڈی کی اس میں جان بند تھی۔ پھر جب شہباز آگیا تھا جیسے تصویر مکمل ہو گئی، ایک دم سے رنگین۔ می ڈیڈی کی توجہ بٹ جانے کے باوجود بھی وہ نہال تھی۔ اسے شہباز کی گڈے کے جیسا لگتا تھا۔ کسی بھی قسم کی حسد اور حسد کی بجائے اس نے شہباز کی آید کو کھلے دل سے قبول کیا تھا۔

اس رات شہباز کی پہلی سالگرہ تھی۔ ہر سال اس کی بھی سالگرہ منائی جاتی تھی اور اچھے خاصے اہتمام کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ لیکن شہباز کی سالگرہ پر تو کسی شہزادے کی سالگرہ کا گمان ہو رہا تھا۔

"ڈیڈی میری فیکسٹ برتھ ڈے پہ بھی ایسے سب لوگ آئیں گے وہ ٹھنک گئی تھی۔ ڈیڈی نے ہنسنے ہوئے

بہت لیا تھا۔  
"ایسے ہی آئیں گے"  
"آپ کی پہلی سالگرہ بھی ایسے ہی منائی گئی تھی۔" می نے اسے خوش کرنا چاہا تھا۔  
"لیکن وہ مجھے یاد نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم آپ کی آنے والی سالگرہ ایسے منالیں گے۔" ڈیڈی کو بچوں سے بحث پسند نہیں تھی۔ جو بات فوراً مانی جاسکتی تھی۔ اس کے لیے حیل حجت کرنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ جبکہ می قدرے ناراض ہو گئی تھیں۔ اگرچہ پیسہ خرچ کرنا انہیں بھی پسند تھا۔ لیکن وہ ڈیڈی کی طرح شاہ خرچ قطعی نہیں تھیں اور ڈیڈی تو وہ انسان تھے جو اپنی ذات کے لیے کم ہر راضی نہیں ہوتے تھے تو بچوں کے لیے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے می کو کسی ملکہ کی طرح رکھا ہوا تھا۔ وہ بے حد کھلے دل و کھلے ہاتھ کے مالک تھے۔ ان کی محبت کے سائے میں می ایک آزاد اور خود مختار زندگی بسر کر رہی تھیں اور اس کا ننھا ذہن تب نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ سب اگر ان کے گھر کے خوش گوار ماحول کے لیے ضروری تھا تو بہت سے لوگوں کے لیے ناگوار و ناقابل برداشت بھی تھا۔

صرف اتنا جانتی تھی۔ وہ جنت کی مکین تھی۔ جہاں صرف خوشیاں بسرا کرتی تھیں۔ غم اور دکھ کیا ہوتے ہیں اسے معلوم نہیں تھا۔ جہاں اس کی پہلی سالگرہ اگر بہت اہتمام کے ساتھ منائی گئی تھی تو اس کی پانچویں سالگرہ پر بھی ایک عالم کو مدعو کر لیا گیا تھا۔ اسے پہلی سالگرہ بھول گئی تھی اور شہباز کی سالگرہ پر روشنیاں رونق اور ہلا گلا دیکھ کر اسے اپنی بھی ایسی ہی یادگار سالگرہ منانے کی خواہش۔ ہوئی تھی۔

شہباز کی چھٹی سالگرہ کی ہی طرح اس کی پانچویں سالگرہ بھی یادگار بن گئی، آخری یادگار۔

\*\*\*

"میں ڈیڈی سے بہت اہمیر لیں تھی۔ وہ میرے لیے کسی دیوتا کا درجہ رکھتے تھے۔ میری چھوٹی سے چھوٹی خوشی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے ہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

میرے خواب لوٹا دو	کسی راستے کی تلاش میں	شریک سفر	ساری بھول ہماری تھی
			
نکتہ عبداللہ	میمونہ خورشید علی	زہرہ متار	راحت جبین
قیمت - 400 روپے	قیمت - 350 روپے	قیمت - 550 روپے	قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی  
فون نمبر: 32735021



کے لیے اپنی بڑی سے بڑی مصروفیت ترک کر دینے والے میرے آئیڈیل ڈیڈی۔ "وہ اویس کو اسٹریٹ پر دھکے دینے لگی تھی۔ دن بھر کی سوچوں کا عکس اس کے چہرے پر کچھ یوں واضح تھا کہ محض ایک بار دیکھا ہوا ہے۔ وہ کسی لاوے کی مانند پھٹ رہی۔"

"وہ سب سے ہٹ کر تھے۔ میری فیملی کے باقی سب مردوں سے ہٹ کر۔ مختلف اور منفرد۔ میرے بھائی اور چھوٹے چاچو بھی ان ہی کے بھائی تھے۔ ایک خون گھڑیڈی کی کوئی ایک بات بھی ان میں نہیں تھی۔ سچے سچ بہت عجیب انسان تھے۔ بہت ہی زیادہ عجیب۔ مجھے ان سے خوف آتا تھا۔ وہ شاید ہی زندگی میں کبھی مسکرائے ہوں۔ ان کے لیے گھر اور اولاد سے زیادہ پیار نہیں کیا۔ امپورٹڈ تھا۔ وہ اپنے سے وابستہ رشتوں کو بہت عجیب طریقے سے ہنڈل کرتے تھے اپنی رعایا سمجھ کر۔ ہمیشہ اپنی منوانے کے عادی۔ اور۔ چھوٹے چاچو۔ وہ بظاہر تو بڑے چاچو جیسے نہیں تھے مگر میں نے انہیں بھی اکثر چینی سے لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ پھر میرے ماموں لوگ وہ ان سے بھی عجیب۔ اتنے بار عجب اور بد بے کی حامل پر سٹائلیز والے اور بیویوں کے ہاتھوں کچھ تکی۔ صرف میرے ڈیڈی تھے جو سب سے الگ تھے۔ انہوں نے بھی اپنی بیوی کو دبا کر اپنے رعب سے ڈرا کر نہیں رکھا۔ وہ یقیناً دوسروں کی عزت کر کے عزت پانے کے خواہش مند تھے۔"

"دنیا میں کوئی انسان ایک جیسا نہیں ہوتا۔ چاہے وہ مجھے بہن بھائی بھی ہوں۔ تم اپنی مثال آپ۔ عزت اور تم میں مزاجاً کچھ بھی ایک جیسا نہیں۔" تحریم نے فوراً اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچا تھا۔ دانت کھینچ کر اویس کو ایسی تند اور شاکی نظروں سے دیکھنے لگی تھی کہ وہ زبان دانتوں تلے دبا کر رہ گیا۔ تحریم یقیناً "حسب عادت" اسے بہت کچھ سنا سکتی تھی۔ لیکن اس وقت ایک الگ حصار میں محصور ہوئی بیٹھی تھی اور شاید فی الحال اس سے ٹکلتا نہیں چاہتی تھی۔ وہ لوگوں کی اس قسم سے تعلق رکھتی تھی۔ جو جب اس ہوتے ہیں تو سب مصروفیات سب مشغلے چھوڑ کر بس جی جان سے اس ہی ہوتے ہیں۔

"وہ بہت نفیس انسان تھے۔ کم پر بھی راضی نہیں ہوتے تھے۔ برانڈڈ کپڑے، برانڈڈ جوتے۔ ہر چیز اعلا استعمال کرتے۔ سیم کی سولیات انہوں نے اپنی بیوی کو بھی دے رکھی تھیں۔" اویس نے ماتھا مسلتا شروع کر دیا تھا۔ وہ ڈیڈی کے ساتھ ان کی بیوی کا ذکر یوں کر رہی تھی گویا ان کی کوئی اور بیوی ہو۔ اس کی ماں نہیں۔ ہمیشہ کی طرح اویس اس کے اس طرز تخاطب پر معترض ہوا مگر صرف دل میں۔

"میری فریڈ زچھ پر بہت رشک کرتی تھیں۔ حالانکہ وہ آج ایسی نہیں تھی۔ مگر آپ کو بتا چل جاتا ہے۔ آپ کی لائف سے ایمپریس ہو رہا ہے اور کون نہیں۔ مجھے خود کو بھی اندازہ تھا میری زندگی بڑی شہانہ مگر رہی ہے۔" اس کی آواز بھرانے لگی تھی اور اب وہ یقیناً "گھنگو کو اس منج کی طرف لے جانا چاہ رہی تھی۔ جہاں وہ خود پر خود ہی ترس کھاتی۔ خود ہی ماتم کرتی۔ اویس نے ہلکی سی جمالی لی تھی۔ "تحریم میں تھکا ہوا ہوں یار۔"

"اور تم جانتے ہو۔ میں اور شہر عرش سے فرش پر گر آئے گئے۔ ہماری ماں تو بھی ہی ہماری گناہ گار۔ ڈیڈی نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا۔" وہ رو رہی تھی۔ ہونٹ چبائے جا رہی تھی۔

"مجھے تم کو ایک بات بتانا تھی۔ رامین کی منگنی فکس ہو گئی ہے۔ می نے مجھے فون پر بتایا تھا۔" اویس نے اپنی سی کو شش کی اسے ایک الگ موضوع کی طرف متوجہ کرنے کی اور وہ ہمیشہ کی طرح ناکام رہا۔ "سی لیے اسی لیے آج جب شہر یار نے مجھے کہا کہ وہ ڈیڈی سے ملا ہے تو شاک لگا۔ بہت برا ٹیل ہوا۔ بہت رونا آیا۔ پرانی ہر بات یاد آگئی۔ اپنی بیوی کی طرح ڈیڈی بھی برابر کے قصور وار ہیں۔ انہوں نے ہمیں تب چھوڑا جب ہمیں ان کی شدید ضرورت تھی۔ انہوں نے نہ جانے کیا سوچ کر اپنی سگی اولاد یوں پھینک دی۔ کوئی ہوش مند انسان ایسا کرتا ہے کیا؟ یہاں سے پتا چلتا ہے۔ خون کی تاثیر ایک ہوتی ہے۔ میں غلط تھی۔ ڈیڈی مختلف نہیں تھے۔ اپنے بھائی کی

طرح۔ یہ بھی سائیکل تھے۔ خود غرض سیلف سینٹرڈ اور ام پیجوس۔" اویس نے اس کے ہاتھ تھکنے شروع کیے وہ کلب رہی باقاعدہ۔

انہیں نے فون بند کر دیا۔ میں شہر یار سے ناراض ہوں۔ اسے ڈیڈی سے نہیں ملنا چاہیے تھا۔ ہم دونوں نے عہد کیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہیں بس۔ کبھی می ڈیڈی سے نہیں ملیں گے۔ کبھی انہیں معاف نہیں کریں گے۔ شہر یار نے مجھے تنہا چھوڑ دیا اویس۔ اس نے میری بات نہیں رکھی۔ "وہ پھوٹ پھوٹ رونے لگی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے اس ایک بات کو اس وقت سے دل پر طاری کر کے اپنا شہر خراب کر لیا تھا۔ اویس نے آگے بڑھ کر اسے خود سے لگا لیا۔ اس کا سر کھینکتے ہوئے وہ ایک بات سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ خون کی تاثیر واقعی نہیں بدلتی۔ تحریم بھی سائیکل لگ رہی تھی۔



تاریک و سنسان برآمدے کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک روندتے طلال نادرہ آگ میں۔ دہک رہے تھے۔ فشار خون تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ بھینچے ہوئے جڑے اندرونی خلفشار کا غماز بنے ہوئے تھے۔ وہ جسے آپے میں ہی نہیں تھے۔ رہ رہ کر عالم صاحب کی گونج واربھاری آواز دل پر ہتھوڑے کی مانند برستی اور انہیں نئے سرے سے الاؤ میں دھکیل دیتی۔ وہ ایک انہونی کا شکار ہونے جا رہے تھے۔ یوں تو اندر خالے بہت کچھ غلط ہونے کی سن گن انہیں کئی دنوں سے مل رہی تھی۔ مگر وہ اسے تو کیا آنکھوں دیکھی تک کو جھٹلاتے رہے۔ عالم صاحب کی گزشتہ کئی روز سے حویلی سے وقت بے وقت غیر موجودگی۔ منشی برکت کی غیر ضروری مشکوک اور قدرے پھر تکی سرگرمیاں۔ پڑاویوں، تحصیل داروں سے ملاقاتیں اور دعوتیں۔ وکیلوں کی آؤ بھگت، مختلف زمینوں کی حد بندیوں غرضیکہ چھپ کر پکائی جانے والی کچھڑی آج انہیں بھی کھلا دی گئی۔ وہ بھونچکا رہ گئے۔

عالم صاحب ڈیرے پر تھے۔ شام سرد رہی تھی۔ جب انہیں بھی بلوا بھیجا گیا۔ وہ کچھ ہوشیار باش ہوئے وہاں پہنچے جہاں دل میں بڑے شک کی تصدیق کا سامان موجود تھا۔ بہت سے کانگڈات ان کے دستخطوں کے منظر تھے۔ "تھو طلال" اپنے آپ میں اچھے طلال چارو ناچار بیٹھ گئے۔ انہیں چائے پیش کر دی گئی۔ جس کا ہر گھونٹ ان کے اندر کڑواہٹ کی مانند گھلنے لگا۔ منظر نامہ سمجھ میں آنے ہی ان کی دلچسپی کو ایڑھ لگ گئی تھی۔ "میں چاہتا ہوں۔ اپنی زندگی میں اس فرض سے آزاد ہو جاؤں۔ آگے میرے بعد تم لوگ خوار نہ ہو۔" ان کے سامنے کانگڈات کا پلندہ کھسکاتے ہوئے عالم صاحب نیچی آواز میں بولے تھے۔ طلال نے بے ساختہ ہونٹ کھینچ کر خود کو بولنے سے باز رکھا۔ وہ کہنا چاہتے تھے خوار ہونے کا کیا سوال؟ اور تم لوگ سے کیا مطلب؟ اولاد کے نام پر وہ ایک ہی تو سونے کا مسکے تھے۔ عالم صاحب کی جھولی میں اور رہا جلال تو وہ تو نہ زندوں میں شمار ہوتا تھا اور نہ مردوں میں۔ بلکہ طلال اپنی کہتے تو جلال صرف مردہ تھا۔ ایک زندہ اور ناقابل برواشت لاش۔ اور وہی فاس پر نہ اب ان کی برابری کرنے لاق بننا جا رہا تھا۔

"میں جان سکتا ہوں یہ ضرورت کیوں پیش آئی۔ آپ کیوں اتنے جلد باز ہو رہے ہیں۔" ان کے مزید کچھ کہنے سے پہلے منشی برکت نے کچھ کانڈان کے ہاتھ میں پکڑا دیے۔ انہوں نے غیر ارادی نظر ان کانگڈات پر دوڑائی۔ شہر میں موجود نمبر مارکیٹ والی دکانیں، آموں کے باغات، حویلی کا آدھا حصہ، غرضیکہ موٹا موٹا مال و اسباب ان سے چھٹنے کا اہتمام ہو چکا تھا۔ ان کے ہاتھ میں موجود زمینوں کی دستاویزات، انتقال، سب کھڑ کھڑا گئے۔ بڑی بو کھلائی ہوئی نظریں انہوں نے عالم صاحب پر ڈالیں کہ جو مطمئن نظر آ رہے تھے۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ ہم میرا مطلب جلال۔"



”ہاں۔ جلال؟“ عالم صاحب نے بغور اپنے بڑے بیٹے کو دیکھا تھا۔ جن کی بدلتی رنگت انہیں مایوس کر رہی تھی۔  
”میرا مطلب آپ نے مجھ سے پوچھا بھی گوارا نہیں کیا۔“  
”پوچھا کیا کیا مطلب؟ اور نہ ہی اس میں دورائے چاہیے تھی۔ جو جس کا حصہ بنتا ہے وہ اسے مل کر رہتا ہے۔ چاہے تمہارے مشورے جو بھی ہوتے۔“ عالم صاحب کی آواز بلند تھی۔  
”ابا جان۔ میرا مطلب یہ تھا۔ مطلب آپ سلامت رہیں۔ ابھی سے کیوں۔“ طلال کو ہکلاہٹ ہونے لگی۔

”بھئی بھڑن وقت ہے۔“ عالم صاحب نے انہیں بچ میں ٹوک دیا۔ طلال کے اندر کا اضطراب چہرے پر سٹ آیا۔ وہ بھی منہ پر ہاتھ پھیر رہے تھے تو کبھی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں جکڑ رہے تھے۔ سچ تو یہ تھا باپ کی اس حرکت نے ان کی سمجھ بوجھ کو منہ کے بل کر ادیا تھا۔ وہ جیسے سن ہوئے دماغ کے ساتھ بیٹھے تھے۔  
”طلال تم اس حقیقت کو تسلیم کرو۔ جائیداد اولاد میں تقسیم ہونی ہی ہوتی ہے۔ تم اور جلال دونوں باپ کی جائیداد کے برابر حق دار ہو۔“

”صرف جلال اور آپ ہی نہیں سائیں۔ خان کی جائیداد میں ایک اور حصہ بھی ڈھکا ہے۔“ اور اس نے منہ لپکاتے ہوئے ”آئیل مجھے بار“ والا کام کیا تھا۔ طلال کے صرف کان ہی نہیں گھڑے ہوئے تھے۔ اندر کیس بڑے زور کی سویاں سی چھٹی تھیں۔ انہوں نے کچھ ایسی لال انگارہ نظروں سے منہ کی دیکھا کہ وہ اپنے آپ میں سٹ کر رہ گیا۔ بات کی سنگینی کا احساس کہہ لینے کے بعد ہوا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ انجانے میں طلال کے دل میں ایک پھانس ڈالنے کا موجب بن گیا تھا۔

”میں چاہتا ہوں۔ آسان موت مردوں۔ کوئی بوجھ میرے سر پہ نہ ہو۔“ پہلی بار طلال کے چہرے پر مسخر پھیلا۔ انہوں نے گہری نظرس باپ پر ڈالیں۔ آسان اور مشکل کا فیصلہ وہ اکیلے کمال کر سکتے تھے۔ درحقیقت تو انہوں نے طلال کے ہاتھ ایک ڈوری تھما دی تھی۔ زندگی اور موت کی ڈوری۔ آسان اور مشکل موت کی ڈوری۔  
”بوجھ۔“ اور اب وہ طویل و سنسان برآمدے میں کھل کر شل ہوئے جارہے تھے۔ مگر اندر کی آگ تھی کہ جھلسائے ہی جارہی تھی۔ ان کی شہ رگ دبانے کے انہیں دیوار سے لگانے کے سامان پیدا کیے جارہے تھے۔ وہ کیونکہ نہ بے سکون ہوتے۔

”آپ۔“ بڑی سی جمائی لیتی اپنے کمرے سے نکلتی سحر کو ٹھکناڑا۔ ”آپ کب آئے؟ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ اندر کیوں نہیں آ رہے؟ اتنی دیر لگادی؟ ابا جان نے کیوں بلایا تھا؟ کون کہہ سکتا تھا وہ گہری نیند سے اٹھ کر آتی ہے۔ طلال کے اندر کی کڑواہٹ مزید بڑھی۔

”تم جو کرنے جارہی ہو وہ کرو پہلے۔“ ایک تو سحر کا سر جھاڑن بہاڑ جلیہ۔ اوپر سے یہ بے وقت کی تفتیش۔ طلال کا دماغ اور خراب ہونے لگا۔ خلاف معمول بحث میں پڑنے کے بجائے سحر منہ بنائی چکن کی طرف رواں دواں ہوئی۔ اس کے جاتے ہی طلال جلدی سے کمرے میں گھس گئے۔ سحر کے آنے سے پہلے انہوں نے سو جانے کا ڈراما کرنا تھا۔ سحر ہونے تک سوال جواب کرتی رہتی۔



ہارون کی براڈ کے بائز ایک طرف پارکنگ کے لیے مختص جگہ پر چرچائے تو جیسے ارد گرد تنی خاموشی کی چادر میں چھید پڑ گئے۔ گاڑی کی ہیڈلائٹس کچھ دیر کے لیے تاریک ماحول پر حاوی ہوئیں اور پھر ڈوب گئیں۔ وہ دونوں ایک

ساتھ گاڑی سے نکلے تھے۔ گھڑی کی سوئیاں اس وقت بارہ کے آس پاس چکرار ہی تھیں۔ دریا کے اطراف کا ماحول سناٹا سا ہوا اور بھیگا ہوا تھا۔ سارے میں پھیلی تلی ہوئی مچھلی کی خوشبو ان کے حواس پر چھانے لگی۔ وہ دونوں بہت روتی سے چلتے ڈھلوان اترنے لگے۔ جس کے عین نیچے دریا سکوت کی لپیٹ میں شاید گہری نیند کے مزے دے رہا تھا۔

”تو مجھے بتا کر لاتا تو میں وصیت ضرور چھوڑ آتا۔“ دریا کے عین کنارے پہنچ کر ہارون نے اطمینان کی سانس لی کہ وہنا پہلے خیریت سے اتر آیا تھا۔

”پچ نہیں انسانوں والے کام تھے آتے کیوں نہیں۔ رات کو ساری دنیا سوئی ہے تو لو کی طرح جاگتا ہے۔“ دونوں دریا۔ کے کنارے بیٹھ گئے تھے۔ یوں کہ پانی ان کے جوتوں کو آکر چھونے لگا۔ تاریکی خاموشی اور گھمائی۔ یہاں پر اسرار ست ہی نہیں خوف ناک بھی محسوس ہوئی۔

”مجھے گیدڑوں کی آوازیں آرہی ہیں۔“ ہارون نے گردن گھما لی تھی۔  
”مجھے لگتا ہے بھیڑیے ہیں۔“ پانی میں پتھر پھینکتے سنجان کا اطمینان قابل دید تھا۔ ہارون کا حقیقتاً ”دل حلق میں آگیا۔“

”مجھے کچھ ہو گیا تو اس کا ذمہ دار تو ہو گا۔ پتا نہیں تو سکون کے دن پیدا کیوں نہیں ہوا۔ بیٹھے بٹھائے جن آجاتا ہے تجھ پر۔ اب اس ٹائم لے کر یہاں آگیا۔ بندہ پوچھے تیری خود سے دشمنی ہے مجھ سے تو نہیں۔ دیکھ تو ذرا۔ ایسی اندھیری رات اور اس پر۔“ ہارون نے درمیانہ نظروں سے تاحہ نظر پھلے بے انت و بے کراں دریا کو دیکھا۔ ”تھا نہیں مار تپائی۔“ یہ اس نے سراسر بڑک ساری تھی۔ پانی اس وقت کھل سکون میں تھا۔ ”عام دنوں میں لوگ پھسل پھسل کر اس میں گریں تو دوبارہ نہیں ملتے اور ہم تو اس کے منہ پر آئے بیٹھے ہیں۔“

”بل اس کے کہ سنجان جواب دتا عین اسی بل کوئی سرور آکھڑا ہوا تھا۔ ہارون کی بڑی بے ساختہ چیخ بلند ہو گئی۔  
”سنجان نے خاصی ناگوار نظروں سے اسے دیکھا اور پھر سر پر گھڑے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔

”یہ کہاں سے آگیا؟“ ہارون نے زبان پھیر کر ہونٹ ترکیے اور ہاں وہاں نگاہ دوڑائی۔ قدرے فاصلے پر بنے نیچے کے نیچے کاؤنٹر اور چولہا وغیرہ نظر آگیا۔

”مچھلی لے آؤں صاحب۔“ وہ پوچھ رہا تھا۔ ہارون کے استفہام پر دیکھنے پر سنجان نے اثبات میں سر ہلادیا۔  
”لے آؤ بھی۔ لیکن روشنی کا بندوبست کر کے تلنا۔ ایسا نہ ہو مچھلی کی جگہ مگر کچھ کھلاؤ۔“ کچھ دیر پہلے والی نفٹ مٹانے کی خاطر ہارون نے غیر ضروری مذاق کرنا چاہا۔ وہ آدمی ”جی اچھا“ کہتا لٹے قدموں واپس گیا تھا۔  
”تیرا بھائی ہے۔ اس ٹائم تک یہاں موجود ہے۔ ابھی آئے گا تو میں اس کو بتاتا ہوں۔ بیٹا یہ دریا ہے، جھیل نہیں۔ یہاں جھیلوں پہ اترتی ہیں۔“ ہارون نے چمک کر کہا تھا۔

”مجھے بتایا اس نے۔“ پانی میں پتھر پھینکنے والی مصروفیت ترک کر کے سنجان نے خاصی سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

”کیا بتایا؟“ ہارون کو ذرا بھی سمجھ نہیں آئی وہ کیا پوچھنا چاہ رہا ہے۔  
”یہ کہ وہ جل پریاں دیکھنے کے لیے یہاں موجود ہے؟“ سوال اتنا طنزیہ نہیں تھا۔ مگر سنجان کا انداز ایسا سنجیدہ کہ ہارون سر کھجانے لگا۔

”واکٹر شمش کا فون آیا تھا۔“ کچھ دیر کے بعد وہ خود سے ہٹانے لگا تھا۔  
”اچھا پھر۔“ ہارون متوجہ ہوا۔

”مما کے چیک اپ کی بات کر رہے تھے۔ جس سائیکائرسٹ کے لیے ریفر کیا تھا۔ وہ عنقریب لاہور پہنچ جائیں



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ تمامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی ہمارے کوالٹی، کمپیوٹر کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



مجھے جلد اپنا ٹینٹ لیٹنے کی بات کر رہے تھے۔  
”یہ تو اچھی بات ہے۔“ ہارون کے لہجے میں خوش گواری تدر آئی۔  
”ہوں۔“ منعان کو شاید یہ اطلاع دینی تھی بس۔ اس کے بعد وہ کافی دیر تک چپ بیٹھا رہا۔  
”پھر کب جا رہا ہے لاہور؟“ ہارون کو کھدبہ ہوئی۔  
”مام کے ہرنیٹ نے رکاوٹ نہ ڈالی تو ان شاء اللہ بہت جلد۔“ اس کا لہجہ پر سوچ تھا۔  
”انکل کیوں روکیں گے؟ کمال کرتے ہو۔“  
”تو جانتا ہے۔ لاہور ہمارے لیے ممنوعہ شہر ہے۔“ اس کی ہنسی میں تمسخر کے رنگ تھے۔ ہارون ”وہ کیوں“  
پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ دل غ میں سے اس کے یا فائزہ کے لاہور نہ جانے کی وجہ نکل گئی تھی۔ مگر فوراً یاد بھی آگئی تو وہ  
چپ کی نکل مار کر بیٹھ گیا۔  
”محترم زکریا آفندی لاہور کا نام سن کر ہوش کھو بیٹھیں گے۔ روکنا یا منع کرنا تو الگ بات ہے۔“  
”انکل اس بار ایسا نہیں کریں گے۔“  
”ہاں۔“ منعان دھیرے سے ہنس دیا۔ ”تو کس دنیا میں رہتا ہے۔“  
”سنی۔ فائزہ آئی کی خاطر مجھے اسٹینڈر رہنا ہوگا۔ کسی بھی قیمت پر تو یہ چانس مس نہیں کرے گا۔“ تیرے لاہور  
جانے کا ایک الگ مقصد ہو گا۔ وہاں صرف غوری منزل نہیں کہ جس کی طرف تو یا فائزہ آئی جائیں گی۔“  
”زکریا صاحب سمجھنے والی مخلوق نہیں ہیں۔“ وہ جیسے خود کلامی کر رہا تھا۔ ”لیکن اس بار میں سمجھا کے رہوں گا۔“  
مجھے واقعی ہر قیمت پر لاہور جانا ہو گا۔  
”شاباش۔“ ہے نامرد کا بچہ۔“ منعان نے بے ساختہ ترجمی نظروں سے گھورا تھا۔ بچت ہو گئی کہ عین اس  
نامردہ آدمی خوشبو اڑاتی مچھلی لے آیا۔  
”وہاں اوپر لے چلو یا رہ۔“ دونوں اس کی معیت میں ڈھلوان چڑھ کے ایک طرف رکھی کرسیوں، میزوں تک  
آئے۔  
”لا جواب۔“ پہلے نوالے پہ ہارون نے چٹکارا لے ڈالا۔ جبکہ وہ دل ہی دل میں لاہور جانے کا لائحہ عمل تیار  
کرتے لگا تھا۔  
”سنو ہے لاہور کی مچھلیاں زیادہ حسین ہوتی ہیں۔ بیٹا میری مان۔ کوئی ایک دو لازمی پھنسا آنا۔ غوری منزل  
ممنوعہ ہے۔ لاہور پورا تو نہیں۔“ کھانے کے دوران ہارون کی زبان زیادہ چلتی تھی۔ منعان نے مچھلی کا نسبتاً بڑا  
ٹکڑا اٹھا کر اس پھرتی سے اس کے منہ میں ڈالا کہ وہ حفاظتی تدبیر بھی نہ کر سکا۔ محض غول غاں کرتا رہ گیا۔

\*\*\*

وہ لوگ اس وقت قدانی اسٹینڈیم میں موجود تھے۔ سیڑھیوں پر جاذب کے برابر میں بیٹھے حسن ضیاء کی نظریں کچھ  
فاصلہ پر بیڈ مشین کورٹ میں کھڑی عقیدت پر تھیں اور وہ بس ریلک ہاتھ میں لیے کھڑی ہی تھی۔ اس کے جیسے کا  
تیم بھی اس کا پارٹنر شریل لغاری کھیل رہا تھا۔ اچھل اچھل کر ہر شارٹ خود پک کرتا شریل اس کے لیے کسی  
مہمان سے کم نہیں ثابت ہو رہا تھا۔ جبکہ دور بیٹھے حسن ضیاء کی نظریں اس پر مقناطیس ہو چکی تھیں۔ ان نظروں  
میں غصہ، رنجیدگی، خفگی اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ ہلکے زرد رنگ کی قمیص اور سفید ٹراؤزر میں ملبوس عقیدت کو دیکھ  
کر اس کے اندر کیسے کیسے احساسات جنم لے رہے تھے۔ عقیدت تو کیا خود وہ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ ان میں سب  
سے اوپری درجے پر اہانت اور بے بسی تھی۔ اس کے بعد اشتعال۔ اور آخر میں کہیں وہ لگاؤ آ رہا تھا۔ جواسے



عقیدت کو دیکھ کر پہلے ڈائی سیکشن ہال اور اب آج بالکل سامنے موجود پارک محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی دن ہی کھلے ہوئے تھے جب وہ اپنے ٹولے سمیت عقیدت فاطمہ کے نام کی ڈھنڈیا بچائے ہوئے تھا۔

”آخر یہ عقیدت فاطمہ سے کون کس برقعے میں ہے۔ نظر کیوں نہیں آ رہی۔ دن ہی کھلے ہوئے ہیں؟“

ڈیٹ سر پہ آئی کھڑی ہے اور آئی تھنک تم ہیڈ منشن کے کوئی ایسے ماہر تو ہو نہیں کہ ہمارے ٹیکس کے ہم کھیلو اور جیت جاؤ۔“ یہ کلمات اعزاز کے تھے۔ حسن نے بو بھی لگا کر سنے تھے کہ وہ خود عقیدت فاطمہ کے سامنے نہ آئے پر کس قدر تاؤ میں آیا ہوا تھا۔

”سنا تو می ہے کہ اپنے پروف کی ہے۔“ عامر گلجھی بھی اس کے ٹولے کا سرغنہ تھا۔ بلکہ سب کا چیف تھا۔

”پھر کیا سلمان ٹوپی پہن کر آتی ہے جو نظر نہیں آتی۔“

اور یقیناً وہ عقیدت کو ڈھونڈنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے؟ اگر درخشاں نئی اطلاع کے ساتھ نہ آتی۔

”نہیں اپنی کوئی اور پارٹنر ڈھونڈتی ہوگی۔“ وہ اطلاع دے کر جانے کے چکروں میں تھی کہ عامر نے روک کر پوچھا۔

”وہ کیوں؟“

”عقیدت فاطمہ کو کچھ ہو گیا ہے کیا؟“

”اسے شرجیل لغاری ہو گیا ہے۔“ درخشاں کا انداز لا پرواہی لیے ہوئے تھا۔ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی، مگر یہ بھی سب کے کان کھڑے ہو گئے۔

”کیا مطلب۔“ حسب عادت حسن کو گھبراہٹ ہونے لگی۔

”عقیدت فاطمہ نے تمہارے ساتھ پارٹنر شپ توڑ دی۔“ کیونکہ اس بار فاضل پروف کے شرجیل لغاری نے اعلان کیا تھا کہ وہ فرسٹ پروف کی کسی لڑکی کو پارٹنر بنائے گا اور اس نے چوز کیا عقیدت کو۔

”لے باس۔“ سب بھر پوری مٹی کی مانند ڈھسے گئے۔

”شرجیل لغاری کے آگے تیری وال کہاں گل سکتی تھی۔ وہ واقعی ہیڈ منشن کا ماہر۔ ہر سال ہر لڑکی اس کے ساتھ کھیلنے کے خواب دیکھتی ہے۔ اس سال اگر وہ خود کو خود ہی پیش کر رہا ہے تو عقیدت فاطمہ کی مجال ہے جو انکا کرے۔“ اعزاز کے ایک ایک لفظ نے حسن کے دل پر آنسو گرائے تھے۔

”تیری اوقات۔“ جازب نے حسن کو ماسف بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ ”مشکلوں سے تیرے ساتھ کسی کا بھٹو بنا۔ وہ وہ دن بھی نہ چل سکا۔“ مارے اہانت کے حسن ضیاء کا چہرہ لال ہو گیا۔

”ارے تو اس میں دل پر لینے کی کیا بات ہے؟ تمہارا بھٹو میں مانگہ کے ساتھ بنا دیتی ہوں۔ وہ بھی ہے۔ تم میں اس کا کوئی پارٹنر نہیں مل رہا۔“ یاروں کی یاد درخشاں سے اس کی اتری صورت دیکھی نہ گئی۔ ”مجھے نہیں بنا مانگہ کا پارٹنر۔ مجھے اپنی انسلسٹ فیل ہو رہی ہے۔“ وہ بس رو دینے کو تھا۔ ”اب تو اس عقیدت کو لازمی دیکھنا ہے۔ اب تو ہمارے حساب کتاب نکلتے ہیں اس سے۔“

”واقعی۔“ یہی عقیدت فاطمہ ہے۔ ”اوپنی لمبی سیدھی سادی“ عقیدت کو دیکھ کر دوستوں نے استہزائیہ ناک سکوڑی تھی تو اس نے دل تھام لیا تھا۔

”تو کیا واقعی۔“ یہ عقیدت فاطمہ تھی؟ ”کوئی بے یقینی تھی کہ ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ ڈائی سیکشن ہال میں ڈیڈ باڈی کو یہ دیکھ سکنے کے غم میں جتا وہ لڑکی۔ جسے اس نے اس دن بڑا دل لگا کر دیکھا تھا۔ وہ ہی اس کی پارٹنر بننے جا رہی تھی۔ اور کیسی قسمت تھی پارٹنر بننے سے پہلے ہی وہ ٹھکرا دیا گیا تھا۔“ سچ کہتے ہیں لوگ یا۔ کم شکلوں کے خیرے بھی بہت ہوتے ہیں۔“ ماڈ اور اشناٹلس لڑکیوں کی کھپ دالے اس کالج میں عقیدت حسن کے دوستوں

کی توجہ کھینچنے میں مکمل طور پر ناکام ہوئی۔ جبکہ اسی عقیدت کو تکتے حسن کی پتلیاں ساکت ہو گئی تھیں۔

تھوڑی سی دیر میں ایم ختم ہو گیا۔ ملیکہ سلمان اور باسط لودھی بری طرح سے بارے۔ وہ شرجیل لغاری کی مدد سے ڈیڑھ میں فلاح ہو گئی تھی۔ اب سرخ پڑتے دکتے چہرے کے ساتھ اپنی دوستوں کے جھرمٹ میں شرمائی، شرمائی سب کی مبارک بادیں وصول کر رہی تھی۔

اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ عقیدت جس کو چار اطراف سے طعنے سننے کو مل رہے تھے کہ وہ ہیڈ منشن جیسا ایم کھیلنے کے لیے ایسے ڈر رہی ہے۔ گویا موت کے کنوئیں میں کار چلائی پڑ رہی ہو اور تو اور اس کی انٹرکٹر جیل نے بھی ڈانٹے ڈپٹے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اسی عقیدت نے میڈل جیتنے والوں میں نام لکھو لیا تھا۔ واقعی بقول مانگہ کے یہ تو ہسٹری ہو گئی تھی۔

ابھی کچھ دن پہلے وہ ہفت چہرے کے ساتھ درخشاں کو کہتے سن رہی تھی۔

”بھئی فاضل امیر کا شرجیل لغاری تمہیں اپنا گیم پارٹنر بنانا چاہتا ہے۔ جلدی سے اپنا فیصلہ سناؤ۔ تم کیا چاہتی ہو؟“ وہ پورا دن اس کا اور مانگہ کا سوچتے گزارا۔

”ہے تو کمال کی آفر۔“ مانگہ شرجیل لغاری کے گیم سے زیادہ اس کی پرسنالٹی پر رجحان رکھتی تھی۔

”ہر سال ورنہ ہوتا ہے، تبھی بھی نہیں ہارا۔“

”تم کیا چاہتی ہو میں کیا جواب دوں؟“ مانگہ نے کندھے اچکا لیے۔

”میں تو چاہوں گی کھیلو۔ اس کے ساتھ“ بس فور تھ پروف کی لڑکیاں ہیں تھوڑی تیز۔ ہضم نہیں کر سکیں گی یہ نیوز۔“ عقیدت نے چند لمحوں کے لیے سوچا اور پھر ایک فیصلے پر پہنچ ہی گئی۔

”نہیں کھیلوں گی۔“ اور واقعی یہ خبر فور تھ امیر کی لڑکیوں پر دھماکا بن کر گر گئی۔ ان کی دھمکیوں کا راگ ایک طرف اور افشاں غفاری کی بچی بین ایک طرف۔

”حسن کو بہت دکھ ہو گا۔“

”ارے ہوتا رہے کمال ہے۔ ہر انسان اپنا فائدہ سوچتا ہے۔ نہ کہ دوسروں کا۔“ حمنی کو بھی افشاں کی بات بری لگ گئی۔

”کمٹ منٹ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“

”کمٹ منٹ کہاں سے آئی۔“ مانگہ نے ناگواری سے کہا۔

”جب اس نے حسن ضیاء کو پارٹنر بنایا تھا تو اسے اسی کے ساتھ بھانا بھی چاہیے تھا۔“

”ارے آپ تو یوں بات کر رہی ہیں جیسے حسن ضیاء اس کا لائف پارٹنر بن گیا ہو۔“ رجا ایسے ہی بولتی تھی۔ بنا سوچے بنا خیال کیے اور اس کی بات ہمیشہ گوئی کے طرح جانتی۔ ابھی بھی افشاں کو کیا ہی جملے کی سنگینی کا احساس ہوا ہو گا۔ جتنا عقیدت کو ہوا۔ اس کے کان کی لوں تک سرخ ہو گئیں۔ اس کے تاثرات سے باخبر مانگہ اسے فوراً

افشاں کے اور شاید رجا کے بھی شکبے سے دور لے گئی۔ بہر کیف بقول درخشاں کے وہ ڈٹی رہی۔ بعد ازاں جیت بھی گئی اور اب قدانی اسٹیڈیم سے سیدھے مانگہ لوگوں کے ساتھ ہاسٹل آئی ہوئی تھی۔ اماں کو ہاسٹل جانے کا فون پر بتا دیا تھا۔ وہ جانے کس جھوٹک میں تھیں، محض ہوں ہاں کر کے رہ گئیں۔ کے ایف سی سے ڈیلوری کے ذریعے

منگوائی چیزوں پر ہاتھ صاف کرتی سب کی زبان چل رہی تھی۔

”بھئی یہ بھی کوئی جیت ہے۔ بلا پکڑ کر شہیدوں میں نام لکھو لیا۔ سارا گیم تو شرجیل خود کھیل رہا۔“ ہونٹ بگاڑ

بگاڑ کر افشاں نے اظہار خیال کیا۔

”ایسی ویسی جیسی بھی ہو۔ جیت جیت ہوتی ہے۔“ مانگہ نے نتھنے پھلا کر اس کی وضاحت کی۔



"ویسے دادی پڑے گی اس کو۔ ایک ساتھ کئی دشمن بنالیے اس نے۔ فوراً تھوڑی پوری پھر ملیکہ سلمان باسط جو اس سے ہارے اور حسن ضیاء۔ حسن ضیاء کا نام افشاں نے بڑے ڈرامائی انداز میں لیا تھا۔

"کیوں۔ حسن ضیاء کیوں۔ فوراً تھوڑی پوری اس لیے دشمن بنی کہ عقیدت نے شرجیل کی پارٹنرشپ قبول کی۔

ملیکہ سلمان اور باسط لودھی اس لیے دشمن بنے کہ وہ اس سے ہارے تھے مگر یہ حسن ضیاء کس حساب سے دشمن بن رہا تھا۔ مائدہ نے قدرے چیخ کر وجہ پوچھی۔

"بھئی اس نے دل توڑا ہے اس کا۔"

"ہاؤسنگسٹنگ۔" مائدہ کو حسن سے زیادہ افشاں پر غصہ آیا۔

"یہ ریکل لائف ہے فلمی اسٹوری نہیں کہ ذرا سی بات پر لڑکے کا دل ٹوٹ گیا۔"

"لڑکے کا نہیں ہیرو کا۔" افشاں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ تصحیح کی۔ عقیدت کا سر گھوم گیا۔ وہ ایک دم سے کھڑی ہوئی تھی۔

"رجا دیر ہو رہی ہے ہم اب چلیں۔" وہ افشاں کو بھی دو چار سنا سکتی تھی۔ مگر اس سے ظاہر ہوتا۔ وہ اسے اہمیت دے رہی ہے۔ اس لیے اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے وہ رجائے بولی تھی۔

"نہیں، نہیں بھئی۔ تم لوگ اپنی پارٹی خراب مت کرو، میں ہی چلی جاتی ہوں۔" افشاں کہنے کے ساتھ ہی فوراً چلی بھی گئی۔ عقیدت خاصی ناراض سی دوبارہ بیٹھی تھی۔

"حسن ضیاء کی آیا نہ ہو تو۔" مائدہ با آواز بلند برسرِ طلی۔ کچھ لوگوں سے ہنستے چہرے دیکھے نہیں جاتے۔ افشاں نفار بھی ان ہی میں سے تھی۔

"کھاؤ سیپیلوں کھاؤ۔ سب کچھ ٹھنڈا ہو گیا۔" ٹویہ نے چھپا ہوا آٹھم بھر سے سامنے رکھا۔ مگر اب عقیدت کی بھوک مرچکی تھی۔ وہ زہرا کرکھانے لگی۔

\*\*\*

وہ ای۔ این۔ ٹی وارڈ کی طرف ڈاکٹر نیازی سے ملنے جا رہا تھا۔ انہیں ایک مریض کے لیے خصوصی تاکید کرنی تھی۔ جب تحریم کی کال آئی۔ گزشتہ رات اس کے موڈ کے پیش نظر آج اوپس نے تمام دن سیل آف نہیں کیا تھا۔ تحریم کے دکھڑے ایک ہفتے تک اسے ہر صورت سننے ہی ہوتے تھے۔ ابھی بھی اس نے چھوٹے ہی کال ریسیو کی۔

"ہاں بولو جان۔"

"اوپس۔" تحریم کی آواز ایسی ہو رہی تھی کہ اوپس کا دل اگلی بات سننے سے پہلے پھڑپھڑایا۔

"تمہاری می۔ اور راین۔ میری می کے گھر پہنچی ہوئی ہیں۔" اس نے روتے ہوئے ایک ایک لفظ یوں چبا کر ادا کیا گویا اوپس کی می اور راین کو چبا رہی ہو۔

"واٹس۔" اوپس کے ہاتھ سے سیل چھوٹنے بچا۔

"تم نے انہیں ایڈریس نہیں دیا۔" وہ غرائی تھی۔

"میں نے۔ نہیں۔ ہاں۔ مگر مجھے۔" اوپس کو سمجھ نہیں آئی وہ کیا کہے کہ تحریم ٹھنڈی ہو جائے۔

"راین کامیج آیا ہے ابھی۔ وہ کہہ رہی ہے۔ وہ سب ماما کے گھر کے گیٹ پر ہیں۔ امی کو منگنی کا کارڈ دینے کے لیے۔" اوپس نے بالوں میں بے بسی سے ہاتھ چلائے شروع کر دیے۔ می اور راین مشامین نے کوئی دشمنی نبھائی تھی اس کے ساتھ۔

"یاد رکھنا۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" تحریم نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھول

ماہنامہ کرن 174

کر رہ گیا۔ کچھ عرصہ پہلے باتوں باتوں میں راین نے شاید اسی وجہ سے اس سے تحریم کی اماں کا ایڈریس اگلوایا تھا۔

ظاہر انہیں راین کی محنتی کا کارڈ دینا تھا۔ مگر اوپس جانتا تھا۔ یہ محض بہانہ تھا۔ اصل میں تو وہ تحریم کے پراسرار سیکے کی بوسہ لینے جانا چاہتی تھیں۔

"میرے اللہ۔" اسے ای این ٹی کے وارڈ جانا بھول گیا۔

\*\*\*

اماں کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ ان کی وہ انڈی ممکنیت۔ وہ مشہور زمانہ رعب و وقار کہیں ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ سامنے موجود خواتین کوئی بھولے بھٹکے سے نہیں آئیں۔ بلکہ وہ تحریم کی ساس ندیں ہیں اور خاص الخاص ان سے ملاقات کے لیے آئی بیٹھی ہیں۔ ان کے سارے جسم میں سنی دوڑ گئی تھی۔ چہرے پر ہمہ وقت رہنے والا اطمینان کہیں رخصت ہو گیا تھا۔ ڈھیر ساری گھبراہٹ اور خجالت لیے وہ کافی سہمی سی بیٹھی تھیں۔

تینوں خواتین جلدی کے موڈ میں نہیں لگ رہی تھیں۔ بیٹھنے کے بعد تا دیر چار اطراف ناقدانہ دیکھتی رہیں۔ راین مشامین کی گیٹ سے اندر آتے وقت جو ناک سکڑی تو ابھی تک سکڑی ہوئی تھی۔ یوں بوز کیا جا رہا تھا جیسے کسی غیر آرام دہ ماحول میں آگئی ہوں۔ اماں کو مکمل طور پر ان کے رحم و کرم پر چھوڑے جیلہ پن کی طرف بھاگی تھی۔ آج اس کے سیکھڑا پے کا امتحان تھا۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے چائے و دیگر لوازمات کی تیاری کرنے لگی۔ جبکہ ڈرائنگ روم میں۔ تحریم کی ساس کو دیکھتی اماں اندر ہی اندر پریشان ہوئی جا رہی تھیں۔ اس اچانک آمد کو بے سبب نہیں کہا جاسکتا تھا۔ گفتگو کا آغاز رکھی پیرائے کے ساتھ شروع ہوا۔

"گھر میں آپ صرف تین خواتین ہی رہتی ہیں۔" اس پہلے سوال پہ ہی اماں کا دل ڈوبنے لگا۔ تحریم کی ساس ایلٹ کلاس کی محبوبک خواتین جیسی لگ رہی تھیں۔ ان کے دیکھنے کا انداز بہت کائنات دار تھا۔ اماں ان نظروں سے خائف ہو رہی تھیں۔

"جی۔" ایک مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے نہایت مختصراً جی کہا۔

"مشکل تو ہوتی ہوگی۔"

"نہیں۔ خاص نہیں۔"

"ہاں ظاہر ہے۔ آپ عادی ہو گئی ہوں گی اس لائف کی۔" اماں خاموش رہیں۔

"آپ کی چھوٹی بیٹی نظر نہیں آرہی؟" راین نے بلا ارادہ ساں وہاں دیکھا تھا۔

"وہ اس وقت کالج گئی ہوئی ہے۔" اگر یہ لوگ تحریم کی سسرالی نہ ہوتیں تو اماں کا اعتماد اور ہی شکل میں ہوتا۔ مگر اب بات کرنا تو کیا ان کے سامنے بیٹھنا بھی مشکل امر لگ رہا تھا۔ نامعلوم تحریم نے اپنے سیکے کے بارے میں کیا کچھ بتا رکھا ہو اور بھول چوک میں ان کے منہ سے کچھ غلط نکل جاتا تو تحریم جھوٹی پڑ جاتی۔ اس کی حیثیت کمزور ہو جاتی اور یہ انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہ ہری پریشانی میں گرفتار ہو رہی تھیں۔

"ہاں۔ سنا ہے وہ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہے۔"

"جی۔" اماں کے چہرہ پر مسکراہٹ پھیلی۔

"بڑی ہمت کی بات ہے۔ آپ نے اپنے بچوں کی تنہا پرورش کی۔ انہیں اس مقام تک پہنچایا۔ ویسے آپ کے ہنرمند۔" عین اس لمحے کوئی اطلاعی کھٹی رہا تھا رکھ کر مٹا نا بھول گیا۔ جیلہ نے کسی راکٹ کے جیسی اڑان بھری اور گیٹ کھولتے ہی گنگ ہو گئی۔ سامنے تحریم کھڑی تھی۔ اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے وہ تیر کی طرح اندر

ماہنامہ کرن 175



آئی تھی۔ ہانپتی ہوئی جیلہ نے پیچھے پیچھے تھلید کی۔

”میں پوچھ رہی تھی آپ کے ہرینٹ۔“ اور جب رابعہ سوال دہرانے لگیں۔ تحریم اسی لمحے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ رابعہ بیگم کا سوال اوجھڑا رہ گیا۔ انہوں نے خاصی بے یقینی سے پہلے تحریم کو اور پھر بڑی غضب ناک نظروں سے بیٹیوں کو دیکھا تھا۔ یقیناً ”ان ہی میں سے کسی کی کارستانی تھی کہ تحریم کو مطلع کیا گیا اور وہ حاضر ہو گئی۔ ان کے جو بھی ارادے تھے فی الحال زمین بوس ہوئے۔“

تحریم سب سے پہلے ساس اور مندوں سے گلے ملی۔ تینوں کے چروں پر بڑی مصنوعی پھکی میٹھی مسکراہٹ تھی۔ بیٹی کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اماں بے ساختہ کھڑی ہوئی تھیں اور آنے والا پل ان کے لیے کسی مسرت بھرے انعام سے کم ثابت نہیں ہوا۔ تحریم ان کے گلے سے آگلی۔ بھلے اس کے دل میں جو بھی تھا مگر اماں خوش ہو گئی تھیں غائب ہونے لگی تھیں۔

”کمال ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے بتایا بھی نہیں۔ میں خود آپ لوگوں کو لے آئی۔“ وہ ایک ہی صوفے پر اماں کے پلو سے جڑ بیٹھی۔ اماں کے دل میں ممتا کے سوتے پھوٹے لگے۔ بس نہیں چل رہا تھا۔ تحریم کو بھیج لیں۔ اپنے سینے میں چھپالیں۔

”ہاں۔ بس وہ۔“ رابعہ بیگم سے جواب نہ دینا پڑا۔

”بھابھی۔ میں نے مسج کیا تو تھا آپ کو۔“ رابعہ نے بروقت امدادی کمک پہنچائی۔ تحریم نے وضاحت ضروری نہیں سمجھی۔ اماں کی طرف رخ کر کے ”آپ ٹھیک ہیں“ یوں پوچھا گویا کہ ان کے بچ کوئی چپقلش کوئی رنجش ہوئی نہ۔ اماں نے محض سر ہلایا کہ آنسوؤں کا گولہ بولنے میں رکاوٹ بن گیا تھا۔ جیلہ نے لمحوں میں میز بجا دی۔

”میں مٹی۔ کھائیں۔“ تحریم پیش اٹھا اٹھا کر ساس کو پیش کرنے لگی۔

”تم بھی لو۔“ یہ ایک مکمل منظر تھا۔ اماں نے سوتی جاگتی آنکھوں سے نہ جانے کتنی بار دیکھا تھا۔ تحریم کا میکے آنا۔ اور یوں استحقاق سے اپنا گھر سمجھ کر آنا۔

”میں پوچھ رہی تھی تمہارے ڈیڈی کے بارے میں۔“ تحریم کا ٹکس کی طرف جانا ہاتھ دیں کہیں ساکت رہ گیا۔ اماں نے درزیدہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی بدلتی ہوئی رنگت ان سے پوشیدہ نہ رہی۔

”میرا خیال ہے۔ میں نے آپ کو بتا رکھا ہے۔“ بتا اماں کی طرف دیکھے تحریم نے مضبوط لمبے میں کہا تو اماں کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

”میں اور شہری بہت چھوٹے تھے جب وہ فوت ہوئے۔“ اماں نے پوری آنکھیں کھول کر تحریم کی طرف دیکھا تھا۔ وہ جیسے ارد گرد سے اپنے آپ سے سب سے بے نیاز بولے جا رہی تھی۔

”مجھے ٹھیک سے یاد بھی نہیں وہ۔“

”تمہاری چھوٹی بہن۔“ اور تب رابعہ بیگم نے وہ سوال کیا جو سرے سے تحریم کے دماغ میں سے نکل گیا تھا۔ اس نے اب اماں کی طرف دیکھا۔ اماں کا چہرہ سفید لٹھے کی طرح ہو رہا تھا۔ جبکہ اس کا کچھ ضبط کرنے کی کوششوں میں سرخ ہو رہا تھا۔

”اس نے ڈیڈ کو دیکھا بھی نہیں۔ اور نہ ڈیڈی نے اسے۔ وہ جب پیدا ہوئی سب کچھ بدل گیا تھا۔“ اس نے یہ تمام جملے اماں کو دیکھ کر بولے تھے۔ اس کی زبان کے برعکس اس کی نظروں کا بیاں سمجھ کر اماں ٹوٹنے لگی تھیں۔

”اوہ سوئیڈ۔ تمہاری بہن تو بہت ان لگی ہے۔ اس نے باپ کی شکل بھی نہیں دیکھی۔“ رابعہ بیگم

مسائل افسوس کا اظہار کرتی رہیں۔ تحریم نے دانت بھینچ لیے۔

”بہت بڑی بات ہے آپ نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ تن تنہا بچوں کو والا۔ پڑھایا لکھایا۔ اب آپ کو اس کا اجر بھی مل رہا ہے۔ آپ کے تینوں بچے اپنی اپنی راہ لگ گئے۔“ اماں نے کوشش بہت کی۔ مگر ان سے مسکرایا نہ گیا۔ ان کے دل کی زمین پر برسات ہو رہی تھی۔ اس کے بعد ماحول کافی دیر تک بوجھل رہا۔ باقی تمام گفتگو اس ایک بات کی وجہ سے بے معنی ثابت ہوئی۔ تحریم کی ساس زیادہ دیر نہ بیٹھ سکیں۔

”ارے آپ کھڑی کیوں ہو گئیں۔ ابھی تو آئی تھیں۔“ لچ کا ٹائم ہے۔ کھانا کھا کر جائیے۔“ اماں بوکھلا گئی تھیں۔

”بہت شکریہ بہن۔ آپ سے ملنے کی خواہش تھی بس۔ اور یہ رابعہ کی معافی کا کارڈ بھی دینا تھا۔“ رابعہ جگہ پر س میں سے کارڈ نکال کر ان کے حوالے کیا۔

”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

”آئی آپ اور تحریم بھابھی آپس میں بہت ملتی ہیں۔ آپ جوانی میں ہماری بھابھی جیسی ہوں گی۔“ کاش آپ کی دوسری بیٹی سے بھی مل لیتے۔ یقیناً ”وہ بھی بہت پیاری ہوں گی۔“ اماں مسکرا مسکرا کر ان کے نصیرے سکتی رہیں۔

”تحریم تم تو ابھی رکو گئی تھیں۔“ اور ان کے ہمراہ ہی نکل پڑنے کو تیار تحریم کے قدم جم گئے۔ ساس اس کی طرف متوجہ تھیں۔

”جی ہاں ماما۔ میں کھانا کھا کر جاؤں گی۔“ اور اماں جانچی تھیں۔ سب محض اداکاری تھی۔ مگر پھر بھی ان کا دل تحریم پر قربان جا رہا تھا۔ وہ اس کی ساس مندوں کو باہر تک چھوڑنے گئیں۔ تینوں معافی پر آنے کی۔ زوردار تاکید کے ساتھ روانہ ہوئی تھیں۔ ان کی کار منظر سے بہتے ہی اماں جب واپس ڈرائنگ روم میں آئیں تحریم ہنوز کھڑی تھی۔ قطعی اجنبی اور لا تعلق ہوئی۔



یا سمین بے دلی سے ہی سہی مگر فردغ ماہ کے انتظار میں رہیں جو نہ جانے کیوں اپنے دیے گئے شیڈول سے لیٹ ہو گئی تھی۔ اس کے لیٹ ہونے پر یہ چند دن یقیناً ”سکون سے گزرتے اگر فائزہ کی فون کال نہ آجائی۔ وہ بری طرح سے رو رہی تھی۔“

”آپ۔ آپ۔ آپ۔ میرا سنی۔“

”کیا ہوا سنی کو؟“ فائزہ کے رونے میں ایسی شدت تھی کہ یا سمین کے اپنے ہاتھ پر بھول گئے۔ ”وہ مر جائے گا“ اس کا بہت خون بہہ رہا تھا۔ میرا بچہ مر جائے گا۔“ یا سمین نے لائن قطع کر کے فوراً بجلی کو کال ملائی تھی۔ اور انہیں آنا ”فانا“ گھر آنے کے لیے کہا تھا۔ جب تک وہ آئے یا سمین بے چین و مضطرب گیسٹ تک کئی چکر لگا آئیں۔ رو رو کر فائزہ اور مستعان کی صورتیں نظروں کے سامنے آ رہی تھیں۔ نہ جانے کیا ہوا تھا مستعان کو؟

”فائزہ بہت رو رہی تھی۔ مجھے لگتا ہے سنی کو کچھ ہو گیا ہے۔“ بجلی کے آنے پر وہ خود بھی رو رہی تھیں۔ ”بہت کرو یا سنی۔“ بجلی کے چرے پر بھیجے کے لیے فطری طور پر پریشانی کھنڈ گئی۔ لیکن وہ جان سے عزیز تر بیوی کے آنسو برداشت نہ کر پائے۔

”مجھے یقین ہے ذکر کیا بھائی نے کچھ کیا ہو گا۔“



”تم آنسو پونچھو۔ وہاں چلتے ہیں تو سب معلوم ہو جائے گا۔ اگر جو زکریا کی وجہ سے سنی کو نقصان ہوا ہے تو میں اس کو چھوڑوں گا نہیں۔“ سنی صرف یا سمین کو ہی نہیں زکریا کو بھی پیارا تھا۔ دونوں کے مضبوط رشتے تھے اس کے ساتھ وہ یا سمین کا بھانجا ہوتا تھا اور ترکی کا بھتیجا۔ یا سمین سے چھوٹی فائزہ ان کے بچھلے دیور زکریا سے چار سال پہلے بیاہی گئی وہ زکریا جو انہیں اس نظر سے بھی پسند نہیں آیا تھا کہ وہ اسے اپنا بہنوئی بنانے کے لیے سوچتے تھے وہ بن گیا۔ شاید اسی وجہ سے کہتے ہیں رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں زکریا میں جذباتیت بہت تھی۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر اشتعال میں آجاتا تھا۔ بنا کسی کا لحاظ کیے دھاڑتا مگر جتنا ہر دم مزاج کو سوا سیر پر رکھتا۔ یا سمین کی ہمیشہ کوشش رہتی وہ زکریا سے کم ہی ہم کلام ہوں۔ پھر جب زکریا کے لیے فائزہ کے رشتے کی بات چلائی گئی تو یا سمین طاقتور مخالف کے روپ میں سامنے آئیں۔ وہ مزاجاً خاصی بہادر اور متحمل مزاج تھیں۔ ہر قسم کے ماحول میں ایڈجسٹ ہو جانے کی صلاحیتوں سے مالا مال لیکن فائزہ ایسی نہیں تھی۔ وہ نرم و نازک جذبات کی حامل، فلسفوں رسالوں کی شائق۔ جاگتے میں بھی خواب دیکھنے کی عادی۔ پھولوں، تیلیوں، جگنوؤں کی محبت میں گرفتار۔ رومانیک مزاج۔ نہایت جس کی شخصیت کا وصف تھی۔ جسے کڑے لہجے خوفناک لگا کرتے تھے۔ اس فائزہ کے لیے یا سمین مگر بھی زکریا کا رشتہ نہیں دے سکتی تھیں۔ نہ قبول کر سکتی تھیں۔ مگر جب یہی درمیان میں آگئے تو جیسے یا سمین کے سارے عزائم سارے ارادے منہ کے بل آن کرے۔

”جان من۔ میں نے کبھی تمہیں تکلیف دی؟ کبھی تمہیں سخت الفاظ کہے۔ کوئی ایک دن بتاؤ جب بہت کیا ہو؟“ اور یا سمین کو وہ ایک دن ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتا کہ ان کی شادی شدہ زندگی میں وہ دن کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کامیاب روپ دیکھا تھا۔ زکریا کی پرچھائیں بھی بچکی کے مقابل نہیں آسکتی تھی۔

”تو زکریا بھی میرا بھائی ہے۔ ہم ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ عادتاً جداسی۔ لیکن مجھے یقین ہے وہ فطرتاً نرم دل کا مالک ہے اور پھر میرے اچھے ہونے میں سارا کمال میری بیوی کا ہے۔ زکریا کو بھی اس کی بیوی سدھار دے گی پھر ہم ہیں نا فائزہ کے سر پر۔ اسے کبھی اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔“

”فائزہ ہی کیوں؟ شہر میں اور لڑکیاں ختم ہو گئیں کیا؟“

”یار بیوی۔“ یہی نے سرگوشی سے کی تھی۔ ”یا سمین نے مجھ جیسے کو اپنے دام میں گرفتار کر لیا ہے تو اس کی بہن فائزہ بھی اس گھر میں ماک ہوگی۔ مجھے یقین ہے۔ منٹوں میں سدھارے گی زکریا کو۔“

یا سمین کو نکتہ پکھلتیں۔ شوہر کے ساتھ اور یقین نے انہیں زکریا کے نام پیاری بہن کرنے کا حوصلہ دیا۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ سب ٹھیک رہا۔ حسین و جمیل فائزہ ایسی ہو گئی کہ اس پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ بات بے بات اس کی ہنسی کی جھنکار گونجتی۔ مگر جب زکریا اسے اپنے ہمراہ ملکن لے گیا تو جیسے سب رنگ مدھم پڑنے لگے۔ فائزہ کی ہنسی دم توڑتی نظر آئی۔ اس کے چہرے کی شفافیت اجلا پن مگدلا ہوا گیا۔ زکریا کسی نفسیاتی مریض کی طرح بیوی کے بیش بہا حسن سے خائف تھا یا کیا۔ اس نے فائزہ پر زندگی کی بہاریں تنگ کر دیں۔

یا سمین فائزہ سے کرید کرید کرا گھواتیں۔ اور اس کا ہر سوال پر ایک ہی جواب۔ ”نہیں میں بہت خوش ہوں۔ مگر مسلمان کی پیدائش کے بعد تو جیسے فائزہ عید کا چاند ہو گئی۔ اسے سیکے یا سمین کے گھر آئے اتنا اتنا عرصہ ہونے لگا کہ اکثر بھائی۔ یا پھر یہاں سے یا سمین خود اس سے ملنے ملان جانیچے اور یا سمین محسوس کرتیں۔ فائزہ ان کی آمد پر خوش تو بہر حال ہوتی ہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے کی سرا سیمکی اس خوشی پر حاوی رہتی۔ شوہر کی خدمت گزار یا سمین بھی تھیں۔ لیکن جس طرح فائزہ زکریا کی ایک پکار پر لبیک کہتی۔ یہ یا سمین کے لیے پریشان کن تھا بظاہر دونوں میاں بیوی سب کے سامنے ٹھیک رہتے۔ خاص کر زکریا

کے چہرہ کا سکون قابل دید ہوتا۔ لیکن پھر بھی یا سمین جانتی تھیں گڑبڑ ضرور ہے اور وہ گڑبڑ اگلے تین سالوں تک نظر میں آگئی۔ مگر پھر بھی ان کے علم میں صرف اتنا آیا کہ زکریا اور فائزہ کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ نہیں۔ فائزہ کیا کچھ جھیل رہی ہے یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

اس روز یقیناً ”فائزہ بہت مجبور بہت خوفزدہ ہو گئی تھی کہ یا سمین کا نمبر ملا بیٹھی۔ ورنہ بہت سے واقعات کی طرح یہ واقعہ بھی دیا سکتی تھی۔“

”آپ بھی چلیں گے کیا؟“ وہ جلدی جلدی اپنے دو چار جوڑے بیک میں ٹھونسٹی پوچھ رہی تھیں۔

”ظاہر ہے مجھے جانا چاہیے۔ اللہ نہ کرے بات زیادہ بڑھی ہوئی ہو تو میں موجود ہوں گا وہاں۔“

”نہیں بھئی۔ آپ گھر پر رہیں۔ فرضاً ماہ نے آنا ہے۔ اگر میری غیر موجودگی میں پہنچ گئی۔ اور آپ بھی گھر

نہ ہوتے تو بہت برا منائے گی۔“ ہر صورت جانے پہ مصریحی فرضاً ماہ کی وجہ سے مجبوراً رک گئے۔ یا سمین جب

لٹان پہنچیں ڈرائیور اسٹیشن پر پہلے سے موجود تھا۔ وہ گھر تک مختلف دعاؤں کا ورد کرتی گئیں آندھی ہاؤس میں

فائزہ اکیلی گھر میں چکرار ہی تھی۔ یا سمین کو دکھا تو صبر کا دامن چھوڑے ان سے آٹپٹی۔

”سنی کہاں ہے۔ مجھے بتاؤ۔ وہ ٹھیک تو ہے۔“ یا سمین کا دل ڈوب رہا تھا۔ فائزہ بنا بولے دیر تک روتی رہی۔

یا سمین نے اسے چپ نہیں کرایا تھا۔

”چلو اندر۔ پانی پیو۔ اور مجھے ساری بات بتاؤ۔“ یا سمین اسے ساتھ لگائے لیونگ روم میں آگئی تھیں۔

”اب بتاؤ۔“ فائزہ پانی پی چکی تو انہوں نے پھر سے پوچھا۔

”زکریا سنی کو اسپتال لے گئے ہیں۔“ بتاتے ہوئے فائزہ کا گلا رندھ گیا۔

”تم کیوں نہیں گئیں۔“ یا سمین نے سخت تیوروں کے ساتھ سوالیہ دیکھا۔ فائزہ چپ رہی۔

”تو چھوٹا سا بچہ زکریا بھائی اکیلے سنبھال پائیں گے۔“ فائزہ ہنوز چپ رہی تو یا سمین نے بھی ڈبٹا بند کر دیا۔

”چھاپتاؤ ہوا کیا؟“

”چچہ لگ گیا سنی کے منہ پر۔ آنکھ کے نیچے۔ بہت زور کا۔ جتنا بڑا بچہ کامنہ تھا اتنا بڑا کٹ آیا۔ بہت

زیادہ خون بہہ رہا تھا۔ سنی بالکل بے ہوشوں کی طرح۔“ فائزہ کی ہچکیاں اس کے بولنے میں رکاوٹ بن رہی

تھیں۔

”لیکن چچہ لگا کیسے؟ خود سے تو نہیں اڑ کر آسکتا؟“

”یا سمین نے ہلکی سی چیخ کے ساتھ پوچھا تھا۔ فائزہ کچھ دیر تو خاموش رہی پھر بتانے لگی۔

”زکریا۔“ وہ شاید نہیں بتانا چاہ رہی تھی۔ یا بتانے کے لیے کچھ مناسب الفاظ ڈھونڈ رہی تھی کہ زکریا کہہ

کر تا دیر گم سم بیٹھی رہی۔ یا سمین برابر اسے منتظر نظروں سے گھورتی رہیں۔

”زکریا مجھے مار رہے تھے۔ سنی میری لیفٹ سائیڈ پر بیٹھا تھا۔ میرے بجائے اسے لگ گیا۔“

”اوماں گاؤ۔“ یا سمین نے بے ساختہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

”ہماری لڑائی ہو گئی تھی۔ میں بحث کر رہی تھی۔ زکریا کو اس لیے غصہ آگیا۔“

”اور اس جاہل انسان نے چچہ کھینچ مارا۔“ یا سمین کا دماغ کھولنے لگا۔ غصے کی شدت سے انہیں سمجھ نہیں آیا وہ کیا کہہ کر اپنے اندر کی کھول نکالیں۔

”اور اس نے اتنی زور سے مارا کہ بچے کا منہ خونوں خون ہو گیا۔ اس کے ٹانگے لگنے کی نوبت آگئی۔ اور

جہالت دیکھو ہاتھ میں جو آیا اٹھا کر کھینچ مارا۔ ایسے تو یہ چھری چاقو بھی مار سکتا ہے۔“

”آپا پلیز۔“ فائزہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ یا سمین کا رد عمل اسے خوفزدہ کر گیا تھا۔ وہ نہ معلوم



کس جذبے کے ہاتھوں مغلوب ہوئی اپنی زندگی کا راز افشا کر بیٹھی تھی۔ اب اگر یا سمین زکریا کا گریبان پھوٹا  
حساب کتاب لینے پر آئی تو بات سارے میں پھیل جاتی۔ اس کے روز و شب کیسے گزر رہے ہیں ایک نمانہ واقف  
حال ہو جاتا۔

”اور مجھے تو لگتا ہے تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ ضرور اس نے کوئی خطرناک چیز ماری ہوگی ورنہ۔“  
”نہیں آیا نہیں۔ چھپے ہی تھا۔“

”اللہ۔“ یا سمین کے دل کو کچھ ہونے لگا سنمان کی تکلیف کا سوچ کر۔

”وحشی انسان۔ آج آئے تو میں دیکھتی ہوں اس کو۔ تمہیں اور سنی کو ساتھ لے چلتی ہوں۔ غضب خدا کا  
تم دونوں اس کے پاس غیر محفوظ ہو۔ بچے کو اللہ نے بچالیا۔ اس کی آنکھ کا نقصان ہو جاتا تو۔ بس میں کہہ رہی  
ہوں میرے ساتھ چلو۔ میرے گھر رہنا چاہو خوشی سے رہو۔ نہیں تو وہاں سے بھائی کو فون کروں گی۔ لے جائیں  
گے تمہیں۔ یہاں تمہیں اس جنگلی کے پاس نہیں چھوڑنا میں نے۔“

یا سمین کے ارادے کچھ سمجھ تھے۔ فائزہ اندر ہی اندر دہکتی رہی اسے یا سمین کو بلانے کا صحیح معنوں میں پچھتاوا  
ہو رہا تھا۔



آفس کی کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ شام آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ نوازا بھی ابھی چائے رکھ گیا تھا۔  
اسے چائے کی طلب نہیں ہو رہی تھی۔ مگر اس آفس میں کسی فدیوی کی طرح صاحب بہادر کے حکم کے لیے منتظر  
بیٹھا۔ اسے ہضم نہیں ہوتا تھا۔ وہ خاموشی سے چائے پئے لگا۔ ان کی چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اور سنمان کی  
ختم بھی ہو گئی زکریا آفندی کا سامنا اور ان سے یوں دو دو گفتگو کرنا۔ اسے اس سب کی عادت نہیں تھی۔ سچ تو یہ  
تھا اسے ان کو باپ کہہ کر پکارنے کی بھی عادت نہیں تھی۔ وہ اپنی زندگی کا وہ دن بھول گیا تھا۔ جب اس نے آخری  
بار زکریا کو ڈنڈی لگایا تھا۔ زکریا کسی زمانے میں اس کے لیے قہر کی علامت تھے۔ اور اب ترس کے قابل۔ وہ اس  
فحش سے یا نفرت کر سکتا تھا۔ یا اس پر ترس کھا سکتا تھا جو خون کے رشتے ہوتے ہوئے بھی ان سے دور تھا جو  
محبوبوں سے خالی تھا جو وفاؤں سے نا آشنا تھا۔ اور جو دعاؤں سے محروم تھا۔

”سنی مل میں کوئی پروگرس نہیں ہو رہی۔ اسے تمہاری نااہلی سمجھیں یا کیا؟“ ”عموماً“ وہ اس ٹائم آفس سے اٹھا  
جایا کرتا تھا۔ زکریا آفندی کی یہاں موجودگی اسے خاصی گراں گزرتی تھی۔ آج بھی وہ جانے کی کر رہا تھا کہ ان کا  
پیغام ملا۔ ”آفس میں آؤ“ یقیناً ”انہیں اس کی موجودگی کی بھٹک بڑھ گئی تھی۔ اور ایسا ہمیشہ ہی ہوا کرتا۔ دونوں اگر  
ایک ساتھ آفس میں ہوتے تو زکریا اسے ملاقات کا شرف ضرور بخشے۔

”میں سمجھا نہیں۔“ اس کی شہد رنگ آنکھیں سکڑ گئی تھیں۔

”تم نئی فیکٹری نہیں چلا پارہے تو مجھے بتا دو۔“ وہ ابھی بھی فائلوں کی طرف متوجہ تھے۔

”ورکرز کچھ ڈیمانڈنگ ہو رہے ہیں۔ مجھے ان کو مطمئن کرنا ہے۔“

”ایسی کیا ڈیمانڈز ہیں ان کی؟“ انہوں نے عینک کے پیچھے سے خاصی ناگوار نظروں کے ساتھ دیکھا۔

”ان کے رہائشی مسائل ہیں۔ بہت سے رہائش کو آرٹرز ابھی زیر تعمیر ہیں۔ پانی بجلی کی سہولیات عدم دستیاب  
ہیں بن مسائل کے حل میں ٹائم لگے گا۔“

”سب تمہاری وجہ سے ہے؟“ انتہائی نان سیریس ہو۔ کام میں تمہارا انٹرنٹ ایک فیصد بھی نہیں۔ نہ جانے  
کن سرگرمیوں میں گم رہتے ہو۔“ اور ایسا۔ ہمیشہ ہوتا تھا۔ وہ کسی ایک بات کو پکڑ کر اس کو ذیل کرنے کا موقع

ذہن نکالتے تھے۔ سنمان کے چہرے پر ناگواری و بے زاری چھلنے لگی۔

”تم میں ذرا سی اہلیت ہوتی تم میرے بزنس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے۔ مگر نہیں۔ تمہیں اپنی آوارہ  
گردیوں سے فرصت ہی نہیں۔ چھ دن تم آفس میں آتے ہو۔ بقایا تمہیں تمہارا پتا نہیں کون سے چلے کانٹے  
گزرنا ہے۔ قصور تمہارا نہیں تمہارے اس بھرے پیٹ کا ہے۔ اس بھاری جیب کا ہے۔ آج اگر میں تم  
سے ہاتھ کھینچ لوں پھر دیکھتا ہوں کہاں لے جاتی ہے تمہاری آوارہ مزاجی تمہیں۔“ وہی پرانے فیضیے ”وہی  
ازنی آٹھ۔ وہی میں۔ اور میں۔“ سنمان عادی ہو گیا تھا یہ سب سننے کا۔

”مجھے سمجھ نہیں آتی تمہارے ساتھ کیا ہے۔ سونے کا چھپے لے کر پیدا ہوئے ہو۔ روپوں پیسوں میں کھیلتے  
ہو۔ پھر بھی تمہارے غریبانہ انداز نہیں جاتے۔ کم تر لوگوں کی سی روش نہ جانے کہاں سے آگئی تم میں۔“  
سنمان کے چہرے کی ناگواری پر اطمینان غالب آ گیا تھا۔ یہ چیز زکریا آفندی کو مزید بھڑکانے کا باعث بنتی تھی۔

”یہ فیکٹریاں یہ پلازے یہ جائیداد راتوں رات نہیں بنی۔ میرا خون پسینہ لگا ہوا ہے۔ دن رات محنت میں  
جھونکا خود کو۔ تب جا کر یہ ہاتھ آیا۔“

”کاش آپ اس سے کہیں آدھی محنت گھر کو گھر بنانے میں لگاتے۔ تو آج کیسے دگنے دولت مند ہوتے۔“  
بلکی سی چیمین سنمان کے دل میں ہوئی تھی۔ مگر اس نے اسے دل میں ہی دبا دیا۔ یہ موضوع زکریا آفندی کے  
پسندیدہ موضوعات میں سے ایک تھا۔ وہ سنمان کو اس کی اصلیت دکھانے کے لیے رات بھی کر چکے تھے۔ مگر  
سنمان بور ہو گیا تھا۔

”میں جاؤں۔“ ”نہ وہ سوال پوچھ رہا تھا۔ نہ اجازت، طلب کر رہا تھا۔ انداز ایسا دل جلا تا کہ زکریا اندر تک  
جھلس گئے۔“

”ہونا وہی جاہل ماں کے جاہل بیٹے۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا۔ پیپر وٹ خاصی زوردار آواز کے ساتھ  
نیل پر لڑھکایا تھا۔

”تم کبھی نہیں سدھو گے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”مگر یاد رکھنا۔ میں تمہیں پلیٹ میں رکھ کر کھلانے والا نہیں۔“ وہ دروازے تک بڑھتے بڑھتے رک گیا۔  
پلیٹ کرانہیں دیکھا۔ اور ٹھوس لہجے میں کہا۔

”مجھے آپ کو بتانا یاد نہیں رہا۔ میں ماما کو لاہور لے کر جا رہا ہوں۔“ کوئی وجہ، کوئی وضاحت دے بغیر وہ آفس  
سے نکل گیا تھا۔ زکریا آفندی سن ہو بیٹھے تھے۔



غوری منزل کے ہر پورشن میں آج چپ کاراج تھا۔ معین بولایا بولایا پورشن سے نکل کر علیزہ کی طرف گیا۔  
مگر یہاں بڑھا کو ماحول نے استقبال کیا۔ شانزے علیزہ کے کمرے میں اس سے سر جوڑے کسی اسائنمنٹ کی  
تاری میں لگی تھی۔

وہاں سے سیدہ سلیمان غوری کے پورشن کی طرف آیا۔ یہاں وہی گزشتہ کئی روز سے چھایا تناؤ قابض تھا۔  
گرینی سمیت سب اس کے زیر اثر آئے اپنے اپنے تجربوں میں بند تھے۔ معین خوب بد مزہ ہوا۔

”سب کو دورے سے پڑے ہوئے ہیں۔“ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا وہ واپس جانے کے لیے جیسے ہی مڑا۔ ملیکہ  
کا پوری طاقت کے ساتھ پھینکا جو گر بڑی بے تکلفی سے ناک پر آگیا۔

”اولیٰ۔ مریگا۔“ اسے دن میں تارے نظر آگئے تھے۔ ناک پکڑتا وہیں قالمین پر بیٹھا چلا گیا۔



”سوری۔۔۔“ ملیکہ کے چہرے پر ہلکی سی شرمندگی تھی۔ دو سراجو گر اس نے تیز سے اتار کے رکھا۔  
 ”آپ ہمارے آئی ہیں۔ آئی تو۔۔۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں اپنی ہار کا بدلہ آپ ہم سے آکر لیں۔“  
 ”نہیں۔۔۔“ ملیکہ کی شرمندگی فوراً ہوا ہوئی۔ ”تمہیں کیسے سکون ہے؟ جب دیکھو دو سروں کے  
 گھروں میں ناکا جھانکی کر رہے ہو۔“ وہ صوفے پر ڈھیر ہو گئی تھی۔  
 ”بائے داؤس۔۔۔ بہت بری طرح سے ہاری ہیں کیا؟“ معیذ کو ابھی کے لیے ایک سامع مل گیا تھا۔ ناک کو  
 بھول کر وہ بورت بھگانے کے نقطہ پر عمل پیرا ہوا۔  
 ”نہیں ہار جانے پر اس میں نہیں ہوں۔ بلکہ میں جس لڑکی سے ہاری ہوں اسے بیڈمنٹن کی اے۔ بی۔ سی بھی نہیں  
 آتی۔ بلکہ اس کی شکل دیکھ کر لگتا ہے اسے کچھ بھی نہیں آتا۔“  
 ”واقعی۔۔۔“ معیذ کو حیرت ہوئی۔

”عقیدت فاطمہ۔۔۔ نام بھی دیکھو مینڈو سا۔۔۔ خود بھی ایک نمبر کی پینڈو۔ اس کی شکل دیکھ کر بھیک دینے کو بل  
 کرتا ہے۔“  
 ”پر وہ جیتی کیسے؟“ ملیکہ پشیمانی بدل رہی تھی۔ معیذ نے جلدی سے کہہ کر اسے موضوع کی طرف واپس  
 کھینچا۔

”اس نے چیکنگ کی۔ عین ٹائم پر پارٹنر بدل لیا۔ فوراً تھ پروف کا شرجیل انصاری۔ ساری شائیں اس نے  
 کھیلیں۔ یہ بس ہاتھ میں ریٹ لیے کھڑی رہی۔“  
 ”ہو ہی نہیں سکتا۔“ معیذ نے دل میں کہا تھا۔

”اور تم دیکھو اس شرجیل انصاری کو عقیدت فاطمہ میں کیا نظر آیا؟ اتنی ساری لڑکیوں میں اس نے اسی کو ہی  
 چوز کیوں کیا۔“ سارا قصہ سمجھ میں آ گیا تھا معیذ کے اصل میں تو عم شرجیل انصاری کی نظر کرم عقیدت پر پڑنے  
 کا تھا۔ نہ کہ ہارنے کا۔  
 ”میں اس کو جیت نہیں مانتی۔“

”آپ کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ جیت تو وہ ہر حال میں۔“ معیذ نے ملیکہ کے زخم پر جان بوجھ کے نمک  
 چھڑکا۔

”اور اگر شرجیل انصاری نے آپ کے ساتھ نہیں اس کے ساتھ ہنسنو بنایا تو اس کو لک کہتے ہیں۔ آئی مین شی  
 از آئی گرل۔“ ملیکہ نے بڑی بری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”اور اسپورٹس مین کا تو بہت بڑا دل ہونا چاہیے۔ جس میں جیت بھی سما سکے۔ اور ہار بھی۔ وہ اسپورٹس مین  
 ہی کیا۔ جو پہلی ہار پر رونے بیٹھ جائے۔“

”تم جلتے نظر آؤ۔“ ملیکہ انگلی کے اشارے سے اسے باہر کا راستہ دکھا رہی تھی۔

”کیوں آپ نے دو سراجو گر مارنا ہے؟“ اور ملیکہ نے مارنے کے لیے اٹھا بھی لیا۔ وہ حقیقتاً ”سر پر پاؤں رکھ کر  
 بھاگا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ملیکہ نے اطراف میں نظریں گھما لیں۔ کشف کی وجہ سے گھر میں خاموشی چھائی  
 تھی، جانے اس کھینچا تانی کا کیا انجام ہو۔ ایک گہرا سانس لیتی۔ خاص مضمحل۔ سی۔ ڈھیلے ڈھالے قدموں  
 کے ساتھ کمرے کی طرف جانے لگی۔ آج عقیدت نے کمال کر دکھایا تھا۔ جن کی نظروں میں نہیں آتا تھا۔ ان کی  
 نظریں بھی آگئی تھیں۔



مغرب ہونے میں ابھی وقت تھا جب راجے اسے گھر کے گیٹ پر اتارا۔

ماہنامہ کرن 182

”اندر نہیں آؤ گی؟“ اس نے اخلاقاً کہا۔ حالانکہ جانتی تھی راجا نہیں آئے گی۔ شام گہری ہونے لگی تھی اور  
 اس کی ماما کو بھی انتظار ہو گا۔

”بچہ کبھی۔“ وہ حسب توقع جواب دیتی گاڑی اسٹارٹ کرتی فوراً وہاں سے غائب ہوئی۔ عقیدت دھڑکتے دل  
 کے ساتھ گیٹ کی طرف پلٹی جہاں جمیلہ منتظر کھڑی تھی۔ عقیدت کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ آج وہ ایک  
 محرکہ سر کر آئی تھی۔ آج شاندار استقبال بنا تھا۔ اسے توقع تھی جمیلہ پھولوں کے ہار نہ سہی پر کچھ ایسا ضرور  
 کرے گی جو اس کی حیات کے شایان شان ہو۔ مگر اسے دھچکا لگا۔ جمیلہ کے چہرے پر ایسا کوئی اشتیاق نہیں تھا۔ وہ  
 بڑی سنجیدگی سے عقیدت کا بیگ قائل اور جوتے رکھتی رہی۔ عقیدت کی حیرت میں ابھٹن کھل گئی۔

”خیر تو ہے؟“ جمیلہ کو نظروں میں تولتی وہ پوچھنے لگی۔ کچھ توقف کے بعد جمیلہ نے جواب دیا۔

”ہاں۔“ اور کچن کی طرف جاتے جاتے پوچھنے لگی۔ ”تمہارے لیے کھانا لگاؤں۔“

نئی میں سر ہلانے کے بعد عقیدت نے اسے جانچتی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

”اماں کہاں ہیں؟“ اس کا جوش ٹھنڈا ہونے لگا۔

”وہ ابھی ابھی کمرے میں گئی ہیں۔ مغرب کی نماز پڑھ کر نکلیں گی۔“ جانے کے بعد جمیلہ کچن میں گھس گئی۔

ان کا حیرت سے منہ کھل گیا۔ خاصی ناراض شکل لیے وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

جمیلہ جانے کا پلے اس کے قریب آگئی۔

”میں نے نہیں مانی۔“ اس کے چہرے پر شدید ناراضی تھی۔

”اچھا ہاں۔“ جمیلہ نے اچانک ہی ہاتھ پٹیا تھا۔ ”آج تو تیرا مقابلہ تھا۔ کیا نتیجہ نکلا۔“ کہاں تو۔ اتنے

دنوں سے وہ عقیدت کو سکھانے کے لیے ہوش سے لگے گانہ ہو رہی تھی۔ اور کہاں آج غیوں کی طرح سرسری سا

پوچھ رہی تھی۔ عقیدت کی ساری خوشی کا فور ہو گئی۔ اسے جمیلہ سے یہ امید نہیں تھی۔

”میں جیت گئی۔“ وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

”ہاں۔ واقعی۔“ جمیلہ نے بڑے دھیمے سروں میں چیخ مارتے ہوئے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ عقیدت کو سراسر

اداکاری لگی۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔

جمیلہ کی ہر ہیکار بے توجہی سے سنتی وہ ٹیرس پر آگئی تھی۔ کھلی ہوا دار فضا میں سانس لینے کی اشد خواہش ہو رہی

تھی وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ ہلکی جھپک جھپک کر آنسو روکنے لگی۔ عجیب زندگی تھی اس کی جس میں خوشی

اور مسرت کا کوئی دخل نہیں تھا۔ آنسو رکنے میں نہ آئے تو وہ انہیں آزادانہ بہانے لگی۔ اور شاید ناوبر بہانی رہتی

اگر سامنے والے لان میں بابا جی نہ نظر آجاتے۔۔۔ ان کے چہرے پر بریشانی مثبت تھی۔ اس سے ہاتھ کے اشارے

سے رونے کی وجہ پوچھنے لگے وہ دونوں ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی کھڑی ہو گئی تھی۔ اس وقت اس گھٹن زدہ

ماتول میں رہ کر آنسو بہانے سے کہیں اچھا تھا بابا جی کے گھر جایا جائے۔ وہ چہرے سے آنسوؤں کی باقیات مٹاتی جلدی

سے نیچے آئی۔

”میں سبکیں بابا کے گھر جا رہی ہوں۔ اماں کو بتاؤ نا۔“

”ہاں۔ بات سن لی۔“ جمیلہ اس کے پیچھے لپکی۔ وہ بنا اس کی طرف متوجہ ہوئے گیٹ پار کر گئی۔ رنجور سی ہوئی

جمیلہ واپس لاؤنچ میں آگئی۔ بی بی کو کیا پتا آج کیا ہوا تھا۔ آج کون آیا تھا۔ پہلے تحریم کی ساس نندیں۔۔۔ اور پھر تحریم

خود۔۔۔ وہ کتنی خوش تھی۔ کتنی زیادہ پر جوش تھی۔ وہ سب ملیں بھی ٹھیک ٹھاک اخلاق سے مکران کے جانے

کے بعد تحریم نے ساری خوشی ملیا میٹ کر دی۔

”یہ مت سمجھیے گا۔ آپ کی عزت و غیرت بچانے یہاں آئی تھی۔ مجھے صرف اور صرف اپنی اپنے بچوں کی فکر

183 ماہنامہ کرن



تھی۔ اپنی عزت کی فکر تھی۔ جو پردے میں نے اس عزت کو بچانے کے لیے ڈال رکھے تھے۔ ان کی فکر تھی۔ انہی کو سنبھالتی بچانے آئی۔ میں اپنے لیے یہاں آئی، کیونکہ میری زندگی ان کے ساتھ گزرتی ہے۔ جھوٹ کی بنیاد پر ہی سہی مجھے ساری زندگی ان کے بیچ رہنا ہے۔ میں اپنا گھر بچانے آئی۔ اور خدا نہ کرے اگر میں آپ کی جیسی ہوں۔ شکل خدا نے بنائی ہے۔ لیکن میری زندگی کا وہ آخری دن ہو گا جب مجھے لگے گا میں آپ کے جیسی ہوں۔ میں آپ کے جیسی نہیں۔" وہ اماں کی خوشی پر پانی پھیر کر چلی گئی۔ اور تحریم کوئی آسیب بھی جو جب آئی گھر سارے پر سایہ کر گئی۔



مشکل نام والے بابا کے گھر وہی اپنائیت بھری فضا تھی۔ ان کی ہر دم تیر مار کر نظروں سے گھورتی بیگم نے آج بھی انہی نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ اندر سے اتنی زیادہ دکھی ہو رہی تھی کہ باباجی کی بیگم کا روکھا سوکھا روپہ محسوس ہی نہ کیا۔ جب تک وہ مغرب کی نماز ادا کر کے آئے۔ وہ لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر گم سم بیٹھی رہی۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ لان کے درخت ہیبت ناک لگنے لگے تھے۔ عام پر وہ اس وقت یہاں نہ بیٹھتی مگر آج دل ہر احساس ہر جذبے سے ماوراء صرف اداسی کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔

"ارے بھئی یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ اندر کیوں نہیں گئیں؟"

"آپ کا انتظار کر رہی تھی۔" وہ تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

"چلو پھر اب اندر چلیں۔" بابا بدستور کھڑے تھے۔

"یہیں ٹھیک ہے سبکدوش بابا۔" اس کے لیے میں لجاجت تھی۔ وہ قریب کی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"مجھے صرف بابا کہہ دیا کرو۔ سچی کوئی ٹیکس نہیں لگتا خالی بابا کہنے پر۔" ان کا انداز مزاحیہ تھا۔ وہ سر جھکائے ہاتھوں کی لکیروں میں کھوئی رہی۔ عام دنوں میں وہ ان کی بذلہ سنبھلی پر ہلکا سا مسکاتی ضرور تھی۔ مگر آج اور خاص کر ابھی سب کچھ برا لگ رہا تھا۔

"وہی آج تمہارا بیچ بھی تھا۔" جس قسم کی اس کی حالت ہو رہی تھی۔ افسردہ ادا اس۔ اس کے پیش نظر بابا نے ہچکچاہٹ کے ساتھ پوچھا۔ اس کے چہرے پر بڑا بڑا لکھا تھا۔ وہ ہار گئی ہے۔

"میں جیت گئی۔" باباجی کو جھٹکا لگا۔

"کمال ہے تم جیت گئیں۔" وہ خوشگوار مسرت میں گھر کر لو۔

"جی۔" اس کا لہجہ ہنوز تھکا تھا تھا تھا۔

"لوکی تمہیں خوشی والے ایکسپریشن دینے بھی نہیں آتے۔" وہ ڈپٹ رہے تھے۔ عقیدت کے چہرے کا حزن گہرا ہو گیا۔

"عادۃً جو نہیں ہے۔"

"خود پر ترس کھانے والے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ بہادر بنو۔ اور مجھے ہنس کے دکھاؤ۔" وہ ہنسنے کا درس دے رہے تھے۔ اور اس کے آنسو ہمہ نکلے۔ باباجی کے ساتھ گزشتہ دنوں ہیڈ منشن کھیلنے کی وجہ سے اتنی بے تکلفی ہو گئی تھی کہ وہ وہ باتیں بھی ان کے سامنے کرنے لگتی جو کسی اور سے نہیں کر سکتی تھی۔

بابا اب کی بار خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔

"میری زندگی بہت ایسا نارمل ہے۔ اور ہمیشہ رہے گی۔ میری اماں۔ وہ ہیں میری اماں۔ مگر ضرورت کے وقت اکثر مجھے خود سے دور محسوس ہوتی ہیں۔ تب وہ مجھے صرف تحریم آپلی اور بھائی کی اماں لگنے لگتی ہیں۔ تب

بہتے ان سے خول محسوس ہونے لگتا ہے۔"

"مگر تمہاری ماں ہیں۔ ہر دم تمہاری فکر میں رہتی ہیں۔ تمہارے لیے دعا گو رہتی ہیں۔ وہ اولاد بہت خوش قسمت ہوتی ہے جو اپنے والدین کی دعاؤں کے حصار میں رہے۔ تمہارا گمان ہو کر گناہ گار مت بنو۔"

"میں بد گمان نہیں ہو رہی۔ میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ میرے قریب ہوتے ہوئے بھی مجھ سے بہت دور ہیں۔ ہمارے درمیان ماں بیٹی والی کوئی بے تکلفی نہیں۔ وہ مجھ سے اپنے راز چھپاتی ہیں۔ اور میں ان کو اپنے دل کا حال نہیں بتاتی۔" اس کے انداز میں شدید نوعیت کی بے بسی عود آئی۔

"زیادہ برا تم کرتی ہو۔" باباجی کے لیے میں فمائش تھی۔

"اپنی دوستوں کی ماؤں کو دیکھ کر میرے اندر کا خلا بڑھتا جا رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں میرے دل میں بے شمار سوالات ہیں۔ مگر اماں نے اپنے گرد ایسا خول تان رکھا ہے کہ نہ بتاتی ہیں کچھ اور نہ پوچھنے دیتی ہیں۔" باباجی نے اسے کھل کر روئے دیا تھا۔ روتے روتے جب تھک گئی خود ہی چپ بھی ہو گئی۔ اب چہرے پر خفت ہی خفت تھی۔ "یہ رونا دھونا اور شکایتیں صرف اس وجہ سے تھیں کہ اماں اور جیلہ نے مبارکباد نہیں دی؟" باباجی پوچھ رہے تھے۔ اس نے ہونٹوں کا کراہتاں میں سر ہلا دیا۔

"یہ خوشی تو ہم یہاں بھی سلیبویٹ کر سکتے ہیں۔ چلو اب اندر۔ تمہاری آنٹی دوبار اپنی آنکھوں سے گولیاں مار کر گئی ہیں۔ اب ٹینک لے کر نہ آجائیں۔" بابا سمنے کی ایکٹنگ کر رہے تھے وہ ہنسنے لگی۔

"بیٹا کیا بناؤں۔ کیا کھاؤ گی؟"

"وہی کارن سوپ جو اس دن آپ ہمارے گھر لائے تھے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔"

"اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔" وہ قدرے ہچکچائی۔ رات ہو گئی تھی۔ اور اماں مختصر ہی نہیں پریشان بھی ہوں گی۔

"ان دونوں کو ہمیں بلوا لیتے ہیں۔ سب مل کر تمہاری جیت سلیبویٹ کرتے ہیں۔" باباجی کا یہی کمال تھا۔ خود بھلے اندر سے کتنے ہی دکھی ہوں۔ دکھی لوگوں کو خوش کر کے چھوڑتے تھے وہ بھی ہلکی پھلکی ہوئی ان کے ہمراہ کچن کی طرف ہوتی۔



شاید بجلی چلی گئی تھی۔ کمرے میں ایسا گھپ اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ بڑھائی نہیں دے رہا تھا۔ سارا دن مختلف کاموں میں رگڑے رہنے کی وجہ سے دلو کی آنکھ رات کو کسی مردے کی طرح بند ہوئی تھی۔ بجلی آئے جائے جلال غوں خال کرے پکڑے خراب کرے اس کی بلا سے وہ مردوں کی نیند سویا رہتا۔ ابھی بھی گھپ اندھیرے میں صرف خراٹے یا جلال کا تیز رفتاری سے چلتا غنٹس سنائی دے رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا۔ کوئی اندر آیا تھا۔ اور اب جلال کی طرف بڑھ رہا تھا۔

(باقی آئندہ)





## صفیہ احمد

## حیرت انگیز داستان

دور فاصلے پر کالے کالے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بادل جمع ہو رہے تھے اور گرجتے ہوئے آبدی کی طرف بڑھ رہے تھے ہوا بھی تیز ہو گئی تھی سہانے چراغ روشن کیا۔ اور چارپائی دیوار کے پاس کھینچ کر لے آئی۔ اس وقت طیور کے قافلے تیزی کے ساتھ پرواز کرتے ہوئے طوفان برق و بار سے بچنے کے لیے دامن کوہسار کی جانب جا رہے تھے۔ سہا کے گھر کے آس پاس جو درخت تھے ان پر بھی طیور نے شور اور دم چا رکھا تھا۔

نیلے نیلے بادلوں پر کنگ کا ایک قافلہ کیس سے اڑتا چلا آ رہا تھا۔ ان کا سردار آگے آگے تھا اور باقی ماندہ بندے ایک کھلی ہوئی مقراض کی طرح دو قطاروں میں پیچھے پیچھے اڑے جا رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ پردہ کی بھی کوئی پناہ کا آسرا ڈھونڈ رہے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی۔ ہوا درختوں میں سائیں سائیں کر رہی تھی۔ بادل کی گرین اور بجلی کی کڑک سے دل دہل جاتا تھا۔

سہا نے گھبرا کر چارپائی پر لیٹے اپنے دونوں بچوں کو دیکھا، دونوں نیند میں تھے اور پھر سر باہر نکال کر آسمان کی طرف دیکھا جو آج برسے پر تلا ہوا تھا۔

”بائے اللہ برسات جس تیزی سے ہو رہی ہے ڈر ہے کچھ دیر بعد ہماری چھت ہی ہم پر نہ آجائے“ سہا نے گھبرا کر چھت کی طرف دیکھا۔ اینٹ اور ٹیکڑے کی بنی چھت جگہ جگہ سے ٹپکنا شروع ہو گئی تھی۔

آئے گی۔ ڈر لگ رہا ہے کہیں بارش اور شدید نہ ہو جائے۔“

”اللہ نہ کرے۔ یہ رحمت تو ہمارے لیے مشکلیں لے آتی ہے۔ خیر کی دعا مانگو چھت کی کالے۔“

”خیر ہی کی دعا مانگ رہا ہوں اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔“ سکھو نے بڑبڑاتے ہوئے ہیرا کے اوپر جگہ جگہ سے پوند لگی رضائی ڈالی۔ جسے شاید سردی لگ رہی تھی۔

آسمان اب بھی سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ طلوع ہونے والی سورج کی کرنیں ابھی مدھم مدھم تھیں۔ ہواؤں کے نرم جھونکوں میں رات بھر ہونے والی بارش کی نمی رچی ہوئی تھی۔

”کہاں جا رہے ہو۔“ سہا کی کھٹکے پر آنکھ کھلی تھی۔ باتیں کرتے کرتے نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا جو اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ صبح کی سپیدی

”پریشان نہ ہو۔ کچھ دیر میں رک جائے گی بارش۔ تو ایسا کر اسی چارپائی پر آ جا۔“ سکھو نے اپنی چارپائی پر جگہ بنائی۔

”اس پر تو پہلے ہی تم اور دونوں بچے لیٹے ہیں۔ اگر میں بھی آگئی تو یہ ٹوٹ نہ جائے۔ میں یہیں بیٹھی ہوں۔“ سہا نے ٹوٹی پھوٹی چھت کا سی چارپائی پر ہی بیٹھ بیٹھے کد۔

وہ بار بار پریشانی سے صحن سے نظر آتے آسمان کو دیکھ رہی تھی کہ شاید وہ اس کے دیکھنے سے برسا بند کر دے گا۔

”کوئی بات نہیں۔ رات بیٹھ کر گزارہ کر لیں گے۔ صبح کچھ کریں گے۔“ سکھو نے نرمی سے کہا۔

”تم ایسا کرو چھت کی کو میری دلی چارپائی پر لٹاؤ۔ تم دونوں باپ بیٹے اس چارپائی پر لٹ جاؤ۔ ہیرا بھی اب بڑا ہو رہا ہے۔ چھوٹی پڑے کی تمہیں کھاٹ ڈومٹ کے لیے سکون سے سو جاؤ۔“

”تو جانتی رہے اور میں سکون سے سو جاؤں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ سہا نے شوہر کی محبت پر اسے نرم نظروں سے دیکھا۔

”کیا چلو جا مل سکتا ہے۔“ سکھو نے اس سے ایک مشکل سوال کیا۔

”کیسے جلاؤں۔ دیا سلائی سیل گئی اور اوپے بھیگ گئے ہیں۔ ورنہ کوشش کر کے جلا لیتی۔“

”چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ اتنی خوف ناک آوازیں آرہی ہیں بادلوں کی۔ اس شور میں نیند تو کیا





آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی ساری رات پرستا آسمان اس وقت بے حد پرسکون تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا یہ ساری رات برسا ہے۔ مگر صبح کی روشنی ابھی رات کی تاریکی کو مکمل ختم نہیں کر سکی تھی۔

”آج کھیت جوتنا ہے۔“ سکھوں نے اپنا ضروری سامان اٹھاتے ہوئے اسے آہستگی سے جواب دیا۔

”ہاں شتا تو کرلو۔“ سوہانے اٹھتے ہوئے کہا۔

”کیسے کر لوں۔ کیا ساری رات تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی جو اوپے سوکھ گئے۔“ سکھو کا انداز سادا تھا۔ مگر سوہانے کو لگا جیسے وہ طنز کر رہا ہے۔

”تو کیا میں نے جان بوجھ کر رات کو چائے نہیں بنائی تھی۔“ سوہانے انداز میں چٹکی تھکی تھی۔

”ارے تو میں کب تجھے الزام دے رہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں تو سو جا ابھی۔ اوپے ابھی کیلے ہی ہوں گے۔ تو جو لہا کیسے جلے گا۔ میں دیکھ کر آکر کھاؤں گا۔“

”اچھا۔“ سوہانے مایوسی سے کہا۔ مگر وہ دوبارہ لپٹی نہیں اور اٹھ کر اسے سامان دینے میں مدد کرنے لگی۔ پھر کچھ یاد آنے پر بولی۔

”نرا ایک تیل سے کیا ہو گا۔“

”تیل لہو سے اس کا تیل مانگا تو تھا۔ آج تو کام چلاؤں۔ کل پھر دیکھوں گا کہ کیا کرنا ہے۔“

”پر دوسروں کے تیل کے سہارے تو کھیتی ہو چکی۔“ سوہانے چادر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹی اور چھت کے نیچے شگاف کے نیچے رکھی بائی کو اٹھا کر محسن میں لے گئی۔ مٹی نے جتنا پانی خود میں جذب کرنا تھا کر لیا۔ باقی وہ اس کے سینے پر یوں ہی دھرا تھا۔

”پال سے پر کیا کیا جائے۔“ سکھو کی ایک عادت بہت اچھی تھی۔ وہ زیادہ بحث نہیں کرتا تھا اور نہ ہی فضول میں بات کو آگے بڑھاتا تھا۔ اب بھی مختصر جواب دے کر باہر نکل گیا۔

\*\*\*

چھوٹے سے محسن اور ایک کمرے کو سمیٹنے میں دیر ہی کتنی لگی۔ سوہانے محسن کو صاف ستھرا کیا۔ کمرے

کی بکھری چیزوں کو سمیٹا۔ چھٹکی اور ہیرا دونوں اٹھ کر تھے اور اب بھوک بھوک کا شور مچا رکھا تھا۔ اس نے بمشکل آگ سلگائی اور دونوں کو ناشتا دے کر سکھو کے لیے روٹی پکائے لگی۔ اس نے کنستری میں جھانک کر دیکھا تو ڈاسا ہی اٹا رہ گیا تھا۔

”اگر آج کام نہیں ہوا تو کیا کل سے ہمیں فلسفے کرنے پڑیں گے۔“ یہ سوچ کر ہی اسے جھرجھری اٹھی اور وہ صدق دل سے دعا کرنے لگی کہ سکھو آج شام تک کام کر لے کھیتوں پر مگر ہر دعا قبول نہیں ہوتی۔ کچھ ہی دیر میں سکھو تھکا ہارا نظر آیا۔ سوہانے اس وقت لپائی کے لیے مٹی گوندھ رہی تھی کہ دھوپ نکل آئی اور چھت کے سوراخوں کو بھر دے۔ سکھو کو دیکھ کر حیرت سے بولی۔

”بھی تو تیل لے کر گئے تھے۔ چھٹکی کے ابال تھے سو رہے ہی لوٹ آئے۔“

”کیا کرتا۔ ایک چوتھائی کھیت پلٹا تھا کہ ضلع دار آگئے۔“

”تو۔ ان کا حصہ تو ہم دے چکے ہیں۔“ سوہانے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔ پر انہوں نے کہا ہے ان کا حصہ لاؤ۔“ سکھو نے سامان محسن کے کونے میں پھینکتے ہوئے کونے میں رکھے تنکے سے پانی نکالا اور چارپائی پر بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔

”ان کا حصہ۔ کیا حصہ۔ دل غ خراب ہو گیا ہے کیا اس کا۔“

”دل غ تو ٹھیک تھا اس کا۔ بس ہم جیسے غریبوں نے خراب کر دیا ہے۔“

”پھر اب کیا ہو گا۔ گھر میں تو اب پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔“

سوہانے تشویش سے کہا۔ وہ ہاتھ دھو کر اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

”یہ ہی تو میں نے بھی کہا۔ بس انہوں نے کھیت سے نکال دیا۔“

”نکال دیا۔ اس کے باپ کا کھیت ہے جو نکال

ماہنامہ کرن 188

”ایہ۔“

”تو غصہ تو مجھ پر کیوں کر رہی ہے۔ انہوں نے نکال دیا تو میں کیا کرتا۔ ہاتھ پیر ہی جوڑ سکتا تھا۔ مٹی میں کر سکتا تھا۔ وہ سب کر لیا مگر وہ کس سے مس نہ ہوا۔“

”پھر کیا کرو گے۔“ سوہانے اندازہ تھا کہ سکھو نے بہت مدت سماجیت کی ہوگی اس خبیث کی۔ مگر

”کرتا ہوں کچھ۔“ سکھو نے گلاس سوہانے کو واپس کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

\*\*\*

”کیا کہا انگلو مہاجن نے۔“ سوہانے چھٹکی اور ہیرا کے کپڑے الگ سے اتار کر تے ہوئے چارپائی پر بیٹھ کر دیکھ دے اور پانی کا گلاس لے کر سکھو کے پاس چلی آئی جو اندر آکر خاموشی سے چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔

”وہ کہتے ہیں کہ جب تک پچھلا روپیہ نہیں دو گے ہم ایک سیپائی اوہار نہ دیں گے۔“

”ان کے کل تیس ہزار دینے تھے اور ہم انہیں سب ملا کے پندرہ اور میں ملا کے پینتیس ہزار دے چکے ہیں۔ اب بھی ان کا روپیہ نہیں اترا۔“ سوہانے پتھری سے کہا۔

”یہ ہی میں نے بھی کہا۔ پر وہ کہتے ہیں وہ سب تو سو رہے۔“

”اللہ عارت کرے اس سود خور کو۔ بڑا بے ایمان ہے۔“

”بے ایمان نہ ہوتا تو آج لاکھوں کا مالک ہوتا۔“

”تو ایمانداری کیا انسان کو کوڑی کوڑی کا محتاج پریتی ہے۔“ سوہانے آواز دھیمی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان دونوں کی باتیں اس کے بچے بھی سنیں اور ان کی بنیادوں میں کوئی کمی نہ جائے۔

”آج کل کے زمانے میں تو واقعی۔“ سکھو نے حسب معمول مختصر جواب دیا۔

\*\*\*

اطلاق میں ابھی تھوڑی دیر پہلے چند مزارے موجود تھے جو اب جا چکے تھے زمیندار نے دو خدمت گاروں

ماہنامہ کرن 189

کے سوا سب کو باہر نکل جانے کا اشارہ کیا اب صرف زمیندار اور اس کے دونوں خدمت گار وہاں موجود تھے اس نے ہاتھ جوڑ کر کھڑے سکھو کو ایک نظر دیکھا پھر بولا۔

”میں اپنے ملازموں کے خلاف ایک بات نہیں سنوں گا۔“ زمیندار کے لہجے میں رعوت تھی۔ آنکھوں میں تکبر اور گردن میں سر۔

”مگر سرکار ہم لگان دے چکے ہیں۔ ایسے سے کھیت جوتنے سے روکا گیا تو ہمارے بال بچے تو بھوکے مرجائیں گے۔“ سکھو نے زمین پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ جوڑے۔ زمیندار اس وقت اپنے کارندوں سے اپنے کندھے دوار ہاتھ۔ ان کے ہاتھوں میں ایسا سرور تھا کہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ سکھو کی بات پر اس نے آنکھیں کھول کر اسے گھورا۔

”تمہارے بال بچوں کی ذمہ داری میری نہیں ہے۔ ضلع دار کا حق نہیں دو گے تو وہ تمہیں کھیت میں گھسنے بھی نہیں دے گا۔“

”سرکار مگر کھیت تو ہمارا ہے۔“ سکھو نے دبی زبان میں کہا۔

”ہاں تو ہم کون سا تمہارے کھیتوں پر قبضہ کر رہے ہیں یا اس پر بلڈوزر چلوار ہے ہیں۔ اپنا حق ہی تو مانگ رہے ہیں۔ جو تم لوگوں کے دلوں سے نکلتا ہی نہیں۔ خون تھکوا دیتے ہو تب کہیں جا کے کچھ پیسے دیتے ہو جیسے ہمارے باپ دادا پر احسان کر رہے ہو۔“

”سرکار۔ آپ کو اپنے بزرگوں کا واسطہ۔“ سکھو نے گرد گڑا کر التجا کی۔ اسے لگ رہا تھا زمیندار کو غصہ آگیا ہے اپنا کھیت کہنے پر اس نے غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے خوشامد کی۔

”بس میں نے کہہ دیا میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تم لوگ ضلع داروں کارندوں کو خوش نہیں رکھو گے تو یہ ہی ہو گا۔ بھوکے مرتے ہو تو مرجائو۔ آخر کیا کیا جائے ہماری بھی مجبوری ہے۔“

لعل خان۔ میرے سر میں بھی درد ہے۔ اندر سے تیل لاکر سر کی بھی مالش کر۔ اس نے تقریریں کر



کے میرے سر میں بھی دو کر دیا ہے۔  
یہ اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ اب وہ سکھو کی کوئی بات نہیں سنے گا۔ اور اگر اس نے زبردستی سنانے کی کوشش بھی کی تو اس سے کوئی بعید نہیں کہ اسے اٹھا کر ہر پھنکوا دے گا۔  
سکھو خاموشی سے اٹھ کر ہر نکل گیا۔

\*\*\*

رات کا وقت تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ کل ساری رات آسمان برس کر صاف شفاف ہو گیا تھا آج تاروں کا فلک آسمان پر رکھا ہوا تھا۔ سچا صحن میں رکھی چارپائی پر لیٹی ستاروں کو گنتی رہی۔ چھٹکی اس سے چمٹی ہوئی بے خبر سو رہی تھی۔ دوسری چارپائی پر سکھو سارا دن کا تھکا ہارا بے خبر سو رہا تھا۔

”کل کیا ہو گا۔“ ایک بڑا سا سوالیہ نشان ستاروں کی جگہ آسمان پر رہا ہوا تھا۔ بظاہر اس کی نظریں آسمان پر نہیں مگر ذہن کل میں الجھا ہوا تھا۔ گھر میں جو اناج تھا ختم ہو چکا تھا اور اب خاقوں کی نوبت آنے والی تھی۔

وہ سوچتی رہی پھر ایک فیصلہ کر کے اٹھی اپنے ساتھ لگی چھٹکی کو آرام سے لٹایا اور چارپائی سے اتر کر دبے پاؤں چلتی اندر کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں جا کر اس نے صندوق میں سے اپنے اور سکھو کے کپڑے نکال کر چارپائی پر ڈھیر کر دیے۔ پھر اندر ہاتھ ڈال کر کونے میں رکھی اس پوٹلی کو نکال لیا۔ یہ وہ گنتے تھے جو سکھو نے شادی کے وقت اس کے ہاتھوں میں ڈالے تھے اور جسے اس نے چھٹکی کے لیے سنبھال کر رکھ دیے تھے اس کے باپ کی نشانی گلے کا ہار اور کانوں کی بالیاں اس نے پوٹلی کھول کر سارا زیور ایک بار پھر دیکھا۔ پھر دوبارہ سے پوٹلی میں باندھ کر ہاتھ سے تولا۔ اور صحن میں آگئی۔

پوٹلی کیسے کے نیچے رکھ کر وہ صبح ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

\*\*\*

”لے آئے روپے مہاجن سے۔“ سوہا جو بے

ماہنامہ کرن 190

قراری سے سکھو کی آمد کی منتظر تھی اسے آتا کی طرح تیزی سے چلتی ہوئی اس کے پاس آگئی۔  
”ہاں لے آیا۔ یہ لے۔“ سکھو نے کرتے کی جیب سے روپے نکال کر سوہا کے ہاتھ پر رکھے۔  
”یہ۔ یہ کتنے ہیں۔“ نوٹ گن کر سوہا نے سکھو کی طرف حیرت سے دیکھا۔

”گنتے نہیں۔“ سکھو نے تلخی سے پوچھا۔

”گنتے ہیں جیسی تو پوچھ رہی ہوں۔ پوٹلی بھر کے زیور دیا تھا اور تم یہ گنتی کی روپیاں لے آئے۔ تمہیں پتا بھی ہے وہ سارا گنتا کتنے کا تھا۔“ سوہا کا غصہ اور دکھ کم نہیں ہو رہا تھا۔ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

”مہاجن نے کہا میں تو ان کے اتنے ہی دے سکتا ہوں۔ ورنہ لے جاؤ۔ کیا کرتا۔ یہ سوچ کے لے لیا۔“

کھیتوں پر کام کر کے اور روپے جمع کر لیں گے تو پھر بنالیں گے۔

”مجھے نہیں چاہئیں اور روپے اور نہ تیل۔ مجھے اپنا زیور چاہیے بس ہائے میں لٹ گئی۔ میرے گنتے۔“ سوہا نے بین کرنا شروع کر دیا تھا۔

”اتنا روٹا پیٹنا مچانا تو دیا ہی کیوں تھا۔ میں نے تمہارے آگے ہاتھ جوڑے تھے کہ دو۔“ سکھو کو ایک تو مہاجن پر پہلے ہی بہت غصہ تھا۔ دوسرا سوہا کا رویہ دیکھ کر وہ برداشت نہیں کر سکا اور پھٹ بڑا۔ مہاجن زمیندار ضلع دار پر تو وہ اپنا غصہ نہیں اتار سکتا تھا سوہا پر تو اتار سکتا تھا نا۔

”میں نے اپنے باپ کی سہاگ کی نشانیاں اس لیے دی تھیں کہ مہاجن کا قرضہ بھی اتر جائے گا ضلع دار کا نذرانہ بھی دے دیں گے اور ایک تیل مول کے لیں گے۔“

”مہاجن اور ضلع دار کو دے کر ہی آ رہا ہوں۔ اب یہ ہی روپے بچے ہیں۔“ دکھ تو سکھو کو بھی تھا۔ سوہا کا زیور جانے کد یہ ہی سوچ کر وہ نرمی سے بولا۔  
”اور اس سے تو تیل نہیں آنے کا۔“ سوہا بس رونے والی تھی۔

”تو کیا کروں۔۔۔ خود کو بیچ آؤں کیا۔“ سکھو سارا دن

کی خوری اور بھوک پیاس کے بعد بھی خالی ہاتھ تھا۔  
”مجھے نہیں چاہیے تمہارا روپیہ۔ مجھے بس میرے گنتے لاؤ۔“ سوہا نے ضدی لہجے میں کہا۔

”اب مہاجن کے پاس جاؤں گا تو وہ تو دھتکار دے گا اور گنتے بھی واپس نہیں کرے گا۔“

”تو اب تیل کہاں سے آئے گا۔ کھیتی کیسے ہوگی۔ اور ہمارا گزارہ کیسے ہو گا۔ ہائے میرے بچے تو بھوکے مر جائیں گے۔“

”مہاجن مرنے ہیں تو یہ ان کی ذمہ داری نہیں۔“ سکھو نے تلخی سے کہا اور باہر نکل گیا۔

\*\*\*

”میں جانتا ہوں کوئی انسان مجرم پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ حالات سے مجبور ہو کر غلط قدم اٹھاتا ہے لیکن تمہارے حالات تو میں جانتا ہوں اپنے کھیتوں پر کام کرتے ہو اور روکھی سوکھی جیسی کھانسی گری ہوئی بچوں کو بالتے ہو پھر ایسی کیا افتاد آ رہی کہ تم نے چوری کی۔“

”تھانے دار سکھو کو جانتا تھا اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی۔“

”غلطی ہو گئی۔“ سکھو آہستہ سے بولا۔  
”تمہاری شرافت کی تو گاؤں والے مثالیں دیتے ہیں پھر تمہیں یہ کیا سوچیں کہ مہاجن کے گھر میں بھانڈ پڑے۔“ تھانیدار سے یہ کبھی حل نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے دماغ پر زور دینے کے بجائے اسی سے پوچھ لیا۔

”سرکار۔ میری گھروالی کا سب گنتا پاتالے لیا اور مول میں گنتی کے نوٹ دے دیے۔“ سکھو نے تفصیل بتائی۔

”تو تم نے بیچا ہی کیوں تھا۔“ اب بھی تھانیدار کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ زیور پہلے تو بیچا پھر چوری کر لیا۔ ایسا کیوں کیا اس نے۔

”کیا کرنا سرکار۔ ضلع دار کو نذرانہ دینا تھا۔“ سکھو نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو گنتے بیچ کر جو روپے ملے تھے ضلع دار کو دے

دیتے۔“ تھانیدار نے آسمان حل بتایا۔  
”کیسے دیتا۔ ضلع دار کو دینے کے بعد جو روپے بچے ان سے تیل نہیں آتا تھا گھروالی نے سارا گنتا تیل مول لینے کو دیا تھا۔ وہ رونے لگی کہ تیل لاؤ۔ نہیں تو میرا گنتا۔“

”ارے سب تو قوف تو اب نہ تو گنتا ملا نہ روپیہ ملا اور نہ تیل اگر کچھ ملا تو مفت کا تیل۔“

”غریبوں کو مفت میں کچھ نہیں ملا کرتا۔ جیل تک آنے کے لیے بھی بہت محنت کرنی پڑی۔“ سکھو نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور زمین پر نڈھال سا بیٹھ گیا۔

وہ کل سے بھوکا پیاسا تھا۔ سارا دن کی خوری خوری اور تھانے دار کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد وہ تھانے کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھا تھا اسے ایک دم سے اپنی انتہیاں مل کھائی محسوس ہوئیں۔ اسے بھوک محسوس ہوئی جو دن میں تین بار لگتی تھی۔ اور تھوڑا سا اناج ہی چاہتی تھی مگر لگتی کیا تھی خشک۔ ہر بار ایک خواب دب جاتا تھا اس کے نیچے۔

بھوک اس کے چہرے پر آنکھوں پر پورے جسم پر۔ ہر جگہ دکھ رہی تھی۔ غرائی ہوئی۔

خواہش کا خون مانگتی ہوئی۔

تو جتنی کھسوتی ہوئی۔

لے کاش۔ لے کاش سیلاب ہی آجائے۔ چھت ہی مگر بڑتی حکومتی آمد تو مل جاتی۔ میرے بچوں کو کھانے کو تو مل جاتا کاش۔“

اس نے آزر دگی سے سوچا اور سلاخوں سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔

\*\*\*

ماہنامہ کرن 191



عتیقہ ملک

## دل کی شہزادی

سکندر بخت کی اکلوتی بیٹی الفشمن سکندر اپنے چچا کے بیٹے عثمان بخت کی منگیتر تھی اس کی زندگی کے ماہو سال اس کے انتظار میں گزر رہے تھے وہ پڑھنے کے لیے سات سمندر گیا ہوا تھا۔ اعلیٰ خاندان جاہ و جلال رکھنے والا خوب صورتی میں اپنی مثال آپ دولت جائیداد میں اس کے باپ کے ہم پلہ عثمان بخت کو واپس آکر اسے رخصت کر کے جانا تھا۔ اس کی بڑھائی ختم ہونے میں صرف ڈیڑھ سال رہ گیا تھا۔ مگر الفشمن سکندر کے انتظار کی نوعیت بدل گئی تھی۔ اس کا دل پلٹ گیا تھا کیونکہ وہ منشی نعمت خان کے بیٹے غفار خان کا اسیر ہو گیا تھا وہ اس غفار خان کو دل دے بیٹھی تھی جو کسی صورت عثمان بخت کے ہم پلہ نہ تھا۔

شہر سے زراعت کی تعلیم حاصل کر کے سکندر بخت کی زمینوں پر حساب کتاب اور فصلوں کی دیکھ بھال کرنے والا غفار خان بھلا خٹک فیملی کے سپوت عثمان بخت کے ہم پلہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ مگر یہ بات الفشمن بخت کے دل کو کون سمجھاتا جو کچھ بھی سننے اور ماننے کو تیار نہ تھا۔

عثمان بخت واپس آیا مگر الفشمن سے مل کر اسے زبردست دھچکا لگا تھا۔ وہ جو سمجھتا تھا کہ الفشمن اس کی واپسی کی راہ تک رہی ہوگی۔ وہ تو کسی اور کو دل میں بسائے ہوئے تھی۔ پھر وہ بہت ہی لبرل سا نظر آنے والا عثمان بخت ایک روایتی خٹک بن گیا وہ جو اس کے دل کی مراد تھی عثمان بخت اسے اپنی مرضی سے ایک عام سی شکل و صورت اور واجبی سی تعلیم اور کم حیثیت والے ملازم کو کسے سونپ دیتا۔ الفشمن کے سارے

اندازے غلط نکلے اور اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ سکندر بخت کی حویلی میں گویا بھونچال آگیا تھا کیونکہ عثمان بخت نے اپنے چچا سکندر بخت اور اعظم بخت تک یہ بات پہنچا دی۔ الفشمن پر کڑی پابندیاں لگا دی گئیں اور خٹک خاندان غفار خان کے خون کا جامہ ٹھہرا مگر پھر بھی الفشمن سکندر نے عثمان بخت کی ہوس سے انکار کر دیا تھا۔

نعمت خان نے اپنے بیٹے غفار خان کو زبردستی شہر بھیج دیا تھا۔ کیونکہ اس کی جان کو خطرہ تھا۔ تب شادی سے صرف تین دن پہلے الفشمن کڑے پرے سے نکل کر غفار خان کی دہلیز پر آن پہنچی غفار خان کی عدم موجودگی کے ساتھ ساتھ اسے نعمت خان نے سمجھایا کہ وہ باپ کی عزت کی لالچ رکھ لے۔ غفار خان کے یوں غائب ہونے پر اس نے باپ کی حویلی آئے بغائے خود کو دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا یوں اس نے اپنے قول کی لالچ رکھی کہ وہ غفار خان کے علاوہ کسی کی ڈولی میں بیٹھنا گوارہ نہیں کرے گی۔

\*\*\*

سکندر بخت کا ڈرائیور احمد نواز جو غفار خان کا دوست تھا اس کا باپ نعمت خان کو یہ اطلاع دینے آیا کہ الفشمن کی بازیابی کی خاطر خٹک فیملی نے غفار خان کی بہن رخسانہ کو اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے یہ سن کر نعمت خان نے احمد نواز کی منت کی کہ وہ رخسانہ کے ہونے والے سر کو بلا لائے تاکہ وہ دو بول پڑھا کر اسے گھر لے جائیں مگر رخسانہ کے ہونے والے سر نے یہ صورت حال جان کر اس رشتے سے ہی انکار کر دیا کہ وہ

ماہنامہ کرن 192

مکمل فن

پوٹھی اور آخری قسط





خٹک فیملی کے غیض و غضب کا مقابلہ کہاں کر سکتا تھا۔

تب نعمت خان نے احمد نواز کی منت کی کہ وہ رخسانہ کو اپنی عزت بنا کر یہاں سے نکال کر لے جائے۔ احمد نواز جو شادی شدہ اور ایک بیٹے کا باپ تھا وہ بھلا یہ کیسے کر لیتا۔ مگر نعمت خان نے بیٹی کی عزت بچانے کی خاطر اس کے پاؤں پکڑ لیے تو اسے مجبور ہونا پڑا اور یوں وہ رات کے اندھیرے میں رخسانہ کو وہاں سے نکال کر پنجاب آگیا جہاں گھر کمار کے ایک گاؤں میں اس کا خاندان آباد تھا۔

احمد نواز رخسانہ کی عزت تو بچالایا تھا مگر کبھی بھی اسے گھر اور شوہر کا تحفظ نہ دے سکا اس ڈر سے کہ اس کی بہن کا گھر نہ اجڑ جائے جس کی شادی دسٹے سٹے کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ پورے خاندان نے رخسانہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ احمد نواز نے صرف اتنا کیا کہ اسے گھر سے نکالنے اور طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا اس نے رخسانہ کے گاؤں میں رابطہ کیا تو بہا چلا کہ اس کے باپ نعمت خان کو غالباً زبان نہ کھولنے کے جرم میں تشدد کر کے اس سے اگلی رات مار دیا گیا تھا۔ رخسانہ کے دکھوں میں اضافہ کرنے کے بجائے اس نے یہ خبر اپنے تک محدود رکھی البتہ رخسانہ پر زندگی کا پیمانہ تنگ ہی رہا۔ وہ امید سے ہوئی تو یہ تنگ پیمانہ اس کے لیے موت کا چھندہ ثابت ہوا وہ آنکھوں میں مینے بچی کو جنم دے کر چل بسی بستی کی عورتیں کہا کرتی تھیں کہ رخسانہ کو کمرے سے نکلے ہوئے احمد نواز کی پہلی بیوی بانو نے دھکا دیا تھا اور بے ڈھب گرنا اس کی قبل از وقت زچگی اور بے وقت موت کا سبب بنا تھا۔

احمد نواز جو بہن کا گھر اجڑنے کے ڈر سے کبھی بیوی کی حمایت میں نہ بول سکا اسے بیٹی کے آگے کچھ بھائی نہ دیتا تھا۔ ساتھ ہی اس کا لا شعور اسے ایک احساس جرم میں مبتلا رکھتا تھا۔

تب وہ بے بس ہو کر اپنی بیٹی کو سینے سے لگا کر دیوانہ وار چومتا تو بانو بیگم کے سینے میں بھانپ کر جلتے لگتے تھے۔ یوں تو کبھی اس نے بیٹوں کو پیار نہیں کیا تھا۔

ایک روز جب احمد نواز دو ماہ کی روتی ہوئی محرومیت سے لگائے کتنی دیر سے نسل نسل کر چپ کر رہا تھا۔ بانو اس کا کھانا رکھے انتظار میں بیٹھی تھی برداشت نہ کر سکی تھی۔

”کیا ہے احمد چارپائی والو سو مجھے کی اب ایسا ہی کیا لاؤ کہ۔“ احمد نواز نے ایک جھٹکے سے رک کر اس کی بات سنی اور حمزہ کو پاس بیٹھی ماں کی گود میں ڈال کر شدید طیش کے عالم میں بانو کو بانو سے پکڑ کر گھر کی دہلیز سے باہر کیا تھا۔

”خبردار آئندہ میری بیٹی کے بارے میں کوئی غلط لفظ تمہاری زبان سے نکلا تو میں بھول جاؤں گا کہ تو میرے بیٹے کی ماں ہے کھڑے کھڑے طلاق دے دوں گا۔“

اس کی بات پر ہکا بکا رہ گئی اس سے قبل تو وہ پھول چھوٹی بات پر فساد کھڑا کر دیتی تھی۔ مگر یہاں اس نے جان لیا کہ پہلے اس کا مقابلہ نعمت خان کی بیٹی رخسانہ سے تھا اور اب بات حمزہ احمد کی تھی جو احمد نواز کی بیٹی تھی اس کی جان اس کے دل کا ٹکڑا اور پھر سانس کے سمجھانے پر اس نے اس معاملے میں خاموشی اختیار کر لی تھی مگر یہ وہ خاموشی تھی جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور یہ طوفان سالوں بعد کسی کو بے بس پا کر نازل ہوا تھا۔

\*\*\*

حمزہ احمد جسے اس کا باپ بارہ رانی کہتا تھا اسے یوں بھلی کا چھالہ بنا کر رکھتا کہ جب اسے شہر کی فیکٹری میں بطور ڈرائیور ملازمت ملی تو وہ اسے پورے گھرانے کو اس لیے ساتھ لے آیا تھا کہ کوئی اس کی رانی کے ساتھ ناروا سلوک نہ کر سکے۔ رانی کو آٹھ سال تک احمد نواز کی ماں نے پالا تھا وہ عورت جس کی آنکھ میں رخسانہ کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی اس نے پوتی کے لیے اپنی محبت بھری آغوش وا کر دی تھی۔ اس کے باپ کی والدہ نے محبت تھی کہ اسے کالونی کے اسکول میں پڑھانے کے بجائے انٹرنش میڈیم اسکول میں داخل کر لیا تھا۔

احمد نواز کی بے تحاشا محبت توجہ اور اپنی ذہانت کی بات اس نے تعلیمی منازل بہت نمایاں انداز سے کی تھیں ایف ایس سی کے پیرز سے فاسغ ہو کر اس نے کالونی سے نیچے آکھٹے کر کے یوشن پڑھانا شروع کیے۔ اپنی اپنے تعلیمی اخراجات کے ساتھ وہ گھر کی معاون بن گئی۔ بی ایس سی کے آخری سال میں بھی۔ جب احمد نواز روڈ انکسٹنٹ میں ایک ٹانگ سے ہاتھ دھو کر لاچار رہا۔ بستر پر آن پڑا۔ علاج معالجہ کے لیے تھوڑی بہت رقم اور اس کے بڑے بیٹے کو مقابلہ نوکری فیکٹری میں دی گئی مگر وہ آئے دن جھڑا کر کے گھر بیٹھ جاتا۔

حمزہ کا یوشن گھر کی گاڑی کھینچنے کا ذریعہ بنا۔ باپ کے علاج کے لیے رقم کی ضرورت پڑی۔ تب وہ اپنی دوست کی توسط سے اس کی خالہ کی اکیڈمی گئی۔ جنہوں نے کوئی دیکھنسی خالی نہ ہونے پر ایک آفس جاب کا اشتہار اس کے سامنے لا رکھا۔ ان ہی کی تسلی حوصلہ افزائی اور اصرار پر اس نے اپلائی کیا اور سلیکٹ بھی ہو گئی۔ چند ماہ تک سب ٹھیک چلا مگر پھر کمپنی کا ایم ڈی ساحر آڑے آیا اور وہ نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھی ایک روز جب ڈھلتی شام میں باپ کی پریشانی کا خیال کر کے وہ نوکری پر سومر تہہ لعنت بھیج کر آفس سے نکلی اور بس سے اتر کر گھر کے راستے پر چلی تو امجد سامنے سے آنا دکھائی دیا اس کے بقول بابا بہت پریشان ہو رہے تھے۔ انہوں نے امجد کو اسے لانے کے لیے بھیجا تھا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو بابا مضطرب سے بیٹھے تھے۔

”رانی پتر کج بہت دیر کر دی تو نے؟“ اسے دیکھ کر گویا ان کی جان میں جان آگئی تھی۔

”بابا آج کام زیادہ تھا تھوڑی دیر بیٹھنا پڑ گیا۔“

انہیں جواب دے کر وہیں ان کے پاس بیٹھ گئی اور تھوڑی دیر بعد ہی وضو کرنے اٹھ گئی کہ مغرب کی آواز نہیں ہو رہی تھیں۔

”کیا بات ہے رانی بیٹی کوئی پریشانی ہے؟“ صحن کے کونے میں گئی ٹوٹی سے وضو کے بعد خاصی دیر تک

بیٹھی ساحر شاہ کے رویے کو سوچتی رہی جب بابا نے اسے دیکھا تھا۔

”کچھ نہیں بس یونہی۔“ اس وقت تو وہ جواب دے کر اٹھ گئی مگر نماز پڑھنے کے بعد فیصلہ کر کے ان کے پاس آ بیٹھی۔

”بابا آئندہ میں آفس نہیں جاؤں گی۔“ اس نے باقی بات گول کر کے ڈیوٹی میں تبدیلی کا ذکر انہیں سنایا تھا۔

”میں زونیرا کی خالہ سے پتا کروں گی کیا پتا ان کی اکیڈمی میں کوئی گنجائش نکل آئے۔“ احمد نواز نے اس کے فیصلے سے اتفاق کیا تو حمزہ نے انہیں آئندہ پروگرام بتایا تھا۔

”نہیں بیٹا اب ہم گاؤں چلیں گے۔“

”لیکن بابا یوں اچانک۔ آپ کا علاج۔“

”کمانا تمہارا نہیں تمہارے بھائیوں کا کام ہے۔ گاؤں جا کر انہیں کسی کام میں لگانے کی کوشش کروں گا۔ اب میرا یہاں رہنے کو دل نہیں چاہتا۔ لگتا ہے واپسی کا ٹائم آگیا ہے۔“ احمد نواز نے اواسی سے کہا تھا۔

باپ کی شدید بیماری کے باوجود یہ تو اس کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ اس کی دنیا سے واپسی کا ٹائم آچکا ہے۔ یہ حقیقت چھاؤں سمٹ کر چھٹی دھوپ اس پر سایہ قلمن کر جائے گی۔ پھر ساحر شاہ کی اس کی زندگی میں شکاک آمد اس کے لیے زندگی کا پیام ثابت ہوئی مگر وہ



قیمت 300/- روپے

ملتان کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ فون نمبر 32735021

37، اردو بازار، کراچی



جو بہت پہلے اس کا باب گمان کیا کرتا تھا۔ اسے جینے کے ڈھنگ کون سکھائے گا۔ اسے زندگی کے نشیب و فراز سے نبھنے کا سلیقہ کون دے گا۔ اس کا خدشہ زندگی کے موڑ پر بار بار درست ثابت ہوا تھا۔

اسے زندگی میں یہ کسی نے نہ بتایا تھا کہ بعض انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جنہوں نے کینجلی اور ڈھکھی ہوئی ہے اور کینجلی کے اندر ان کا اصل روپ بڑا بھیانک ہوتا ہے۔

اس کی زندگی سنوارنے والے دو لوگ اس کا شوہر اور باپ تھے۔ اس کی غلطی تھی کہ خود سے محبت کرنے والے ان دو افراد سے وابستہ اور گرد و لوگوں پر اس نے اعتبار کیا تھا مگر اس کے اعتبار کے چندار کو جب نہیں لگی تو اسے دکھ و اذیت کا ایک سمندر عبور کرنا پڑا تھا۔

”پلیز تھوڑا سا کھالیں۔“ نرس نے ٹرے میں سے باؤل اٹھا کر اس کے منہ کے قریب کیا تھا۔

”پلیز سسٹر مجھے کچھ نہیں کھانا مجھے تنگ مت کریں۔“ اس نے بے بسی سے انکار کیا تھا۔

”ایسے کیسے نہیں کھاؤ گی دو لگاؤں گی اب۔“ ڈاکٹر صوفیہ صبح سے تیسری مرتبہ اس کے کمرے میں آئی اور اس کا انکار سن کر تپ اٹھی تھی تب ہی رعب سے کہتے ہوئے برس پڑی تھی۔

”چلو تھوڑا سا سوپ پی لو۔“ اس نے ٹرے میں سے سوپ کا پیالہ اٹھا کر اس کے سامنے کیا تو حمزہ نے ہاتھ سے پرے دھکیل دیا، آنسو تھے کہ مسلسل بے چلے آ رہے تھے۔

”حمزہ! تم کیوں مسلسل روئے جا رہی ہو؟“ ڈاکٹر صوفیہ خاصی حیران پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا ساحر کے شام کو نہ آنے کی وجہ سے؟“ اس نے خود ہی قیاس کیا تھا۔

”کون ساحر؟ مجھے کسی ساحر سے کوئی مطلب نہیں ہے؟“ اور دروازے سے اندر آتا ساحر یک دم ٹھنک کر رک گیا تھا۔ وہ تو مسلسل یہی سوچتا آیا تھا کہ اس سے کس طرح معافی مانگے گا کن الفاظ میں گناہ کا اعتراف

کرے گا تب بھی اس کو الفاظ کم پڑتے محسوس ہوتے تھے تب ہی اس کا موبائل اٹھالیا تھا کہ شاید یہ کسی اس کے دل کو قرار آجائے۔ وہ خود تو اپنے آپ کو بڑے کہنے کے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ مگر اب۔۔۔

”کیا کہہ رہی ہو تم؟“ ڈاکٹر صوفیہ کو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہوا تھا۔

”آپ مجھے کب ڈسچارج کر رہی ہیں میں ٹھیک ہوں پلیز مجھے جانے دیں؟“ اس کی بات کو نظر انداز کر کے اس نے وہی سوال دہرایا جو صبح سے اب تک کئی مرتبہ کر چکی تھی۔

”کیوں؟ کیا گھر بہت یاد آ رہا ہے؟“

”گھر؟ کون سا گھر؟ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“

”ایسے نہیں کہتے چندا تمہارا تو اتنا پیارا گھر ہے تمہارا اور ساحر کا گھر۔“ ڈاکٹر صوفیہ نے خواہ مخواہ یقین دہانی کرائی تھی۔

”وہ گھر تو گھر تو لیلا کا ہے۔“ یہ بات اس نے کتنی اذیت سے کہی تھی یہ تو اس کے چہرے پر درج تھا۔

”ان دونوں نے خاصی پریشانی سے اسے دیکھا تھا۔

”چھاپلو یہ فیصلہ تو بعد میں ہو گا کہ وہ گھر کس کا ہے۔“ ساحر نے بیڈ کے قریب آکر قدرے ہلکا ہلکا انداز اختیار کیا اور پھر صوفیہ کے ہاتھ سے سوپ کا کپ پکڑ لیا تھا۔

”نی الحال تو تم اس طرح کرو کہ کچھ کھاؤ بیو تاکہ تمہاری سوچ درست۔“ ساحر کی بات ادھوری رہ گئی کہ حمزہ نے اس قدر زور سے ہاتھ مارا تھا کہ کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اڑتا ہوا دور جا گیا تھا۔

”مجھے آپ کی مہمانیوں کی ضرورت نہیں ہے بہت عنایتیں کر چکے آپ مجھ پر ان کا خراج بھی وصول کر لیا ہے نا۔“ حمزہ روتے ہوئے زور سے چلائی تو جہاں ساحر اسے گم سم ہو کر دیکھنے لگا وہیں صوفیہ اس کی حرکت پر حیران رہ گئی تھی۔

”آپ مجھے جانے دیں پلیز۔“ تھوڑی دیر روئے کے بعد اس نے پھر سے سر اٹھا کر صوفیہ کی طرف منہ

کئے انداز میں دیکھا تھا۔

”کہاں جانا ہے تمہیں؟“ صوفیہ کی چھٹی حس نے

”میں نہیں بھی جاؤں آپ کو اس سے کیا؟“

”یوں تو ہم تمہیں کہیں نہیں جانے دیں گے؟“

ڈاکٹر صوفیہ نے اس کی ہٹ دھرمی کے جواب میں ہٹ دھرمی دکھانا چاہی تھی۔

”آپ لوگ مجھے اس لیے نہیں جانے دیتے کہ میرے بھائی نے پانچ لاکھ روپے لیے تھے میں دے دوں گی میں وہ پیسے واپس کر دوں گی میں۔“ جب کر کے قسطوں میں واپس کر دوں گی۔ اپنی بات کے اختتام پر آنسو بھائی وہ یک دم ہی تڑپ تڑپ کر رو

کی تھی۔

”اس سے پوچھیں یہ کہاں جانا چاہتی ہے میں اسے روکوں گا نہیں۔“ ساحر کے کہنے پر ڈاکٹر صوفیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”میں۔۔۔ میں کسی ہاسٹل۔۔۔ میں جاؤں گی۔ میں ایک رہوں گی اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔“

\*\*\*

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو کہ جہاں جانا چاہے تم اسے روکو گے نہیں۔“ خاصی دیر کے بعد صوفیہ نرس کو اس کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے باہر نکلی تھی تو ساحر اس کے ساتھ ہوا تھا۔

ساحر اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پاکٹ سے سگریٹ کیس اور لائٹر نکال رہا تھا۔

”یہ اتنا بڑا تو اسموکنگ کا بورڈ تمہیں نظر نہیں آ رہا کیا؟ ڈاکٹر صاحب ختی سے منع کرتے۔“

”نری بکو اس کرتا ہے ڈاکٹر کا بچہ؟“ آپ بھی اس کی باتوں پر توجہ نہ دیا کر رہے۔

”پہلے تو وہ سخت جھنجھلایا پھر قدرے ہلکے پھلکے انداز میں مشورہ دینے لگا تھا۔

”بالکل تاکہ بعد میں تمہاری طرح عزت کرواتی پھر دوں۔“ صوفیہ کو ساحر کے ہاتھ سے کپ چھوٹنے کا سین یاد آیا تو بے اختیار مسکرا کر کہنے لگی تھی۔

## خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا ایکسٹریا والی انسانی کلر میڈیا

کانیا ایڈیشن قیمت - 750/- روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

گھانا گھانا

قیمت - 250/- روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی - 800/- روپے کا مٹی آؤ در سال فرمائیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول



قیمت - 300/- روپے

## نخل حلیہ میں



فاخرہ جبین

قیمت - 400/- روپے

بہارِ بیدار اک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 بازار کراچی۔ فون: 32216361



”مجھے وارڈ کا چکر لگانا ہے، مگر اس سے پہلے میری بات کا جواب دو۔“ وہ دونوں روم میں جا کر بیٹھے تو صوفیہ نے اپنا سوال پھر سے دہرایا تھا۔

”بھابھی! یہ جو خاتون ہیں تاہم وہ بی بی! یہ جو ٹھکان لیتی ہیں وہ کر کے دکھاتی ہیں، چاہے سیڑھیوں پر قلاب مار کر اسپتال کے بیڈ پر ہی کیوں نہ پڑ جائیں اب آپ اسے زبردستی روکیں گی تو کئی بعد نہیں کہ رات کو پھولن دیوی بن کر نکل پڑیں اور کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔“

”ہوں!“ ڈاکٹر صوفیہ نے تائید کی تھی۔  
”آپ لوگ یہاں کب شفٹ ہو رہے ہیں؟“  
اسپتال کے اوپر گھر کا پورشن تکمیل کے مراحل میں تھا سو وہ اسی کے بارے میں پوچھنے لگی۔  
”ڈیوڑیشن کا ایک دوپہتے کا کام باقی ہے بس اتنے ہی دن لگیں گے۔“

”اب میں حمزہ کو گھر لے کر نہیں جاؤں گا، ماما بھی دس پندرہ دن میں واپس آ رہی ہیں، آپ کچھ دن بیٹیں رکھ کر اسے اپنے ساتھ فلیٹ پر شفٹ کر لیں۔ کہہ دیجیے گا کسی اچھے ہاسٹل کا پتا کریں گے۔“  
”کیا مطلب؟ تمہیں اس کی بات پر ابھی اعتبار نہیں آیا؟“

”اس کی بات پر تو خیر مجھے کبھی بھی اعتبار نہیں تھا تو اب کیا آنا کرکے“ اچھے اچھے انداز میں کہتے ہوئے وہ رک گیا تھا۔

”ساحر آخر تم مان کیوں نہیں لیتے حمزہ بے قصور ہے۔“ مرد کے دل میں گڑا شک کا کاٹنا عورت کی زندگی کو اوجھڑا کر دیتا ہے اور ڈاکٹر صوفیہ اس معصوم اور سادہ سی لڑکی کی راہ کے کانٹے سمیٹنا چاہتی تھی سو اپنی بات پر اصرار کر کے کہنے لگی تھی۔

”بھابھی! ایک غزل سنیں گی؟“ ساحر چھپکی سی مسکراہٹ کے ساتھ موبائل کے مینو میں کیے تو حامد علی خان کی آواز کمرے میں گونجنے لگی تھی۔

”میں فارغ نہیں ہوں کہ تم شام غزل چھیڑ کر بیٹھ جاؤ۔ مجھے بس اتنا بتا دو کہ تمہیں حمزہ کی بات پر یقین

کیوں نہیں ہے۔“ ڈاکٹر صوفیہ نے چکر کرکھا مگر اسے مل جیران ہو کر موبائل سے ابھرنے والی آواز کیلئے کھلی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“  
”خدا کی نافرمانی ہے۔“ ساحر نے برکت کہا تھا۔  
”مگر اس کی تو آواز بھی آ رہی ہے۔“ ڈاکٹر صوفیہ نے خاصا محظوظ ہو کر پوچھا تھا۔

”دیر سے میرے سر پر بڑی ہے ٹاس لپے۔“  
”چھایا کرو اس کو میرے موبائل میں بھی رکھا دو کر دینا مستقبل میں اگر کبھی میرا اپنی بہو کے ساتھ کوئی چار سو بیسی کرنے کا ارادہ بناتا تو اس ریکارڈ کو سن لیا کرتا گی۔“ ڈاکٹر صوفیہ نے اشتیاق سے کہا تھا شاید اس کے آٹھ سال بعد بھی میڈیکل کی اصطلاح میں کوئی خراب نہ ہونے کے باوجود یہ جوڑا اولاد سے محروم تھا۔ سو ساحر اس دور اندیشی پر ہنس ہی سکتا تھا۔

پانچ روز کے بعد اس کے ڈسچارج ہونے پر ڈاکٹر صوفیہ اور ایاز نے ان کے درمیان صبح کی معمولی سی کوشش کی مگر حمزہ کی ایک ہی رٹ تھی کہ اسے کسی ہاسٹل میں رہنا ہے۔ ساحر اب اس کے ساتھ نہ رہتی تھیں کرنا چاہتا تھا سو اس کی اجازت سے ڈاکٹر صوفیہ اسے اپنے فلیٹ پر لے آئی تھی۔ اس وعدے کے ساتھ کہ جلد ہی کسی اچھے ہاسٹل کا پتا کر کے اسے شفٹ کر دیں گے یہاں پر ایک ملازمہ دن کو رہا کرتی تھی سو وہ چار دن سے یہاں اکیلے رہنے دھونے خدا سے شکوے کرنے میں اپنا وقت بتاتی۔ ڈاکٹر صوفیہ اور ایاز رات گئے آتے تو بمشکل تھوڑی دیر اسے کہنی دیتے۔

اس روز ملازمہ بھی چھٹی پر تھی۔ فلیٹ کی اطلاع ملتی تھی تو اس نے بیرونی دروازے کے پاس جا کر بجک آئی سے جھانکا تھا۔ باہر ساحر کھڑا تھا۔ وہ حیران ہو کر کچھ سیکنڈ اس کی آمد کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر دروازہ کھولے بغیر لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی تھی۔

ساحر نے قدموں کی چاب دروازے کے قریب آتے اور پھر واپس جاتے سنی تھی۔ ایاز نے اسے فلیٹ کی چابی دینا چاہی، مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک تو وہ حمزہ کی اجازت کے بغیر اندر نہیں آنا چاہتا تھا۔ دوسرے یہ غلط فہمی بھی تھی کہ وہ اسے دیکھ کر دروازہ کھول دے گی۔ مگر اب بند دروازے کے باہر پریشان کھڑا تھا۔

”چھی طرح پتا بھی ہے کہ صوفیہ بھابھی اور ایاز بھائی اس وقت اسپتال میں ہوتے ہیں، پھر یہاں کیوں تشریف لائے ہیں؟“ وہ روکھی ہو کر بند دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ ایک دو مرتبہ پھر ٹیل بجی مگر وہ مضطرب سی بیٹھی رہی۔ اگلے پل فون کی بیل بج اٹھی۔

”ہیلو۔“ اس نے نمبر دیکھے بغیر ریسیور اٹھایا تھا۔  
”حمزہ پلیز۔“ دیکھو مجھے ایاز نے۔“ اس نے ٹھیک سے پوری بات سننے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

”عجب میں نے بتایا تھا کہ میں ڈاکٹر کے پاس گئی ہوں تب میری پوری بات نہیں سن سکتے تھے اب کیا کہنا ہے بھلا۔“ اس کی سوچوں کا تسلسل ایک مرتبہ پھر فون کی بجتی بیل سے ٹوٹا تو وہ یوں ہی خالی خالی نظروں سے سیٹ کو دیکھتی رہی۔ وقفے وقفے سے فون کی بجتی بیل پر اس نے سی ایل آئی پر نمبر دیکھا تھا وہ یہ تو اسپتال کا نمبر ہے فوراً ہی ریسیور اٹھایا تھا۔

”وہ حمزہ دراصل میں اور صوفیہ چند ڈاکٹرز کے ساتھ ایک ایریا میں کیمپ لگنے جا رہے ہیں۔ چند دنوں تک واپس ہوگی۔ میں نے ساحر سے کہہ دیا ہے وہ تمہارے پاس۔“

”لیکن ایاز بھائی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود رہ لوں گی اور پھر آئی ہیں نا۔“ اس نے ان کی بات کاٹ کر فوراً ”ملازمہ کا حوالہ دیا تھا۔“

”مگر وہ تو ایک ہفتے کی چھٹی پر گئی ہے۔“  
”پھر بھی۔ ایاز بھائی آپ خود ہی تو کہتے ہیں۔“  
یہاں کا سیکورٹی سسٹم بہت اچھا ہے۔ میں اکیلے رہ لوں گی۔“  
”اب اتنا بھی سیف نہیں ہے کہ تم اکیلے رہنے

لگو۔ سو وارداتیں ہو جاتی ہیں۔ اب اگر کوئی چور ڈاکو جن، بھوت گھس آئے تو میں تمہارے پچھلوں کو کیا جواب دوں گا۔“

چور ڈاکو کے نام پر کیا اثر ہوتا مگر جن بھوت کے معاملے میں اس کا ایمان حدود درجہ کمزور تھا۔ اگر کوئی مذاق بھی کر لیتا تو اس کی حالت دیکھنے والی ہو جاتی تھی۔ اب بھی ایاز کے کہنے کی دیر تھی۔ آنکھوں کے سامنے خواہ خواہ ہی عجیب اختلاف پابے بناتے گئے۔ آٹھ بجے تو اس ایریا میں لائٹ بھی ایک گھنٹے کے لیے چلی جاتی تھی۔ سو ڈاکٹر ایاز کو خدا حافظ کہہ کر وہ تیزی سے دروازہ کھولنے کے لیے اٹھی۔ دل میں یہ خدشہ بھی تھا کہ کیس ساحر واپس نہ چلا گیا ہو مگر خیر وہ ابھی تک وہیں براہمان تھا۔ دروازہ کھول کر اس کی موجودگی کا یقین کرتے ہی وہ تیزی سے پٹی اور اپنے بیڈ روم کا دروازہ بند کر لیا اور پھر رات گئے تک باہر نہیں نکلی۔ حتیٰ کہ کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور ساحر نے بھی اس کے تئیں دیکھ کر برا نہیں کی۔ آرام سے دوسرے بیڈ روم میں شفٹ ہو گیا تھا۔

پہلے تو آفس ٹائم کے بعد بھی اس کی بزنس کی مصروفیات چلتی تھیں۔ شوروں اور ہی جلدی گھر آتا تھا۔ مگر اب روزانہ پانچ بجے واپس آکر کچن میں جا کر خود ہی چائے بنا کر پینا اور لاؤنج میں صوفے پر لیٹ کر رات گئے تک ٹی وی دیکھنا۔ ایسے میں حمزہ کمرے میں بند ہو جاتی۔ مجبوراً ہی باہر نکلتی۔ اسے ساحر پر غصہ آتا۔

اس کے بیڈ روم میں اچھا بھلا ٹی وی موجود تھا۔ پھر یوں لاؤنج میں پھیل کر بیٹھنے کی کیا تک بنتی تھی۔ دوسری طرف ساحر اگرچہ اس سے بلا ضرورت مخاطب نہیں ہوتا تھا۔ مگر کبھی گھبراہٹ میں آتی جاتی حمزہ کو کن انکھیوں سے دیکھتا رہتا کہ اس کا دل شدت سے اس ناراض لڑکی کو دیکھنے کا متمنی رہتا تھا۔ ڈاکٹر ایاز اور صوفیہ کو کیمپ کے لیے گئے پانچ دن ہو چکے تھے۔ وہ تین دن سے لگا تار دونوں کے موبائل پر فرائی کر رہی



تھی۔ مگر کوئی بھی اس کی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ ساحر کے جانے کے بعد وہ اس کے بیڈ روم میں چلی آئی۔ جہاں تین سوٹ کیس بڑے اس کا منہ چڑھا رہے تھے۔ کھول کر دیکھا تو ایک میں ساحر کے اپنے کپڑے اور کچھ چیزیں جبکہ باقی دونوں اس کے کپڑوں اور دیگر سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ عجیب سے محضے میں بڑا کمرہ سارا دن خود سے الجھتی رہی۔

شام کو اس نے ساحر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ صوفے پر لیٹے لیٹے اس نے سراٹھایا۔ وہ کنفیوز سی اس کے سر پر کھڑی تھی۔ وہ کوئی نوٹس لیے بغیر دوبارہ مکن سے انداز میں لیوی دیکھنے لگا تھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ بالا خروہ بول رہی تھی۔ ساحر نے کچھ کہے بغیر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔

”صوفیہ بھابھی اور ایاز بھائی میری کال کیوں ریسیو نہیں کر رہے؟ اور اتنے دنوں سے وہ لوگ کہاں غائب ہیں۔“

”فکر مت کرو۔ وہ خیریت سے ہیں؟“ وہ گویا محفوظ ہوا تھا۔

”مجھے ان کی خیریت کی فکر نہیں ہے۔ صوفیہ بھابھی نے مجھ سے پراس کیا تھا کہ وہ لوگ واپس کیوں نہیں آ رہے۔“

”ان کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ جواباً اس نے اطمینان سے بتایا تھا۔

”ان کے گھر کی سہنگ مکمل ہو چکی تھی۔ وہ لوگ وہیں شفٹ ہو گئے ہیں۔ یہ فلیٹ اب میں ہائر کر چکا ہوں۔“ ساحر نے سیدھا ہو کر بیٹھے ہوئے بتایا تھا۔

”میرے ساتھ اس چہنگ کا مقصد؟ میں نے ان کی منت نہیں کی تھی۔ صوفیہ بھابھی نے مجھے۔ خیر میں خود ہی کل کسی ہاسٹل میں شفٹ ہو جاؤں گی۔“ وہ طیش میں آ کر کہتے ہوئے مڑ گئی۔

”کیا کہا تم نے؟ دوبارہ سے کموڑا؟“ ساحر ریسیو پھینک کر تیزی سے اٹھا اور اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا۔ اس کا انداز اتنا سخت تھا کہ اسے

اپنے الفاظ دوبارہ ہرانے کی جرات نہیں ہو سکی۔ ”تمہیں یہاں لانے کو میں نے صوفیہ بھابھی سے کہا تھا اور یہاں سے جانے کے بارے میں سوچنا بھی تم اپنی کہیں سروائیو نہیں کر سکتیں میرے ساتھ رہ کر تمہارا یہ حال ہے تو۔“ پچھلے تجربے بھول گئی ہو کیا؟ تم اتنی بے وقوف ہو کہ لوگ تمہارے بارے میں پلان بنا کر عمل کر ڈالتے ہیں اور تمہیں تب تک خبر نہیں ہوتی جب تمہارے سر پر آن پڑتی ہے۔“ چند سیکنڈ کے لیے ان کے درمیان خاموشی کا وقفہ در آیا تھا۔

”جیسے چاہو یہاں رہو، میں تم پر کوئی حق نہیں جتا رہا۔ مگر ہر حال تم میری بیوی ہو۔ یہاں سے نکل کر خود کو تماشائے کی ضرورت نہیں ہے، سمجھیں تم۔“

اور آئندہ یہ بات میں تمہارے منہ سے نہ سنوں ورنہ بہت برا پیش آؤں گا۔“ آخر میں سخت لہجے میں اس نے وارننگ دی تو وہ پریشان نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔



مسز شاہ کو سنیل کی کال نے از حد پریشان کر دیا تھا۔ سندس کی طبیعت بھی مکمل طور پر ٹھیک نہیں تھی۔ پھر بچی کے ساتھ گھر کو دیکھنا۔ مگر آپ وہ گھر سے دور رہنے کا مزید رسک نہیں لے سکتی تھیں۔ اس سے پہلے کہ ساحر اور حمزہ کے درمیان غلط فہمیوں کی دیوار گرتی انہیں واپس پہنچ کر صورت حال کو مرضی کے مطابق ڈھالنا تھا۔ سورضوان سے انہوں نے ٹکٹ کروانے کا کہہ دیا تھا۔ وہ واپسی کی تیاریوں میں تھیں۔

جب گھر فون کرنے پر صفراں نے انہیں وہ اطلاع دی جسے سن کر گویا وہ جھوم اٹھی تھیں۔ حمزہ ساحر کو بتائے بغیر گھر سے باہر گئی تھی اور پتا چل جانے پر ساحر نے جھکڑا کیا تو وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی اور واپس نہ لوٹی تھی۔

اپنے طور پر انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ ساحر نے اسے طلاق دے دی ہوگی۔ ورنہ وہ دم کئی جونک اسے بھلا کہاں چھوڑنے والی تھی۔ اس کا ٹھکانہ ہی کون سا تھا

جہاں وہ جاتی۔ یقیناً یہی بات تھی تب ہی تو وہ چلی گئی۔ انہوں نے فوراً واپسی کا ارادہ کینسل کر دیا کہ ابھی گھر بچی اور سندس کو ان کی ضرورت تھی۔ پھر چند ماہ مزید وہاں رہنے میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی۔ ابھی ساحر کو ٹھیک کرنے کے لیے تھوڑا وقت چاہیے تھا۔ ان ہی دنوں ساحر کو فون کر کے انہوں نے حمزہ کے بارے میں کرید لگانا چاہی، مگر اس کے جواب نے انہیں مزید سرشار کر دیا تھا۔

”ناما میں حمزہ کے بارے میں ایک لفظ نہیں سننا چاہتا۔“ یقیناً اب وہ اس سے اتنا متنفر ہو چکا تھا کہ اس کے بارے میں بات تک کرنے کا روادار نہیں تھا۔ اپنی کامیابی اور فتح کے یقین کے ساتھ انہوں نے چند ماہ بعد واپسی پر ساحر اور لیلی کی شادی کا کافائل پروگرام بھی ترتیب دے ڈالا تھا۔



”یہ سلسلہ کب تک چلے گا حمزہ بی!؟“ چار ماہ سے ساحر صبح کی کئی ناکام کوششیں کر چکا تھا۔ وہ عشاء کی نماز کے لیے وضو کر کے باتھ روم سے نکلی تو ایک مرتبہ بھر کمرے کے دروازے میں ایستادہ خاصی شگفتگی سے پوچھ رہا تھا۔

”کیا سلسلہ؟“

”یار مجھے اب اکیلے کمرے میں خفقان ہونے لگا ہے۔“ اس نے خاصی بے چارگی سے بتایا تھا۔

”فکر نہ کریں آپ کی والدہ محترمہ جلد ہی اس خفقان کو دور کرنے کا بندوبست کر دیں گی۔“

”ہیں؟“ سچ کہہ رہی ہو؟“ وہ خاصے اشتیاق سے پوچھنے لگا تھا۔

”ایویں ہی سبز باغ نہ دکھاؤ مجھے۔“ مسکراہٹ دیا کہ وہ مصنوعی بے اعتباری دکھانے لگا تھا۔

کوئی اور وقت ہو تو تاہم ساحر کے اس انداز کو انجوائے کرتی۔ مگر اب تو دل میں دھواں سا بھرنے لگا تھا۔ سو رخ موڑ کر یوں ہی ٹیبل پر پڑی کتابوں کی ناویدہ گرد کو صاف کرتے لگی۔

”آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟ نقصان تمہارا ہوا ہے تو خوشی میری بھی رائیگاں گئی ہے۔ پھر مجھ سے کیا ناراضی ہے تمہاری۔“ تھوڑی دیر انتظار کے بعد وہ خاصی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”کوئی ناراضی نہیں ہے میری۔“ وہ قطعیت سے بولی تھی۔

”تو پھر اس سلسلے کو کب ختم کرو گی؟“

”جب آپ چاہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”مطلب یہ کہ جب تک آپ مجھے یہاں سے نہیں جانے دیں گے یہ سب یوں ہی چلے گا۔“

”کیوں جاؤ گی تم یہاں سے؟“ وہ شکست خوردہ سا پوچھ رہا تھا۔

”اس لیے کہ مجھ میں مزید کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب مزید کچھ نہیں ہو گا۔“

”تمہارے ساتھ ظلم ہوا تو میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا، مجھے بھی دھوکا۔“

”آپ کو دھوکا ہوا ہو گا، مگر میں کسی دھوکے میں نہیں ہوں۔ میں حقیقت کا آئینہ دیکھ رہی ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ اب مجھے اکیلے ہی رہنا ہے۔“ خاصی تلخی سے کہہ کر وہ بیڈ پر جا بیٹھی تھی۔

”پلیز آپ جا میں یہاں سے اور یہ دروازہ بند کر جائے گا، مجھے نیند آرہی ہے۔“ یک دم ہی وہ سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ یہ گویا ایک طرح سے فرار تھا کہ اس کے سامنے جو شخص کھڑا تھا۔

وہ اس کے شکستہ انداز زیادہ دیر تک نہ دیکھ پاتی۔

اب سے چند ماہ پہلے جب وہ اسے روند کر خود کو سگریٹ کے دھوئیں میں جلاتا تھا تو اپنی چونوں کو سہلاتی حمزہ احمد کا دل اسے چھوڑ کر ساحر شاہ کے ساتھ جلنا شروع کر دیتا تھا۔ اسے خود سے زیادہ اس کی اذیت پر تکلیف ہوتی تھی۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ ایک بار پھر اس کی زندگی کا حصہ بن کر اسے کھونے کا حوصلہ نہیں



رکھتی تھی۔ نہ ہی اسے شیر کپاتی۔ اس کے خیال میں اب وہ ایک ایسا ڈنڈہ مند درخت تھی جس پر کوئی شاخ کوئی پھل پھول نہیں لگتا تھا۔ ساحر کی ماں — کوئی کمی کوئی خامی نہ ہونے کے باوجود اسے اس حال کو پہنچا سکتی تھیں تو پھر آئندہ کے لیے جلد یا بدیر۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ بند ہونے کی آواز پر وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دل پر اتنا بوجھ تھا کہ یوں لگ رہا تھا جیسے دل پھٹ جائے گا۔

اور غصے سے پیچ و تاب کھاتا ساحر سرگٹ سلگا کر ہیں لاؤنج میں صوفے پر دراز ہو گیا تھا۔ وہ اسے زبردستی صبح کرنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ بھلا وہ کب تک ناراض رہتی مگر جب سے حمزہ نے اپنی قیمت کا ذکر کیا تھا۔ تو اس کے دل میں کوئی ایسا احساس پیدا ہوا تھا کہ وہ اس پر بھرپور نظر ڈالنے سے بھی گریز کرتا تھا اور بات کرنے کے لیے بھی اس کے کمرے کے دروازے تک محدود رہتا اندر نہیں جاتا تھا۔

اندر سے آتی سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازیں اسے سنائی دیتے تھیں تو وہ گم سم سا ہو گیا تھا۔ کلر کار کے ہوٹل میں گزارنے والے چند روز میں جب حمزہ بے تکان بولتی تھی تو ساحر نے جان لیا تھا۔ زندگی میں در آنے والے اس اچانک موڑ نے اس کے باپ کی موت کا غم تازہ کر دیا ہے۔ اسے بھائی کی خود غرضی اور اس کے خون سفید ہونے کا بے حد ملال تھا۔ جواری سینٹ کے شہنشاہ سے بچ کر ساحر کا ساتھ ملنے پر وہ خود کھڑے کے بجائے کسی کھائی میں گرامحسوس کرتی تھی۔ مگر تین دن اس کے ساتھ سرکھپا کر اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ اس کی زندگی میں اور کوئی نہیں تھا۔

اور جب اس کا ساحر پر اعتبار لوٹنے لگا تھا تو جہاں اس کے رخساروں کی گلابیاں ساحر کو اپنی محبت کی گواہ لگتی تھیں۔ وہیں اس کی آنکھوں کی چمک میں ساحر کو اپنا آپ نظر آتا تھا۔ پہلی بات اسے بے حد خوشی دیتی تھی۔ دوسری بات اسے مطمئن کرتی۔ اسے خیال آتا حمزہ اس سے محبت کرے تو ٹھیک۔ ورنہ وہ اس کی ہو چکی تھی۔ یہ اس کے لیے کافی تھا۔ محبت کوئی احساس

نہیں ہوتی کہ بدلے میں محبت کی توقع رکھی جائے۔ وہ اسے دنیا کی ہر خوشی دینا چاہتا تھا۔ مگر اس لڑکی کی خوشیاں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اسے کسی ہوٹل میں کچن یا ڈنر کرنا اتنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ جتنا کہ اپنے کمرے کے باہر بیٹھ کر ساحر کے ساتھ چائے پینا اسے شاپنگ کرنا پورنگ لگتا تھا۔ سو اس کے لیے شاپنگ وہ خود ہی کرتا تھا۔ زیادہ گھومنے پھرنے کی وہ شوقین نہیں تھی۔ بقول اس کے وہ واپسی کے لیے انتظار کی کوفت میں جھلا ہو جاتی تھی۔ البتہ ساحر کے ساتھ چھوٹی موٹی گیدرنگز میں وہ خوشی خوشی جاتی تھی۔ سندس نے کئی مرتبہ اصرار کیا کہ وہ حمزہ کو ساتھ لے کر امریکہ آئے۔ مگر اس کے اصرار کے باوجود وہ انکار کر دیتی۔

”سندس پاکستان آئے گی تو مل لگی۔ مجھے تو اتنا لمبا سفر کرنے کا سن کر ہی تھکن ہو گئی ہے۔ ہنی مون پر مری جانے کے علاوہ وہ ایک مرتبہ اس کے ساتھ سنگاپور اور چند مرتبہ آؤٹ آف سٹی گئی تھی۔ وہ بھی اس کے شدید اصرار پر۔ شام کو اسے گھر سے قریبی پارک میں جانا بے حد اچھا لگتا تھا اور ساحر اس ایکٹوٹی میں اس کا ساتھ دینے کے لیے کئی مرتبہ اپنے ارجنٹ کام بھی اگلے دن پر چھوڑ دیتا تھا۔ وہ اس کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو جی جان سے پورا کرتا تو وہ حیران ہو جاتی۔

”آپ میری کسی بات سے اختلاف کیوں نہیں کرتے۔“ وہ پوچھنے لگتی۔

”من ننھی منی باتوں کو مان کر کون ان ایزی فیل کر سکتا ہے۔“ وہ ہنس کر جواب دیتا۔

”میں نے تو سنا ہے کہ عورتیں اپنے شوہروں سے بڑی بڑی ڈیمانڈز کرتی ہیں تمہارے دل میں کوئی ایسی۔“

”میں عورت ہوں؟ مگر صوفیہ بھابھی تو مجھے لڑکی کہتی ہیں اور ایاز بھائی تو کبھی کبھی مجھے بے بی بھی کہہ دیتے ہیں۔ آپ مجھے اس قدر مشکل کھینچوی میں کیوں کھڑا کر رہے ہیں؟“ اس کی بات کو ایک طرف پھینکتے ہوئے انتہائی رنجیدگی اور افسردگی کے تاثرات

چہرے پر لاتے ہوئے مصنوعی دکھ سے پوچھنے لگتی۔

”لی بی میں اس ایکٹنگ پر تمہیں پرائیڈ آف برقرار متس نہیں دینے والا۔“ وہ دل ہی دل میں محفوظ ہو کر اسے ٹوک دیتا۔

”کمال ہے یہ تم پر ایاز کا رنگ کیسے چڑھ گیا وہ بھی یوں بات کرنے کرتے پینتر بدل لیتا ہے۔ اچھا اب بتاؤ نا بیویاں اتنی فرمائشیں کرتی ہیں تمہارے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں ہوتی جو تم مجھ سے منوانے کی کوشش کرو۔“ اس نے ایک روز بہت اصرار سے پوچھا تھا۔

”اصل میں جب آپ میرے ساتھ ہوتے ہیں تو مجھے کچھ سوچنے کا وقت نہیں ملتا اور جب آپ آفس چلے جاتے ہیں تو میرا دھیان آپ کے آنے جانے کے حساب کتاب پر لگا رہتا ہے۔ اب ایسے میں میرے پاس کچھ اور سوچنے کا وقت کہاں؟“ بڑی سنجیدگی سے سنانے اچکا کر اس نے بتایا تو ساحر لا بروا تاثرات سے سچ سا وہ سے چہرے والی اس لڑکی کو دیکھتا چلا گیا۔ جس کی زندگی کا مرکز وہ خود تھا۔

چاہنے والے ہمیشہ چاہے جانے کی طلب رکھتے ہیں اور یہی ان کی فتح ہوتی ہے۔ مگر ساحر کا دل چاہتا ہے اس کی محبت کا اعتبار کرے۔ اس کی محبت حمزہ کا مان بنے اس کی محبت سے وہ زندگی کی ڈھیروں خوشیاں کشید کرے۔ یہی اس کی فتح ہوگی اور اس جیت کے چکر میں حمزہ کا دل اس کے گرد چمک پھیریاں کھانے لگا تھا۔ اس کا مشاہدہ تو یہی تھا کہ اگر کوئی نچلے طبقے کی عورت باحیثیت مرد سے شادی کرے تو اس کی دولت اڑانے اور دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ مگر یہاں معاملہ اس کے بالکل الٹ تھا۔ مرید پور میں نکاح پائے کے مندرجات پر کرتے ہوئے ایاز نے مہر کی رقم دس لاکھ لکھی تھی۔ شاید اسے حمزہ کے بھائی کا لاپچی انداز بہت برا لگا تھا اور دانستہ طور پر اس نے ازالہ کرنا چاہا تھا۔ تب پاس بیٹھے ساحر نے یوں ہی مذاق میں کہنا مار کر اس سے استفسار کیا تھا۔

”یہ ٹیکہ کیوں لگا رہا ہے؟“

”اصل میں تم اسپیشل قسم کے مریض ہو ایسے مریضوں کو ایسا انجکشن ضرور لگنا چاہیے۔“ اس نے ہنوز اسی کے انداز میں جواب دیا تھا۔ ہنی مون پر جانے سے پہلے جب ساحر نے حمزہ کا اکاؤنٹ کھلوانے کے لیے بینک فارم اسے سائن کرنے کے لیے دیا تھا۔ تو اس کے پوچھنے پر ساری بات من و عن ہنستے ہوئے بتائی تھی۔

”جھا تو آپ کو برا لگا تھا کہ ایاز بھائی نے اتنی رقم کیوں لکھی ہے۔ چلیں میں خود ہی ہاتھ جوڑ کر یہ رقم آپ کو معاف کرتی ہوں۔ آپ میرے ہیں یہ اطمینان میرے لیے کافی ہے۔“ وہ سکون سے کہتی ہوئی فارم ایک طرف رکھ کر اٹھ گئی تھی۔

”ارے نہیں بھئی اتنے بھی برے حالات نہیں۔“ وہ تو میں یوں ہی مذاق کا بتا رہا تھا۔ ورنہ تو اس روز مجھ سے کوئی جان بھی مانگ لیتا تو میں خوشی خوشی دے ڈالتا۔ تب ساحر کے اصرار پر اس نے سائن تو کر دیے تھے۔ مگر اپنے اکاؤنٹ نمبر بینک یا چیک بک کے بارے میں کوئی خبر نہ لی تھی اور ڈاکٹر صوفیہ کے کلینک میں جس طرح اس نے بات کی تھی اس سے ساحر کو لگا تھا کہ ٹینشن میں ہے۔ مگر شاید اسے بات یاد ہی نہ تھی۔ مگر جب وہ ڈاکٹر صوفیہ کے ساتھ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر آرہی تھی تو ساحر نے اسے چیک بک لا دی تھی۔ یہ سوچ کہ وہ خود بہت اکیلا محسوس کرتی تھی۔ کم از کم رقم کے معاملے میں خود کو فلاح محسوس نہ کرے۔

آفس میں جب پہلی مرتبہ وہ اس کے سامنے آئی تھی۔ تو اس کے باوقار انداز نے بلاشبہ ساحر کو چونکا دیا تھا۔ بعد میں اس کی یہ انرکیشن شدید محبت میں بدل گئی۔ مگر جب وہ اس کی زندگی میں شامل ہوئی تو ساحر نے جانا کہ جیسے وہ نظر آتی تھی اس سے کہیں زیادہ پیاری اور اچھی عادتوں کی مالک تھی۔ ایک بھر پور لکڑی لائف کا حصہ بن کر بھی اس کے زیادہ تر انداز وہی رہے۔ حتیٰ کہ لباس کے معاملے میں اس نے اپنا چولا بالکل نہیں بدلا تھا۔ پہلے کی طرح اس کا رفل تھی



یا بڑے بڑے پٹے پھیلا کر ہی لیا کرتی تھی اور یہ اس کا کوئی پوز نہیں تھا کہ اکثر یکن میں ٹیک پایا کے سامنے جاتے ہوئے بھی وہ سر کو ڈھانپ لیتی تھی۔ ساحر جب اپنے سرکل میں عورتوں کے آدھے ادھورے لباس دیکھتا تو بارہ اور باحیا بیوی کے ساتھ پر اسے فخر محسوس ہونے لگتا تھا۔

حزہ کی شخصیت میں کوئی جھول نہیں تھا۔ وہ تو کھلی کتاب کی مانند اس کے سامنے تھی۔ پھر وہ کیوں اس سازش کا اس قدر کامیابی سے شکار ہو گیا تھا؟ وقتی طور پر غصہ آنا ایک فطری اور لازمی بات تھی۔ مگر بعد میں وہ اس کی بات سن سکتا تھا۔ پھر؟

حزہ اپنے دل کی بھڑاس خوب نکال لینے کے بعد نماز پڑھ کر سو گئی تھی۔ مگر وہ بہت دیر تک وہیں بیٹھ کر گزرے وقت کے حساب کتاب میں الجھا پچھتاووں میں گھرا رہا تھا۔

\*\*\*

مسز شاہ مزید پانچ ماہ سندس کے پاس گزار کر واپس لوٹی تھیں۔ گھر واپس آکر پہلے تو انہیں اس بات سے حیرت ہوئی کہ ڈرائیور ریسیو کرنے آیا تھا۔ وہ سرا دھچکا گھر پہنچ کر اس وقت لگا جب نیک محمد نے انہیں بتایا کہ ساحر صاحب صرف مہینے کے شروع میں ملازمین کی تنخواہیں دینے آتے ہیں۔ فون پر تو بزنس کے بارے میں اور دیگر امور پر نارمل طریقے سے بات کرتا تھا۔ ہاں حمزہ کا ذکر اس کے بعد جان بوجھ کر انہوں نے کبھی نہیں جھیڑا تھا کہ اس گزرے قصبے سے انہیں کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ پھر ساحر خود ہی تو کہہ چکا تھا کہ وہ اس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تو بات ختم ہو چکی تھی۔ مگر اب گھر نہ آنے کا کیا جواز؟ حد تو یہ تھی کہ وہ ماں کی اتنے ماہ بعد واپسی پر بھی ان سے ملنے نہیں آیا تھا۔

انہیں صفراں پر شدید تاؤ آنے لگا۔ جس نے حمزہ کے جانے کا تو بتایا تھا، مگر ساحر کی اس روئین کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ خیر اتنا بڑا کام انہوں نے اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق انجام دے لیا تھا تو ساحر کب تک گھر

سے بے زار رہتا۔ مگر ساحر پر غصہ بھی آتا تھا۔ بھلا ایسا بھی کیا خود کو روگ لگا لیا ہے جو اس کے جانے کے بعد وہ گھر کا راستہ بھولنے لگا ہے۔ شاید اپنی زندگی سے اسے نکال کر پھینکا رہا ہے۔ انہوں نے دل ہی دل میں قیاس آرائی کی تھی۔ اب اسے لیلیٰ کے لیے منانے کا نسبتاً کم دشوار مرحلہ درپیش تھا، پھر تو اس جیسی ایکٹو اور تیز طرار لڑکی کا ساتھ پا کر ماضی کو خود بخود بھول جائے گا۔ انہوں نے ایک فیصلہ کرتے ہوئے خود کو تسلی دی تھی۔

\*\*\*

وقت کی گردش سے چند گھنٹے بعد وہ دن پلٹ کر آنے والا تھا۔ جب دو سال پہلے وہ مرید پور گیا تھا اور حمزہ احمد اس کی زندگی میں آئی تھی۔ وہ بہت دیر تک لاؤنج میں بلا مقصد ہی لائٹ آن کیے بغیر بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر ٹیرس پر چلا آیا تھا۔ سامنے والی بلڈنگ کے ایک فلیٹ پر کوئی فیکشن ہو رہا تھا۔ شاید کوئی ہندی وغیرہ کی تقریب تھی۔ کتنی دیر جگمگ کرتی روشنیوں کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ حمزہ بھی سرشام ہی اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے غافل ہو گئی تھی۔ ذہن کے سانے پر فینڈ نے غلبہ پانا شروع کیا۔ اٹھ کر بیڈ روم میں چلا آیا تھا اور پھر بہت دیر تک کروٹیں بدلتے کے بعد سونے میں کامیاب ہوا تھا۔

شدید پیاس کے احساس سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ لائٹ جانے کی وجہ سے کمرے کی کوننگ بھی خاصی کم تھی۔ موبائل کی لائٹ آن کر کے وہ پانی پینے کچن میں اٹھ آیا تھا۔ مگر واپس اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ٹھنک گیا تھا۔ پورا فلیٹ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ جبکہ حمزہ کے کمرے کے نیم دروازے سے نظر آنے والی مدھم روشنی بھلا کیسی تھی؟ اس نے آہستگی سے دروازے کو دھکیل کر کمرے میں جھانکا اور ساکت رہ گیا تھا۔ وہ صوفے پر دو نوں پاؤں چڑھائے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ساکت بیٹھی تھی اور اس کے سامنے اس کے سامنے ٹیبل پر کیک دھرا تھا۔ جس

کے اوپر جلتی دو موم بتیاں اپنا سفر تمام کرنے کو تھیں ساحر کو لگا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ اس نے بے اختیار موبائل کی اسکرین پر ٹائم دیکھا سوئیاں چار کے ہندسے کو کراس کر چکی تھیں گویا وہ ساری رات سے یونہی بیٹھی رہی تھی وائٹ شیٹون کے سفید سوٹ میں ملبوس اپنی اس سلبریشن کی وہ اکلوتی مہمان اور میزبان چہرے پر بے تحاشا اداسی اور حزن کا رنگ لیے اس وقت کوئی بھٹکی ہوئی روح لگ رہی تھی یا پھر پتھر کی کوئی مورتی جو صدیوں سے اسی زاویے سے رکھی کسی چاپ میں مگن ہو۔

وہ چند قدم آگے بڑھ کر صوفے پر اس کے قریب جا بیٹھا تو اس نے چونک کر نظریں اس کی سمیت اٹھائی تھیں۔ سرخ آنکھیں اور بھاری ہونے اس بات کے غماز تھے کہ وہ بہت روئی رہی تھی۔

”تم یا گل ہو گئی ہو کب تک مجھ سے اس طرح بدلہ لوگی۔“ ساحر کو شدید غصہ بھی آیا اور ترس بھی۔

”نہیں میں بدلہ نہیں لے رہی، میں ادھوری ہوں اور کوئی اس ادھورے پن میں حصہ دار نہیں بن سکتا۔“

”حمزہ میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں تم۔ تم تو میری زندگی ہو۔“ ایک جذب سے کہہ کر ساحر نے اسے خود سے لگایا تھا۔ اس کا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔ تب ہی موم کی کسی گڑیا کی مانند ذرا سا رخ میوڑنے پر اس کے شانے پر سر رکھ کر آنسو بہانے لگی تھی۔

”کھک کاٹیں؟“ مطلع قدرے صاف ہوا تو ساحر نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

”میں منہ دھو کر آتی ہوں۔ آپ کچن سے چھری لے آئیں۔“ پہلے تو اس نے ذرا شرارت سے اس کی آستین کی شرٹ سے آنکھیں صاف کیں اور پھر ہاتھ روم کی طرف مڑتے ہوئے مخاطب ہوئی تھی۔ درد ابھی بھی دل کا مین تھا، مگر اب وہ اس کی مجرم بن کر خدا کی گناہ گار نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی۔

\*\*\*

”بڑی دیر کی مہمان آتے آتے۔“ اس نے صوفیہ بھا بھی کا فون ملایا تو سلام دعا اور حال احوال کے بعد انہوں نے مصرعہ داغنا تھا۔

”کیا مطلب بھا بھی میں تو۔“

”مطلب کی بی بی! میرا تو دل چاہتا تھا کہ تمہیں جا کر دو چار ایسی ٹھوکوں کہ ہوش ٹھکانے آجائیں مگر ساحر ہر مرتبہ فیور کر جاتا تھا۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آئی کہ میرے دیور کے دل میں تم نے ایسا کون سا موم کا کلزافٹ کر دیا جو تمہارے لیے پکھلتا ہی رہتا ہے۔ ادھر تو یہ حال ہے کہ چوبیس گھنٹے مریضوں کا خیال رکھو اور صاحب کے معاملے میں ذرا کوتاہی ہو جائے تو دونوں منہ کے زواہیے ہی ٹھیک نہیں ہو پاتے۔ کوئی ٹوکنا مجھے بھی بتاؤ بھی۔“ یہ خراج تحسین گویا ساحر کو تھا سو اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔

”بھا بھی ایاز بھائی سے تو مجھے کچھ زیادہ امید نہیں تھی، مگر آپ نے بھی چیکنگ کی؟“ اس کا شکوہ ہنوز دل میں دبا تھا سو اظہار کر دیا۔

”کون سی چیکنگ؟ ہم نے دو مسلمانوں کے درمیان صلح کی کوشش کی اور مسلمان بھی کون؟ میاں بیوی! واہ! شیطان تمہارے سر پر سوار ہو کر تالیاں بیٹ رہا تھا اب ہم بردانت پیس رہا ہو گا۔“ انہوں نے خود کو داد دے کر اس کی بات کو چٹکیوں میں اڑا دیا تھا۔

”ویسے حمزہ! تمہیں ساحر سے اتنا لبا پگنا نہیں لینا چاہیے تھا۔ میرا تو دل ہوتا رہا تمہاری اس بے وقوفی پر۔“ آخر میں وہ قدرے سنجیدہ ہو کر اسے سمجھانے لگی تھی۔

”ہمارے اسٹاف کی بھی ڈیمانڈ تھی اور میرا بھی خیال تھا کہ اپنے گھر شفٹ ہونے کی خوشی میں ایک گیٹ ٹو گیدر رکھ لیتے ہیں، مگر ایاز کہنے لگے جب تک مسٹر اور مسز ساحر اکٹھے آنے پر راضی نہیں ہوتے تب تک نہیں۔“

”چھا! مگر میں تو ایاز بھائی سے ناراض ہوں۔“ ان کے خلوص پر شک نہیں تھا، مگر یونہی منہ سے نکل گیا۔

”تم جانو اور ایاز۔ ذرا کسی روز دن کے وقت



میرے پاس آنا میں نے تمہارے کچھ ٹیسٹ لینے ہیں۔  
”کیوں؟“ ڈاکٹر صوفیہ کے کہنے پر اس کا سانس رک گیا تھا۔

”بھئی میں چاہتی ہوں فائٹ سے دو چار بچے پیدا کر کے اپنی ساس کو دو۔۔۔ انہیں بتا تو چلے اس لڑکی کو اپنے بیٹے کی زندگی سے نکالنے کی انہوں نے کتنی کوشش کی ہے مگر قسمت۔۔۔“ حمزہ نے لرزتے ہاتھوں سے ٹھک سے فون بند کر دیا تھا اور وہیں بیٹھ کر آنسو بہانے لگی۔ کسی کو جلانے کے لیے نہیں دکھانے کے لیے نہیں اپنی زندگی کو آباد کرنے کے لیے کاش خدا مجھے صرف ایک دفعہ اس نعمت سے سرفراز کرے اب جب میں سب کچھ جانتی ہوں تو پھر اس لاحاصل کی امید میں کیوں بیٹوں؟

\*\*\*

”صوفیہ بھابھی کتنے دن سے تمہیں بلا رہی ہیں کیا پتلنا ہے؟“ چند روز بعد ڈاکٹر نیکم نیبل پر ساحر نے ذکر چھیڑا تو وہ ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔  
”کیا صوفیہ بھابھی نے میری طرح ساحر کو بھی لاعلم رکھا ہو گا؟“ اس نے بغور ساحر کے چہرے پر کچھ تلاشا چاہا تھا۔

”مجھے ہی وہ دونوں عقل سے پیدل سمجھتے ہیں۔ ساحر سے بھلا کیوں چھپاتے۔“ اس نے خود ہی جواب تلاشا تھا۔

”میں کل آفس سے جلدی گھر آؤں گا پھر چلیں گے۔“ اس کی خاموشی کے جواب میں وہ خود ہی کہنے لگا تھا۔

”نہیں مجھے نہیں جانا۔“ اس نے قطعیت سے انکار کر دیا تھا۔

”کیوں؟“ وہ حیران ہوا تھا۔  
”جب کہہ دیا مجھے نہیں جانا تو پھر نہیں جانا۔“ حمزہ نے در سے پلیٹ میں بیٹھے ہوئے وہ کرسی دھکیل کر اٹھی اور تقریباً دوڑتے ہوئے بیڈ روم میں بند ہو گئی تھی۔

ساحر کی حیران پریشان نظروں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ پچھلے چند ماہ فرسٹریشن کے نکال دیے جاتے تو حمزہ نے کبھی اس کے ساتھ اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ وہ خود سے الجھتے ہوئے بیڈ روم میں چلا آیا تھا۔  
”کیا ہوا ہے؟“ اس نے تکیے پر پیشانی ٹکائے حمزہ کا چہرہ سامنے کرنا چاہا تھا۔

”میں بہت پریشان ہوں مجھ سے بات نہیں کریں۔“ وہ تلخی سے کہہ کر رخ موڑ گئی۔  
”کوئی ریزن بھی ہو گا یا ر۔“ اس نے سمجھ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا تھا۔

”کوئی ریزن نہیں ہے پلیز آپ جا کر کھانا کھائیں۔“  
”اس قدر پریشان کر کے اب ٹھونسنے کا بھی آرڈر۔“ وہ بدترلاتے ہوئے اٹھ گیا تھا۔

”نیکم صاحبہ آپ کا شیف آپ کا سرونٹ کھانا لیے حاضر ہے۔“ تھوڑی دیر میں وہ کھانے کی ٹرے لیے اس کے سر پر کھڑا تھا۔

”آٹھ جاؤ ورنہ یہ ٹرے میں اپنے سر پر دے ماروں گا۔“ اس کے ٹس سے مس نہ ہونے پر دھمکی دی تھی۔

”دیکھیں نیکم صاحبہ آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں اتنی بے رخی نہ بریں بے شک میری آدمی تنخواہ کٹ لیں۔“ اس پر کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر اتنے مسکین انداز میں کہا کہ مصلحت سی مسکراہٹ لیے حمزہ کو اٹھنا پڑا تھا۔ اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے جی وہ بغور اس کا چہرہ جانچتا رہا۔

”اب میں سو جاؤں۔“ چند لقمے بمشکل لینے کے بعد اس نے جس طرح اجازت مانگی ساحر کو یوں لگا گویا اتنی دیر سے اس نے حمزہ کو باندھ رکھا تھا۔ سر ہلا کر وہ ٹرے اٹھا کر کچن میں رکھنے چلا گیا اور پھر اپنے لیے چائے کا گم لیے واپس آیا تو وہ سر سے پیر تک چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ بیڈ کے دوسری طرف نیم دراز چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے حمزہ کے روپ کو سوچے ہوئے اس نے ایک سرسری نظر اس کے سوتے ہوئے

رہو پر ڈالی جو ہلکے ہلکے جھٹکے کھا رہا تھا۔  
”گم سائیڈ نیبل پر رکھتے ہوئے اس نے ہاتھ بدھا کر چادر کو کھینچا اور گول مول کر کے صوفے پر اچھال دیا تھا۔

”رونا کس بات پر ہے؟“ وہ درشتی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ هنوز خاموش بیڑی رہی۔

”میں بہت پریشان ہو رہا ہوں۔“ ساحر اس پر جھک کر پوچھنے لگا۔ اسے یوں رونا دیکھ کر اس کے لہجے میں ملال اترنے لگا تھا۔

”کوئی بات نہیں ہے۔ بس یوں ہی دل بو جھل ہو رہا ہے۔“ اس نے پلکیں موند لی تھیں۔  
”دل بو جھل ہونے کی بھی کوئی وجہ ہوا کرتی ہے۔“ وہ سو گئی مگر ساحر بہت دیر تک اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے سوچتا رہا۔

\*\*\*

”ساحر! میں اتنی دیر سے کچھ کہو اس کر رہی ہوں۔“ مسز شاہ کے لہجے میں طیش در آیا تھا۔

”جی۔“ ساحر نے سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔

”کہاں دھکے کھاتے پھرتے ہو؟ گھر کیوں نہیں آتے۔“ اب کے انہوں نے قدرے نرمی سے کہا تھا۔

”ماما میں گھر میں رہتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔“ اس نے بہت ٹھنڈے ٹھار لہجے میں جواب دیا تھا۔

”کس کے گھر میں رہتے ہو؟ میں اپنے گھر کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ جھک کر کہہ رہی تھیں۔

”ماما گھر وہ ہوتا ہے جہاں انسان کی عزت محفوظ ہو اور میں جہاں رہ رہا ہوں وہاں میری عزت محفوظ ہے۔ لہذا میں اسی کو اپنا گھر سمجھتا ہوں۔“

”تمہاری باتیں میرے تو لیے نہیں پڑ رہیں، چلو میرے ساتھ گھر۔“ وہ قدرے ٹھنک کر نارمل ہوتے ہوئے پھر اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”آپ نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے۔ اس کے

بعد بھی اس بات کی گنجائش نکلتی ہے کیا؟“ وہ زیادہ دیر تک اپنا نارمل انداز برقرار نہ رکھ سکا سو بھڑک کر پوچھنے لگا تھا۔

”میں نے کیا کیا ہے بیٹا؟“ وہ از حد حیرت اور بھولہن سے پوچھ رہی تھیں۔ ساحر کچھ کہے بغیر اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”دکھ تو اس بات کا ہے ماما! آپ میری خوشی کا خیال نہ رکھتیں مگر آپ نے میری عزت کا بھی خیال نہیں کیا؟ وہ لڑکی جسے آپ نے ایک غیر شخص کے ساتھ سرگ پر تماشا بنایا، وہ آپ کے بیٹے کی بیوی تھی۔ اس کی نفرت میں آپ یہ بھی بھول گئی تھیں کیا؟“ اس نے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انتہائی دکھ بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا ساحر۔ وہ تو میں نے ایک آنکھوں دیکھی۔“

”ایک منٹ ماما پلیز۔“ ساحر نے استعزائے انداز میں ماں کو دیکھتے ہوئے موبائل کے بٹن پر پس کیے اور موبائل نیبل پر رکھ دیا تھا۔ مسز شاہ حق دق ہو کر موبائل سے ابھرنے والی آوازیں سن رہی تھیں۔ ان کا چہرہ ایک لحظے کے لیے تاریک پڑ گیا تھا۔ مگر اگلے بل ہی وہ خود کو سنبھال کر جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”میں نے جو کیا، ٹھیک کیا۔ وہ لڑکی جس کا نہ آکا نہ بیچیا اس قابل تھی کہ ہمارے خاندان کا حصہ بنتی۔ تمہاری بیوی کہلاتی صرف ولیمہ پر ہی میں نے لوگوں سے کیا کیا ہمانے بنائے تھے۔ اس کے پیرئس باہر گئے ہوئے ہیں۔ ساحر وہ لڑکی ہمارے اسٹیٹس سے بچ نہیں کرتی تھی۔ آخر کو یہ بات خود تمہارے نانچ میں ہونی چاہیے تھی۔ تم اتنے بدوقوف کب سے ہو گئے تھے کہ اس دو گنے کی لڑکی کو نکاح کر کے گھر لے آئے اور سر پر بٹھالیا۔ اسے تمہاری زندگی سے نکالنے کا میرے پاس یہی ایک آپشن رہ جاتا تھا۔“ وہ انتہائی ڈھٹائی سے کہہ رہی تھیں۔

”اوہ تو ولیمہ پر آپ بہت کلشس فیل کرتی رہی تھیں۔ مجھے بتائیں میں ریسپشن پر کھڑے ہو کر



لوگوں کو بتانا کہ میں اسے پانچ لاکھ کے عوض خرید کر لایا ہوں۔ کیونکہ وہ اتنی قیمتی تھی کہ مفت میں مل نہیں سکتی تھی۔ اس نے اطمینان سے ماں کو جواب دیا تھا۔ ”اچھا چھوڑو اس ذکر کو جو ہوا سو ہوا اب تو وہ لڑکی تمہاری زندگی سے جا چکی، لیکر پیٹنے کا کیا فائدہ اسے بھول جاؤ، میں تمہاری شادی لیلی سے کر رہی ہوں۔ اس کا ساتھ پا کر تمہیں یاد بھی نہیں رہے گا کہ کوئی حرمہ کبھی تمہاری زندگی میں آئی تھی۔“ انہوں نے ساحر کے ہاتھ کو محبت سے تھاما تھا اور ساحر الجھ کر ماں کا چہرہ دیکھنے لگا۔ (وہ تو ماما یہ سمجھ رہی ہیں کہ وہ میری زندگی سے جا چکی ہے۔)

”وہ آپ کے گھر سے جا چکی ہے، مگر میری زندگی سے نہیں، کیونکہ میری زندگی سے اور میرے دل سے حرمہ احمد کا جانا اتنا آسان نہیں ہے۔“ ساحر نے ماں کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا اور تیزی سے آفس سے نکلتا چلا گیا تھا۔

”کمال ہے، یہ ساحر تو بالکل پاگل ہو گیا ہے۔ وہ کلمہ ہی جا کر بھی اس کے دل و دماغ سے نکل نہیں رہی۔“ مسز شاہ نے اس کی بات کو دیوانے کی بریخیاں کرتے ہوئے قدرے پریشان ہو کر خود سے قیاس کیا تھا۔

\*\*\*

صبح سویرے ایک ماسی آئی تھی جو صفائی اور ناشتے کے بعد لڑکی بھی تیار کر جاتی، حرمہ کا موڈ ہوتا تو خود بھی کچھ نہ کچھ کبھی کبھار بنا لیتی تھی۔ ساحر آفس جانے کے بعد تیار ہو کر ڈائننگ ٹیبل پر آیا تو اسے سرو کر کے اپنے لیے سلاکس پر جیم لگایا اور بے دلی سے کھانے لگی تھی۔ طبیعت میں بھاری پن محسوس کر کے آدھ کھایا سلاکس پلیٹ میں واپس رکھا اور جوس لانے کا ارادہ کر کے اٹھی تھی۔ مگر اگلے ہی قدم پر کمرے کی ہر چیز گویا گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے ڈائننگ چیئر اور دوسرے ہاتھ سے ساحر کا بازو تھامنا چاہا، مگر کچھ بھی ڈھنگ سے ہاتھ نہ لگا تھا۔

”کیا ہے بھئی؟“ چائے کی چسکیاں لیتے اخبار پوری طرح منہ کے سامنے کھولے ساحر نے سرسری سا استفسار کر کے اس کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسے تھامنا چاہا، مگر تب تک وہ بندھال سی زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔ یکن سے یہ منظر دیکھتی ماسی بھی بھاگی آئی تھی۔ اس کی مدد سے وہ حرمہ کو بیڈ تک لایا اور بغور پریشانی سے دیکھنے لگا تھا۔

”آئی! ذرا ڈائننگ ٹیبل سے میرا موبائل لا دیں۔“ ماسی سے کہہ کر وہ پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ایاز لاؤنج میں بیٹھ کر لی دی کے چینل سرچ کرنے لگا تھا، جبکہ صوفیہ اس کے ساتھ روم میں تھی۔ اسے چیک کرنے کے بعد ڈاکٹر صوفیہ نے جو خبر سنائی وہ ساحر کے لیے بے انتہا خوشی کا باعث بنی، جبکہ حرمہ حیرت سے ساکت رہ گئی تھی۔

”کیا بات ہے؟ تم اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟“ صوفیہ نے اس کی حیرت بھانپ کر پوچھا تھا۔ ساحر لاؤنج میں جا چکا تھا۔

”مگر بھائی! آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔“ تھوک نلگتے ہوئے وہ بمشکل کہہ پائی تھی۔ اسے تو ڈر لگ رہا تھا کہ اس خواب سے کہیں آنکھ نہ کھل جائے۔

”میں نے کہا تھا؟ مگر کب؟“ صوفیہ کو اس سے بھی زیادہ حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

”جب میں آپ کے اسپتال میں ایڈمٹ ہوئی تھی۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ یا میری یادداشت اتنی کمزور ہو گئی ہے؟“ جواباً ”ترہ خاموش رہی۔“

”مگر ایسی کوئی بات ہوتی تو بھلا اب یہ خوش خبری تمہیں کہاں سے سننے کو ملتی۔“ ڈاکٹر صوفیہ نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھپکا تھا۔ ”میں نے اپنے روم میں دو زرسوں کو خوابات کرتے سنا تھا۔“

”وہ خدا لایا۔“ صوفیہ نے گویا سر پکڑ لیا تھا۔

”وہ کون سی منحوس زریں ہیں جو یوں انوا میں پھیلاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری رپورٹس آنے سے

پہلے میں نے ایسے کسی خدشے کا اظہار کیا ہو، مگر منڈر پرنسٹ کوئی بات ہوتی تو میں تمہیں اور ساحر کو اندھیرے میں کیوں رکھتی۔“

”اچھا۔ میں کبھی شاید مجھے پریشانی سے بچانے کے لیے آپ نے یہ بات نہیں بتائی۔“ اس نے اتنے عرصے سے دل میں رہی بات کو زبان دی تھی۔

”آئی تھنک میرے اتنی دفعہ بلانے پر بھی تم زیٹ منٹ کے لیے اسی لیے اسپتال نہیں آئی تھیں؟“ کچھ سوچ کر ڈاکٹر صوفیہ نے قیاس کیا تو اس نے سر ہلادیا تھا۔

”بے وقوف۔ میں تمہیں اس لیے بلاتی تھی کہ جب تم دوبارہ پریگنٹ ہو تو بیڈ ریسٹ کی نوٹ نہ آئے کچھ ایسی میڈیسن ہوتی ہیں جو ویک نیس تو ختم کر دیتی ہیں، بہر حال اب رہو بیڈ پر، جب تک تمہارے اسپتال میں کچھ ٹیسٹ نہیں ہو جاتے تب تک بیڈ سے چکی رہو۔“

”جیسے آپ کا حکم۔“ اس نے ہنس کر تابعدار لہجے میں کہا تھا۔

”ساحر، ایاز اور صوفیہ کو چھوڑنے کا ڈی تک گیا تھا۔ وہ پچھلے چند ماہ کو سوچنے لگی اور ساحر کے ساتھ اپنا رویہ یاد کر کے دل کو پشیمانی نے آن گھیرا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کتنا اچھا تھا۔ جبکہ وہ خود ایک غلط فہمی کو دل میں رکھ کر اس سے کس طرح لا تعلق ہو گئی تھی۔ ساحر کے واپس آنے تک آنکھوں میں دھند اترنے لگی تھی۔

”یار مجھے ایک اچھی سی مبارک باد دیں۔“ ساحر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے تھام کر نہ جانے کیا کہنے لگا تھا۔ مگر حیران ہو کر رک گیا۔

”خیریت۔ یہ بے موسم کی برسات کیوں؟“ اس نے تشویش سے پوچھا تھا۔ جواباً ”وہ اس سے لپٹ کر زور شور سے رونے لگی تھی۔“

”آہم سوری ساحر! میں نے آپ کے ساتھ بہت برا کیا نا۔ میں کتنا عرصہ آپ سے ناراض رہی۔ آپ کی بالکل پروا نہیں کرتی تھی۔ دراصل میں یہ سمجھتی رہی

کہ اب میں آپ کو کوئی خوشی نہیں دے پاؤں گی۔ اس لیے ہاسٹل میں جانے کا سوچ لیا تھا۔“ ساحر نے ایسی از خود وار فکری پر اسے مسکرائی نظروں سے دیکھا تھا۔

”یا اللہ اتنی چھوٹی موٹی سی بیوی کو چھوڑ کر گیا تھا۔ اتنی سی دیر میں اتنی بولڈ خاتون کہاں سے آگئیں۔ اللہ نے چھت پھاڑ کر دے دی۔ نہیں اوپر تو اتنی فیملی آباد ہیں۔ کھڑکی سے اندر پھینکا ہو گا۔ چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی۔“

”برے نہیں، میں بیڈ ریسٹ پر ہوں، پتا ہے ٹائیڈ ریسٹ کا کیا مطلب ہوتا ہے۔“

”یہی کہ اوہر اوہر منہ اٹھا کر پھرنے کی ضرورت نہیں۔ کمرے میں رہ کر مجھے اچھی سی کہنی دو۔“

”ہیں۔ میری تو کوئی کہنی نہیں ہے۔ نہ چائے بنانے والی نہ سگریٹ پانے والی نہ دوا یوں کی کہنی۔ آپ نے کہنی کے لالچ میں مجھ سے شادی کی ہے تو بھول جائیں۔ اگر میری کوئی کہنی ہوتی تو میں آپ کی طرح آفس نہ جاتی۔ گھر میں بیٹھ کر کھیاں کیوں مارتی۔“ اس نے بے حد حیران ہو کر جس طرح شرارتی انداز میں اسے ہری جھنڈی دکھائی، ساحر بے اختیار اسے دیکھتا چلا گیا۔ آج کتنے عرصے بعد پہلے والی حرمہ اسے دکھائی دی تھی۔ جو ہنستی مسکراتی باتوں باتوں میں چکروتی شاہاوس میں کسی تلی کی مانند پھرا کرتی تھی۔ ”تھینک گاؤ۔ پچھلے چار ماہ سے سوچ سوچ کر میرا دماغ دکنٹے لگا تھا کہ نہ جانے اس لڑکی کو ایسی کون سی بات پریشان رکھتی ہے جس کا وہ پتا نہیں دیتی یہ بات تھی تو مجھ سے شیر کیوں نہ کی۔“ ساحر ریلیکس ہو کر پوچھ رہا تھا۔

”مجھے لگتا تھا۔ میں آپ سے یہ بات کروں گی۔ تو آپ دو سری شادی کا ذکر چھیڑ دیں گے۔“ وہ چہرہ صاف کرتے ہوئے گویا ہوئی تھی۔

”یہ تو کون سا بڑی بات ہے۔ شادی تو بہت اچھی بات ہوتی ہے اور پھر ایک سے دو بھلے، تم نے وہ محاورہ نہیں سنا کیا؟“ ساحر کے اطمینان سے کہنے پر حرمہ نے



اسے گھورا اور اگلے پل ایک زوردار مکاس کے سینے پر دے مارا تھا۔

”آئے ہائے عین دل کے اور مارا ہے توڑ دیا میرا بیمار دل جس میں تم خود رہتی تھیں۔ اب رہو گی کہاں؟“ ٹان سینس لڑکی اپنا شیلو بھی کوئی تباہ کرتا ہے بھلا؟“ وہ لوٹ پوٹ ہو کر اسے کوٹنے لگا تھا۔

”اس شیلو میں کسی اور کو لانے کی خواہش پیدا ہوئی تو تباہ کر دوں گی مگر کسی اور کو گھسنے نہیں دوں گی۔“

حمرہ نے سخت تیوروں کے ساتھ آگاہ کیا تھا۔

”آج میں اتنی خوش ہوں ساحر مجھے سب کچھ بھول گیا ہے اپنی ساری پریشانیاں اور ساری تکلیفیں۔“ کچھ سوچ کر حمرہ نے سر ت کا اظہار کیا تھا۔

”تم بھول سکتی ہو مگر میں کبھی نہیں بھولوں گا اور خاص طور پر وہ جو مجھے خفقان کا مرض لاحق ہوا تھا میں سمجھا تھا تم اچھی پڑوسن کی طرح میری تیمارداری کرو گی۔ مگر تم نے تم نے جو کیا وہ میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ کبھی نہیں۔“ ساحر نے اس کے دوپٹے کا پلو گول مول کر کے زار و قطار آنسو پونچھتے ہوئے کسی پرانی فلم کی ہیروئن کا خاص لب و لہجہ اختیار کیا تھا۔

”آپ کو کچھ بھی بھولنے کی ضرورت نہیں ہے اور مجھے بھی بالکل پروا نہیں ہے۔ میرا ب مجھ پر اس قدر مہربان ہے تو۔“ حمرہ نے ٹپکے سے اپنا پلو کھینچ کر بے رخی دکھائی تو ساحر آنکھیں کھول کر حیرت سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

”مجازی خدا راضی نہ ہو تو خدا بھی ناراض ہو جاتا ہے بے وقوف لڑکی۔“ ساحر نے دانت پیس کر اسے ڈرانا چاہا تھا۔

”مگر مجھ سے تو خدا راضی ہے تب ہی اتنا مبارک اتنا خوب صورت دن دکھایا ہے۔“ حمرہ نے شانے اچکا کر کہا اور ریموٹ اٹھا کر پردے سمیٹ دے تو گلاس دعو سے باہر کا منظر نظر آنے لگا جہاں اوائل مئی کا تہنا سورج خاصا اور آچکا تھا۔ اس کی کرنیں کھڑکی کے شیشوں سے پھن پھن کر اندر آنے لگیں۔ مگر حمرہ کو یہ سب کچھ بہت بھلا لگ رہا تھا۔

”ماما یہ ساحر کب تک روٹھی حسینہ بنا بیٹھا رہے گا۔ میرے سسرال والے میرا سر کھا رہے ہیں۔“ سنبل ایک بار پھرتی ہوئی بیٹھی تھی۔

”بیٹا اسے سنہلنے کے لیے تھوڑا وقت تو چاہیے نا۔“ مسز شاہ نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔ درحقیقت وہ ساحر کے رویے سے خود بھی بہت پریشان تھیں۔ پہلے تو خیر انہیں زیادہ فکر نہیں تھی۔ مگر اپنی سازش کا پوٹ کھلنے کے بعد سے یہ پریشانی ضرور لاحق ہو گئی تھی کہ نہ جانے ساحر کھلی کے لیے ہاں کرتا ہے یا نہیں۔

”میں نے کنیزچی سے یہی بات کہی تھی۔ مگر وہ تو اگلا اعتراض کرنے لگیں کہ ساحر کوئی عورت تو ہے نہیں جس کے لیے طلاق کے بعد عدت پوری کرنا ضروری ہو۔“

”ان کی بات اپنی جگہ درست ہے مگر۔“

”مگر مگر کچھ نہیں ماما۔ بس آپ کسی طرح بھی ساحر کو منائیں۔ کوئی بیماری وغیرہ کا ڈرامہ کر لیں۔ کسی ڈاکٹر سے ملی بھگت کر کے دو چار روز اسپتال میں ایڈمٹ ہو جائیں تو خود ہی مجبور ہو جائے گا۔ میں نے تو کنیزچی سے کہہ دیا ہے وہ بے فکر ہو کر شادی کی تیاریاں کریں۔ اب ہم ساحر کو کہیں نہیں جانے دیں گے۔“

”آئیڈیا تو تمہارا بھی اچھا ہے مگر اس سے پہلے میں ایک دفعہ ڈاکٹر لایا ز اور اس کی بیوی کی خبر لینا چاہتی ہوں۔ وہی ساحر کو الٹی پٹیاں پڑھاتے ہیں۔“

”ماما جو بھی کرنا ہے جلدی کریں۔ بس اب مزید دیر نہیں کرنی۔ ورنہ یہ ساحر صاحب پھر رسیاں ترا جائیں گے۔“ سنبل پر کچھ زیادہ ہی غلجٹ سوار ہو رہی تھی۔

مسز شاہ نے اس کی بات پر سر ہلا کر ٹیلی فون اپنے قریب کھسکایا اور نمبر ملائے لگیں۔

”صوفیہ میں مرمیم شاہ بات کر رہی ہوں۔“ دوسری طرف ڈاکٹر صوفیہ ہی لائن پر تھی۔ سو خاصے روکھے پھکے انداز میں انہوں نے تعارف کروایا تھا۔

”جی آئی کیسی ہیں آپ؟“ صوفیہ نے خوش دلی

سے پوچھا تھا۔

”نہیں تو ٹھیک ہوں یہ تم اور تمہارے میاں کے ساتھ کیا براہم ہے۔ کیا چاہتے ہو تم لوگ؟“ ان کا سوال صوفیہ کو کھٹک جانے پر مجبور کر گیا تھا۔

”آئی آپ کو کوئی غلط فہمی۔“

”غلط فہمی؟ یہ غلط فہمی ہے کہ تم لوگ ساحر کو ہرکا رہے ہو۔ پہلے تمہارا شو ہر اسے پکڑ کر کلر کمار کے گیا اور اس کلروٹی کے متھے لگا دیا۔ اب بمشکل اس سے جان چھوٹی ہے تو۔“

”آئی ساحر کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے اپنا اچھا برا خود سمجھتا ہے۔“ صوفیہ نے تب کر ان کی بات کالی تھی۔

”اپنا اچھا برا خود سمجھتا ہے تو تم لوگوں نے اسے کھٹے سے کیوں لگا رکھا ہے۔“

”آئی امیں پھر کہوں گی کہ آپ کو کوئی غلط فہمی۔“

”کیسی غلط فہمی؟ پانچ مہینے سے تمہارے فلیٹ پر رہ رہا ہے کیا سمجھتے ہو تم لوگ؟ میں اس بات سے بے خبر ہوں۔“

”آئی ساحر نے وہ فلیٹ خود ہائر کیا ہے۔ ہم تو اپنے گھر شفٹ ہو چکے ہیں۔ ان ہی دنوں ساحر کوئی ریزیڈنس ہائر کرنا چاہ رہا تھا۔ کیونکہ حمرہ شاہ ہاؤس میں نہیں رہنا چاہتی تھی تو ساحر اس کے ساتھ اوپر شفٹ ہو گیا۔ ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”حمرہ کا وہاں کیا تعلق۔ وہ بھی۔ ساحر کے ساتھ رہ رہی ہے۔“ مسز شاہ کی زبان حیرت کی زیادتی سے لڑکھانے لگی تھی۔

”کمال کرتی ہیں آئی آپ؟ بیوی شوہر کے پاس ہو گی۔ شوہر بیوی کے ساتھ ہو گا۔ یہ کوئی پوچھنے والی بات ہے بھلا؟“ ڈاکٹر صوفیہ نے کمال انجان پن سے کام لے کر انہیں حقیقت سے روشناس کروایا تھا۔

اب کے لائن پر دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی۔

”اگر آپ اس بات سے واقف نہیں تھیں تو یقیناً اس بات سے بھی لاعلم ہوں گی کہ آپ وادی بننے والی ہیں۔“ ڈاکٹر صوفیہ کے کہنے پر انہوں نے کچھ

کہے بغیر ٹھک سے ریسیور رکھا اور بدحواس سے انداز میں سامنے بیٹھی سنبل کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”گیا ہوا ہے ماما؟ کیا کہہ رہی ہے صوفیہ؟“ انہیں سنبل کو یہ بتانے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ ان کی سازش کے سارے مہرے پٹ گئے تھے۔ ان کی فتح شکست میں بدل چکی تھی۔ سچ جھوٹ پر غالب آ گیا تھا کہ سچ کو جیتنا ہی ہوتا ہے۔

## ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
بساط دل	آمنہ ریاض	500/-
درد و موم	راحت جبین	750/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ گارعدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ گارعدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	500/-
حیرت نام کی شہرت	شازیہ چودھری	250/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
تکھڑا ہائیں خواب	آسیہ رزاقی	200/-
درد و کھدھی سمجائی سے	فوزیہ یاسین	250/-
اناموں کا چاند	ہتری سید	200/-
رنگ خوشبو ہوا بدل	انفاس آفریدی	500/-
درد کے قاسمے	رضیہ جمیل	500/-
آج عمن پر چاند نہیں	رضیہ جمیل	200/-
درد کی محزل	رضیہ جمیل	200/-
میرے دل میرے مسافر	حیم عمر قریشی	300/-
حیری راہ میں دل مگی	میمونہ خورشیدی	225/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	400/-

خواتین کے لیے نئی کتاب ایک خرچ 30/- روپے  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اندر بازار کراچی۔  
فون نمبر 32216361



فلٹیٹ کی اطلاعی کھنی بجی تو اس نے اندھا پھینٹ کر فرانگ پین میں ڈالتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور پتھرے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا تھا۔ تب ہی تیل ایک مرتبہ پھر بج اٹھی تھی۔ آنے والا ہوا کے گھوڑے پر سوار لگ رہا تھا۔

”آتا ہوں، بھی ڈرا صبر تو کرو۔“ آواز لگاتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا تو سامنے باقی کھڑا تھا۔

”باقی تم۔؟ اس وقت؟ میں ناشتا بنا رہا ہوں۔ کچن میں ہی آجاؤ۔ ایک کپ چائے کا مل جائے گا۔“ حاتم طائی کی قبر رلات مارتے ہوئے وہ واپس مڑا تھا۔ باقی نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور اگلے ہی لمحے وہ کی قیص کا کار اس کے ہاتھ میں تھا۔

”ارے۔ ارے یہ کیا کر رہے ہو؟“ وہی اس افتاد پر پوکھلا گیا تھا۔

”نکالو میرے تین لاکھ روپے۔ جن کی ڈیل میں نے تمہاری یقین دہانی پر کی تھی۔ اب تمہاری آٹی اور اس کی چلتر بجی نے مجھ کو جواب دے دیا ہے۔ پہلے وہ مکار عورت مجھے یہ کہہ کر رختانی رہی کہ اس کی ماں کو ایمر جنسی میں امریکہ جانا پڑ گیا ہے۔ واپس آئے گی تو۔ اور اب ان کا کہنا ہے کہ جب میں نے کوئی کام کیا ہی نہیں تو پیسے کس بات کے۔“ باقی نے مسلسل وہی کو جھنجھوڑتے ہوئے دو چار زوردار ہاتھ بھی جڑ دیے تھے۔

”باقی بات سنو میری، میری غلطی ہے میں تمہارے پیسے بھرنے کو تیار ہوں۔“ وہی نے اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے باقی کے ہاتھ پکڑ کر عاجزی سے کہا تھا۔

”جب لڑکی اس شہر میں موجود ہی نہیں تھی تو میں کہاں سے اٹھواتا اور پھر میں نے تیری آٹی کے۔ کو پچاس پچاس ہزار ایڈوانس دیے تھے۔ جنہیں میں اس کام کے لیے ساتھ لے کر گیا تھا۔“ باقی نے خاصی بھاری بھر کم کھلی کا استعمال کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ٹھیک ہے مجھے ان کی گارنٹی نہیں دینی چاہیے تھی اب میں تمہارا نقصان پورا کرنے کے لیے تیار

ہوں۔“ وہی دریا میں رہ کر مگر مجھ سے ہیر نہیں لینا چاہتا تھا سوزنی سے کہنے لگا۔

”صرف ایک لاکھ روپے نہیں، میں اپنی ڈیل کی پوری رقم ان ماں بیٹی سے وصول کروں گا اور وہ بھی سیدھے ہاتھ سے نہیں بلکہ اگلے ہاتھ سے۔“ باقی اس کی عاجزی دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

”تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہ لڑکی کون تھی جسے یہ دونوں عورتیں منظر عام سے ہٹانا چاہتی تھیں۔“ باقی کا دل غم جانے کس نقطے پر کام کر رہا تھا جو اس نے وہی سے تفصیل جانا چاہی۔

”وہ لڑکی مسز شاہ کی بہو تھی اس کے بیٹے نے اپنی مرضی کے خلاف اس سے شادی کی تھی اس کا تعلق غالباً ’لوئر کلاس‘۔“

”ایک منٹ۔“ باقی نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

”تمہیں کچھ چلنے کی بو آ رہی ہے؟“ اس نے زور زور سے سانس لیتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہی اٹھ کر کچن کی طرف بھاگا جہاں فرانگ پین میں اندھا جل کر دھواں ہو چکا تھا۔

”لوگ اتنے دالو کب سے ہو گئے کہ خود سے چل کر ہمیں ملنے آگئے۔“ علیزہ نے گلے لگاتے ہوئے اس کا ریتاک استقبال کیا تھا۔

سنیل کی اس سے ملاقات جم میں ہوئی تھی جو بعد ازاں اچھی دوستی میں بدل گئی تھی۔ علیزہ اس کے گھر کئی مرتبہ آچکی تھی۔ مگر اس کے بے حد اصرار کے باوجود وہ پہلی مرتبہ اس کے ہاں آئی تھی۔

”چلو میرے گھرے میں بیٹھتے ہیں تم کوئی مہمان تو نہیں ہو جو ڈرائنگ میں بٹھا کر تمہاری تواضع کی جائے۔“ وہ اسے اپنے بیڈ روم میں لے آئی تھی۔

”تم بیٹھو میں ریفریجیٹ کا بندوبست کر کے آتی ہوں۔“ سنیل نے وقت گزاری کے لیے ریک پر رکھا البم اٹھا لیا تھا۔ علیزہ ٹرائی دھکیلتی اندر آئی تو جوس کا ٹن اسے پکڑا کر خود بھی بیڈ پر بیٹھ کر اسے البم سے

متعارف کرانے لگی۔ بے دھیانی سے صفحے پلٹتے ہوئے سنیل کی نگاہ ایک تصویر پر جم کر رہ گئی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر علیزہ کو دیکھا اور دوبارہ تصویر پر جمادی تھی۔

”یہ میری بیسٹ فرینڈ اور (پڑوسی) نکلت کی تصویر ہے ہمارے بیٹے اور اس کی بیٹی کی برتھ ڈے ایک روز ہوئی ہے تو ہم آٹھ ہی سلیبس وٹ کر لیتے ہیں۔ دونوں بچے ایک کٹ رہے ہیں۔ یہ اس کے فرینڈ زبیر اور یہ نکلت۔“ سنیل کا جی چاہا وہ چیخ کر کہے یہ تو اس کا محبوب ہے اس کا شوہر۔ مگر اس کی ساکت نگاہیں صرف تصویر کو کھورتی رہیں۔ اس نے خوف زدہ سی نگاہ علیزہ پر ڈالی جو ابھی بھی کچھ کہہ رہی تھی۔ مگر سنیل کو اس کے ہلے ہونٹ دکھائی دے رہے تھے۔

\*\*\*

ہوٹل میں ایک چائیز ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ کچھ مشینری امپورٹ کرنے کے سلسلے میں ان کی میٹنگ تھی۔ ابھی میٹنگ ہونے میں کچھ وقت تھا سو وقت کا اندازہ کر کے اس نے نیو پیپر سامنے کیا اور سرخیوں پر نظر دوڑانے لگا تھا۔ جب اس کی ٹیمیل پر پڑے انٹر کام کی تیل بجی تھی۔

”پیس“ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تھا۔

”سر کوئی باقی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ میکسٹری فورین نے بتایا تھا۔

”باقی صاحب۔“ اس نے پرسوج انداز سے دہرایا۔

”سر وہ کہہ رہے ہیں کہ کوئی بزنس میٹر نہیں ہے۔ ایک چھوٹکی وہ کسی پرسنل ایٹو پر آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”اوکے بات کرو اور میں۔“ اگلے پل باقی لائن پر تھا۔

”ساحر اسپیکنگ فرمائیے۔“

”میرا نام فرمان باقی ہے میری مسز شاہ اور مسز زبیر سے ایک ڈیل ہوئی تھی۔ مگر کام ادھورا رہ جانے کی وجہ سے وہ مجھے بے منت کرنے سے انکار کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے یہی مناسب لگا کہ آپ سے بلیٹ کر لوں۔“ باقی نے انتہائی معصومیت سے اپنا مسئلہ

بیان کرنا شروع کیا تھا۔

”کیسی ڈیل؟“ ساحر حیران ہوا اور جواباً باقی اسے سب کچھ بتاتا چلا گیا جسے سن کر ساحر سن سا ہو گیا تھا۔ پھر اسے خیال آیا۔ آیا یہ وہی شخص ہے جس نے حمزہ کو گھر کے گیٹ پر ڈراپ کیا تھا۔

”آپ ایک منٹ ہو لڈ پکیجے میرے موبائل پر ارجنٹ کال آ رہی ہے۔“ باقی سے کہہ کر اس نے سعد کا نمبر ملایا اور اصل وہ اسے ٹریس کرنے کے لیے سعد کو الٹ کرنا چاہتا تھا مگر بد قسمتی سے سعد کا نمبر بڑی آ رہا تھا۔

”جی باقی صاحب کہیے۔“ اس نے دوسری لائن پر باقی بات کر لی چاہی مگر تب تک وہ فون رکھ چکا تھا۔

”یا خدا یا ماسکیل اس حد تک گر سکتی ہیں۔“ ذیل و ذہن الڈنی اذیت کی شدید لہر کو دباتے ہوئے جڑے بیچ کر کرشل ٹیمیل پر زوردار مکا دے مارا تھا۔ اس بات سے بے نیاز کہ کرشل کی کڑیاں اس کے ہاتھ کو لہولہاں کر دیں گی۔

”میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے چنی آنکھوں والے ہمارا انتظار نہیں کریں گے ہمیں ان سے پہلے پہنچنا ہے۔“ سعد بولتا ہوا آفس میں داخل ہوا۔

”ساحر یہ کیا ہوا ہے تمہیں؟“ اچانک اس کی نظر ساحر کے دیوانگی بھرے انداز اور خون سے آلودہ آستین پر پڑی تو وہ لپک کر اس کے پاس آیا تھا۔

”کچھ نہیں ہوا مجھے جاؤ تم یہاں سے لیو می الوں۔“ زور سے چیختے ہوئے اس نے سعد کا ہاتھ جھٹکا تھا۔

”پاگل ہو گئے ہو تم کیوں خود پر ظلم کر رہے ہو۔“ سعد نے چیخ کر جھولتے ہوئے ساحر کو دونوں کندھوں سے تھما اسٹنٹ میجر قریبی کسی کام سے اندر داخل ہوا تو اندر کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”اٹھو یہاں سے“ اوھر صوفے پر بیٹھو۔“ سعد نے زور دے کر کہا اور قریبی۔ کی مدد سے بمشکل اسے صوفے پر آنے پر رضامند کیا۔ کیونکہ جس طرح وہ



ریو الونگ چیئر پر جھول رہا تھا میں ممکن تھا کہ چیئر ہی الٹ جاتی۔

”ساحر تمہیں میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنا ہو گا تمہارے ہاتھ سے بہت خون بہ رہا ہے۔“ سعد نے چار پانچ ٹشو پپر اکٹھے اس کے ہاتھ پر رکھے جو چند سیکنڈوں میں ہی خود تر ہو گئے۔

”مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے تم لوگ جاؤ یہاں سے۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر اسے جھاڑ دیا تو سعد تیزی سے اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔

\*\*\*

وہ کافی دیر سے رائنگ چیئر پر مسلسل جھول رہی تھیں۔ اس نئی خبر نے ان کے دماغ کو بھی ماؤف کر کے رکھ دیا تھا۔ سسٹل ابھی ابھی روٹی ہوئی ان کے پاس سے گئی تھی۔ وہ مسلسل انہیں اور ساحر کو مود الزام ٹھہرا رہی تھی۔ اس کے خیال میں اگر وہ چاہتے تو اس کا گھر بجاسکتے تھے ان کی سوچ کا دائرہ ایک ہی سمت میں حرکت کر رہا تھا۔ کیا واقعی ان کا تصور تھا یا پھر اس کی قسمت کا؟ اگرچہ اس خبر کی مکمل تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ مگر تردید کا بھی کوئی پہلو نہیں نکھٹا تھا۔ موبائل کی بجٹی بیل پر انہوں نے دیکھا اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر چمک رہا تھا۔ انہوں نے کال اینڈ گئے بغیر موبائل آف کر دیا اور زیر کے متعلق پھر سے سوچنے لگیں۔ یہ سب کچھ تو بہت پہلے سے واضح تھا اپنے دوست کے ساتھ ریزیڈنس شیئر کرنے کا بہانہ، سسٹل کے اصرار کے باوجود مختلف جیلوں برائوں سے اسے ساتھ نہ رکھنا، پھر کراچی میں بزنس کرنا اس سب کے باوجود اگر سسٹل انجان رہی تو یہ تصور اسی کا تھا۔

”بیگم صاحبہ، بیگم صاحبہ“ صغرا کی بوکھلائی ہوئی بلند آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی اور پھر دھاڑ سے دروازہ کھلا تھا۔

”وہ دفتر سے کسی آدمی کا فون آیا ہے صاحب نے خود کو زخمی کر لیا ہے اور۔ اور۔“ صغرا کی آواز پھول گئی تھی۔

\*\*\*

گاڑی سے اتر کر تقریباً دوڑتے قدموں سے وہ آفس میں داخل ہوئیں اور اسی رفتار سے ساحر کے آفس کا دروازہ کھول کر اس کی طرف لپکی تھیں۔ جو صوفے پر بہت سی ہڈی ہال سے انداز میں ہم دراز تھا۔

”ساحر بیٹا یہ کیا ہوا ہے اور تم ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں۔“

”مگر کیا آپ کا بیٹا۔“ اس نے تنفر سے ان کا ہاتھ جھٹکا تو خون کے چھینٹے کا ربڑ اور صوفے کے سامنے پڑی کرشل ٹیبل پر جا گرے تھے۔

”مار دیا آپ نے اپنے بیٹے کو۔“ وہ رو رہا تھا۔

”میں واقعی آپ کا بیٹا ہوں؟ میں آپ کا بیٹا ہوتا تو آپ مجھے زندہ دفن کرنے کا پلان کرتیں؟“

”ساحر تم ڈاکٹر کے پاس چلو، تمہارے زخم کی ڈرننگ۔“ انہوں نے اس کا زخمی ہاتھ پکڑ کر کندھوں سے تھام لیا۔

”اتنے سے زخم سے نہیں مرنے والا میں۔ بہت کچھ سہ کر بھی زندہ ہوں۔ آپ کی بیٹیوں نے اپنی زندگی کے فیصلے اپنے مرضی سے کیے تھے میں نے ایسا کر لیا تو کیا جرم کیا؟ جو آپ اس حد تک چلی گئیں؟“

”ساحر بیٹا میں نے کچھ نہیں کیا تم۔ تم اٹھو ڈاکٹر کے پاس چلو۔“ انہوں نے راستے میں لایا زکو فون کر دیا تھا مگر نہ جانے کیوں وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ اگرچہ زخم اتنا بڑا نہیں تھا مگر شاید کرشل کا کوئی ٹکڑا کسی رنگ کو کاٹ گیا تھا ابھی اس کے ہاتھ سے بھل بھل بہتا خون لاسٹ بلو شرٹ کو داغ دار کرتا مسز شاہ کے دل کو وحشت زدہ کر رہا تھا۔

”مجھے چھوڑیں، باقی کو جا کر وہ قیمت ادا کریں جو آپ نے مجھے زندہ دفن کرنے کی طے کی تھی۔ ورنہ وہ خاندان کے تمام لوگوں سے فردا فردا رابطہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس کا کہنا ہے کہ اب وہ طارق پٹا اور زہیر بھائی سے بات کرے گا۔ کیا عزت رہ جائے گی آپ کی

بیٹی کی اس کے سسرال میں۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں جیوں یا مریں مگر آپ کو اپنی شکل زندگی بھر نہیں دکھاؤں گا اور اگر آپ میرے سامنے آئیں تو خود کو شوٹ کر لوں گا۔“ مسز شاہ کانپ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

\*\*\*

”آپ آج اس وقت کیسے آگئے؟“ کمرے میں ساحر کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی حمزہ کبل سے سر نکال کر پوچھنے لگی۔

”بس یوں ہی۔“ مختصر سا جواب دے کر وہ بیڈ کے دوسری طرف نیم دراز ہوا تھا البتہ زخمی ہاتھ اس نے پہلو میں لٹکا رکھا تھا تاکہ حمزہ کی اس پر نظر نہ پڑے۔

”ایاز بھائی آپ کے ساتھ آئے ہیں؟“

”ہوں!“ باہر سے ایاز کی آواز آرہی تھی۔ وہ شاید کچن میں ملازمہ سے کوئی بات کہہ رہا تھا۔

”یہ پیچھے۔ گرا گرم دودھ پئیں۔“ ایاز تھوڑی دیر بعد ڈرے سامنے رکھ کر کہہ رہا تھا۔

اپنے لیے چائے کا گگ لے کر وہ صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

”ساحر آپ کی شرٹ کہاں ہے۔“ حمزہ کو خیال آیا ہاف سلیوز بنیان کے اوپر سے اس کی شرٹ خائب ہے۔

”وہ میری شرٹ۔“ وہ قدرے گڑبڑا کر رک گیا تھا۔

”راستے میں مگن پوائنٹ پر ڈاکوؤں نے اتروالی ہے۔“ جواب اس کے بجائے ایاز نے دیا تو ساحر کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”ڈاکوؤں نے شرٹ اتروالی؟“ حمزہ نے حیرت سے ٹیبل پر پڑے ساحر کے موبائل اور والٹ کو دیکھا۔

”کیوں شرٹ کے ریشے کوئی سونے سے بنے ہوئے تھے۔“ ایاز کی بات بات میں مذاق کرنے والی طبیعت سے وہ اچھی طرح واقف تھی سو کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔

”اچھا ابھی میں تو چلا۔“ ایاز خالی مک ٹیبل پر رکھ کر

کھڑا ہو گیا۔

”حمزہ تمہیں یاد ہے ایک دفعہ تم نے سنگاپور میں مجھ سے کہا تھا کہ تم ہو مل کے بند کمرے میں پریشان نہیں ہو کم از کم محفوظ تو ہو؟“

”جی! اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”تم نے ایسا کیوں کہا تھا؟“ اس وقت جس بات پر وہ الجھا تھا اب تقریباً سمجھ آچکی تھی مگر پھر بھی پوچھنے لگا۔

”سسٹل آپلی جب بھی آتی تھیں میری طرف ایسے دیکھتی تھیں جیسے وہ میرے ساتھ کچھ کر گزریں گی۔“

”مثلاً؟“

”مجھے ایسے لگتا تھا جیسے وہ کچن میں گیس کھول کر مجھے زبردستی جلا دیں گی یا پھر ٹیرس سے نیچے پھینک دیں گی یا پھر۔ اچھا چھوڑیں نا اب گزری باتوں کا کیا ذکر۔“ حمزہ کسی سوچ سے ڈوب کر ابھرتے ہوئے نارمل انداز میں کہنے لگی تو ساحر خاموشی سے اسے دیکھتا چلا گیا تھا۔

”لڑکی جو اس کی محبت پر شریعت کی مہر لگنے کے بعد بھی تختی حواس باختہ رہی تھی۔ اگر اس کا واسطہ شاہ ہاؤس میں اپنے ہی گھر میں اپنے کمرے میں جرائم پیشہ مردوں سے بڑا تو اس کی کیا حالت ہوتی اور اگر وہ اسے اپنے ساتھ سنگاپور نہ لے جاتا تو آج یہ کہاں ہوتی؟

ساحر جبرے بھیج کر چشم تصور سے متوقع منظر دیکھ رہا تھا۔

”ساحر آپ مجھے اتنے غصے سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔“ حمزہ کو اس کی آنکھوں میں اس قدر طیش نظر آیا کہ وہ پریشان ہو گئی۔

”تمہیں میں تمہیں غصے سے نہیں دیکھ رہا۔“ وہ چونک کر سیدھا ہوا اور بے دھیانی میں ٹرے اٹھانے کے لیے وہ ہاتھ بڑھایا جو اتنی دیر سے چھپا رکھا تھا۔

”ساحر یہ۔ یہ آپ کے ہاتھ پر زخم کیسے آیا؟ کیا واقعی آپ کو راستے میں ڈاکو ملے تھے؟“ ساحر کا ٹوٹا بکھرا منظر سامنے انداز اور یہ زخمی ہاتھ، حمزہ خوف زدہ ہو کر اسے دیکھنے لگی تو ساحر کے ہونٹوں پر نفی میں سر ہلاتے



ہوئے پھینکی سی مسکراہٹ آگئی۔

\*\*\*

”یہ ساحر اتنی دیر سے کہاں غائب ہے؟“ کراؤں سے ٹپک لگائے وہ اپنے پہلو میں سوئے ننھے وجود میں گمن تھی۔ جب ڈاکٹر صوفیہ کی آواز نے اسے چونکایا تھا۔

”مسیح چھوڑ کر گئے ہیں کہ کنٹرول پر سائن مار کر کے آتا ہوں شاید سیدھا بھائی نے ایمر جنسی میں بلوایا ہے۔“

”نکما انسان آج اپنی مصروفیت کم نہیں کر سکتا تھا۔“ ڈاکٹر صوفیہ کو اعتراض ہوا۔

”تمہاری ساس شریف لارہی ہیں۔ انہیں میں نے مبارک باد کا فون کیا ہے۔“ کچھ سوچ کر صوفیہ اسے بتانے لگی۔

”انہوں نے مجھ سے ایک سفارش کی ہے کہ تمہیں اور ساحر کو گھر چلنے کے لیے رضامند کروں۔“

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ساحر سے بھی کہہ دوں گی۔“ وہ فوراً مان گئی تھی۔

”ارے واہ۔ چلو اچھا ہی ہے اب ان کے بھی سارے کس بل نکل چکے ہیں۔“ صوفیہ نے اس کی وسعت قلبی پر ہلکا سا دھچکا دیا۔

”بھابھی! آج میری فحش کا دن ہے اور فحش کے دن میں نے دشمنوں کو معاف کر دیا ہے۔ پھر میں سوچتی ہوں جب میرا رب مجھ پر اتنا مہربان ہے تو میں اس کی مخلوق سے بغض کیوں رکھوں؟ چاہے کسی نے میرے ساتھ برا ہی کیوں نہ کیا ہو۔“ حمزہ نے اپنی سوچ بیان کی تھی۔

”یہ بھی درست کہا تم نے؟ میں ذرا ساحر کا تو پتا کر لوں۔“ صوفیہ اسے کہہ کر کمرے سے نکلنے لگی تبھی ساحر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔

”بھابھی! میرا بیٹا کہاں ہے؟“ اس نے کمرے میں چاروں طرف یوں نظر دوڑائی جیسے بیٹا کہیں کھڑا ہوا نظر آجائے گا۔

”بھابھی! اتنا بڑا نہیں ہوا کہ بیٹا کہہ کر تمہارے گلے

لگ جائے۔“ صوفیہ نے اس کی ایکٹنگ پر ہنس کر اس کی کمر میں ایک دھوپ رسید کی تھی۔

”یہ تو بہت چھوٹا ہے۔“ بیڈ کے پاس آکر آریان پر جھک کر اسے پیار کرتے ڈاکٹر صوفیہ سے پوچھنے لگا تھا۔

”اچھا! جلد دن وارڈ سے تین چار سال کا بچہ لانا! تمہاری انگلی پکڑ کر گھر جا سکے گا اور مفت میں میرے اسپتال کی پبلٹی بھی ہو جائے گی۔“ صوفیہ کو اس کی حیرت پر ہنسی آگئی۔

”ہوں! آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن پولیس کے سامنے میرا نام تو نہیں لیں گی۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”ڈیور بھابھی حوالات کی سیرا کٹھے ہی کرتے جائیں گے۔“ نہیں، نہیں یہی ٹھیک ہے اس کو بڑا کر لیں گے کیوں حمزہ؟“ اس نے حمزہ سے رائے ڈالی تھی اور حمزہ بھلا کیا رائے دیتی بس ان کی ٹوک جھوک سختی مسکراتی رہی۔

”بے وقوف پیدائش کے وقت بچے اس سے بھی کم وزن کے ہوتے ہیں۔ تمہارا بیٹا تو ماشاء اللہ کافی صحت مند ہے۔“ ڈاکٹر صوفیہ اسے تسلی دے کر باہر چلی گئی تو وہ اسٹول کھینچ کر بیڈ کے پاس بیٹھ گیا۔

”سندس کو فون کیا آپ نے؟“ حمزہ نے پوچھا تھا۔

”صبح کروں گا اب تو وہاں آدھی رات ہوگی۔“ نہیں صبح وہ بہت ناراض ہوگی کہ اتنی دیر سے کیوں بتا رہے ہیں۔“ حمزہ کو اس کی عادتوں کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا سو فوراً کہنے لگی۔

”ساحر! لانا آ رہی ہیں؟“ حمزہ نے مسز شاہ کا ذکر چھیڑا تھا۔

”ہاں تو آئیں ناکس نے منع کیا ہے۔“ وہ آریان کی بند مٹھی کو کھولنے کی کوشش میں مصروف سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”اب ہم گھر جائیں گے؟“ ”ہم گھر سے آئے تھے گھر ہی جائیں گے۔“ وہ اس کی بات سمجھ کر بھی پہلو تھپی کر رہا تھا۔

”میرا مطلب ہے ہم شاہ باؤس جائیں گے مجھے اپنا

کمرہ بہت یاد آتا ہے۔ میرا اس فلیٹ میں بالکل دل نہیں۔“

”وہ جوتے یاد نہیں آتے جو وہاں تم نے کھائے تھے۔“ یکدم ہی وہ بھڑک اٹھا تھا۔

”دل چاہ رہا ہے کہ تمہارے منہ پر اتنے زور سے تھپڑ ماروں کہ آئندہ زندگی کے لیے تمہیں یہ سبق مل جائے کہ کوئی بھی بے تکی بات کرنے سے پہلے سوچا جاتا ہے۔“ حمزہ اس کے اس قدر شدید رد عمل پر حیران رہ گئی تھی۔

”ساحر جو ہوا اسے بھول۔“ ”پہلے جو کچھ ہوا تمہارے لیے کافی نہیں ہو گا مگر میرے لیے بہت ہے۔ تمہیں وہاں جانا ہے تو شوق سے جاؤ مگر میں اور میرا بیٹا وہاں ہرگز نہیں جائیں گے اسٹیوڈیو کی تمہیں میری زندگی سے نکالنے کے لیے۔“

”اگر آریان کو کوئی نقصان پہنچا تو؟“ ”لانا ایسا کیسے کر سکتی ہیں؟ آریان ان کا کچھ نہیں لگتا کیا؟“ حمزہ اس کی بات سن کر زور پڑ گئی بے ساختہ

ہی اس نے اپنا ایک ہاتھ آریان کے اوپریوں رکھا اسے فی الفور کوئی خطرہ درپیش ہو اور اس کی اس حرکت پر ساحر کو ہنسی تو بہت آئی مگر وہ ضبط کر گیا۔ اس کے ساتھ

اسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ اب اگر وہ حمزہ بی کے باؤس پکڑ کر بھی شاہ باؤس چلنے کو کہے تو وہ راضی نہیں ہوگی اور کلب تو دروازے کے باہر کھڑی مسز شاہ بھی گئی تھیں وہ خوشی خوشی پوتے کو دیکھنے آ رہی تھیں مگر اب ان کے قدم ڈگمگائے تھے۔

”مجھے کیا پتا وہ کیا کر سکتی ہیں اور کیا نہیں؟ مگر میں یہ جانتا ہوں کہ وہ بہت کچھ کر سکتی ہیں۔“ ساحر نے ہنوز جھڑپے میں جواب دیا تھا۔

”اچھا آج تو مجھ سے ناراض نہ ہوں۔“ حمزہ نے موضوع کو لپیٹتے ہوئے قدرے مسکین انداز اختیار کیا تھا۔

”کیوں آج تم باؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی کو ہاتھ لگا آئی ہو؟“ ساحر اس کے انداز پر مسکرایا تھا۔

”وہ بھی بھلا کوئی کام ہے۔“ حمزہ نے کندھے اچکا رہے۔

”یہ تم نے اسے سلا کیوں دیا ہے مجھے اس سے باتیں کرنی ہیں۔“

”میں نے خود اس سے بہت امپورٹنٹ میٹرز ڈسکس کرنے ہیں مگر یہ محترم لہجہ کرتے ہی خواب خرگوش کے مزے لینے لگے۔“ حمزہ کو ساحر کی بات پر بہت زور سے ہنسی آئی تھی۔

”میں اسے چگانے لگا ہوں۔“ ساحر نے چل کر اسے دھمکی دی تھی۔

”یہ روئے گا تو نہیں؟“ گلے بل وہ پوچھ رہا تھا۔ ”آپ اسے جگائیں تو۔“ میں پوچھتی ہوں اس سے کہ تم روئے گے تو نہیں؟“ حمزہ اس کی بے تابی پر ہنسنے ہوئے کہنے لگی تو ساحر اس کی آنکھوں میں چمکتی روشنیاں بغور دیکھتا چلا گیا۔

”کسی خوش نگاہ سی آنکھ نے یہ مجھ پہ کمال کرم کیا مری لوح جاں پہ رقم کیا

وہ جواک چاند ساحر تھا جواک شام سا نام تھا وہ اک پھول سی بات پھرتی تھی در بدر

اسے گلستان کا پتہ دیا میرا دل تھا کہ شہرِ مال اسے روشنی میں بسا دیا

مری آنکھ اور مرے خواب کو کسی ایک پل میں مرے آئینوں پہ جو گرو تھی مہ سال کی

وہ اتر گئی وہ خود دھند تھی میرے چار سو

وہ بکھر گئی سب ہی روپ عکس جمال کے

سب ہی خواب شام وصال کے جو غبارِ وقت میں سرسبز تھے اٹے ہوئے

وہ چمک گئے میری بے گہری کو پناہ دی

میری جستجو کو نشان دیا جو یسین سے بھی حسین ہے مجھے ایسا اگلا دیا

اسے ایک نظر میں بھم کیا کسی خوش نگاہ سی آنکھ نے

یہ مجھ پہ کمال کرم کیا





دستک دے کر صوفیہ اور ایاز اندر داخل ہوئے تھے۔

”آئیے ڈاکٹر صاحب ان سے ملے یہ ہیں ہمارے برخوردار آریان، مجھے یقین ہے انہیں آپ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوگی۔“ ایاز کے قریب آنے پر ساحر نے اسے استہول پیش کرتے ہوئے تعارف کرایا تھا۔

”غلط اندازے کا شکریہ میں ان سے مل چکا ہوں، میں نے ہی انہیں مسلمان گھرانے میں آمد کی خوش خبری دی تھی اور انہوں نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے آنکھیں مٹکا مٹکا کر پسندیدگی کا اظہار بھی کیا تھا۔“ ایاز نے اسے مفصل جواب دیا۔ تب ہی صوفیہ نے آریان کو اٹھا کر ایاز کی گود میں لا ڈالا تھا۔

”میرا خیال ہے یہ تم دونوں پر نہیں گیا، کچھ پیارا پیارا سا لگ رہا ہے میری طرح۔“ ایاز نے اسے احتیاط سے بازوؤں میں لے کر پیار کیا اور پھر معصومیت سے اظہار رائے کیا تھا۔

”دیکھو ڈاکٹر، تم اس کے ماما باا کی انسٹلٹ کر رہے ہو یہ تمہاری پٹائی کر دے گا مجھے تو لگتا ہے مکا مارنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔“ ساحر نے ذرا سا جھک کر آریان کی بند مٹھی کو کھولا جو پھر سے بند ہو چکی تھی۔

”صوفیہ ان بے چارے لوگوں کے لیے روم سیٹ کر دیا ہے؟“ ایاز اس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لا کر ڈاکٹر صوفیہ سے پوچھنے لگا تھا۔

”نہیں ایاز بھائی ہم اپنے گھر۔“

”کون سے اپنے گھر بی بی؟ تم لوگوں کا تو گھر ہے نہیں، کرائے کے فلیٹ میں دھکے کھاتے پھرتے ہو، اپنے ساتھ اتنے چھوٹے بچے کو بھی خوار کرو گے“ ایاز نے حمزہ کی بات کا ٹوٹی تھی۔

”اتنے چھوٹے بچے کی کیئر کرنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ اسے بھوک لگے گی تب بھی روئے گا پیاس لگے گی تب بھی کلن میں خارش ہو، سر میں جھجلی یا خدا نا خواستہ بیماری میں یہ صرف رو کر اظہار کر سکتا ہے

اور تمہیں کیا پتا چلے گا کیوں رو رہا ہے؟“

”وہ ایک آیا کا بندوبست۔“

”اتنے چھوٹے بچے کی دیکھ بھال آیا کرے گی۔“

تمہیں کیا پتا کہ وہ ٹھیک سے اسے سنبھال رہی ہے یا نہیں۔ چلو چند دن ادھر رہو، اگر ہمیں لگا کہ تمہیں ٹھیک سے بچے کو سنبھالنا آتا ہے تو گھر جانے کا شوق بھی پورا کر لیتا۔“ ایاز کے کہنے پر وہ خاموش رہی تھی۔

”صوفیہ آریان کے کمرے میں ڈیٹر آن کروں گا۔“ آریان اوپر آ رہے ہیں۔“ ڈاکٹر ایاز نے صوفیہ سے یوں کہا گویا بالی سب بھائیں میں جائیں۔

”حمزہ یہ بے ایمان ڈاکٹر تو ہمارے بچے پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا ہے اب ہم کیا کریں گے۔“ ساحر نے بے حد پریشانی سے استفسار کیا تو وہ مسکرا دی۔ ”مجھے آریان نے کسما کر آواز نکالی تھی۔“

”دیکھو ڈاکٹر قبضے، یہ بھی احتجاج کر رہا ہے ہمیں واپس کرو۔“ ساحر نے اسے وارن کیا۔

”نہیں میں اسے چپ کرالوں گا۔“ ایاز ہنستے ہوئے اٹھ کر باہر کی طرف چلا تھا۔

”حمزہ ہم بھی ان کے ساتھ چلتے ہیں موقع دیکھ کر نکل جائیں گے۔“ ساحر اس کے پیچھے لگا تھا۔

”آئیں میڈم میں آپ کو اوپر لے چلتی ہوں۔“ ڈاکٹر صوفیہ کے کہنے پر ایک نرس اسے لینے چلی آئی تھی۔



”کسی کے مقدر کا ستارہ کوچ کر کوئی دسرا اپنی زندگی کو تباہ کر کیسے کر سکتا ہے۔ وہ رحیم و کریم جو تقدیر لکھنے پر قادر ہے وہ رحیم و کریم جب کسی کی پیشانی پر کوئی تحریر کندہ کر دیتا ہے تو وہی اس لوح محفوظ کے سائے میں زندگی گزارتا ہے۔ پھر میں نے ایسا کیوں کیا؟“ پچھتاوے کے ساتھ واپسی کے سفر میں مسز شاہ خود ہی سوچ رہی تھیں۔ ”ساحر اگر اپنی خوشی سے حمزہ کو زندگی میں شامل کر بھی لایا تھا تو کیا ہوا اچھے کردار اور سچے اوصاف رکھنے والی پڑھی لکھی اور باشعور ان کی

آئندہ نسلوں کی ضامن بننے جا رہی تھی۔ دولت نہیں تو کیا ہوا؟ اس کے ہونے سے ساحر کی زندگی میں خوشیاں تھیں سکون تھا۔ اور میں نے اس کی خوشیوں کو کسے تاراج کیا۔ اس کی غیرت پر جوٹ لگا کر اس کے سکون کو تہہ و بالا کیا۔ صرف سنبھل کا گھر بنانے کی خاطر وہ گھر جس کی بنیاد بے حد کمزور تھی۔“

سنبھل کی شادی سے پہلے اڑنی اڑنی خبریں سننے میں آئی تھیں کہ زبردستی کسی کلاس فیلو سے شادی کا خواہاں ہے۔ سنبھل کے لیے کون سا رشتہ کی کمی تھی ٹمروہ زبیر کو گونا گونا نہیں چاہتی تھی۔ وقت نے فیصلہ کیا کہ سنبھل کا فیصلہ غلط تھا۔ اس کی بیٹی کی اسکو لنگ کلاس کو دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس نے سنبھل سے پہلے شادی کی تھی یا نکلت سے۔ اور جب سنبھل آدھی رات کو ماں کو فون کر کے اس بات کو ڈسکس کرتی تو ان کا دل چاہتا وہ اسے کسی سائیکالرسٹ کو دکھائیں۔ اپنی ادھوری سلطنت بچانے کے لیے ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر اب وہ بیرونی فقیروں کی طرف مائل ہو رہی تھی۔ گاڑی گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی بھی ان کے موبائل پر سندس کی کال بجنا شروع ہوئی اس وقت جب امریکہ میں آدھی رات تھی وہ انہیں کال کیوں کر رہی تھی یقیناً ”ساحر نے پردیس میں بیٹھی بہن کو اپنی خوشی میں شریک کیا تھا۔ ان کا دل مزید بوجھل ہوا۔ اندر کی طرف بڑھتے ہوئے انہوں نے نظروں سے عریض شاہ ہاؤس پر ڈالی۔ جانے کب ساحر لوٹ کر آئے۔ پتا نہیں یہ گھر بھی آباد بھی ہو گا یا نہیں۔ تھکے تھکے قدم اٹھائی وہ اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

وقت تین سال آگے سرگ گیا تھا۔ مسز شاہ کی آریان سے پہلی ملاقات تب ہوئی جب وہ چار ماہ کا ہو چکا تھا۔ ”سچہ عقیقے کی تقریب میں شامل ہونے کے لیے انہیں صوفیہ اور ایاز نے بار بار فون کیا مگر جب ساحر نے بی ماں کو یاد کرنا گوارہ نہیں کیا تو وہ اس کی خوشیوں میں حصہ دار ہونے کا دعوا کیونکر کرتیں؟ چند ماہ بعد سندس کاپا کستان آنا ہوا۔ وہ کچھ دن ساحر کے

پاس رہی۔ کبھی ان کے ساتھ رہنے چلی آئی اور تھوڑا وقت سنبھل کے ساتھ گزارا۔ ایک روز وہ حمزہ کے ساتھ آریان کو ان سے ملوانے چلی آئی۔

”ماما میں نے کہا جن لوگوں کا آپس میں جھگڑا ہے بے شک ناراض رہیں۔ مگر آریان کا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ سوائے تو میں اس کی دادی سے ملوانے جا رہی ہوں۔ بھابھی خود ہی تیار ہو گئیں۔“ آریان کو ان کی گود میں دیتے ہوئے سندس نے اپنا کارنامہ بیان کیا تھا۔

”تو کیا حمزہ اس لیے چلی آئی ہے کہ وہ آریان کو اکیلے نہیں بھیجنا چاہتی تھی۔ آریان کو پیار کرتے ہوئے ان کے ذہن کو کھٹکا ہوا تھا۔ ان کے جانے کے بعد بھی یہ سوال مسز شاہ کے ذہن میں کھلبلا رہا۔

”ساحر کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے؟“ اگرچہ یہ پوچھنے کی بات تو نہیں تھی کہ جس طرح سندس بار بار اس کی طرف چکر لگاتی تھی۔ یقیناً ”ان کا سلوک اچھا ہی ہوتا ہو گا۔ مگر ایک روز یہ سوال ان کی زبان پر آگیا تھا۔

”ماما میرے بھائی ہیں مجھ سے ان کا رویہ بدل سکتا ہے بھلا؟“ جواباً ”وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

”میرے ساتھ ان کا رویہ بیشک کی طرح ہے بہت لوہنگ بہت کیڑنگ۔ اور بھابھی ان سے بھی دو چار ہاتھ آگے ہیں۔ مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر آپ لوگوں کے درمیان ایسا کیا کلیش ہے جو میری سمجھ سے باہر ہے اور مجھے کوئی پتا نا بھی نہیں۔ خیر اب میں آئی ہوں تو بھائی کی خوب خبر لوں گی شرم نہیں آئی ماما کو اکیلا چھوڑ کر علیحدہ گھر بسائے بیٹھے ہیں۔“ وہ کچھ جوش سے کہہ رہی تھی۔ مگر جب دونوں گزار کر واپس آئی تو اس کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔ بلکہ وہ بے حد اچھی ہوئی بھی تھی۔ کئی بار بات کرتے کرتے رک کر ماں کا چہرہ دیکھنے لگتی۔

”ماما آپ کسی بات کو جانتی ہیں؟“ اس کے پوچھنے پر مسز شاہ ٹھٹک گئیں۔

”ماما پلیز بتائیں نا کیا آپ اس نام کے کسی شخص کو





جانتی ہیں۔ بھائی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ "مسز شاہ کے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہ تھا سو خاموشی سے نظریں چرا گئیں۔"

"ماما آئی کانٹ لی لیوٹ جب بھائی نے مجھے بتایا تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ مگر آپ کی خاموشی بتا رہی ہے کہ وہ غلط نہیں کہہ رہے۔ ماما آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اگر بھائی اپنی مرضی سے شادی نہ کرتے تو کیا ہوتا؟ زیادہ سے زیادہ یہی تاکہ آپ لپٹی کو ہوتا لائیں۔ اور چاچا کی فیملی تو کبھی ہم سے مخلص نہیں رہی۔ سنبل آپ کی زندگی کا انہوں نے کیا شکر کیا۔ حرہ بھابھی میں کون سی کی تھی بھلا کیا خامی تھی یہی کہہ وہ کسی بہت دہل آف فیملی سے لی لائنگ نہیں کرتی تھیں تو دولت کی ہمارے پاس کون سی کی تھی۔ بھائی نے اتنی مخلص اتنی اچھی لڑکی کا انتخاب کیا یہ ہماری زندگی کا پس پوائنٹ تھا۔ مگر آپ آپ کی بڑھائی پیٹیاں ہی اذیر کر رہیں۔ وہ اپنے لیے درست فیصلہ نہ کر سکیں۔ مگر اپنی سازشوں سے بھائی کو آپ سے اس قدر دور کر دیا کہ شاید وہ کبھی بھی لوٹ کر یہاں نہ آ سکیں۔" سندس بے حد افسوس سے کہتی چلی گئی اور ان کے دل کا بوجھ سوا ہوتا چلا گیا۔

پھر سندس کے جانے کے بعد انہوں نے وقفے وقفے سے تین چکر ساحر کی طرف لگائے دو مرتبہ تو وہ گھر پر موجود ہی نہیں تھا ایک دفعہ آتنا سامنا ہوا تو سلام اور مختصر حال احوال کے بعد کسی کام سے چلا گیا جس کے لیے وہ شاید پہلے سے ہی تیار کھڑا تھا۔

تکلیفوں کے ساتھ نیک لگائے بیٹھا تھا گڈا انہیں دیکھ کر غوغاں کرتا، مسکراتا، کبھی قہقاریاں مارتا، جب وہ اسے اٹھا کر بہار کرتیں تو غور سے ان کا چہرہ دیکھ کر انہیں پہچاننے کی کوشش کرتا۔ مسز شاہ کو یوں لگتا جیسے حرہ انہیں آریان کے پاس چھوڑ کر بھاگ کر کسی نہ کسی کام میں مگن دراصل ارد گردیوں چکراتی جیسے اسے آریان کے حوالے سے کوئی خدشہ ہو۔

تب پہلی بار انہیں غصہ نہیں آیا، اپنے لیے دکھ محسوس نہیں ہوا بلکہ اس پر ترس آیا تھا۔ دودھ کا جلا

چھانچہ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے جب وہ ایک مرتبہ اسے بہت محبت مانا اعتبار کے ساتھ بے خبری میں زک پنچا چکی تھیں تو وہ ان پر کیوں اعتبار کرتی اور وہ بھی اپنے جگر گوشے کے معاملے میں جبکہ ساحر اس کی توجہ اس طرف مبذول بھی کرا چکا تھا۔ اس کے بعد وہ بہت چاہنے کے باوجود بھی آریان سے ملنے نہ جاسکیں۔ کوئی فاصلہ نہ ہونے کے باوجود دوری کا احساس ہونے پر ان کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ یوں تین سال بیت چکے تھے۔

☆ ☆ ☆  
"مجھے ڈاکٹر صوفیہ سے ملنا ہے چیک اپ نہیں کروانا میں اس کی۔"

"جی آپ اندر چلی جائیں ڈاکٹر صوفیہ روم میں ہی ہیں۔" مریضوں کو ان کی باری پر بھیجتا وارڈووائے شاید انہیں پہچانتا تھا اس لیے اندر جانے کو کہہ دیا تھا۔ وہ معمول کے چیک اپ کے لیے ایاز سے فارغ ہو کر یونہی صوفیہ سے سلام دعا کرنے چلی آئی تھیں۔ مگر اندر داخل ہوتے ہی ایک غیر متوقع منظر دیکھ کر ٹھٹھکی گئیں۔

"یہاں درد ہو رہا ہے۔ اور (ادھر) درد ہو رہا ہے۔" ڈاکٹر صوفیہ کے پاس ایک چھوٹی سی چیئر پر براجمان تین سالہ آریان اپنے ساتھ نیبل پر پڑے بھالو کو ہانسیں دے چکے گر رہا تھا۔

"چھاتم رو نہیں میں تم کو چاکلیٹ دوں گا تم اچھے ہو جاؤ گے۔" آریان نے نیبل پر بڑے فتن باکس میں سے چاکلیٹ نکال کر رپر بھالو کے گلے میں اٹکایا اور چاکلیٹ خود کھانے لگا تھا۔

"بے ایمان ڈاکٹر۔" مسز شاہ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"میری ماما کہتی ہیں جو بچے دودھ پیتے ہیں وہ جلدی بڑے ہو جاتے ہیں۔" وہ چاکلیٹ کھاتے ہوئے اس سے مخاطب تھا۔ چاکلیٹ کھا کر دودھ کے فوائد گنوائے جا رہے تھے۔

"بھلا ڈاکٹر۔"

"آریان اب میں لکھ رہی ہو آپ بھی لکھو۔" ڈاکٹر صوفیہ مریضہ کے معائنے سے فارغ ہو کر حیزی سے پیڑ پر لکھتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ اس پر بات پر آریان نے نیبل سے کالی اٹھائی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اوپر کالی کو سیٹ کرنے لگا تھا۔

"آئی میں جی تمہیں لکھوں گا کالی پر نظر ڈال کر وہ منہ بسور کر کہہ رہا تھا۔

"جی" (G) نہیں لکھو گے تو ڈاکٹر کیسے بنو گے؟ ڈاکٹر بن کر تو "G" لکھنا پڑتا ہے۔

"میں آدمی رکھ لوں گا۔" گویا ڈاکٹر بن کر بھی "G" لکھنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

"آریان اب میں آپ کو ماروں گی۔" صوفیہ نے اسے دھمکی دی۔

"میں آپ کو سرج لگا دوں گا۔" آریان نے بھی جواباً "دودھ دھمکی دی تو جہاں ڈاکٹر صوفیہ کی بھلائی نہ تھی نگلی دیں مسز شاہ نے آگے بڑھ کر بٹنے ہوئے آریان کو گود میں اٹھالیا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے بھی؟"

"قرے آئی آپ۔" ڈاکٹر صوفیہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔ اس کے روم کی سیٹنگ کچھ اس طرح تھی کہ دروازہ بائیں ہاتھ پر ہونے کی وجہ سے اب تک ان پر نظر نہیں پڑ سکی تھی۔

"بیشخص پلین۔" پہلے میں آریان کی شرارتوں پر انجکشن لگانے کی دھمکی دیتی تھی۔ اب یہ سرج کا نام لے کر مجھے دھمکانے لگا ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر بننا سیکھ رہا ہے۔ کہتا ہے پڑھنا لکھنا کچھ نہیں ہے یوں ہی ڈاکٹر بننا سیکھ لے گا۔ اس کی بھی ہاؤس جاب چل نکلی ہے آج کل۔" آریان ان کی گود میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے اتنا معتبر بن کر بیٹھا تھا۔ گویا ہاؤس جاب کیا اسپیشلائزیشن بھی کر لیا ہو۔

"یہ تمہارے پاس ہوم ورک کرنے کیوں آتا ہے۔" مسز شاہ اس کے صوفیہ کے پاس اکیلے بیٹھنے پر کچھ حیران سی تھیں۔

"ویسے تو یہ ہمارے پاس رہنے کا عادی ہے۔ لیکن آج کل اس کی ماما آرام فرما رہی ہیں۔ آیا کے ہوتے ہوئے بھی یہ اسے بہت تنگ کرنا تھا۔ اپنے سارے کام اس سے کرواتا ہے تو میں نے ہی ساحر سے کہا کہ اسکول سے اسے یہاں چھوڑ جایا کرے۔ شام کو میں اور ایاز اسے چھوڑ آتے ہیں۔"

"اچھا تمہیں تو یہ بہت تنگ کرتا ہو گا۔ میں اسے ساتھ لے جاؤں فارغ ہو جاتی ہوں۔" بے ساختہ ہی ان کے منہ سے نکلا تھا۔

"کیوں نہیں آئی ویسے بھی اس کی وجہ سے میری سیٹ خطرے میں ہے۔ کل مجھے کہہ رہا تھا آپ میرے دوست کو چیک کریں۔ میں آپ والے لوگوں کو چیک کرتا ہوں۔" صوفیہ نے ان کے کنبے کی حسرت کو محسوس کر کے ہلکا پھلکا انداز اپنایا اور انٹرکام پر آریان کی آیا کو بلائے اور چائے پینے کا آرڈر دینے لگی۔

"آپ میرے ساتھ چلو گے۔ میں آپ کو چاکلیٹس لے کر دوں گی۔" بے لوث بھی لے کر جاؤں گی اور آپ کو G بھی نہیں لکھنا ہو گا۔ انہوں نے گود میں بیٹھے آریان کو مخاطب کیا تھا۔ وہ سر اٹھا کر کچھ کہے بغیر ان کا چہرہ دکھتا رہا۔ مریضوں کو دیکھنے کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے روک کر صوفیہ چائے پیتے ہوئے ان کے ساتھ گپ شپ کرتی رہی۔

"آریان منہ صاف کرو۔" صوفیہ نے ہاتھ بڑھا کر ٹشو پیپر نکالا اور آریان کی طرف بڑھایا تھا۔

"ارے صوفیہ۔" مسز شاہ کچھ ششدر سی اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"ماشاء اللہ۔ تم تو خود اتنی صحت مند ہو گئی ہو اتنی بڑی خوشی کی خبر مجھ سے کیوں چھپائی۔" سو ذرا سا اٹھنے پر انہیں صوفیہ کے سر اے میں تبدیلی کا احساس ہوا تو خوشی اور حیرت کی ملی جلی کیفیت میں پوچھنے لگی تھیں۔

"آئی میں ابھی آپ کو بتانے ہی والی تھی۔" وہ کچھ جھینپ کر کہہ رہی تھی۔

"تو بیٹا آپ کو بھی رسٹ کرنا چاہیے۔"

"آئی ابھی کافی ٹائم ہے اور پھر میری تو روٹین



ہے۔ ویسے ہم نے ایک نئی ڈاکٹر لپائنٹ کی ہے۔ اس لیے تو میرے پاس رش بہت کم ہے۔ میں نے ایک دن آپ کے پوتے کو بتایا کہ آپ کی بہن آئے گی۔ آپ اس سے ٹھیک کرنا پہلے تو پریشانی سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا ٹھیک ہے۔ میں اس کو شمندر میں پھینک آؤں گی۔ صوفیہ نے ہنستے ہوئے بتایا تھا۔ ”بے بی کرل کنفرم ہے؟“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

”نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو بیٹی کی خواہش ہے۔ پہلے مجھے تسلی دیا کرتے تھے کہ قسمت میں اولاد ہوگی تو اللہ کرم کر دے گا۔ مگر اب مجھے دھمکی دیتے ہیں بیٹی نہ ہوئی تو میں دوسری شادی کر لوں گا۔“ صوفیہ کی گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ لوگ کتنے خوش تھے۔

”میں تو کہتی ہوں میرا بیٹا تو ہے نا آریان۔ میرے دل کا ٹکڑا۔“ اس نے پیار بھری نظر آریان پر ڈالی تھی۔

”آئی آپ کے کان میں ایک بات بولوں۔“ آریان اپنی آیا کو ساتھ لے کر مسز شاہ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوا۔ پھر کنفیوڈ سارک گیا تھا۔

”ہاں بولیں۔“ صوفیہ ذرا سا جھکی۔

”یہ پکٹے (پکڑنے) والی آئی تو نہیں ہیں؟“ وہ اڑیاں اچکا کر اس کے کان کے پاس با آواز بلند سرگوشی کر کے پوچھ رہا تھا۔ ساتھ ہی مسز شاہ کو کنفیوڈ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”نہیں بیٹا بالکل بھی نہیں۔“ صوفیہ نے اس کا منہ چوم کر تردید کی۔

اصل میں ہم نے اسے بتایا ہوا ہے اسکول اندر یا باہر کسی بندے سے کوئی چیز لے کر نہیں کھانی اور نہ کسی دوسرے بندے کے ساتھ جاتا ہے۔ وہاں بچوں کو پکڑنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ مشکوک ہو رہا ہے۔“ صوفیہ نے انہیں بتایا تو ان کے ہونٹوں کی مسکان چھن گئی یہ فاصلے تو ان کے اپنے پیدا کر رہے تھے۔

بہر حال ڈاکٹر صوفیہ کے سمجھانے پر وہ اسے ہاتھ

ہلاتا ان کے ساتھ چلا تو مسز شاہ کی گویا عید ہو گئی تھی۔

”آریان! آریان بیٹا کیا کر رہے ہو؟“ ساحر نے ٹیس پر کھینچنے والے دروازے میں کھڑے ہو کر اسے پکارا۔ مگر وہ کوئی جواب دیے بغیر رنگ سے سرٹکا کر نہ جانے نیچے اندھیرے میں کیا تلاش کر رہا تھا۔

”آریان!“ ساحر نے پاس جا کر ایک مرتبہ پھر اپنی طرف متوجہ کیا۔

”پیلا آپ جیا کو نکال دیں۔“ اس نے شکایتی انداز میں اپنی آیا کی طرف اشارہ کیا جو اطمینان سے چیر پر بیٹھی تھی۔

”کیوں نکال دیں؟ یہ اس کا گھر نہیں ہے کیا؟ ایسے نہیں کہتے بیٹا۔“ ساحر نے اسے سرزنش کی۔

”پیلا یہ میری بال لے کر نہیں آئی۔“ اس نے نیچے کپاؤ بند کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”تو اس ٹائم تو میرے جیوں پر اندھیرا ہو گا۔“

”اور (ادھر) سے ہی لادے نا۔“ آریان نے ہاتھ سے خلا میں اشارہ کیا۔

”بیٹا آپ نے ابھی اسے اتنا جھگ نہیں کیا کہ یہ ادھر سے جا کر خود کشی کر لے اور یہ کھیلنے کا کون سا ٹائم ہے۔“

”سونا نہیں ہے کیا؟“ ساحر نے اسے اٹھا کر پیار کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

”میں ماما کے پاس سووں گا۔“ اس نے اقرار میں سر ہلایا تھا۔

”ٹھیک ہے“ آپ ماما کے پاس بالکل چپ کر کے سو گئے کوئی بات کوئی کھیل نہیں ہو گا۔“ ساحر نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے تنبیہ کی۔

”جیا آپ جا کر سو جاؤ“ میں اس گدھے کو سلا دوں گا۔“ اندر کی طرف جاتے ہوئے ساحر نے اس کی آیا کو مخاطب کیا تھا۔

”میں گدھا نہیں ہوں پیلا۔“ آریان نے ٹانگیں ہلا کر احتجاج کیا تھا۔

”ساحر آپ کو پتا ہے آج آریان کہاں گیا تھا؟“ حمزہ نے اپنے تئیں آریان کو سلاتے کے بعد مدھم آواز میں گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

”ہوں! بھابھی کا فون آیا تھا۔“ اس نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔

”پیلا میں بتاؤں؟“ آریان فوراً ”اٹھ بیٹھا۔“

”ساحر آپ کو اچھا لگا؟“

”نہیں۔“

”تو کیا برا لگا؟“ حمزہ نے پھر پوچھا۔

”نہیں۔“

”آئی“ آریان کو خود چھوڑنے آئی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ آئندہ اسکول سے لے جائیں گی اور شام کو پھر ورجیا کریں گی۔“

”لائٹ آف کرو ورنہ یہ سوئے گا نہیں۔“ نہ انکار نہ اقرار اس نے سپاٹ سے انداز میں بات ہی بدل دی۔

”ماما لائٹ آف نہیں کریں میں تو سو گیا ہوں۔“

آریان کی سرگوشی پر حمزہ کا سونچ بورڈ کی طرف بڑھتا ہاتھ رک گیا۔

سنبل پہلے پہل تو آریان کو ان کے پاس دیکھ کر بے حد حیران ہوئی مگر اس نے آریان کو مخاطب نہیں کیا۔

مسز شاہ کو محسوس تو ہوا مگر وہ عجیب سا سنگی طبیعت کی ہو چلی تھی۔ سوائے کچھ کہنا بھی مناسب نہیں تھا۔ ایک روز اس کے آنے پر مسز شاہ نیک مجھ کی غیر موجودگی کے باعث کچن میں چائے بنانے چلی گئیں۔ آریان وہیں ہوم ورک کر رہا تھا۔ اس کا ایک ریٹ باہر چلا گیا تو وہ اسے پکڑنے کے لیے باہر گیا۔ تھوڑی دیر میں واپس آیا تو سردی کے باعث کلن اور گال سرخ ہو رہے تھے۔

”آریان ادھر آؤ۔“ سنبل نے اے۔ پکارا۔

”جی آئی!“ وہ اس کے پاس آ گیا۔

”آپ باہر کیوں گئے تھے۔ باہر سردی نہیں ہے؟“

اس نے اولی ٹوپی کو کھینچ کر اس کے کان اندر کیے۔

”نہیں۔“ میری ماما کہتی ہیں باہر دھوپ ہوتی

ہے۔ دھوپ میں گرمی لگتی ہے۔“ اس نے چند ماہ پہلے کا ماما کا اقوال زریں سنایا تو سنبل کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

”آئی آپ روز ہمارے گھر کیوں آتی ہیں؟“ وہ خاصی لاپرواہی سے پوچھنے لگا۔ سنبل کے تصور میں یاد

کادروا ہوا اور اسے حمزہ کے ساتھ کی گئی گفتگو یاد آئی۔

”میں۔ میں روز اس لیے آتی ہوں بیٹا کہ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“ اس کی آنکھیں بھگ بھگ گئیں۔ شاید

اپنی زندگی کی محرومی پر تنہائی پر۔

”آج تو پھر پھوٹتے جتنے میں بڑی گپ ہو رہی ہے۔“

مسز شاہ نے چائے کی ٹرے سنبل پر رکھی۔

”ماما میں سوچ رہی ہوں۔ اللہ جب کسی پر اپنے کرم کی بارش برساتا ہے تو دوسرے اس پر کتنی ہی چھتریں

کیوں نہ تان لیں۔ اس بارش کے کتنے ہی رخ موڑ دیں۔ مگر وہ اپنے نصیب کی بارش میں بھگ کر رہی رہتا ہے۔“ سنبل کچھ آزدگی اور رشک کے طے جلتے جذبات سے کہہ رہی تھی۔

”یہ کرم تو اللہ نے مجھ پر کیا ہے تمہیں ایک بات بتاؤں سنبل آج کل میں اللہ سے لمبی عمر کی دعا کرنے لگی ہوں کہ جب میرا ننھا بیٹا بڑا ہو اس کی داڑھی

آئے اس کی مونچھیں آئیں اس کی شادی ہو تو یہ سب دیکھنے کے لیے زندہ رہوں۔“ انہوں نے آریان کے حوالے سے اپنے خواب بیان کیے۔

”ماما میں سمجھی آپ اسے بڑا آدمی۔“ سنبل ہنس کر اپنی بات مکمل کر رہی تھی۔

”دادو ان آئی نے آپ کو ماما کیوں بولا ہے۔“ پاس کھڑا آریان اچانک تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں بھی سنبل تم نے خواہ مخواہ مجھے ماما کیوں بولا ہے۔“ انہوں نے باز پرس کی۔

”معاف کر دیں۔“ غلطی ہو گئی۔“ سنبل نے

خاصی عاجزی سے جواب دیا تھا۔ مگر آریان کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ قبضہ سجا اور دعویٰ جھوٹا کے مصداق دادی کی گود میں بیٹھ گیا اور خاصی دیر تک کبھی اپنے کوٹ کے ہٹنوں سے کھیلتا کبھی ان کی سوئٹر کے بن گنتا اس

کے



آئی کے جانے کا انتظار کرتا رہا جو اس کی داد کو مانا کہہ رہی تھی۔

چند ہی روز میں ساحر کے ساتھ ان کے تعلقات میں ٹھنڈاؤ ختم ہو گیا تھا۔ مسز شاہ میں ننھے کھلونے کو باکر زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ انہوں نے اپنی سوشل ایکٹیویز کم کر دی تھیں۔ اگر کہیں جانا ہوتا تو آریان کو ساتھ لے کر جاتے ہوئے ان کے اندر فخر بھر جاتا تھا۔

اس کی غیر موجودگی میں ان کا دھیان لاشعوری طور پر آریان کی طرف رہتا۔ بے اختیار وہ اس کسی معصوم سی بات کو یاد کر کے مسکرا دیتیں۔ اپنے بچوں کے جو کام انہوں نے خود نہیں کیے تھے وہ اس کے اپنے ہاتھوں سے کر کے وہ بے تحاشا خوشی محسوس کرتیں۔ کبھی کبھار صوفیہ اور ایاز آریان سے ملنے آتے تو اس کی چھٹی باتوں کو دہرا کر انجولے کرتے تب مسز شاہ کے اندر احساس زیاں جاگنے لگتا۔ جب ان کا یہ شہزادہ پہلی دفعہ مسکرایا ہو گا اس نے پہلی بار کوئی لفظ ادا کیا ہو گا۔ وہ ان لحوں کی خوشی سے محروم کیوں رہیں؟ آریان کو چھوڑ کر واپس جانے لگتیں۔ تو وہ ہمانے ہمانے سے انہیں روکنے کی کوشش کرتا۔ دراصل اس کا معصوم ذہن یہ وضاحت نہیں کر پاتا تھا کہ وہ سب کے ساتھ رہنا چاہتا ہے اور جب وہ اس کی خواہش کو محسوس کر سکتی تھیں تو بھلا حمزہ اور ساحر کیسے انجان رہتے ہوں گے۔ ساحر آؤٹ آف شئی گیا ہوا تھا۔ وہ آریان کو چھوڑنے آئیں مگر اس کے اصرار پر رات وہیں رکنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حمزہ کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے انہوں نے اپنے گزشتہ رویے اور غلطیوں پر معذرت کی تھی۔

”آپ کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے ماما۔ میں سب کچھ بھول چکی ہوں۔ اللہ نے مجھے اتنی خوشیاں دی ہیں کہ مجھے کچھ یاد نہیں اور میں تو ساحر سے بھی کہتی ہوں کہ سب کچھ بھلا کو ہم پہلے کی طرح اکٹھے رہیں۔“ حمزہ کے کہنے پر ان کے سر سے کوئی بوجھ سرک گیا تھا۔ جب وہ اٹھ کر آریان کو سلائے اس کے کمرے میں چلی گئیں تو حمزہ نے انہیں جاتے دیکھ کر

سوچا تھا۔ ”میں کیسے بھول سکتی ہوں؟ وہ بے بسی دیکھ کر وہ ذلت میرے کردار پر اس وقت بھی کوئی چھینٹا نہیں پڑا۔ جب میں کمانے کے لیے سنسان رستوں پر چلا کرتی تھی اور آپ نے مجھے محفوظ سائین سے نکال کر میرے کردار پر کس طرح تہمت دھردی۔ میرے سر سے آسمان اور میرے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔ مگر جب بھی مجھ پر کوئی مصیبت آئی تو میرے رب کی مدد نے مجھے تھام لیا۔ اس نے مجھ پر اتنا احسان کیے اتنے کرم کیے کہ میں اس کے احسانوں کا شکر بجالانے کے قابل نہیں ہوں۔ اس نے مجھے آریان دیا۔ میں ساری عمر بھی سجدہ شکر۔ بچا لاؤں تو آریان کے بدلے برابر بھی شکر ادا نہ کر سکوں اور جب میں جانتی تھی کہ اس کے احسان اس کا کرم بہت بڑا ہے اور میرا سب شکر بہت چھوٹا بہت کم اور بہت مختصر ہے تو میں یہ تو کر سکتی ہوں۔ ان کے ساتھ اچھا کروں جنہوں نے میرے ساتھ بڑا کیا تو میرے رب کے نزدیک میرا یہ عمل یقیناً زیادہ پسندیدہ ہو گا۔ وہ سب مجھے اس لیے بھی بھلا دینا ہو گا کہ میں نہیں چاہتی کہ میرا شوہر ماں کا نافرمان ہو کر صرف دنیا کی کامیابی کا حصہ دار بنے۔ میرے رب نے میرا دامن خوشیوں سے بھر کر میرے ساتھ انصاف تو کر دیا ہے۔ وہ بہتر حساب کرنے والے انصاف کرنے والے ہیں۔“

آریان کو تھکتے ہوئے مسز شاہ سوچ رہی تھیں۔ جو کچھ میں نے کیا بے شک غلط تھا۔ مگر اب جدالی کی طویل سزا کاٹ چکی۔ ان شاء اللہ اب نئے مہمان کا عقیدہ شاہ ہاؤس میں ہی ہو گا۔ چاہے مجھے ساحر کی کتنی ہی منت کیوں نہ کرنی پڑے۔ آخر کار وہاں ہی جائے گا کہ اس کے پیچھے کوئی ہرکانے والا ہاتھ نہیں ہے۔ ”دادو میں کرکٹ کھیلوں گا۔“ آریان اپنے موجودہ کھیل سے کچھ بے زار ہو کر کہہ رہا تھا۔ ”تو ٹھیک ہے میرا بیٹا کرکٹ کھیل لے۔“ انہوں نے پیار سے اسے اجازت دی وہ کمرے میں جا کر بیٹ اور بال اٹھالایا تھا۔

”میں جو کیدار سے کہتی ہوں۔ وہ آپ کے ساتھ کرکٹ کھیلے گا۔“ ”سنس میں آپ کے ساتھ کرکٹ کھیلوں گا۔“ اس نے اطمینان سے فرمائش کی۔ نہ انہیں بیٹنگ کرنا آتی تھی نہ ہی آریان کو ٹھیک سے بالنگ کرنا آتی تھی مگر کھیل کامیابی سے جاری رہا۔ اگرچہ بیٹ اور بال پلاسٹک کے تھے مگر انہوں نے یہ سوچ کر بیٹنگ کرنا اپنے ذمہ لی کہ کہیں بال آریان کو نہ لگ جائے۔ مگر آریان بال پھینک کر کتنی گن رہا تھا۔ غالباً وہ اس طرح اپنے رنز گن رہا تھا۔ گیٹ سے گاڑی اندر آنے کی آواز آئی۔ مگر سنبھل کا خیال کر کے انہوں نے توجہ نہیں دی۔ بال کبھی مشرق تو کبھی مغرب کو جا رہی تھی۔ وہ ایک جگہ بیٹ ٹھونک کر اسے دن میں شو کرنا دیکھ رہی تھیں۔

”دادو آپ کھیل نہیں رہیں؟“ ایک دو مرتبہ بھاگ کر بال اٹھاتے ہوئے اس نے پوچھا بھی۔ ”بیٹا کھیل تو رہی ہوں۔“ انہوں نے بیٹ ہوا میں لہرایا اور لان کا تنقیدی جائزہ لینے لگیں۔ ”دادو میں جیتوں گا کب؟“ بھاگ بھاگ کر خود ساختہ رنز کرتے آریان نے پوچھا۔ یعنی یہ بھی پہلے سے طے ہو چکا تھا کہ جیتنا بھی اسی نے ہے۔ ”جب آپ کی کاؤٹنگ پوری ہو جائے گی۔“ انہوں نے مسکرت جواب دیا۔

”دادو میں جیت گیا۔ میں جیت گیا۔“ ففٹی تک رنز بنا کر وہ بھاگ کر ان کے پاس آیا اور گلے لگ گیا تھا۔ یوں اس احقانہ بیچ کا اختتام ہوا۔ ”آپ کو کس نے بتایا کہ جیتنے کے بعد گلے ملتے ہیں۔“

”نکلنے سے۔“ اس نے خوش ہو کر بتایا تھا۔ ”ماما۔“ ان کے کندھے سے پرے آریان کی نظر بڑی تڑپ چلائی تھا۔ مسز شاہ نے مڑ کر دیکھا اور سرشار ہو گئیں۔ لاؤنج کے اس طرف کھلنے والے دروازے کے باہر حمزہ اور ساحر کھڑے تھے۔ ”شیطان نیچے آپ نے دادو کو ہرا دیا شرم نہیں

آئی۔“ آریان بھاگ کر ان کے پاس گیا تو ساحر نے اسے پیار کرتے ہوئے شرم دلائی۔ ”ننھی بیٹا میں جیت گیا ہوں۔“ آریان کو اس بات سے غرض نہیں تھی کہ ہارا کون۔ ”آج میرے بچے اپنے گھر کا راستہ کیسے بھول گئے۔“ مسز شاہ نے ساحر کے بال بکھیرے۔ ”ماما۔ حمزہ کا آؤٹنگ کا موڈ ہو رہا تھا تو اس نے آپ کو اور آریان کو سر پر اتار دینے کا پروگرام بنالیا۔“ ”پاپا میں آپ کو اندر لے چلوں۔“ آریان اچھا میزبان ثابت ہو رہا تھا۔

”ہاں یا۔ ضرور۔“ درندہ پھر کہیں راستہ بھول کر گیٹ کی طرف نہ نکل جائیں۔“ ساحر نے اسے رہنمائی کا پورا موقع دیا۔ ”ماما اندر چلیں۔“ ان دونوں کو اندر کی طرف جاتے دیکھ کر حمزہ مسز شاہ کی طرف متوجہ ہوئی تو بھیگی آنکھوں میں ڈھیروں تشکر لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ”تم بہت اچھی ہو حمزہ تمہارا طرف بہت بڑا ہے۔“ انہوں نے سچے دل سے تعریف کی۔ ”ماما میں سوچتی ہوں۔ میں آریان سے دور نہیں رہ سکتی تو کوئی بھی ماں اپنے بیٹے سے کیوں دور رہے۔“ ”تمہارا گھر اجاڑنے کی ہر کوشش کرتے ہوئے میں نے ایسا کیوں نہیں سوچا تھا؟“ مسز شاہ کے دل میں ڈھیروں ملال جاگا۔

”میری دعا ہے رب تمہیں ڈھیروں خوشیاں عطا کرے۔ تمہیں ہمیشہ اس گھر میں آباد رکھے۔ تم رانی بن کر یہاں راج کرو۔“ ”اس گھر کی مالک نہ ہوگی جو میری مرضی سے آئے گی۔ میں تمہیں دوسرے شرمیٹل کروا دوں گی۔ کوئی نیا بڑھونڈ لیتا۔“ کہہ کر بڑے تنفر اور یقین کے ساتھ اس کی تقدیر اپنے ہاتھ سے لکھنے والی مسز شاہ آج اس کی خوشیوں کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا کو بھیج رہی تھیں۔ حمزہ مسکرا کر ان کے قریب ہوئی تو انہوں نے اسے گلے لگاتے ہوئے بہت محبت اور خلوص کے ساتھ اس کی پیشانی چوم لی تھی۔



## حرف در حرف

جڈلوں کی دلیز پر گہری اپنے اطراف بٹھری ان پھولوں کو رنگ و بو کے ساتھ دیکھ رہی تھی جو اس کے دل کے گلشن میں ارحم کی محبت لگا گئی تھی۔ وہ مکی کلیں کو ہاتھوں میں لیے دیکھ رہی تھی جو اب پھول بن گئی تھیں۔

وہ ان کلیوں کے سرہانے پر سر رکھے ان پھولوں کی طرح مسکرا رہی تھی وہ اس کٹنی کو بھولنے کی کوشش میں تھی جو اس کے ارحم کے بچ پیدا ہو گئی تھی۔

سرست ہو اُنیں، خوشگوار جھونکے، بارش کی بوندیں کالی گھٹائیں بھی اس کی اندر کی کم کرنے میں معاون ثابت نہیں ہو رہی تھیں۔ اس کی سوچوں کی میساکھی ٹوٹی اور وہ پھر سے جوڑ لیتی۔ پھر اس کے ہاتھ سے پھسلتی اور دور جا گرتی۔ جیسے چکنے فرش پر تیل بکھر کر بہا چلا جاتا ہے۔

کوئی شریں سی بوند اس کے اوپر گرتی اور وہ خود میں بگدلی گرتی گزر جاتی۔ وہ بے ساختہ ہاتھوں میں چھو چھپا کر بننے لگتی۔ عجیب سے احساس نے اس کے اندر سر اٹھایا پھر جیسے اس کے خیالوں کو چھینتا ہوا گزر گیا۔

”زارش تم نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟“ ارحم کے جھلے کی گونج بوندوں کی طرح ٹپ ٹپ گونجنے لگی۔ اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سچ موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کے اندر کی ایک دم شریں سی بچی جاگ اُٹھی۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں نے اپنے آپ سے محبت کی ہے۔ ہر خوب صورت چیز مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے جیسے۔“

”جیسے میں۔؟“ ارحم نے پوچھا۔

”نہیں۔ ابھی میری پوری بات سنو۔ پھول، خوشبو اور رنگ مجھے، اچھے لگتے ہیں۔ برسات کے موسم میں جب گھٹاؤں کی آغوش میں بجلی چمکتی ہے یا دل جب ایک دوسرے سے ٹکرا کر گر جتے ہیں اور موسلا دھار بارش زمین کی ہر چیز کو سیراب کر دیتی ہے تو یہ سارے منظر میری آنکھوں کا نور بوجھا دیتے ہیں۔ فطرت سے مجھے پیار ہے۔ حسین چیزوں سے بھی محبت کرتی ہوں۔“

”اُہ میں نے تمہیں منظر کشی کے لیے تو نہیں تھا۔ فطرت سے ہر شخص پیار کرتا ہے۔ میرا مقصد یہ تھا اور تھا۔“

”اچھا تمہارا اشارہ اس محبت سے ہے جو مجھے تم سے ہے؟“

”ہاں۔“

”اور جب چاند ڈر کر بادلوں میں منہ چھپا لیتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے کہ وہ ڈر کر محبوب کی آغوش میں چھپ جانا چاہتا ہے۔“

”زارش۔ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ اپنی بات پوری کر کے وہ خوب ہنسی۔ کھلکھلا کر جیسے وہ اس کی بات کا مذاق اڑا رہی ہو۔

”سوری ارحم میں مذاق کر رہی تھی۔“ اس کا

سوری کرنا ارحم کے آگ جیسے غصے پر پانی کا کام کر گیا۔

”میں نے کچھ پوچھا تھا تم سے؟“

”وقت آئے پرچھاؤں گی۔“

اس کی یہی ادا اُنیں، شوخیاں اور مسکراہٹیں ارحم کو اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ اس کی قربت اسے مسحور کر دیتی تھی۔

زارش بہت سنجیدہ لڑکی تھی اور اس حادثے کے بعد تو اور بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس روز بھی نہ جانے کیسے وہ اتفاقاً کر گئی جو ارحم کو بہت برا لگا، لیکن اس کی سوری نے جلتی ہوئی آگ پر پانی کا کام کیا، مگر پھر بے درے ایسے واقعات ہوتے چلے گئے کہ ان کے بچ بچتی بڑھتی گئی اور اس آگ کو پیروں دکھانے کا کام سنانے لگا۔ جس نے فوراً ”آگ پکڑ لی۔“





مرد کی محبت بارش کی بوند یا شبنم کا قطرہ ہوتی ہے جو مٹی میں گرتے ہی جذب ہو جاتا ہے۔ محبت سے گرے تو جذلوں میں گلشن کھلا دیتا ہے۔ اگر نفرت سے تو گلشن کو بھی خار بنا دیتا ہے۔

زارش بھی تو اس کی لپیٹ میں آئی غمی اس کی ہنسی مسکراتی زندگی ارحم کی نفرت اور فریب کی نذر ہو گئی تھی۔ وہ اندھال سی ہو گئی۔ کسی سے شہر کیا نہ محسوس ہونے لگا۔ اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔ یہ سب بتا کر ایک بار پھر قیامت برپا نہیں کرنا چاہتی تھی اپنے گھر پر۔

”ارحم! کیا تم یہ سب کچھ سنجیدگی سے کہہ رہے ہو؟“

”اس میں مذاق والی کون سی بات ہے زارش؟“

”ارحم! ارحم! الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

”ہاں جلدی سے کہو جو بھی کہنا ہے۔ ایک ضروری پائنٹنٹ ہے۔ دیر ہو رہی ہے مجھے۔ اور تم ہر وقت وجہ بے وجہ فون مت کیا کرو مجھے۔“

”مطلب کیا ہو۔ بھی آدمی کو اپنی ذات کے لیے خاصا وقت چاہیے ہوتا ہے!“

”ارحم! کیا تم کچھ غلط نہیں کہہ رہے؟ تمہارا ہی دعو تھا کہ تم تمہارے شب و روز تمہاری سوچیں سب کے سب میرے ہیں۔“ اس نے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”کبھی بے وقوفی میں کہہ دیا ہوگا، لیکن اس وقت مجھے کچھ یاد نہیں اور میں یاد کرنا بھی نہیں چاہتا اور نہ ہی ان فضول باتوں کے لیے میرے پاس اتنا وقت تو وقت ہے۔ تم فون بند کرو۔ مجھے کیس بات کرنا ہے۔“

”نہیں کروں گی جب تک تم میری بات کا جواب نہیں دے گے مجھے مطمئن۔“

”تو کیا ہوا میں کال ڈراپ کروں گا تم مزے سے رابطہ کیے رہنا۔“ اس نے حد درجہ بے گانگی اور لائبرلٹی سے کہا اور بج بج کال ڈراپ کر دی۔ وہ پھر سے

نمبری ڈائل کرنے لگی۔ اس نے پہلی ہی بیل پر کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو۔ سمجھ نہیں آتا تمہیں کیا کہا تھا میں نے؟“ اس نے تلخی سے کہا۔ جواب میں وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ابھی تک اس کے بے رخی کا اثر دل پر تھا۔

”ہیلو۔ ہیلو۔“ اس نے موبائل کلن سے ہٹا کر دیکھا اور سگنل چیک کے کال چل رہی تھی۔

”میں پاگل ہو جاؤں گی۔ پلیز ارحم دیکھو۔ دیکھو مجھے ستا رلا کے تمہیں کیا ملے گا۔“ وہ اس کی عادتوں سے بخوبی واقف تھی۔

”کچھ نہیں نہ۔ میں تمہیں ستانا چاہتا ہوں اور نہ ہی آئندہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ اس لیے تمہیں اس طرف سے خوف نہ نہیں ہونا چاہیے اپنے دل سے خدشے واپس نکال دو۔ اس سب کے بدلے میں صرف آزادی کا طلب گار ہوں۔ زندگی کا ایک سیٹ اپ چاہتا ہوں۔ اسی کوشش میں لگا ہوں اور میرا خیال ہے یہ کوئی جرم نہیں۔ تم بھی اپنے معاملوں میں آزاد ہو۔ شوق سے جو چاہے کرو۔ بس میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میری راہیں صاف کرو۔ سنا تم نے؟“ اسے

خدا حافظ کیے بنا لائن کٹ دی۔ چند لمحے وہ موبائل ہاتھ میں لیے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر ایک دم ہی خزاں سی آواز آئی تھی۔

”کیا بات ہے زارش! یہ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بچ رہے ہیں۔ خیریت سب ٹھیک تو ہے؟“

”ہاں بس ویسے ہی۔“ اس نے ہلکے سے کہا۔

”کیا تم ارحم سے بات کر رہی تھیں؟“

”ہاں۔“ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس نے رخ دوسری جانب پھیر لیا۔ اپنی کیفیت چھپانے کو۔

”اب کیا ہوا ہے؟“ وہ خاموش رہی۔

”آج سے پہلے تو اس سے بات کرتے ہوئے تمہارے چہرے پر قوس و قزح کے رنگ دکھائے ہوتے تھے اور آج تاریکی کے بادل چھائے ہیں۔ کیس کوئی جھڑپ تو نہیں ہو گئی؟“

”ارے نہیں۔ بس ویسے ہی۔“ وہ صاف چھپا

”اور تم نے اتنی جلدی فون بند کر دیا ورنہ فون بڑی رکھنے میں تو تم دونوں ہی مشغور ہو۔ میرا خیال ہے“

”تمہیں باتیں کرتی ہو تم اس سے۔ تم تھکی نہیں زارش۔؟“

”نہیں۔ بس اسے کہیں جانا تھا۔ دیر ہو رہی تھی۔“ سارہ نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھا اور مسکرا دی۔

”ویسے زارو اللہ کا شکر ہے میں تو اس ملک بیماری سے بچی ہوئی ہوں۔ میری چند زندگی اتنی فضول چیز نہیں ہے کہ اسے جل کر رکھ کر زار دی جائے اور وہ بھی کسی اجنبی کے نام۔ میرے نزدیک جیسے زندگی بے وفا ہے۔ جانے کون سے لمحے رعا دے جائے اسی طرح محبت سب سے ناقابل اعتبار چیز ہے۔“ سارہ نے ایک واضح کے انداز میں کہا۔

”ہر لڑکی زندگی کسی نہ کسی کے نام کرتی ہے۔ بندھن محبت کے ساتھ جوڑا جائے تو حرج کیا ہے؟“

زارش نے اپنی پریشانی چھپانے کی سعی کی۔

”توبہ کرو۔ شوہر ہونا ہی ایک برا عذاب ہے۔ وہ شوہر محبوب بھی ہو تو بات ذرا ٹھنسن سی ہو جاتی ہے۔ زندگی ناز و خیرے اٹھانے میں ہی گزر جائے گی۔“

”ناز اٹھوانے والے ناز اٹھاتے بھی ہیں۔“ ہمارے لقمہ دیا۔

”ہم تو ناز اٹھوانے والوں میں سے ہیں۔ اٹھانے والوں میں سے نہیں۔ ویسے میری مانو تو ان ارحم صاحب کو ہری جھنڈی دکھا دو۔ کسی نہ کسی بہانے تمہیں پریشان ہی رکھتے ہیں۔ تمہاری محبت کی گہرائیاں ناپتے رہتے ہیں کہ کتنی محبت۔ زمین کے اندر رہے اور کتنی باہر۔“ سارہ نے اسے مشورہ دیا۔

”ویسے یہ ہری جھنڈی کے علاوہ سفید، نیلی، پیلی اور سرخ بھی تو دکھائی جا سکتی ہے۔ میرے خیال میں تو سرخ دکھانی چاہیے۔ خطرے کا الارم جاؤ میاں عیش کرو۔ سگنل بدل گیا ہے۔ کسی اور ترین میں چڑھ جاؤ۔“

ہمارے منٹے ہوئے سارہ کو آنکھ دیا کر کہا۔ اس کا مقصد زارش کو تنقید کا نشانہ بنانا تھا جو ارحم کے سامنے تو کسی دوسرے کو کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی۔ بس ارحم ارحم ارحم۔ ایک ہی نام کی تکیج کرتی اور اس کی تعریف میں زمین آسمان کے فلابے ملا دیتی۔

”جھا زارش ہم جا رہے ہیں شام میں چکر لگاؤں گی۔“ وہ گھر چلی آئیں۔ چند فرلانگ کا فاصلہ تھا ان کے گھر کے بیچ ان کے جاتے ہی زارش اپنے کمرے تک خود کو بمشکل تمام گھسیٹتی ہوئی پہنچی اور بستر پر گر گئی۔ ارحم کے لفظوں کی تلخی ان سے نکلتی بے زاری اور آگ نے اپنے حصار میں لے لیا۔

”مجھے زندگی کا سیٹ اپ چاہیے مجھے آزاد کرو۔“ میری راہیں صاف کرو۔ آزادی سب کا حق ہے۔ میں اس معاملے میں سنجیدہ ہوں۔“ وہ سسکنے لگی۔ ہاتھوں میں چھو چھپا کر سسکتی رہی۔

”زارش! زارش!۔“ مٹی اسے پکار رہی تھیں۔

”اٹھو بیٹا! یوں منہ چھپائے کمرے میں بیٹھی ہو بے شک کام میں ہاتھ نہ ملنا، لیکن کمرے سے باہر تو آ جاؤ۔ ارشاد کب سے تمہارے منتظر ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے مگر۔“

”ارے یہ کیا بات ہوئی۔ صبح تم نے ناشتا نہیں کیا کہ دوپہر کو اپنا من پسند کھانا کھاؤ گی۔ اٹھو اور فوراً باہر آ جاؤ۔ تمہارے پسند کی بریانی، قیسم، آلو اور مسور کی وال بنائی ہے۔ ساتھ میں ہرے مسالے کی پودینے کی چٹنی بھی۔“

”زارش بیٹا! ہر آ جاؤ۔“ پاپا کی آواز اس کی سماعتوں نے سنی تو اس نے خود کو بے بس محسوس کیا۔

”بچو اٹھو۔“ مٹی نے اس کی کلائی تھامی تو چونک پڑیں۔

”ارے تمہیں تو بخار ہے، کب ہوا؟ تم نے بتایا تک نہیں۔“ انہوں نے زارش کو پیار سے دیکھتے پوچھا۔ بخار کی شدت سے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ مٹی سب کچھ بھول بھال کر اس کے



پاس بیٹھ گئیں۔ ارشاد آئے۔  
 "کہاں ہو بھی سب لوگ۔ بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے۔"  
 "زارش کو دیکھیں، بخار میں جل رہی ہے۔"  
 "بخار کب ہوا، ہمیں تو خبر ہی نہیں۔" وہ بولے۔  
 "دونوں کھانا بھول کر اس کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ شام کو روجی، جنید و قار، خالد احمد کے گھر سے لوٹے تو وہ بستر میں تھے۔"  
 "زاری کیا ہوا۔ بخار چڑھا لیا اچھا بھلا سوتا چھوڑ گئے تھے تم کو۔" روجی اس کے پاس آچھٹھی۔  
 "روچی پلیز چپ ہو جاؤ۔ مجھے سونے دو۔" اس نے گمبل اوپر کھینچے ہوئے خود کو پھپھالایا۔  
 \* \* \*  
 ادھر سائہ اس کی طرف جاسکی نہ زارش آئی۔ تو سائہ نے خدا کا شکر ادا کیا اور جھٹ ارحم کا نمبر ملایا۔  
 "ہیلو ارحم بول رہا ہوں۔"  
 "تم میرے فون کے منتظر تھے؟"  
 "آف کورس، اتنی دیر سے کال کی کہاں تھیں تم؟"  
 "بس وہ زارش کی طرف جانا تھا، لیکن میں جانہیں اسکی تو زارش کا انتظار کرتی رہی کہ کہیں وہ نہ آجائے۔ کیوں کہ اس کے آنے کا امکان زیادہ تھا۔"  
 "تو وہ نہیں آئی، اس کا مطلب ہے جسے ہم سنگی دیوار سمجھ رہے تھے وہ ریت کی بھر بھری دیوار ثابت ہوئی، اشارے میں ہی ڈھے گئی۔" سائہ ہنس دی تو وہ بھی ہنس پڑا۔  
 "آخر یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ اسے تمہاری جان چھوڑ دینی چاہیے اب تک۔" سائہ نے ایک ادا سے پیار بھرے لہجے میں کہا۔  
 "ہاں سائہ، مگر یہ ڈرامہ سوپ سیریل ہے۔ ڈراما سین کے لیے سوچنا پڑے گا۔ کسی طریقے سے ہی راہ سے ہٹانا ہو گا۔"  
 "تم نے یہ روگ پالا ہی کیوں؟"

ماہنامہ کرن 230

"بس دل نادان غلطی کر گیا۔ بندہ غلطی کی سزا بھگتے کے لیے تیار ہے۔"  
 "ہو نہ جیسے سارے شہر کی لڑکیاں ختم ہو گئی تھیں کہ تم کسی ایک سے شادی کر سکو۔"  
 "کسی لڑکی کی کیا مجال، تم جو تھیں جان من۔ تم بہم کسی نہ کسی طرح تم تک پہنچ گئے۔ ہمیں پہنچنا ہی تھا۔"  
 "جی ہاں۔"  
 "وہی ایک بات کہوں ڈیرے؟"  
 "ہاں کیوں۔"  
 "ہم زندگی بھر اس کے ممنون رہیں گے جس کے سبب ہم نے تمہیں پایا۔" ارحم کے لہجے میں شوق رنگوں کی جھلک تھی۔  
 "ارحم ایک تو تم بہانے بہانے اس کا ذکر درمیان میں ضرور رکھتے ہو۔ بہت شوق ہے اسے یاد رکھنے کا۔" سائہ جل سی گئی۔  
 "سائہ ساتھ رہنے والے لوگ کسی نہ کسی طور یاد تو رہتے ہی ہیں۔"  
 "تمہاری کیا مجال کہ تم اسے یاد رکھو۔ بس میرے آنے کی دیر ہے۔ ساری چوڑی بھول جاؤ گے تم۔ وہ بے چاری زارش کیا چیز ہے۔"  
 "چہ چہ، بے چاری زارش۔" ارحم کے لہجے میں جانے کیا تھا۔ سائہ پھر ہنس پڑی۔  
 "صبح اس کا موڈ ایک دم آف ہو گیا۔ کیا کہا تھا تم نے اس سے؟"  
 "یہ تھوڑی کہہ سکتا تھا کہ میں نے سائہ کو منتخب کر لیا ہے اس لیے تمہاری چھٹی۔ کسی نہ کسی طرح ہی دامن بچانا ہو گا۔ سائہ وہ لڑکی مجھے سنجیدگی سے چاہتی ہے۔ میں اسے کہہ دوں کہ میں کسی اور سے پیار کرنے لگا ہوں تو وہ اسی دم مرجائے گی۔"  
 "مائی فٹ، ایک طلاق یافتہ لڑکی کو حق ہی کیا ہے کہ وہ ارحم جیسے لڑکوں بھانستی پھرے۔"  
 "یہ تو اس کی غلطی ہے، نادانی ہے۔ میں اس پر ترس کھا بیٹھا اور معاملہ ترس ہی ترس میں آگے بڑھ

گیا۔"  
 "بس میں کہہ رہی ہوں نا تم کسی دن اسے صاف صاف کہہ دو۔"  
 "کہہ دوں گا بھی کہہ دوں گا۔ ویسے کہنے کی ضرورت بھی نہیں جس دن ہم سر پابندھے تمہارے در پہ حاضر ہوں گے ایک دوسرا دیکھے گی اور زارش ارشاد تو سب سے پہلے دیکھے گی۔ تمہارے اور اس کے گھر کا فاصلہ ہی کیا ہے۔" سائہ مسکرا دی۔  
 "کہا سوچ رہی ہو؟"  
 "پہلی ملاقات کا وہ دن۔" ارحم نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔  
 "نہیں بھی اس دن تو تم نے مجھے زارش کے حوالے سے دیکھا تھا۔ یاد ہے مجھے بھی وہ سفر بڑی اجنبی نئی ہوئی تھیں۔"  
 "میں بھی نہیں بھولی۔ تم زارش کے پہلو میں بیٹھے بڑے شاداں و فرحان نظر آ رہے تھے۔ اجنبی تو بننا ہی تھا مجھے۔"  
 "جی نہیں، بیک ویو مر میں تمہارا حسین کھنڈا دیکھ کر دل امنگوں سے بھر گیا تھا۔ تمہارا زارش سے کیا مقابلہ، تمہیں دیکھ کر تو ہوش اڑ جاتے ہیں۔"  
 "زیادہ باتیں مت بناؤ۔"  
 "روک لو، روک لو، چند دن کی ہی بات ہے۔ جب ہم خیر سے مجازی خدا ہو جائیں گے تو شب و روز ہماری مرضی اور خواہش سے گزریں گے۔" ارحم کے لہجے میں شوخی اور شرارت دونوں جھلک رہے تھے۔  
 "ہاں بھی اندر آگئی۔ اشارے سے پوچھنے لگی کس سے باتیں کر رہی ہو، اس نے لیوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود بخود گھونگٹو رہی۔"  
 "تمہاری مٹی کب آ رہی ہیں ارحم؟"  
 "بہت جلدی ہے تمہیں فکر نہ کرو۔ ایرپورٹ سے سیدھا تمہارے ہی گھر لاؤں گا۔"  
 "اچھا ارحم بھائی کا فون ہے۔ لاؤ مجھے دو۔ میں بھی بات کروں۔" ہانے سیل سائہ سے لے لیا۔  
 "ہیلو ارحم بھائی کیسے ہیں آپ؟ سائہ پر آپ نے

ماہنامہ کرن 231

کیا جادو کر دیا ہے۔ دن رات آپ کے سن گاتی ہے۔"  
 "اچھا ہے نایاد کرنا چاہیے۔ یہ اس کا حق ہے بلکہ فرض ہے۔"  
 "لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا۔ زارش کا مسئلہ کیسے حل ہو گا۔"  
 "چنگلی بجاتے ابتدا تو ہم نے کر دی ہے۔ کسی روز دھماکا بھی کر دیں گے۔ تم اس بے چاری کی پریشانی کا برا مت مانا کرو۔ ایک عرصہ رفاقت رہی ہے بھولنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ یہ سب اتنا آسان تو نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔"  
 "بہت ہمدردی ہو رہی ہے آپ کو؟"  
 "ہاں انسانی ہمدردی جس کے تحت میں اس کے قریب رہا۔"  
 "چلی تھی آپ کو پانے کے خواب دیکھنے۔ اگر اس کا نصیب اتنا ہی اچھا ہو تا تو آج اپنے گھر میں آباد ہوتی۔ خواہ مخواہ ہمدردی کے تحت گلے کا ہار نہ بنتی آپ کے۔" اس نے اچھی خاصی سنا ڈالی۔ ہما کے دل کو ٹنڈک محسوس ہو رہی تھی۔  
 "ہاں نصیب ہی تو انسان کو ذلیل کرتا ہے۔ سارا کھیل ہی تقدیر کا ہے۔ تم بس میرے اور سائہ کے لیے دعا کیا کرو۔ خدا ہم دونوں کے نصیب اچھے کرے۔ ہم ایک کامیاب زندگی گزاریں، خوش اور مطمئن رہیں۔"  
 "آمین۔" اس نے صدق دل سے کہا۔  
 "کرتی ہوں۔ ہر لمحہ کرتی ہوں دعا۔ میری طرف سے اللہ حافظ۔ آپ سائہ سے باتیں کریں۔" اس نے سیل سائہ کو تھماتے ہوئے کہا اور خود کمرے سے باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد آئی تو سائہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز آ نکھیں بند کیے آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔  
 "کیا بات ہے سائہ۔ دولہا بھائی نے کوئی زبردست بات کہہ دی جو یوں مسکرائے جا رہی ہو بے خود ہو کر۔"



”نہیں ہمارے دل یاد آ رہے ہیں“ ارحم سے ملنے کا وہ پہلا دن اور پھر بہت سارے دن۔“

”ویسے سارے تم مان لو۔ میری پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔ میں نے ہی یہ نوید سنائی تھی تم کو اور بات سچ نکل آئی تھی۔ کجنت وہ پہلے دن سے ہی تمہارے قدموں میں دل بٹھا کر بیٹھا تھا۔ زارش تو آڑ تھی ایک بہانہ تھی۔ ایک خوب روئیل انجو کھٹل اور ہینڈ سم نوجوان کو کیا پڑی کہ ایک مہر چھائے ہوئے پھول کی خاطر زلت مول لے۔“

”تمہیں یاد ہے ہاں جب ہم لوگ لی سی میں گئے تھے۔ ارحم زارش کے ساتھ بیٹھا تھا لیکن اس کی نگاہوں کا حصار میرے گرد بندھا تھا۔ بار بار ایک ایک چیز مجھے پیش کر رہا تھا۔ میڈم یہ لیجیے وہ لیجیے۔ آپ تو کچھ کھا ہی نہیں رہیں۔ بس دیکھ دیکھ کر ہی پیٹ بھر رہی ہیں اور زارش وہ ارحم کے التفات پر خوش بیٹھی رہی اور اس دن جو لانگ ڈرائیو پر گئے تھے بیک ویو مرر میں ارحم کی شریر نظریں میرے سراپے پر لگی رہیں۔“

”اچھا تب ہی تم سہر پہلی بی جا رہی تھیں۔“

”نہم بھی کمال کی باتیں کرتی ہو ہاں۔ جواب نہیں تمہارا۔“

”آگے آگے دیکھتی جاؤ۔ ہوتا ہے کیا۔“

”اچھا خیر۔ آگے سنو۔ تم نے دیکھا نہیں تھا اس دن پارک میں گھومتے ہوئے اس نے زارش کو کس بری طرح جھاڑ دیا تھا۔ تو یہاں کے احساس سے اس بے چاری کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پھر مڑ جانے سے میں رک گئی اور آواز پر مڑ کر دیکھا تو وہ زارش سے کہہ رہا تھا۔“

”زارش تمہیں اپنی دوستوں کا بالکل خیال نہیں۔ میرے ساتھ بھاگی چلی آ رہی ہو۔ پیچھے مڑ کر دیکھو سارے کی طرف جاؤ۔“ تب وہ ڈی چلی آئی۔ ارحم کی جان پر بن گئی اور وہ بے چارہ ساری تفریح بھول کر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے آیا۔ کتنا پریشان ہو گیا تھا۔“

”یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہو۔ میں تو جانتی ہوں سب۔ وہ تمہارے لیے دیوانہ ہو رہا تھا میں نے ہی

اطلاع دی تھی تمہیں۔“

”بہر حال زندگی گزارنے کے لیے ارحم جیسا سہا تھی برا نہیں۔ کھاتے بیٹے گھرانے سے ہے۔ یہ تو قسمت کی کرم نوازی ہے۔ سورنہ میں کہاں اور وہ کہاں۔“

”ہاں سارے تقدیر کے سامنے سب مجبور ہوتے ہیں اور مقدر کی دیوی تم پر مہربان ہے۔“

”بس اللہ نظر بد سے بچائے۔“

”میں بہت پریشان ہوں ہاں۔“

”کیوں۔“

”آخر یہ چھپن چھپائی کب تک چلے گی ایک نہ ایک دن تو زارش کو خبر ہو جائے گی۔ وہ کیا خیال کرے گی۔“

”کہہ دینا یہ سب نصیب کی بات ہے زارش۔ اگر ہمارا جوڑا آسمان پر لکھ دیا گیا تھا تو زمین پر ملاپ تو ہونا ہی تھا۔ اس میں میرا کیا قصور۔“

”کیا وہ مان لے گی سب؟“ سارنہ نے کہا۔

”جب سب کام ہو جائے گا۔ وہ مانے یا نہ مانے پھر کیا فرق پڑتا ہے۔“

”کہہ تو تم بھی ٹھیک رہی ہو۔“

”ویسے ایک بات کہوں سارنہ؟“

”ہاں کہو۔“ وہ گہری سوچوں میں گم تھی۔

”مرد بہت بے اعتبار شے ہے۔ مرد کے خیالات بدلنے میں دیر ہی مگنی لگتی ہے۔ آج اس کا کل اس کا برسوں کی اور کا۔“ وہ ہنسی پھر بولی۔

”سارنہ خیال رکھنا۔ کہیں برسوں وہ سچ ہی کسی اور کانہ ہو جائے اور تم ہاتھ مسکتی رہ جاؤ۔“

”کیا یہ بھی تمہاری پیشین گوئی ہے؟“ سارنہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”ہاں کہہ سکتی ہو۔ میری چھٹی حس خطرے کا الارم بج رہی ہے۔“

”اس خطرے کے الارم کی لائٹ فوژ کرو اور گرین سگنل آن کرو۔ پھر سب ٹھیک ہی ہو گا۔ تم فکر نہ کرو اور ویسے بھی وہ دور گزر گیا جو ظالم و جابر مردوں کا ہوا کرتا

تھا۔ آج کا مرد عورت کا غلام ہے۔ بیوی کے اشاروں پر ناپتا ہے۔ ایک نہیں ہزاروں مثالیں تمہارے سامنے ہیں۔ کیا کوئی دیکھ لو عہد کے سامنے دم مارنے کی ہمت نہیں۔ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اس گھر میں صرف وہ ہی ہوتا ہے جو صرف مہاجراتی ہیں۔“

”لیکن یہ تو مہاجراتی کے آپس کا پیار ہے نا سارنہ۔“

”مجبوری کا نام شکر یہ اسی کو کہتے ہیں۔“

”دیکھ لیتا کیسے رکھتی ہوں ارحم کو۔ میرے پیچھے دم ہلاتا نظر نہ آئے تو نام بدل دیتا۔“ سارنہ سنجیدہ تھی۔

”تو ارحم صاحب کا مستقبل بہت تاریک ہے۔ وہ ہر دم ہاتھ باندھے تمہاری حاضری میں کھڑے ہوں گے لیکن یہ یاد رکھنا وہ ایک بگڑا ہوا امیر زادہ ہے اور تمہاری سوچوں کے مطابق تمہیں ایک زر خرید غلام کی ضرورت ہے۔ محبت کی نہیں۔“

”تو محبت کس کافر کو ہے۔ بھلا شوہر بھی کوئی دل لگانے کی چیز ہے پاگل لڑکی۔ وہ ایک معاشرتی اور معاشی ضرورت ہے جس سے اپنی عقل مندی کی مدد سے فیض اٹھایا جاسکتا ہے۔“

”تو گویا تمہیں شوہر نہیں ایک لڑکھوٹ چاہیے۔“

”تمہاری مرضی ہے کچھ بھی سمجھ لو تم۔“

”سمجھ تو میں بہت کچھ رہی ہوں لیکن آنے والا وقت بتائے گا ہو گا کیا اور تمہاری حاکمانہ سوچوں کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔“ سارنہ اسے گھورتے ہوئے ہنس پڑی پھر دونوں کا تقہمہ کمرے میں گونج رہا تھا۔

\*\*\*

روحی اس کے پاس بیٹھی گہری سوچوں میں گم تھی۔ اس کی سوچیں زارش کی آواز پر ٹوٹیں۔

”پانی۔“ اس نے تھامت سے کہا۔

”ٹوٹی لو۔“ اس نے زارش کو سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے پانی کا گلاس اس کے لبوں پر سرنگھایا۔

ایک سانس میں ہی اس نے گلاس خالی کر دیا۔ لگتا تھا وہ صدیوں سے پیاسی ہو۔ روحی نے تکیوں کے

سہارے اسے بٹھا دیا۔ وہ اک دم ہی زرد پھول کی طرح ہو گئی تھی۔ جیسے اس کے بدن سے خون کا ایک ایک قطرہ بھی نچوڑ لیا ہو۔ اس حالت میں زارش کو دیکھ کر اس کا دل کٹ گیا مگر وہ خاموش تھی چند لمحوں بعد وہ بولی۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟ کیا محسوس کر رہی ہو؟“

”بہتر محسوس نہیں کر رہی۔“ اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

”بہت سے کام لو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر لگاتی ہو۔ ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ اس حالت تک پہنچ گئی ہو؟“

اس نے ہونٹوں کو مضبوطی سے ایک دوسرے میں جکڑ لیا اور دانتوں سے چبانے لگی جس سے اس کی ذہنی انتشار کا اندازہ ہو رہا تھا۔ روحی نے ایک ٹھنڈی سانس لی مگر بولی کچھ نہیں۔ وہ اس کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی کیوں کہ ابھی وہ ٹھیک نہیں تھی۔ اس کی باتوں سے مزید الجھنوں کا شکار ہو سکتی تھی۔

”روحی۔“

”وہ آئے تھے؟“

”کون ارحم بھائی۔ نہیں تو۔“

”کال بھی نہیں آئی ان کی؟“

”نہیں۔“

”تم فون کر کے انہیں بتا دو۔ انہیں تو خبر ہی نہیں کچھ۔ پھر شکوہ کیا۔“

”کیا بتاؤں ان کو۔ اگر انہیں احساس نہیں تو ہمیں کیا بڑی ہے کہ بتاتی پھوں ان کو جس روز خیال آئے گا تو خیر بہت معلوم کر لیں گے تو میں بھی بتا دوں گی۔“

اس نے سخت اور تلخ لہجے میں کہا۔

”اگر میں ٹھیک ہوتی تو میں خود بتا دیتی۔ وہ پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”عجب اتنی بات کر سکتی ہو تو اطلاع بھی کر دو۔ رہی بات پریشان ہونے کی تو یہ تمہارا وہم ہے۔ اگر اتنا ہی خیال ہے تمہارا تو خود معلوم کرتے کہ تم کہاں غائب ہو لیکن تم تو کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہو۔ پتا نہیں ایسا



کون سا جادو کر دیا ہے تم پر۔ اس حالت میں بھی ان کا ہی خیال۔ بس رہنے دو زارش۔ رحم کرو خود پر۔ پاگل ہو گئی ہو رحم کے لیے۔ اگر اسے تمہارا خیال نہیں تو تم بھی مت کرو۔ جب تمہاری یاد آئے گی تو بات کر لیتا اور یہ یاد چند دنوں میں بھی آسکتی ہے ہفتوں اور مہینوں میں بھی۔ اس کے لفظوں سے نفرت چھلک رہی تھی اور لبوں پر زہریلی مسکراہٹ۔

”روحی پلیز“ وہ دودی کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اس کی آنکھوں اور لہجے میں التجا تھی۔ وہ سر کو جھٹکتی ہوئی سیل لے کر دوسرے کمرے میں آگئی۔ اس کی انگلیاں ارحم کا نمبر ملا رہی تھیں۔

”السلام علیکم ارحم بھائی۔“

”لو ہو۔ کیسی ہو روحی۔“

”چھی ہوں۔ آپ ہماری طرف آئے نہ ہی فون کیا۔“

”کیا کرنے آتا ہے؟“

”روحی کے ہاتھوں سے موبائل گرتے گرتے بچا۔ لیکن اگلے لمحہ سنبھل گئی۔“

”زارش بیمار ہے۔“ اس نے بیمار خاصا زور دیا۔

”خدا صحت دے، میں کوئی ڈاکٹر تو نہیں ہوں۔ تم نے کسی ڈاکٹر کو فون کیا ہوتا۔“

”ارحم بھائی آپ مذاق کے موڈ میں ہیں اور وہ واقعی بیمار ہیں۔“

”میں نے کہنا میری ساری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔“

”تو پھر کب آرہے ہیں آپ؟“ روحی نے جیسے سنی ان سنی کر دی۔

”سوری روحی۔ میں نہیں آسکوں گا۔ میرے اور اس کے بیچ ایسا ناہمی نہیں رہا کہ میں اس کی بیماری پر دوڑا چلا آؤں۔ یہ بات زارش بھی اچھی طرح جانتی ہے۔“

”روحی کو غصہ آگیا، لیکن وہ بڑی رکھ رکھاؤ والی لڑکی تھی۔ غصہ پی گئی۔“

”ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔“ اس نے کال ڈراپ

کر دی۔ وہ غصے میں بل کھاتی ہوئی ساتھ کے گھر کی طرف چل دی۔ آج کا دن جیسے اس کے لیے برا ثابت ہوا تھا۔ ارحم کے بعد دوسری طرف سے بھی مایوسی اس کی منتظر تھی۔ دونوں ہمیشہ شاید شاپنگ کر کے لوٹی تھیں۔ سامان اپنے سامنے پھیلائے تبصرہ کر رہی تھیں۔

”او، او روحی۔ کیسے آنا ہوا خیریت؟“

”خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔“ روحی کو ان کا یوں چونک جانا سوچ میں ڈال گیا۔ بجائے اس کے وہ اس کا حال احوال معلوم کرتیں، اس کے آنے سے جیسے پریشان ہو گئی ہوں۔ فوراً ”خیریت معلوم کرنے لگیں۔“

”زارش کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ زارش کا خیال ہے تم لوگوں کو اس کی طبیعت کی خرابی کا پتا نہیں تو خبر کروں۔“

”وہ کب سے؟“ ہمیں تو کچھ خبر ہی نہیں۔ ”دونوں بہنوں نے معصوم سے انداز میں کہا، لیکن روحی ان لفظوں میں چھپے طنز کو سمجھ گئی۔

”ارحم کو اطلاع دی؟“ ساتھ نے کن آنکھوں سے روحی کو دکھا۔

”ہاں۔“

”پھر تشریف لارہے ہیں؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ دے رہے تھے۔“

”تو لے جاؤ نا۔ ارے ہاں روحی ہماری شاپنگ تو دیکھ لو بیٹھو تو سہی یا۔ ساتھ کے جینز کی ہے۔“

”اچھا ساتھ کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔“

”روحی سب بھول کر ان کی چیزیں دیکھنے لگی۔“

”ہاں بہت جلد۔ بس دولہا بھائی کی والدہ کا انتظار ہے۔“

”ارے بہت بہت مبارک، لیکن اتنی بھی راز داری کیا ہمیں دولہا کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں۔“

”سب پتا چل جائے گا۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔“ ہما حد سے زیادہ خوش تھی۔

”لیکن ہمایہ دولہا بھائی آسمان سے اترے ہیں یا زمین سے اگے ہیں کہ اچانک ہی وارد ہوئے ہیں۔“

”دیکھ کر اندازہ لگاتی رہنا کہ کیسے آئے دنیا میں۔“

”دونوں ہمیشہ معنی خیز انداز میں ہنس دیں۔“

”اچھا زارش کو بتا دینا شام کو آئیں گے ہم۔ اس کی بیمار پرسی کو۔“ وہ اثبات میں سر ہلا کر دروازے کی طرف بڑھی۔

”زارش ارحم بھائی کا نمبر آف ہے، لیکن مسیج چھوڑ دیا ہے میں نے ان کے لیے۔“

اس نے سنجیدگی سے کہا کیوں کہ اس میں بہن کا دل توڑنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس لیے اس نے جھوٹ بول دیا، لیکن وہ جھوٹ بول کر بھی مطمئن تھی۔ زارش خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اسے صورت حال کا اندازہ لگانے میں کوئی دیر نہ لگی۔

”اور ہاں ساتھ ہما شام کو آئیں گی۔“



بہت سارے دن گزر گئے۔ بخار سے زیادہ اس کے دل پر ارحم کی بے رخی کا اثر تھا۔ کتنے دنوں سے وہ نہیں آیا تھا۔ اس کی جان پر سنی ہوئی تھی۔ اس نے روحی کو بتائے بغیر ایک کارڈ پر چند الفاظ لکھے اور بھیج دیا۔

وہ آفس کے لیے نکل رہا تھا جب مہین نے وہ کارڈ اسے تھمایا لفافے کی پشت پر لکھے ایڈریس کو دیکھ کر وہ جان گیا کہ کارڈ کس نے بھیجا ہے۔ اس نے غصے سے لفافہ پھاڑ ڈالا اور ایک خوب صورت گلاب کے پھولوں والا جن کی پتیوں پر مجسمہ کے قطرے چمک رہے تھے کارڈ اس کے ہاتھ میں آگیا۔

خیال تیرا ہے سانس جیسا جو یہ نہ آئے تو مرنے جاؤں

اس نے کارڈ ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”بیچیا کیوں نہیں چھوڑ رہی ہو میرا۔“ وہ بڑبڑایا۔

”کس کا کارڈ تھا ارحم بھائی۔“ دروازے میں ماریہ کھڑی تھی اس نے ایک دم ماریہ کو دیکھا۔

”کسی کا نہیں۔“ ارحم کا مؤدبہری طرح خراب تھا۔

”تو ارحم بھائی یوں ہی پھاڑ دیا آپ نے ہو سکتا ہے میری کسی دوست کا ہو۔“

”تمہاری دوستیں میرے نام کارڈ بھیجیں گی۔“

”لوہ، سوری۔ ہاں یاد آیا۔ وہ صبح کوئی لڑکی آپ کا پوچھ رہی تھی۔“

”کون تھی وہ؟“

”نام تو نہیں بتایا بس کہہ رہی تھی اگر وہ اب تک سو رہے ہیں تو انہیں کہہ دیں زیادہ سونا صحت کے لیے اچھا نہیں۔“ ارحم خاموش ہی رہا۔

”کس کو اتنی ہمدردی تھی مجھ سے۔“

”نام پوچھ لیا ہوتا۔“

ارحم کال کرنے لگا۔ ماریہ پاس ہی کھڑی تھی۔

”ہیلو ساتھ، یار بڑی فکر کرتی ہو میری۔ صبح جگانے کا بے حد شکریہ۔“

”سوئے ہوئے کو جگانا ہی چاہیے۔ وہ لڑکی کون تھی؟“ وہ ہنسا اور لولا۔

”ہاں وہ میری بہن تھی ماریہ۔“

”جلدی آجاؤ ساتھ تاکہ یہ سوئے جاگئے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے کا سارا انتظام تم سنبھال لو۔ تنہا بندہ حق تعالیٰ غلطیاں کر سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے روز مرہ کی روٹین میں۔“

ماریہ پاس کھڑی آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ وہ فون بند کر کے پلٹا تو ماریہ کہنے لگی۔

”تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟“

”جی۔“

”یوں کسی کی باتیں سننا اخلاقی جرم ہے۔“

”اور یوں کسی کو دھوکا دینا بھی اخلاقی جرم ہے۔“

”ماریہ جب تم کچھ جانتی نہیں تو بہتر ہے خاموش رہو۔“

”یہ ساتھ کون ہے ارحم بھائی؟“ اس نے حیرانی



سے پوچھا۔  
”ایک اچھی لڑکی جلد ہی تمہاری بھابی بن جائے گی۔“

”یہ سب کیا ہے ارحم بھائی۔؟“

”جو بھی ہے تمہارے سامنے ہے تیار رہنا کسی دن لے جاؤں گا ملانے کے لیے۔ ویسے ماما کے آنے کی دیر ہے۔ معاملہ طے ہو جائے گا۔“ اس نے بریف کیس ہاتھ میں پکڑا اور باہر چل دیا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگی۔

”مگر ارحم بھائی وہ زارش بھابی۔ ان کا کیا ہو گا۔“  
”جو بھی ہو گا تمہیں اس سے دل چسپی نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی یہ تمہارا سرور ہے کہ سوچ سوچ کر پریشان ہو جاؤ۔“

”ارحم بھائی۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”ارحم بھائی، آپ نے تو سارے گھر والوں سے لڑ جھگڑ کے ہزاروں دکھ اٹھا کر اپنا آپ ان کے نام کر دیا تھا۔ انہیں نئی زندگی دے دی تھی۔“

”انسان سے بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ اسے میری غلطی سمجھ لو۔ نادانی یا بھول۔“

”نہیں ارحم بھائی یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔ فضول باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ صبح ہی صبح کس منحوس کا ذکر لے کر بیٹھ گئی ہو۔“ وہ کھٹ پٹ کر تاپلا گیا۔

ماریہ وہیں کھڑی رہ گئی۔ حیران و ششدر۔ بے شک ارحم اس کا بھائی تھا، لیکن ہر حال ایک مرد تھا اور مردوں کے متعلق ماریہ کے خیالات کچھ زیادہ ٹھیک نہ تھے۔ رادیہ بھابی بھائیوں کو چھوڑ کر واپس آئیں تو وہ اسی طرح کھڑی تھی۔

”خیر تو ہے ماریہ یہاں چپ چاپ کیوں کھڑی ہو۔“

”ہوں ہاں کچھ نہیں۔ بس یوں ہی۔“

”نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔“

ورنہ ماریہ اور یوں پریشان ہونا ممکن ہی بات ہے۔  
”میں زارش آپ کی ہاں جاؤں گی۔ بڑے دنوں سے گئی نہیں۔“

”تو ارحم کے ساتھ چلی جاتیں۔ وہ تو ویسے بھی وہاں جانے کے بہانے تلاش کرتا ہے۔“

”نہیں بھابی، انہیں شاید وہاں جانے کی ضرورت نہیں رہی۔“ وہ ہنسی بکھی تھی۔

”وہ کیسے؟ تم رونی صورت بنائے کھڑی ہو۔ کیا بات ہے۔“ وہ سچ بولنے لگی۔

”بھابی یہ مردوں کی قوم بڑی بے ایمان قوم ہے۔ کل کے دن یہ ارحم بھائی مرے جا رہے تھے۔ زارش آپ کے لیے آج کوئی اور لڑکی ان کو پسند آگئی ہے۔ آج کسی اور لڑکی سے عہد و پیمان کر چکے ہیں۔“

”مپا سب۔ ارحم ایسا نہیں ہے۔ تم بس ہو کر الزام لگا رہی ہو جانتی ہو وہ زارش کے معاملے میں کتنا سنجیدہ ہے۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والی سچ سچ پہلی لڑکی ہے۔“ رادیہ بھابی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہرگز ماننے کو تیار نہ تھیں کہ ارحم نے ایسا کیا ہے۔

”بھابی میں نے خود اپنے کانوں سے سب کچھ سنا ہے بلکہ انہوں نے خود مجھ سے کہا ہے۔ وہ سارے نامی کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

”شیطان کی حدوں کو چھو رہا ہے وہ۔“

”ہاں ہاں، بھابی سچ کہہ رہی ہوں۔ بھائی گھر پر نہیں ہیں تو میں خود چلی جاؤں گی۔ جا کر معلوم تو کروں آخر ایسی کیا بات ہو گئی کہ نوبت تعلق ختم کرنے تک آگئی۔“

”نہیں ماریہ، ابھی مت جاؤ پہلے ارحم سے بات کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہو تمہاری جلد بازی سارا کھیل بگاڑ دے۔ زارش تو ویسے بھی بہت چھوٹے دل اور معصوم سی لڑکی ہے۔ حساس اتنی ہے کہ بیمار پڑ جائے گی۔ ہو سکتا ہے یہ بات اسے زیادہ دکھ دے۔“

”ٹھیک ہے بھابی۔ مجھے آپ کی رائے سے اختلاف نہیں ہے۔ اس کے بعد ہی کچھ ہو گا، لیکن زارش آپ کی طرف ضرور جاؤں گی ایک بار چاہے کچھ

بھی ہو۔“ وہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی آئی۔

\*\*\*

سارہ اور ہما پیغام ملنے کے بعد بھی اس کی عیادت کو نہ آئی تھیں۔ زارش کے دل میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ وہ نقاہت کے باوجود سارہ کی طرف چل پڑی۔ ویسے بھی ایک سڑک ہی تو درمیان تھی ان دونوں کے گھروں میں۔

سارہ کے گھر پر خاموشی کا راج تھا۔ گھر پر کوئی نہیں تھا شاید۔ وہ اس کمرے کی طرف چل پڑی۔ اندر سے منے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ شاید اندر چلی بھی جاتی، لیکن ایک لفظ نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا۔ اس کے کان اس آواز پر لگ گئے جو یقیناً ”سارہ کی ہی تھی۔“

”تم بھی حد کرتے ہو۔ ارحم جی۔“

”ہاں ہاں پھر اس بے چاری کو بے وقوف بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ اکثر فوں، ادائیں اسے جھجتی بھی کب ہیں۔ اتنی ہی اچھی ہوتی تو وہ اسے طلاق کیوں دیتا۔ آخر ایک اچھی پوسٹ پر تھا۔“

”چلیے چار دن کا پتہ مذاق، دل لگی سمجھ کر معاف کیے دیتی ہوں آئندہ احتیاط کرنا۔ میری موجودگی میں یہ سب ناممکن ہو گا۔ ایک دم لائن کلیئر ہونی چاہیے۔ ویسے میں حیران ہوں ایک عرصہ یہ چکر چلاتی رہا۔ تم اسے بے وقوف بناتے رہے اور وہ تم کو امیر بن گئی۔“

”اچھا دونوں ہی بنتے رہے۔ ویسے ارحم وہ

تو یہ خواب دیکھ رہی ہے کہ تم اس سے سچ سچ شادی کرو گے۔ ایسی لڑکیوں کو شرم آنی چاہیے جنہیں اپنی عزت کا خیال ہوتا ہے نہ اپنے والدین کی۔“

جواب میں ارحم نے کیا کہا تھا کہ وہ ہنس پڑی۔

زارش سے کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ کمزوری نے اس کی پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ بات اس کو آسمان سے زمین پر گرا دینے کے لیے کافی تھی۔ اور وہ ایک بار پھر بیڑھی پر قدم رکھنے کی کوشش میں زمین پر منہ کے بل گری تھی۔

”اچھا بابا، جمعرات کو شام سات بجے ہم سب تمہارا

انتظار کریں گے۔“  
”تم فکر نہ کرو۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی اور ہو بھی جائے تو کیا ہے۔ چوری تو نہیں کی اور نہ ہی ڈکیتی ہے۔ سب نصیب کی باتیں ہیں۔ تم نے ہوش و حواس کے ساتھ مجھے پر پوز کیا ہے۔ تم زارش کی جائیداد تھوڑی ہو کہ بڑا رے کا ڈر ہو اور میں ڈروں، ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہونہ۔“

زارش نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ کیا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ اس نے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ تلخ حقیقت اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مارے ناچنے لگے۔ اس سے کھڑے ہونا مشکل ہو گیا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا، لیکن زیادہ دیر کھڑی نہ رہ سکی۔ سارہ کا کھینکنا، پراعتقاد لوجہ، اس کی بر جوش آواز اس کا دل جلا رہی تھی۔ وہ بمشکل تمام خود کو گھسیٹتی ہوئی اس کے گھر سے نکلی اور اسی طرح خود کو کھینچتی ہوئی گھر پہنچی۔

شکستہ قدموں کے ساتھ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ ارحم کی بے وفائی کا احساس وجود کو چھینتی کر رہا تھا۔ ٹھکرائے جانے کا دکھ، صدمہ، غم بہت جان لیوا تھا۔ دھوکہ دینے والی کوئی اور نہیں اس کی اپنی دوست تھی جو اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ آستین کا سانپ ثابت ہوئی۔ وہ اسے کیا سمجھتی رہی اور وہ کیا نکلی۔

\*\*\*

ارحم کی دھوکا بازی اس کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ تھی اس کے بعد زندگی گزارنا ایک بے کاری سی بات تھی۔

”اف یہ مرد لوگ کتنے ہر وہیے ہوتے ہیں۔ میرے وجود کی آڑ میں وہ محبت کے کھیل دوسروں سے کھیلتا رہا زندگی کے لیے کسی اور کو منتخب کرنا تھا تو دل کے لیے میں ہی ملی تھی اسے۔ نہیں، نہیں۔ یہ سب کچھ دھوکا نہیں ہوتا۔ جو کچھ ارحم نے میرے ساتھ کیا۔ وہ دھوکا نہیں ہو سکتا، مگر مگر میں نے اپنے کانوں سے سارہ کی



ہاتھیں سنی ہیں میری ساتیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔  
 یسین نہ کرنا بے وقوفی ہے اور یسین کرنا بھی موت ہے۔  
 ارحم یہ لذت مجھ سے میرا وجود چھین لے گی۔ کیا یہ  
 بستر نہ تھا کہ تم مجھے میری ذات کے زندان میں قید  
 رہنے دیتے کیا بگاڑا تھا میں نے تمہارا۔ کیوں دی مجھے  
 اتنی بڑی سزا؟ کیا اس کی حق دار تھی میں۔ اگر یوں ہی  
 تڑپنے کے لیے چھوڑنا تھا تو میری آنکھوں کو اپنے  
 ساتھ کے خواب کیوں دکھائے تھے۔ زندگی کی حسین  
 تپتی میری تھیلی پر کیوں رکھ دی تھی اور۔ اور پھر اس  
 رنگین پردوں والی تپتی کو دونوں ہتھیلیوں کے بیچ رکھ کر  
 مسل دیا۔ اس کے کچے رنگ پانی کی چند بوندیں بہا لے  
 گئیں۔

وہ بستر پر پڑی اپنی بے بسی اور ناکامی کا ماتم کر رہی تھی  
 کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ آواز ماریہ کی تھی۔  
 ”آئی زارش آئی کہاں ہیں؟“  
 ”کوہر اپنے کمرے میں ہی ہے۔“ امی کی آواز  
 آئی۔

”دن چڑھے تک اپنے کمرے میں۔ اس سے  
 پہلے تک تو وہ کبھی اپنے کمرے میں نہیں ملیں؟“  
 ”کئی دن سے بخار ہے۔ ابھی ٹھیک نہیں ہوئی۔“  
 ”بخار؟“

”ارے تمہیں خبر نہیں میں تو دل ہی دل میں سب  
 سے خفا تھی کہ کسی نے مزاج پرسی کی ضرورت نہیں  
 سمجھی۔ ہاں کئی دنوں سے ارحم بیٹا بھی نہیں آئے تو  
 تمہیں کیسے خبر ہوئی۔“ زارش نے خود کو سمجھانے کی  
 کوشش کی۔ ماریہ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اسے دیکھ  
 کر ششدر رہ گئی۔

”ارے زارش آئی۔ کیا ہوا آپ کو۔ اتنی کمزور  
 ہو رہی ہیں رنگت دیکھیں کسی زرد ہو رہی ہے اور  
 آنکھیں اندر کودھنس گئی ہیں۔ کمال ہے اتنی بیمار اور  
 ہمیں خبر ہی نہیں۔ یہ غیروں والا رویہ۔ سمجھ نہیں  
 آئی مجھے۔“ ماریہ نے سخت حیران ہوتے ہوئے تیز  
 آواز میں شکوہ کیا مگر زارش کی نگاہیں جھکی رہیں۔  
 ”خبر کرنے کی ضرورت اور تعلق کہاں رہ گیا ہے

ماریہ!

”کیوں؟“ ماریہ کی پیشانی پر شکنوں کا جال بن  
 گیا۔ زارش خاموش رہی، لیکن اس کی جھکی جھکی  
 نگاہیں پانیوں سے بھر گئیں۔ وہ پانی اتنا شفاف تھا کہ اس  
 کے اندر کی کیفیت عیاں کر رہا تھا، لیکن وہ تصدیق  
 چاہتی تھی۔

”زارش آئی۔ کیا ہوا۔ آپ رو کیوں رہی  
 ہیں۔“ وہ اس کے قریب آئی اور اسے اپنے شلے  
 سے لگا لیا۔

”کوئی بات نہیں ہے۔ تم سناؤ کیسی ہو۔ گھر میں  
 سب کیسے ہیں۔ بڑے دنوں سے رادیو بھا بھی نے بھی  
 چکر نہیں لگایا۔ کیا کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہم لوگوں  
 سے؟“

”آئی ایسا مت بولیں۔ آپ اتنی پیاری اور اچھی  
 ہیں کہ کوئی غلطی کر ہی نہیں سکتیں۔ کوئی آپ سے خفا  
 نہیں ہے۔ بس میں ایک مسئلے کی وجہ سے بہت  
 پریشان ہوں اور رادیو بھا بھی ماما کی غیر موجودگی کی وجہ  
 سے خاصی مصروف ہیں۔ ورنہ یہ ہوسکا ہے کہ وہ ادھر  
 نہ آتیں۔ ہاں زارش آئی آپ کی ان درجنوں دوستوں  
 کا کیا حال ہے جو آپ کے آڑے وقت آپ کے ارد  
 گرد ہوتی ہیں۔“

”سب ٹھیک ہیں۔ کیوں خیریت؟“  
 ”مجھے آپ کی دوستوں سے ملنا تھا۔“  
 ”کیوں کچھ تاؤ سہی؟“

”ہاں سب خیریت ہے۔ بس کام تھا۔“  
 ”دوستیں تو کئی ایک ہیں۔ کیا خبر تم کس سے ملنا چاہ  
 رہی ہو، لیکن ماریہ تم ان سے مل کر کرو گی کیا؟“  
 ”جو کچھ ارحم بھائی چاہتے ہیں وہ ہی کچھ۔“

زارش نے بے یقینی سے ماریہ کے چہرے کی طرف  
 دیکھا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے آپ بھی ان کی سرگرمیوں سے  
 ناواقف نہیں ہیں اور یہ سب ان پر ہی منحصر ہے کہ وہ  
 کیا چاہتے ہیں۔ اپنا ہر فیصلہ وہ خود کرتے ہیں اور ہمیں  
 تو سدا بھائیوں کے احساسات کا تحفظ کرنی ہے۔ سو

مجھے بھی سارا صاحبہ کو دیکھنا ہے ملنا ہے کہ میرے بھائی  
 کی نئی پسند کیسی ہے۔ ایسے کون سے سرخاب کے پر  
 لگے ہیں اس میں کہ وہ آپ کو نظر انداز کر گئے۔“  
 وہ ماریہ کے طنز کو نہ سمجھ سکی۔ پلکوں پر انکے موتی  
 پُپ کر کے گرنے لگے۔

”تو یہ سچ ہے ماریہ ارحم سارا سے شادی کرنا چاہتا  
 ہے۔“

”آپ جانتی ہیں؟“ اسے حیرت کے جھٹکے لگتے  
 محسوس ہوئے۔

”ہاں۔“ اس نے مختصر کہا۔  
 ”اور آپ خوش ہیں؟“ وہ ابھی تک حیرت میں  
 تھی۔ زارش خاموش رہی۔ کتنی بھی کیا۔  
 ”وہ تو آپ کی جاں نثار قسم کی دوست تھی۔ وہ دوستی  
 کہاں چلی گئی۔ محبت کو موت کیسے آگئی؟“

”ہر چیز فنا ہے۔ ہر چیز کو زوال ہے۔ تو پھر محبت ہی  
 کیا حیثیت رکھتی ہے۔“  
 ”لیکن حقیقت بھی تو معلوم ہو؟“

”جانے دو ماریہ، ساری بات تقدیر کی ہوتی ہے۔  
 میں اسی میں بھی راضی ہوں۔ سہاگن وہ ہی جو پیا من  
 بھائے۔“

”آپ پلیز میرے ساتھ کسی کو بھجوا دیں۔ میں  
 سارا کے گھر جانا چاہتی ہوں تاکہ ماما کے آنے تک  
 راستہ ہموار ہو جائے۔“

”ہاں ماریہ تمہاری بات ٹھیک ہے۔ اگر مجھے وہ  
 بتا دیتا تو مجھے اس کی راہ میں آنے کی ضرورت بھی نہیں  
 تھی۔ میں تو بس بے وقوفی کر گئی۔ اس نے اپنی مرضی کا  
 فیصلہ کر لیا ہے تو مجھے اس میں خوش ہونا چاہیے۔  
 ویسے بھی زبردستی تو نہیں کی جاسکتی کسی بھی معاملے  
 میں۔ خاص طور سے زندگی کے بارے میں۔ کیوں کہ  
 دنیا میں انسان ایک بار آتا ہے اور اسے پورا حق ہے کہ  
 اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنی زندگی  
 گزارے۔“

میں جاری ہوں۔ کچھ دیر میں آجاؤں  
 گی، خدا حافظ۔“ وہ زارش کے دکھوں میں اضافہ کر کے

چلی گئی۔ وہ خالی دل و دماغ سے کمرے کی درو دیوار کو  
 تکتی رہ گئی۔ کیا کہتی، کیا سوچتی۔ سب کچھ ایک بے درد  
 سنگدل پتھر انسان نے چھین لیا تھا۔  
 وہ بھر بھری ریت کی طرح ڈھلے گئی۔ ریت اس کے  
 آنکھوں میں چبھنے لگی تھی۔

\*\*\*

اس کے خاندان میں بزرگوں، رشتوں کا حقوق کا  
 بہت زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔ تب ہی تو دادا جان نے  
 اسے پیدا ہوتے ہی کامران سے وابستہ کر دیا تھا۔  
 کامران اس کا فرسٹ کزن تھا۔ میٹرک کے بعد ہی آیا  
 جان نے اسے مزید تعلیم کے لیے لندن بھجوا دیا تھا۔  
 ان دنوں وہ ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ چھ سات  
 سال بعد وہ لوٹا تو بھرپور جوان تھا۔ ایک دم سن و سپید  
 بھورے بال، سفید موتیوں جیسے چمکتے دانت۔ وہ ایک  
 خوبصورت جوان تھا۔ وہ تھوڑا سیر میں بھی جب کامران ایک  
 کامیاب انجینئر بن کر وطن لوٹ آیا اس کے طرز زندگی  
 میں مغرب کے انداز رچ بس گئے تھے جن سے بننے  
 کے لیے وہ ایک انچ بھی تیار نہ تھا، لیکن زارش ایک  
 خالص مشرقی لڑکی تھی۔ شرم و حیا کا پیکر، کامران کے  
 آتے ہی شادی کی دھڑلہ فکس کر دی گئی اور دادا جان  
 نے کامران سے اس کا پرہ کر دیا۔ آنے کے بعد  
 کامران نے اسے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا اور پھر کچھ  
 دنوں بعد وہ دلہن بن کر اپنے تایا جان کے گھر میں جوان  
 کے گھر سے ملحق تھا۔ اتر آئی۔ زارش کے دل میں  
 چاہت تھی، پیار تھا، سنے تھے، ارمان تھے۔ جلد عروسی  
 میں کامران سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی جسے اس نے  
 سدا اپنی ملکیت سمجھا تھا۔ وہی کامران اس کے سامنے  
 تھا۔

”زارش یہ بندھن مبارک ہو۔“ اس نے پہلی بار  
 زارش کو مخاطب کیا تھا۔ اس کا سر جھک گیا۔  
 ”کیسی انوکھی بات ہے، شرم اسی سے جس کے  
 ساتھ عمر گزارنے کا عہد و پیمان اور تمام جملہ حقوق  
 کاغذوں پر اپنے نام لکھوا چکا ہوں جن کاغذوں کے



ذریعے ہم شرعی اور قانونی طور پر ایک مقدس بندھن میں بندھ چکے ہیں نکاح کے ان تین لفظوں سے تم نے اپنا آپ میری سپردگی میں دینے کا عہد ہی تو کیا ہے بھر یہ شرم و حیا یہ رسمی تکلفات بے کار ہیں اور تم جانتی ہو میں تکلفات کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ مجھے تیز رفتار دنیا میں ساتھ دینے والی بیوی کی ضرورت ہے یہ ڈیکوریشن میں نہیں یوں جوجج کر سامنے آو تو میں ایسی صورت دیکھ کر ہنس پڑوں اور تم خفا ہو جاؤ۔ تم ان لغویات سے چھٹکارا کر انسان بن کر آؤ۔

وہ اس کو بھاری گھونگھٹ کی اوٹ سے دیکھنے کی ہمت بھی نہ کر سکی۔ اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں بھیگ گئی تھیں وہ اس کے حکم کی تعمیل نہ کر سکی اور اسی انداز میں خود میں کھٹی بیٹھی رہی۔

”میرا خیال ہے تم نے میری بات سن لی ہے۔ ہری اپنی آئی وائٹ ٹوٹیک سم ریسٹ۔“

جانے کیا ہوا کہ وہ بے جان قدموں سے چلتی ڈرننگ روم تک آگئی۔ ٹائٹ ڈریس پہنے بھاری زیوروں کی قید سے آزاد میک اپ سے دھلا نکھرا صاف ستھرا چہرہ لیے اس کے سامنے تھی۔

اور کامران بیڈ پر نیم دراز تھا۔ بے نیاز سا۔ جیسے آج کوئی اہم واقعہ نہ ہوا ہو۔ جیسے زارش کے وجود کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور ضبط کرنے کی کوشش میں سینے میں درد سا اٹھ رہا تھا جسے دبانے کی کوشش میں ناکام ہو گئی تھی۔

\*\*\*

شادی پر کامران پندرہ دن کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ جیسے تیسے یہ دن کئے اور وہ اسے لیے دینی آگیا۔ زارش کے لیے زندگی بہت مشکل ہو گئی تھی۔ بہت زیادہ مشکل اور دشوار ترین۔ اس کی مصروفیات گھر اور کالج تک محدود تھیں، لیکن کامران اسے گھر سے نکال کر غیر ملک تو لے ہی آیا تھا اور یہاں ابگ سوشل زندگی بھی

اس کی منتظر تھی جبکہ وہ اس زندگی کی عادی نہ تھی۔ آئے دن دعوتیں پارٹیاں کلب مختلف قسم کی تقریبات۔ آفس سے آتا تو کہیں نہ کہیں جانے کا پروگرام ہوتا۔ مخلوط محفلیں، شراب، جوا، عورت شیوں انتہائی مذہب انداز میں ان لوگوں کی زندگی میں شامل تھے۔ زارش وہی سادہ سے ماحول میں پرورش پانے والی لڑکی تھی۔ اس کی وہ ہی سادگی برقرار رہی۔ وہ اکثر سادہ لباس میں اس کے ساتھ چلتے کو بادل ناخواستہ تیار ہوتی۔

”زارش بیگم۔ لوگ تمہیں میرے حوالے سے جانتے پہچانتے ہیں خود کو بدلو، اگر ڈلگتی ہو اس گز بھر کی چٹیا کے ساتھ اور یہ لباس کوئی پہنے کا ہے وہ ڈبسل کہاں ہیں جو تمہیں لا کر دیے تھے میک اپ کرنے کا ڈھنگ تمہیں آتا تو بیوی پار لہی جایا کرو۔ کیا ہو گا خرچ میں تھوڑا سا اضافہ ہو جائے گا، لیکن عزت تو رہ جائے گی۔ جیسے تم تیار ہو کر جاتی ہو تو ایک نگاہ بھر کر دیکھنے کو دل نہیں چاہتا جب میرا یہ حال ہے تو باقی لوگوں کا تو منہ کڑوا ہو جانا ہو گا۔“

وہ کبھی بھی اس ماحول کا حصہ نہیں بن سکتی تھی اور نہ ہی وہ کامران کا مغربی انداز اپنا سکتی تھی۔

اس گھر میں آنے سے چھ ماہ سے زائد عرصہ ہو گیا تھا۔ کامران کی شخصیت کے کئی پہلو کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ مغربی طرز معاشرت نے اس سے کردار کی ساری خوبیاں جو ایک مسلمان مرد کی ذات کا حسن ہوتی ہیں چھین لی تھیں۔ وہ خود دن میں متعدد لڑکیوں سے بات کرتا۔ کئی ایک سے راہ رسم رکھتا ایک آدھ سے اپنی شام کارنگین تصور رکھتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی بیوی بھی اسی انداز کو اپنالے تاکہ دوست اس کی بیوی کے حسن سے مرعوب ہوں۔ اس کے اخلاق سے متاثر ہوں اور اسے ایک سوشل عورت سمجھیں، لیکن زارش ان خیالات سے سمجھوتا نہیں کر سکتی تھی۔

اس کا تعلق ایک ایسے گھر سے تھا جہاں لڑکیاں

اپنے بھائیوں سے بھی ایک حد کے اندر رہ کر بات کرتی تھیں۔ جہاں گزرتے ان کا تعلق صرف سلام کی حد تک تھا۔ جہاں والدین والدہ کے سامنے اونچی آواز میں بھی بات کرنے کا دستور نہ تھا۔ باہر نکلتے وقت خود کو سیاہ چادر کے لباوے میں چھپا لینے والی زارش خود کو غیر مردوں کے سامنے بے پردہ کیے کر دیتی۔ اس بات نے اختلاف کی صورت اختیار کر لی اور اختلاف نے فاصلے بڑھانے شروع کر دیے۔ روز بہ روز ان فاصلوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ فاصلے علی بن کردوئوں کے درمیان حائل ہو گئے۔ ان ہی دنوں ایک نیا خاندان ترکی سے آکر دی میں آباد ہوا اور اس کے ساتھ ہی وفا اور کامران پہلی ملاقات میں ہی ایک دوسرے کے اسیر ہو گئے۔

اب کامران زارش کو کلب جانے کو نہ کہتا، فیشن کا اصرار نہ کرتا۔ دوستوں کو بھی گھر پر نہ بلاتا۔ اس کے بن تو ملازمت کے سلسلے میں باہر گزرتے تھے شامیں اور رات کا بیشتر حصہ باہر ہی گزرتے لگا۔ زارش کسی ناکارہ شے کی طرح اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئی۔ گھر بھی بہت کم بات ہوتی اور جب ہوتی تو لحد بھر کی پلچل زندگی کا پتا دے جاتی۔ وہ دن آخری دن ثابت ہو گیا جس دن وفاتے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر وہ زارش کو طلاق دے دے تو وفا اس سے شادی کر سکتی ہے۔

زارش کو اس کی خبر نہ تھی، لیکن کامران نے ایک منصوبے کے تحت اسے پاکستان بھجوانے کے انتظامات مکمل کر لیے۔

”زارش میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔“ زارش استری کر رہی تھی اس کے ہاتھ ایک دم استری کے ہینڈل پر رک گئے۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے کامران کے چہرے کو دیکھا جو سنجیدگی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

”یہاں رہ کر تم کافی بور ہو چکی ہو۔ کچھ دن پاکستان رہ آؤ۔ میں چند ماہ میں آ جاؤں گا۔“

”لیکن میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ نہ ہی آپ سے

پاکستان جانے کا اظہار کیا پھر ایک دم کیوں۔؟“

”گھر سے باہر نکلتا تمہیں پسند نہیں، تقریبات میں شریک ہونا تمہارے نزدیک دنیا کا سب سے برا گناہ ہے تو خود جتاؤ کیا یہ سب ٹھیک ہے ہر وقت گھر میں قید رہتی ہو جبکہ میری طرف سے تم پر ایسی کوئی پابندی نہیں مگر تم خود ہی اپنی دشمن بن گئی ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں ہر طرح سے سمجھایا، لیکن اپنی کوششوں میں ناکام ہو چکا ہوں، تمہاری نہاں میں نہ بدلی۔ تو ایسی صورت میں نے سوچا تمہیں پاکستان بھجوا دوں تاکہ فریش ہو کر یہاں لوٹو۔ دل و دماغ پر کوئی بوجھ نہ ہو اور ہو سکتا ہے یہ عارضی دوری، ہمیں ایک دوسرے کے قریب اور فاصلے ختم کرنے میں معاون ثابت ہو۔ ہماری کوئی بہتری ہی ہے۔ کچھ اچھا ہی ہو جائے اور تمہاری نیگیٹیو سوچیں مثبت رخ اختیار کر لیں۔“

وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔ چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی اور پھر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

”تم اپنی تیاری کر لو اور چاہو تو میرے ساتھ چلنا کچھ شاپنگ کر لینا اور سب کے لیے گفٹس لے لیتا۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ بہت سارے ڈریسز میرے پاس ان چھوٹے پڑے ہیں۔“

”اور گفٹس۔؟“

”اس کی بھی ضرورت نہیں۔“ اس نے اسی طرح نارمل لہجے میں کہا۔

”ہو سکتا ہے تمہارے گھر والوں کو ضرورت نہ ہو، لیکن میرے گھر والے ضرور غصہ ہوں گے مجھ پر۔ بہر حال میں خود ہی لے آؤں گا کچھ نہ کچھ۔ تم اپنی تیاری رکھو۔ کسی وقت بھی جاسکتی ہو۔“

اس نے ایک بار پھر غور سے کامران کی بات سنی اور اس کے چہرے کو دیکھا اور سر کو اثبات میں ہلادیا۔

\*\*\*

زارش اپنے بھول پن اور سادگی سمیت اپنے گھر واپس آ گئی۔ نیا جان اور نئی جان اس کی آمد پر بہت خوش ہوئے۔ انی زارش کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔



ارشاد کو تشویش ہوئی۔ وہ صحت مند چاق و چوبند سرخ و سپید زارش کے بجائے بڑیوں کا ڈھانچہ تھی۔  
 ”کیا ہوا؟ اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہو؟ میکا یاد آتا رہا؟“  
 اب وہ ہوا اس نہ آئی۔ کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟ آخر کیا ہوا؟ کامران نے تمہارا خیال نہ رکھا۔ تم خوش تو ہو اس کے ساتھ یا پھر کوئی اور بات ہے؟“  
 ”تمہاری گود بھی ابھی تک سونی ہے۔ کہیں یہی وجہ تو نہیں؟“  
 ”آخر کچھ بتاؤ گی تو معلوم ہو گا۔“

سوال اس کے ارد گرد منڈلاتے رہتے اور وہ خاموشی سے سنتی رہتی۔ کسی بھی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس یہ مسئلہ کیسے حل ہونا تھا وہ تو خود ابھی رہتی، لیکن کچھ سمجھ نہ آتا۔  
 پھر جلد ہی سب کی سمجھ میں آگیا۔ ابھی گتیاں سلجھ گئیں کامران کا خط ارشاد صاحب کے نام تھا۔ کامران کا خط طلاق نامہ اور ساتھ میں مہر کی رقم کا ڈرافٹ۔  
 خاندان بلکہ زارش کے گھر والوں پر ہم کے دھماکے کی طرح پھٹا تھا کہ پورے خاندان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

کامران نے اس کی ذات کے آئینے کو ایک ٹھوکر میں کرچی کرچی کر دیا تھا۔ طلاق نامہ کیا تھا ان تین لفظوں میں اس کے ناکرہ گناہوں کی ایک کہانی تھی۔ کامران نے اس پر بد چلنی کا الزام لگایا تھا۔ اس کے کردار پر کاری ضربیں لگائی تھیں۔ اپنے دوستوں سے اس نے اس کی بے حیائی کے قصے منسوب کیے تھے۔ اس نے لکھا تھا کہ ایک غیرت مند مرد ہونے کے سبب وہ یہ سب برداشت کرنے سے قاصر تھا۔ لہذا اس نے آسان راہ اختیار کرتے ہوئے زارش کو طلاق دے دی۔

اس دن گھر میں ماتم برپا تھا۔ ارشاد ایک کونے میں منہ چھپائے آنسو بہا رہے تھے امی سینہ کو پی کر رہی تھیں۔ بیٹی طلاق کا کلنک لیے دبیز برآں بیٹھی تھیں۔ روحی حیران تھی جنید اور وقار کم عمر تھے، لیکن یہ بات

ان کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی۔ دادا جان بے چارے صدے سے گنگ ہو کر رہ گئے تھے۔ دادی جان نے کامران کو کوسا۔ تایا جان شرمندہ تھے، لیکن مائی جان کسی کی سننے کی روادار نہ تھیں۔ سارے عیب انہیں زارش میں نظر آئے۔ زارش کا دل جل گیا۔ دادا جان نے تایا جان سے قطع تعلق کر لیا۔ ارشاد دل برداشتہ ہو کر یہ گھر ہی چھوڑ گئے۔ انہوں نے دوسرے شہر ٹرانسفر کر دیا۔ سرکاری رہائش گاہ ملنے پر بیوی بچوں کو بھی وہیں بلوا لیا۔



پورے ایک سال زارش صدے سے بستر سے نہ اٹھ سکی۔ یہ حادثہ جان لیوا تھا۔ معاشرے میں طلاق یافتہ عورت کی اہمیت سے وہ آگاہ تھی۔ پھر لوگوں نے اس کی طلاق سے قصے وابستہ کیے تھے۔ وہ تو اسے مار ڈالنے کو کافی تھے۔ کسی نے کامران کو قصور وار نہ ٹھہرایا تھا۔ ہر ایک کا خیال تھا۔ عیب زارش کی ذات میں تھے۔ نئے شہر نئے لوگوں میں اگر ان باتوں سے نجات مل گئی تھی۔ دل کے زخم تھے تو سہی، لیکن ان پر کھربند آگئے تھے امی نے اسے سنبھالا۔

روحی نے حوصلہ بخشا۔ جنید اور وقار نے اپنی خوب صورت باتوں سے اس کا دل بھلایا، لیکن اس کا ٹوٹا دل پھر نہ جڑ سکا۔ ارشاد نے فیصلہ کیا کہ دل بھلانے کو اپنی ادھوری تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کرے اور روحی کے ساتھ کالج جانا شروع کرے، لیکن زارش نے کہا کہ وہ بی اے پرائیویٹ کرے گی اس کے بعد مزید تعلیم ریگولر حاصل کرے گی اور اس مقصد کے لیے اس نے اکیڈمی جوائن کر لی اور اس نے بی اے بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا اور اب ایم اے میں داخلے کے لیے ارشاد صاحب نے ہی اصرار کیا بلکہ اس کے لیے داخلہ فارم بھی لے آئے۔

وہ جاب کرنا چاہتی تھی، لیکن ایک بار پھر پاپا کے اصرار پر اس نے فیصلہ کرنے اور عمل کرنے میں ہی چین پایا۔ اس نے ماس کیونی کیشن میں ایڈمیشن لے

لیا۔ ساتھ ہی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتا شروع کر دیا۔  
 وہ بیڈ مشن کی بہت اچھی کھلاڑی تھی اور اس نے بیٹھ اپنے اسکول کالج کو فرسٹ پرائز سے ہی نوازا تھا۔ شادی کے بعد تو وہ سب کچھ جیسے بھول ہی گئی تھی، لیکن یونیورسٹی جوائن کرتے ہی اس کے اندر کی سونی کھلاڑی لڑکی پھر سے بے دار ہو گئی اور وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی۔

یونیورسٹی جانے پر اس کے شب و روز میں تبدیلی آگئی تھی۔ وہ کتابوں اور اپنے کھیل میں گم ہو گئی۔ سب کچھ دل سے کھرچنے بھلا دینے کی کوشش میں اس نے کتاب زندگی سے کامران کی سنگت میں گزرے دنوں کے ذکر کے اوراق ہی بھاڑ ڈالے۔ والدین اپنی نظروں میں مجرم بنے ہوئے تھے۔ زندگی کا اہم فیصلہ انہوں نے بزرگوں پر چھوڑتے ہوئے اپنی بیٹی اور کامران کے مزاج و عادات کے فرق کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ ایسی ہولناک تباہی کی صورت ملا۔

سب کچھ اپنی جگہ درست، لیکن ستم پر ستم تو ایک اور ہوا تھا دشمن و غدارے تو صدمہ اتنا جان لیوا نہیں ہوتا جو دوستوں کی جفا لیا کرتی ہے۔ راہزن لوٹ لے تو معمول کی ایک حرکت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہوش تو تب لگتے ہیں جب راہزن لوٹ لینے کی ٹھان لیں۔ کامران نے نہیں دھوکہ تو ارحم عرفان نے کیا تھا۔ زبردست دھوکہ محبت کے حسین جذبوں میں لپٹا ہوا دھوکہ۔

ارحم سے اس کی پہلی ملاقات ایک ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی آخری پریڈ فری تھا۔ سو وہ گھر چلی آئی راستے میں سڑک پر وہ اس کی گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے پچی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی کہ گاڑی کے بریک چرچائے شامل اس نے گاڑی تیزی سے واپس لا کر اس کے قریب روکی تھی۔

”محترمہ مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو خود ہی مرنے کے لیے کسی غریب کو اپنے ساتھ کیوں کھینچتی ہیں کیوں

کہ اس غریب نے ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔“ اس نے ایک دم اسے دیکھا۔  
 ”جی، کیا ہوا؟“

”بہت کچھ ہو جاتا بس خدا کی مہربانیاں ساتھ تھیں ورنہ آپ نے تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ کسی فلاسفر کی روح آپ میں سمائی ہے۔ تو کوئی کونا کھدرا سنبھالے گھر کا۔ دنیا کا کسی پارک کا؟ یہ سڑکیں آپ کے فلسفے کا بار نہیں سہہ سکتیں۔ دھوا رہ جائے گا سارا فلسفہ اور آپ تشریف لے جائیں گی اگلی دنیا میں۔“ وہ سخت غصے میں تھا جو منہ میں آیا کہہ گیا۔  
 ”معذرت خواہ ہوں، غلطی میری ہے، آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔“

”ہونا بھی نہیں چاہیے۔ دیکھیے نا محترمہ مجھے تو مرنے کا شوق نہیں۔ مئی کی دل جلے اس دنیا سے عاجز ہوں گے۔ چڑھا دیں گے آپ پر گاڑی اور اوس۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”معاف کیجیے۔ میں نے خواہ مخواہ ہی فرض کر لیا کہ آپ کو مرنے کا شوق ہے اگر ایسا نہیں ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ بہر حال اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ کو خیال رکھنا چاہیے۔ سڑک سوچ بچار کی جگہ نہیں ہے۔“

”آپ کی اطلاع کا بے حد شکریہ۔ سڑک واقعی سوچ بچار کی جگہ نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں از حد شجیدگی تھی۔ وہ قدم بڑھا کر چلنے لگی۔ اس نے اپنی راہ لی ایک دو دن گزر گئے۔ روحی کا بخار اتر گیا تو وہ بھی ساتھ ساتھ آنے لگی اسی سڑک پر وہ دوسری بار مل گیا۔ گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے اس نے قریب آکر آواز بلند کیا۔

”میری نصیحت پر عمل کرنے کا بے حد شکریہ۔ ورنہ کسی دن آپ کی جان چلی جاتی اور مجھے خواہ مخواہ دکھ ہوتا۔“ وہ سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ گاڑی دور نکل گئی تھی۔

بہت سارے دن گزر گئے اس سڑک پر وہ اکثر نظر آ جاتا کبھی آتے ہوئے کبھی جاتے ہوئے، لیکن زارش



نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔ یونیورسٹی کی ایک تقریب میں وہ مہمانوں کی قطار میں نظر آیا۔

تقریب ختم ہو گئی۔ رات ہو جانے کے ڈر سے وہ جلد گیٹ کی طرف آگئیں۔ وہ اپنی سیاہ کڑیاں پورس کر رہا تھا جو گاڑیوں کی قطار میں پھنسی کھڑی تھی۔ وہ سڑک پر آگئیں۔ ٹیکسی کے انتظار میں۔

”کہاں جاتا ہے آپ کو؟“

”ہمیں نزدیکی ہے۔“ راجی بول اٹھی۔

”برانہ لگے تو آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔“

”معاف کیجیے مسٹر۔ گھر جانے کے لیے ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہمیں اپنے گھر کا راستہ معلوم ہے۔“ زارش کے لہجے میں تندی تھی۔

”یونیورسٹی میں نے تو اخلاقی طور پر بلکہ انسانی ہمدردی کے تحت کہا تھا۔ آپ کی مرضی نہیں تو نہ سہی۔“ اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔

”تم حد سے زیادہ بد اخلاق اور بد مزاج ہو۔“ راجی نے غصے سے کہا۔

”بد مزاجی کی کیا بات ہے۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ لڑکوں سے لفٹ لینے کا اور آج کل لڑکے تو ویسے ہی ہمارے ڈھونڈتے ہیں راہور سم بڑھانے کے۔“

”ارے کون سی تفریح حاصل کر لیتا ہم۔ ذرا دیر میں گھر پہنچ جاتے، لیکن نہ جانے کیوں تم اتنی وقتاؤسی۔“

”اگر وہ ہمیں کیس اور لے جاتا تو۔۔۔؟“

”کہاں لے جاتا۔؟“ راجی کے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔

”مصور تو ایسی نہیں ہے۔ کھانا نہیں۔“

”مصور توں پر مت جاؤ۔ اکثر بھولی صورتوں والے ہی غضب ڈھاتے ہیں۔ منہ مومنوں کے اور کام شیطانوں کے۔“

”لوگوں کے بھید خدا بہتر جانتا ہے۔“ راجی نے پھر دھیرے سے کہا۔

”تو پھر تم ضد مت کرو۔“ زارش اس بار تلخ ہو گئی۔

”اچھا بابا، بہت ہو گیا۔ اس موضوع پر کوئی بات

نہیں کرنا چاہتی میں۔“

”شکر ہے۔ جان تو چھوڑی اس بے چارے کی۔ اب تک تو وہ اپنی مطلوبہ جگہ بھی پہنچ گیا ہو گا۔“

”بھی کیس سڑک پر ہی گاڑی دوڑا رہا ہو گا کہ کوئی حیدر لفٹ کرائے۔“

”ہاں مل جائے گی کیوں کہ آج کل کی لڑکیوں نے خود ہی گر لیا ہے خود کو ورنہ ان مردوں کی یہ مجال۔“

”اور تم کیا کرنے چلی تھیں محترمہ۔“

”لو باتوں ہی باتوں میں گھر آ گیا۔ یہی تو میں چاہتی تھی۔ اس کی برائیاں کرتے ہوئے سفر کرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔“

”ہونہ۔“ زارش کو غصہ آ گیا اور وہ گھر میں داخل ہو گئیں۔

سلسلہ شب و روز چلتا ہی رہا وہ ایم اے کے فائنل ایئر میں آگئی کہ پنجاب اسپورٹس ٹیم کا آغاز ہو گیا۔ جس میں پنجاب بھر سے اسکولز کا بجز اور یونیورسٹیز نے بھی شرکت کی۔ زارش نے والدین کی مرضی سے یونیورسٹی کی طرف سے ان گیمز میں حصہ لیا اور اس وقت نہ صرف اس کے والدین بلکہ یونیورسٹی کا اسٹاف بھی حیران رہ گیا۔ جب اس نے بیڈمنٹن کے مقابلے میں پنجاب بھر میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ وہ ایک دم پرنٹ میڈیا، الیکٹرونک میڈیا کی نظروں میں آ گئی۔ اسے فل کورج دی گئی۔ اس کے والدین بہن بھائیوں کے خوشی سے زمین پر پاؤں نہیں ٹک رہے تھے۔ بہت ساری کامیابیاں اور انعامات کے ساتھ وہ گھر لوٹی تو ماں باپ نے اسے گلے سے لگالیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کتنی کٹھن دشواریوں کے بعد آج وہ حقیقتاً خوش تھی۔

اسی شام جب زارش کی کلاس فیلوز اسے مبارک باد کہنے کے لیے اس کے گھر جمع تھیں کہ ان کے گھر کے چھوٹے سے گیٹ پر سیاہ کڑیاں آن رکی۔

”ہیلو مس زارش ارشاد۔“ گاڑی والا نوجوان اس

کے سامنے کھڑا تھا۔

”اس کامیابی پر مبارک باد کہنے سے پہلے اپنی حیرانی کا اظہار ضرور کروں گا یقیناً نہیں آتا کہ بارہا میری گاڑی سے ٹکرانے اور خودکشی کرنے کی کوشش کرنے والی ایک لڑکی اس قدر اچھی کھلاڑی ہوگی۔ سبالی کارڈ دیکھنے میں آپ اس قدر ذہین اور اچھی اسپورٹر نظر نہیں آتیں۔“

میں آپ کے شہر کے ایک کثیر الاشاعت روزنامے میں جزوقتی جاب کرتا ہوں اور آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ میں آپ سے انٹرویو کے لیے وقت لینے آیا ہوں۔ کیا اس وقت میری آپ کے والد صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“

زارش نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

”بندہ ناچیز کو ارتم عرفان کہتے ہیں۔ ہو سکے تو والد صاحب سے عرض کیجئے کہ ”روزنامہ حقائق“ کی طرف سے ارتم ملاقات کا منتہی ہے۔“

”اندر آجائے میں پیاسے کھتی ہوں!“

”وہ اس کے پیچھے چلا آیا۔ اسے دیکھ کر زارش کی کلاس فیلوز کا گروہ اس کی طرف لپکا۔ زارش گھبرا گئی۔ ان کے ڈرائنگ روم کا دروازہ باہر نہیں تھا بلکہ ڈرائنگ روم تک پہنچنے کے لیے گھر کے اندر سے ہو کر جاتے تھے اور اس وقت زارش کی فریڈز صحن میں بیٹھی تھیں۔“

”یہ ارتم ہیں۔“ روزنامہ حقائق کے سب ایڈیٹر نانکھ کی معنی خیز مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ سائیک کی نظروں میں اچانک ور آنے والی مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔

”لو کیاں اسے دیکھ کر کھسک پھر کر رہ گئیں۔ وہ اسے لے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ اسے بٹھا کر باہر آ گئی۔ پایا کو دیکھنے لگی تو وہ نماز عصر کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ وہ نمی کو بتا کر اپنی دوستوں کے پاس آ گئی۔ ان سب نے اس سے ملنے کی خواہش کی اور وہ بھی زارش سے کچھ معلومات بہ مل کر ناچا ہوتا تھا۔ ممی کی اجازت سے وہ ان کو لے کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

ارتم نے ایک نظر اس گروپ پر ڈالی اور بڑے اعتماد سے بیٹھا رہا۔ تو نانکھ نے سلسلہ گفتگو شروع کیا۔

”تو ایک پوزیشن ہولڈر لڑکی کا انٹرویو کرنے آپ خود بہ نفس نفیس تشریف لائے ہیں۔“

”جی ہاں کیونکہ ایسے لوگ مجھے از حد اپیل کرتے ہیں۔“

”اور وہ بھی۔“ لڑکی۔ ”زوردار قہقہہ پڑا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ اتنے میں زارش کے پایا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ جہاں زارش اس کی دوستیں ارتم اور فوٹو گرافر موجود تھا اور جب راجی مختلف کھانے پینے کی چیزوں سے بھری ٹرالی کھینچتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اس نے زارش سے سرگوشی میں کہا۔

”لو نکل آیا تا شریف زادہ۔ تم اس پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھیں۔ کسی اخبار کا سب ایڈیٹر کوئی غنڈہ بد معاش نہیں ہوتا۔“ وہ خاموش رہی وہ اسے لے کر کمرے میں آئی اور بولی۔

”میرا خیال ہے ڈریس چنچ کر لو اور ہلکا سا میک اپ بھی۔ اچھے انداز میں تمہاری تصویریں آئی چاہیں۔“

”ناگل ہو تم۔ مجھے کسی فیشن شو میں جانا ہے۔“

”میں چاہتی ہوں ارتم صاحب تمہاری اسپورٹس کے ہی نہیں حسن کے بھی قائل ہو جائیں۔“

”اتنا بڑا دھوکا کھانے کے بعد ایک بار پھر دھوکا کھاؤں میں۔ اس حادثے کے بعد میں جینے کے لائق بھی نہیں رہی تھی راجی تم سب کی وجہ سے تم سب کی خاطر زندہ ہوں۔ تم میری بہن ہو کر مجھ سے مذاق کرتی ہو۔ طنز کرتی ہو مجھ پر۔ مجھے ایسی باتیں پسند نہیں۔ اس کامیابی نے جو تھوڑی سی خوشی میرے حصے میں لکھی ہے تم اس کا احساس مجھ سے چھین لیتا چاہتی ہو۔ مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں اپنی تعلیم مکمل کر کے جاب کروں گی اور پایا کا ہاتھ بٹاؤں گی۔ ممی پایا کا بوجھ ہلکا کروں گی تم لوگوں کا مستقبل سنواریں گی۔ بس میری زندگی کا اہم مقصد یہی ہے۔“



”تم غلط سوچ رہی ہو۔ پاپا تمہارے لیے بہت فکر مند رہتے ہیں۔ تمہاری عمری کیا ہے۔ تم نے دنیا میں دیکھا بھی کیا ہے۔ پاپا کھلے دل کے مالک ہیں۔ فرسودہ رسم و رواج سے انہیں نفرت ہے۔ دیکھا نہیں نے شہر میں آکر کتنی تبدیلیاں آئی ہیں ان کے اندر۔ وہ تمہیں اپنے گھر میں خوش باش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہ سوچ غلط بھی نہیں ان کی اور ہو سکتا ہے یہ کامیابی قسمت کے دروازے کھول دے تم پر۔ اس کے گھر سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ دیر ہے اندھیر نہیں۔ اگر ایک چیز چھینتا ہے تو اس سے کئی گنا زیادہ بہتر اور مناسب عطا کرتا ہے۔ تم کیوں بھول رہی ہو اس کو۔“

”چھوڑو روحی تم بھی کیسی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو اور والدین اولاد کی محبت کے سامنے مجبور ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھیں اولاد کی خاطر خواب دیکھیں۔ لیکن میں نے ایسا کوئی خواب اپنی آنکھوں میں نہیں سچایا۔ یہ معاشرہ جس میں ایک گنواہی لڑکی کی شادی بھی ایک بہت بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ تو ایسے میں ایک طلاق یافتہ عورت کی دل جوئی کیسے کر سکتا ہے اور مجھ پر تو بڑے بڑے الزام ہیں روحی۔ آوارگی بد چلتی کے۔“

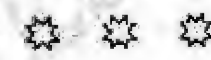
”صرف اس شخص کے لگائے الزامات جو خود بھی اس کردار کا مالک ہے اور دنیا اندھی تو نہیں کہ اس کی جھولی باتوں پر عمل کرے۔ تمہارا کردار اتنا صاف اور مضبوط ہے کہ آئینے میں دیکھ اور پرکھ سکتی ہے دنیا۔ آئینے پر گروہم جانے سے آئینہ وھندلا نہیں ہو جاتا اور نہ ہی خراب ذرا سا ہاتھ سے صاف کریں تو سارے عکس صاف نظر آتے لگتے ہیں۔ ندی کے شفاف پانی کی طرح ہو تم۔ دل سے سارے خیالات نکال دو اور بھول جاؤ گزری زندگی کے واقعات۔“

”کوئی کسی کے باطن میں نہیں جھانکتا روحی۔ سب ظاہر دیکھتے ہیں۔ تم یہ ذکر چھوڑو۔“

وہ روحی کی کوئی بات ماننے بغیر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور سادہ سے حلیے میں نکھرے نکھرے چرے اور جھکی آنکھوں کے ساتھ ذرا رنگ روم میں داخل ہو گئی۔ اس کے دوستیں باہر نکل آئیں۔

انٹرویو ہوا روحی نے چائے اور دیگر لوازمات سے ان سب کی تواضع کی اور جب ارحم واپس جا رہا تھا۔ تو زارش اسے خدا حافظ کہنے باہر تک چلی آئی۔

”مس زارش ارشاد۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ خوب صورت بیگنی آنکھیں اور نامور کامیاب لوگ مجھے بہت اپیل کرتے ہیں۔ اور خدا نے آپ کو دونوں چیزوں سے نوازتے ہوئے اپنا خاص کرم کیا ہے۔ آپ کی آنکھیں اور آپ کی کامیابی ہر دم یاد رہے گی مجھے۔“



زندگی کے شب و روز پھر اپنی روٹیں پر آگئے۔ ارحم یونیورسٹی آئے لگا تھا۔ وہ اکثر اسے مل جاتا۔ اصل میں چر نظرم کے شعبے سے متعلق طلباء کے آرٹیکل اکثر اس کے اخبار کے خاص ایڈیشن کی زینت بنا کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں وہ یونیورسٹی آیا کرتا تھا۔ اس سے سامنا ہو جاتا تو سلام دعا ہو جایا کرتی۔ ارحم بات بڑھانے کی کوشش کرنا لیکن زارش موقع نہ دیتی۔ اکثر اس کے ساتھ ’ہما‘ ساتھ اور نائلہ ہوتیں۔ جن سے زارش کی دوستی بے تکلفی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ ارحم ان سے گپ شپ کرتا تو ذہنی باتیں کرتا اور رخصت ہو جاتا۔

ایک دن میں وہ عقبی لان میں اپنی دوستوں کے ساتھ پراجن ہو گئی۔ لڑکیاں بے فکری سے قہقہے لگا رہی تھیں۔ جب ارحم اچانک وارد ہوا کتنی دیر دور کھڑا ان کی منتارہا اور جب زارش کی نظر اچانک اس پر پڑی تو ان طرف لپکا۔

”ہیلو مس زارش ارشاد۔ ہیلو ابوری پاؤی۔“

لڑکیاں خاموش ہو گئیں۔ زارش اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیسے ہیں آپ ارحم صاحب۔؟“

”اچھا ہوں۔ بلکہ بہت اچھا۔ شاید اتنی خوشی کبھی مجھے نہ ملی ہو۔“

”ایک زحمت دینا تھی آپ کو۔ اگر گوارا کریں تو۔“

”جی فرمائیے۔“

”اصل میں نے مقابلے کا امتحان پاس کیا ہے سنٹرل گورنمنٹ کا اور قریبی ضلعی ہیڈ کوارٹر۔ میرا مطلب ہے، ضلعی مقام پر اگم ٹیکس کے آئی ٹی کی حیثیت سے تعینات کیا گیا ہوں۔ میرے والد صاحب نے اسی خوشی میں ایک ضیافت کا اہتمام کیا ہے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں اپنے دوست احباب کو شریک کروں۔ لیکن ایک اچھی اسپورٹس گرل نہ جانے کیوں مجھے دوست لگی اور میں مدعو کرنے چلا آیا۔“

اس کے لمحے میں زمانے بھر کی سادگی تھی۔ خلوص تھا۔ زارش جو کامران سے قطع تعلقات کے بعد بے اعتباری کے صحراؤں میں کھو گئی تھی۔ اسے اس خلوص اور سادگی پر بھی شبہ تھا بلکہ اسے اس اتفاقات کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ اس گومو میں تھی کہ ارحم کی طرف سے برہمایا گیا کارڈ لے لیا نہ لے۔ کہ نائلہ نے وہ کارڈ لے لیا۔

”زبے نصیب کہ آپ مع اس کارڈ کے تشریف لائے۔ اس گونگی لڑکی کی طرف سے شکریہ میں ادا کرتی ہوں جناب اور اس کی شرکت کی ذمہ داری خود ہی اپنے سر لیتی ہوں۔“

زارش نے احتجاجی نظروں سے اسے دیکھا لیکن نائلہ نے اس کی ایک نہ سنی۔ اور کہے گئی جو بھی منہ میں آیا۔

”زارش میں بعد شوق و انبساط آپ کا انتظار کروں گا۔ اس نے سب کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ زارش خاموش رہی۔ وہ خدا حافظ کہہ کر واپس چلا گیا۔ وہ گھر پہنچی تو پاپا بھی آئے ہوئے تھے۔ ممی کچن میں تھیں۔ روحی کھانا چن رہی تھی۔

”تمہاری ممی کیا کر رہی ہیں؟“ ارشاد نے پوچھا۔

”آخری روٹی ڈال رہی ہے تو بے پراہمی۔“

”بھئی کینر جلدی آؤ۔ ایک زبردست خبر ہے۔“ انہوں نے اونچی آواز میں جیکم کو آواز دی۔ پاپا بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ممی فارغ ہوتے ہی چلی آئیں۔

”آج میرے آفس میں تمہارے بھائی آئے تھے۔“

”میرے بھائی۔؟“ ممی حیران تھیں۔

”ہاں بھئی وہ تمہارے ماموں زاد۔ انہوں نے خود ہی مجھے پہچانا، خود ہی تعارف کرایا۔ وہ اے سی صاحب کو کسی تقریب کا دعوت نامہ دینے آئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مجھ سے بغل گیر ہوئے۔ خود ہی بتایا کہ مجھے ان کا بہنوئی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ہمیں تو خبر ہی نہیں وہ روزنامہ حقائق کے مالک ہیں۔ بیٹے کو اعلا سروس مل جانے کی خوشی میں ایک دعوت کا اہتمام کیا ہے۔ انہوں نے ہمیں بھی مدعو کر دیا۔ بھئی زارش روحی آج کا دن نئے رشتہ داروں کی نذر۔ تیار ہو جانا شام کو جانا ہے۔ تمہارے ان ماموں صاحب نے کہا تھا نہ آئے تو خود لینے آجاؤں گا۔“

”مگر کیسے۔ وہ وہ ہی سب ایڈیٹر تو ان ماموں جان کے بیٹے نہیں۔“ قبل ازیں وہ کوئی بات کہتی۔ ارشاد نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔

”دور کیوں جاؤ تمہاری زارش کا انٹرویو کرنے والا تمہارے بھائی کا بیٹا ہی تھا۔ لیکن اس نے بتایا نہیں۔“

”کمال کرتے ہیں آپ بچے کو بھلا خواب آ جاتا کہ ہم اس کے رشتہ دار ہیں۔ خالد بھائی اپنی مصروفیات میں ایسے گم ہوئے کہ اپنے شہر کی راہ ہی نہ لی انہوں نے بچے عمر زوا قارب کو کیسے پہچانتے۔“

ممی جھٹ اپنے میکے کی حمایت میں بولنے لگیں۔ ارشاد مسکرائے۔

”تمہائی بات ہی روحی نے پر جوش لہجے میں کہا۔“

”ہرے“ وہ بندہ جسے تم شریف کہنے کی روادار نہ تھیں۔ اپنا رشتہ دار بھی نکل آیا۔ اب تو تم جان پہچانے میں کامیاب نہ ہو سکو گی۔“

”ہشت“ خاموش رہو، میں اس تقریب میں نہیں جاؤں گی۔ تم چلی جانا اور میری طرف سے اجازت ہے۔ اگر وہ شخص نہیں بہت اچھا لگتا ہے تو۔“

”آگے کچھ بھی نہیں کہنا۔ اس سے وابستہ خوب صورت جذبے تمہاری ذات کے سبب ہیں۔ ورنہ کچھ



بھی نہیں اور شام میں تمہیں ہر حال میں چلنا ہے۔ تمہاری حیثیت تو وی پی آئی ہو گئی ہے۔ دو دو کارڈز کے سبب۔ زارش ہنس دی۔

شام روتی ہوئے اہتمام سے تیار ہوئی۔ زارش نے اپنے لیے سادہ سے گرے سوٹ کا انتخاب کیا۔ وہ تیار ہو کر شرکت کے لیے روانہ ہو گئے۔ خالد احمد اور ارحم دونوں ہی گیٹ پر موجود تھے۔ ارشاد کی گاڑی کا دروازہ خالد احمد نے خود کھولا۔

”آئیے ارشاد۔“ ارحم بھی آگے بڑھا۔

”یہ خوشی کہ آپ میری عزیزہ بھی ہیں۔ چار گھنٹے پرانی ہو چکی ہے۔ لیکن اظہار پھر بھی فرض بننا ہے۔ موسٹ ویلکم مائی کزنز میرے گھر کا دروازہ خوشی کے ساتھ آپ کا منتظر ہے۔“

مئی نے ملاقات کی اس رسم کے بعد تحفہ ارحم کی طرف بڑھا دیا اور سب اندر چلے آئے۔ ضیافت کا اہتمام شاندار تھا اور زارش کا خاندان تو اب رشتہ داروں کی فہرست میں شامل تھا۔ سوسب لوگ اندر چلے آئے۔ لان میں معززین شہر کے لیے انتظام تھا۔ ارشاد خالد احمد کے ساتھ باہر چلے گئے۔ اندر تعارفی مراحل طے ہونے لگے۔ ماریہ نے زارش اور روتی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ارحم سے بڑے عدنان بھائی کی موہنی سی بیوی رادیہ سب سے خوش اخلاقی سے پیش آئیں۔ کافی خواتین جن کے کسی نہ کسی طور اس گھر سے تعلقات تھے۔ اندر موجود تھیں۔ زارش ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ”سر مئی شام اور آپ دونوں ہی خوب صورت اور قابل توجہ ہیں۔“ سرگوشی پر اس نے پیچھے دیکھا۔ درتپے کے قریب ارحم کھڑا تھا۔

”میری دعاؤں میں اتنا اثر ہو گا اس کا مجھے گمان تک نہ تھا۔ شکر گزار ہوں کہ مالک نے کئی خوشیاں ایک ساتھ میری جھولی میں ڈال دیں۔“

”ارحم صاحب پلیز۔ میں ایسی گفتگو پسند نہیں کرتی۔“

”میں بھی۔ لیکن سوچتا ہوں کہ آپ سے نہ کہہ

سکا تو عمر بھر ایک پچھتاوا میرا ساتھ رہے گا۔ میں نہیں آپ کو۔“

”اللہ ارحم بھائی۔ یہ کوئی چھپ جانے کا وقت ہے۔ کیا کر رہے ہیں آپ؟ چلیے بابا بلا رہے ہیں۔ سب سے آپ کا تعارف کرانا ہے۔“ ماریہ نے مداخلت کی۔ ارحم چلا گیا۔

سب نے کھانا کھا لیا۔ مہمان رخصت ہو گئے۔ خالد احمد اور ان کے اہل خانہ ارشاد فیملی سے باتیں کرنے لگے۔ ماریہ زارش اور روتی کو اپنے کمرے میں لے آئی۔ ایک اخبار کے مالک کی بیٹی بھی خاصا سیاسی اور اپنی ذوق رکھتی تھی۔ زارش اس کی لائبریری میں کھو گئی۔ جب کہ روتی اور ماریہ اپنے پسندیدہ گلوکاروں کی ویڈیو دیکھنے میں لگی تھیں۔ ارحم زارش کی طرف آنکلا۔

”زارش مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے آئیے دو منٹ باتیں کر لیتے ہیں۔“ زارش نے جو وقت گردانی کر رہی تھی کتاب بند کر دی۔

”میں بھی آپ سے بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ ارحم صاحب اور میرا خیال ہے کہ کہنے سننے کا یہ موقع بہترین ہے۔“

ارحم نے ناقابل یقین انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اور صوفے پر ٹنگ گیا۔ زارش کھڑی رہی۔

”اب فرمائیے کہ کہنے کا موقع مجھے دیں گی یا پہلے آپ کہیں گی۔“

”آپ تو شاید کئی ہوئی بات کو دہرائیں گے لیکن میں نئی بات کہوں گی۔ اس لیے کہنے کا حق پہلے مجھے ہے۔“

”جی نہیں ہمہ تن گوش ہوں۔“

”ارحم صاحب! آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“

”یہی کہ آپ ہماری پھوپھو زاد ہیں۔ قدرت نے آپ کو کئی خوبیوں سے نوازا ہے اور وہ ساری خوبیاں اتفاق سے ہمارے اس خاکے سے ملتی ہیں۔ جو ہم نے ایک جیون ساتھی کے لیے ذہن میں بنا رکھا ہے اور

بس۔“

”آئی ایم سوری کہ آپ بہت سی باتیں نہیں جانتے۔“

”کیسی باتیں۔ پلیز آپ ان سے آگاہ کر کے میری اگلی نسلوں پر احسان فرمادیں۔“

”مجھے انسانوں کی پرکھ کا نہ کوئی تجربہ ہے نہ کوئی دعوا لیکن جہاں تک میرا خیال ہے۔ آپ روز اول سے مجھ سے کچھ کہنے کی سعی کر رہے ہیں۔ اس کا جواب میں تفصیلی طور پر دینا چاہتی ہوں اور اس وقت اس تفصیل میں جانا مناسب نہیں۔“

”اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو مجھے یونیورسٹی میں مل لیں۔“

”نہیں ارحم صاحب ایسا ہرگز نہیں۔“

”چلیے فون پر بات کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔“

میرا خیال ہے ہم دونوں آسانی سے اپنی اپنی بات کہہ سکیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”میں شام سے رات تک گھر میں ہی ہوتا ہوں۔ آپ فون کر بیچے گا یا اجازت دیں تو میں رنگ کر لوں گا۔“

”نہیں میں خود ہی کر لوں گی رنگ۔“

”اوکے۔“ ارحم کے لبوں پر بڑی ذمہ داری مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور وہ رخ پھیر گئی۔

پوری رات وہ اپنے بارے میں سوچتی رہی۔ ارحم کے بارے میں سوچتی رہی۔ اور ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔

جو وقت ارحم نے بتایا تھا اس وقت ارشاد صاحب گھر پر ہوتے تھے اور اس دوران میں وہ ارحم سے بات نہیں کر سکتی تھی کیونکہ کسی نہ کسی کام سے اسے ہی بکارتے تھے۔ بہت سوچ سمجھ کر اس نے ساتھ کے گھر

کی طرف رخ کیا۔ ایک دوست کی حیثیت سے وہ اس کے بے حد قریب تھی۔ کمانہ کے گھر بی بی سی ایل سے

وہ ارحم کے بی بی سی ایل پر با آسانی اور اچھی طرح بات کر سکتی تھی۔ سو اس نے ساتھ کی اجازت سے ارحم کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ گویا فون کا انتظار کر رہا تھا۔

جھٹ ریسور اٹھا لیا۔

”ہیلو ارحم۔ از آن وی لائن۔“

”زارش بول رہی ہوں۔“

”زبے نصیب کیسی ہیں؟“

”اچھی ہوں۔“

”میں بھی اچھا ہوں لیکن تھوڑا سا تذبذب کا شکار ہوں۔ کل سے آپ کے لبوں سے ادا ہونے والے الفاظ کے بارے میں فرض یہ فرض کیے جا رہا ہوں۔ خدا را کوئی ایسی بات نہ کہیے گا۔ جو میری خوشیوں پہ کوئی کاری ضرب لگا دے۔“

”خدا آپ کو خوشیاں دے ارحم صاحب۔“

”لیکن آپ کے دم کے ساتھ۔“ وہ بے باکی سے بولا۔ زارش کے لبوں پر اداس مسکراہٹ رہ گئی۔

”ہر چہکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔“

”مجھے سونا نہیں چاہیے اور میں تو ویسے ہی بہت سی زیادہ چمک دمک سے الزبح رہتا ہوں۔ ابھی تک سر مئی شام کی بھول بھلیوں میں الجھ رہا ہوں۔ کھویا ہوا ہوں اس کے سحر میں۔“

”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“

”کل سے ہی منتظر ہوں کہ جانے کیا کہیں گی۔“

”میں۔۔۔ وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“

”جہاں تک میرا خیال ہے آپ جیمن بائڈ کے سلسلے کا کوئی پراسرار کردار بھی نہیں ہیں وہ شوخی سے کہہ رہا تھا۔“

”لیکن معاشرے کا عضو معطل ضرور ہوں۔“

”کیا مطلب ہے؟“

”ارحم صاحب اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی رکھنا میری بے وقوفی ہوگی۔ میں ایک طلاق یافتہ عورت ہوں۔ ٹھکرانی ہوئی جسے ایک مرد نے الزامات کی بھرمار کے ساتھ گھر سے نکال دیا۔“

”نو۔ ٹائٹ ایٹ آل۔“

”آف کورس ارحم صاحب۔ کوئی اپنی ذات بھی زمانے کی ٹھوکروں میں رکھتا ہے بھلا۔ یہ ایک سچ ہے



میری زندگی میں کسی ثابت و سالم خوشی کو دیکھ کر  
کے لیے کچھ نہیں ہے۔ آپ کی منزل کوئی ٹولی پھولی  
عورت نہیں۔ پلیز آپ اس پر غور کیجیے گا پلیز۔  
ارحم کتنی دیر خاموش رہا۔ شاید کہنے کو کچھ نہیں  
تھا۔

”کیا یہ سچ ہے زارش؟ لیکن میں یقین کرنے کو تیار  
نہیں۔“

”آپ کے یقین نہ کرنے سے حقیقت بدل نہیں  
جائے گی۔ وہ تو یوں ہی رہے گی پیشانی کا فلک بن کر۔“  
”مگر ابھی تو آپ پڑھائی کے مراحل سے گزر رہی  
ہیں۔ اگر یہ واقعہ ہے تو کب پیش آیا؟“ اسے اپنی آواز  
کسی پاتال سے آتی محسوس ہوئی۔

”یہ پڑھائی تو میری ذات کی ٹولی کرجیاں جوڑ کر مجھے  
ایک شکل دینے کی کوشش ہے۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ تو۔۔۔“  
اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”روحی کو آپ سے انیت اور لگاؤ ہے۔ وہ بہت  
اچھی لڑکی ہے آپ۔ آپ۔ آپ۔“ آگے وہ کچھ نہ کہہ  
سکی۔

ارحم ہنس دیا۔ یہ ہنسی بے حد پر اسرار تھی۔  
”میں ہر بات کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہر بات کی  
مجھے خبر ہے۔ شاید آپ کو خبر نہ ہو کہ میری اس سے  
تفصیلی بات چیت بھی ہو چکی ہے۔“

”کیا اس نے اور باتوں کی ساتھ آپ کو میرے  
بارے میں نہیں بتایا؟“

”وہ بچی ہے۔ ڈر پوک۔ زمانے سے نا آشنا شاید  
اسے یہ خیال آتا ہو کہ اس کے بعد میں آپ کا تصور  
کرنا چھوڑ دوں۔“

”اور آپ کو ایسا ہی کرنا ہو گا۔“

”یہ سوچنا میرا کام ہے۔ آپ کا نہیں انسان کو  
پہچاننے کے لیے ایک نظر بعض اوقات کافی رہتی  
ہے۔ لیکن زندگی کے فیصلے چاہے ایک بل میں کیے  
جائیں۔ ان پر غور کرنا نظر ثانی کرنا بہت ضروری ہوتا  
ہے۔ میں بھی ایک دو دن سوچوں گا پھر آپ سے بات  
کروں گا۔ اپنا نمبر مجھے دے دیجئے۔“

”ارحم صاحب میں اپنے گھر کے بجائے اپنی  
دوست سائرہ کے گھر سے بات کر رہی ہوں۔ بات کرنا  
اس لیے ضروری تھا کہ آپ ایک بے نام منزل کی  
طرف آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔“

”تو اس نمبر پر بات کر لوں گا۔ بات کرنا ایسا بھی  
محبوب نہیں۔ بس وہ دن کی مہلت چاہتا ہوں۔ اوکے  
خدا حافظ۔“

وہ کچھ کہنے کی کوشش میں لبوں کو بھیجنے کر رہ گئی۔  
کیونکہ وہ خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ چکا تھا۔

سائرہ اس کے قریب بیٹھی بظاہر ایک میگزین کی  
ورق گردانی کر رہی تھی۔ لیکن اس کے کان ان ہی  
باتوں میں لگے تھے۔ اس نے ریسیور نیچے رکھا۔ سائرہ  
نے اس کی طرف دیکھا۔

”زارش ڈونٹ مائنڈ اگر ایک بات پوچھوں تو۔۔۔“  
وہ پہلے ہی اداس سی تھی۔ سائرہ کی توجہ نے اسے اور  
بھی رنجیدہ کر دیا۔

”تم شادی شدہ ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا؟“ جواب  
میں زارش نے سب کچھ اسے بتا دیا۔ جو پچھلے دو سالوں  
میں کبھی نہ بتا سکی تھی۔ اسے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کو  
کندھا میسر آ گیا۔ جی بھر کے روئی۔ پھر اس نے ارحم  
کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ سائرہ نے بہت غور اور  
توجہ سے سنا۔

”یہ تمہارے حق میں بہتر ہو گا کہ اسے سکون تسلی  
سے سوچے۔ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ جلد بازی میں  
غلط فیصلہ بھی ہو سکتا ہے۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے  
سے دل پر سکون اور مطمئن رہے گا اور سوچ بچار کے  
بعد وہ تمہارا دامن تھامنے کو تیار ہو تو ایک بل بھی دیر نہ  
کرنا۔ اس کا ہاتھ تھام لیتا۔ قسمت مہربان ہو رہی ہے تو  
اس کو ٹھکرانا ناشکری ہے۔“

”نہیں سائرہ میں خود کو اس قابل نہیں مانتی۔“  
”یہ تمہارا نہیں ارحم کا فیصلہ ہے۔ بس تمہیں اس  
کے فیصلے پر سر جھکانا چاہیے۔ زندگی کا بند دروازہ کھل  
رہا ہے تو اسے دوبارہ اپنے ہاتھوں سے بند نہ کرو۔ پھر  
شاید ہی قسمت اتنی مہربان ہو۔“

”لیکن سائرہ کامران کے اس سلوک کے بعد میرا  
مردوں کی ذات سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔“  
”ساری دنیا ایک جیسی نہیں ہوتی۔ تم فکر نہ  
کرو۔“ اس نے تسلی دی۔

تیسرے دن حسب وعدہ اس نے فون کیا۔  
”زارش بہت کچھ سوچ بچار کے بعد بھی فیصلہ وہی  
رہا جو پہلے دن تھا۔ میں تمہیں اپنا نا چاہتا ہوں۔ ہر  
قیمت پر۔ زمانہ تمہیں دنیا کی انتہائی ہستی کا سا بھی بنا  
دے اور مجھے انتہائی بلندی پر کوئی مقام بخش دے۔ میں  
تمہاری چاہ میں تمہاری تلاش میں ان پستیوں تک آ  
پہنچوں گا۔ بہت جلد ممّا اور پاپا تمہارے گھر آئیں  
گے۔ تم انکار مت کرنا۔ فار گاؤں سیک۔ تمہیں محبت  
کے ان بے لوث جذلوں کی قسم جو دلوں کو آپ ہی آپ  
اپنے گھرے میں لے لیتے ہیں۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ زارش پریشان ہو گئی۔ سائرہ  
نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ اسے تسلی دیتے ہوئے  
فورا ارحم کا نمبر بتا دیا۔

”ارحم بھائی آپ نے خبر نہیں کن الفاظ کے  
سہارے زارش کو اپنی محبت کا یقین دلایا ہے۔ لیکن  
بجہ ان الفاظ پر زندگی بھر قائم رہے گا۔ کیونکہ وہ پہلے  
ہی بہت دکھی ہے۔ اور دوسری بار دھوکا کھانے کی سکت  
نہیں ہے اس میں امید ہے جس چاہ کے ساتھ آپ  
نے اس سے وعدہ کیا ہے۔ ابھی بد عمدی نہیں کریں  
گے؟“

”ویری گڈ۔ ویری گڈ۔ بڑی بڑی ہستیاں محترمہ  
زارش ارشاد کی طرف دار ہیں۔ آپ یقیناً سائرہ ہیں۔“

”جی ہاں۔“  
”اطمینان رکھیے۔ وفا کے راستے پر کبھی آپ کی  
دوست کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ وفا کے راہی ہیں  
۔ وفا کے ہر امتحان میں فرس۔ گلاس فرسٹ پوزیشن  
لے لیں گے ہمیشہ ان شاء اللہ۔“

”یہ نہ ہو یہ سارے دھوے دھرے رہ جائیں اور  
ان وعدوں کے غباروں سے ہوا نکل جائے۔“

”آزمائیے سائرہ صاحبہ۔“  
”گڈ۔“ وہ ہنس پڑی تو۔ زارش بھی اس کے ساتھ  
مسکرائے لگی۔  
ارحم نے اگلے روز ہی زارش سے شادی کرنے کا  
دھماکا کر دیا۔

یہ فیصلہ کسی کو بھی قبول نہ تھا۔ ممّا پاپا عدنان بھائی  
اور نہ راویہ بھائی کو۔ راویہ فیصلے کرنے کی اہل نہ تھی۔  
گھر والوں کو زارش کی ذات نہیں اس سے وابستہ  
حالات اس فیصلے کی مخالفت پر آمادہ کر رہے تھے۔

خالد احمد کا خیال تھا۔ ارحم ایک جذباتی لمحے کی زد  
میں آکر اس سے شادی کا فیصلہ کر بیٹھا ہے۔ ممّا کا خیال  
تھا اس نے ارحم کو پھانس لیا ہے۔ راویہ بھائی عورت  
ہونے کے ناتے عورت کے حق میں تھیں۔ عدنان  
بھائی کی سوچ میں یہ احتمالہ سوچ تھی۔ ان کو یقین تھا  
کہ بقول عدنان بھائی شادی کے بعد ارحم کو اپنی حماقت  
، غلطی کا احساس ہو گا۔ تب وہ بچھڑائے گا۔ تب ایسا بھی  
ہو سکتا ہے زارش کو ایک بار پھر طلاق کا سامنا کرنا پڑ  
جائے۔

راویہ کے خیال میں بھی ارحم بھائی ایک طلاق یافتہ  
لڑکی سے شادی کے لیے بھند تھے جبکہ کسی طور یہ ممکن  
نہیں تھا اور یہ عجیب سی بات تھی۔ لیکن اسے کون  
سمجھاتا۔ ارحم کے سر پر تو زارش کا جادو سر چڑھ کر بول  
رہا تھا۔ اسے زارش کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔  
اس کے لیے وہ جان دینے کو بھی تیار تھا۔

خالد احمد نے ارحم سے تنہائی میں بات کی۔ عدنان  
بھائی نے سمجھایا۔ راویہ بھائی نے کئی مثالیں سامنے  
رکھیں اور دلائل دیے۔ ممّا نے سختی کی۔ دودھ نہ  
بخشنے کی دھمکی بھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی ڈھاک  
کے وہی تین بات۔ ارحم اپنے فیصلے پر سختی سے پابند رہا۔  
اور جتنا وہ اسے فورس کر رہے تھے اس کے فیصلے میں  
اتنی ہی سختی اور مضبوطی آ رہی تھی۔ وہ اٹل رہا اپنے  
ارادے۔

سب سمجھا سمجھا کر تھک گئے لیکن وہ کسی کی ماننے  
کو تیار تھا نہ سننے کو۔ اس کی ایک ہی ضد تھی زارش



سے شادی کرے گا۔

یہ خبر ارشاد صاحب کی فیملی تک نہ پہنچی تھی۔ صرف زارش کو اس کی خبر تھی۔ خالد احمد کا آنا جانا اس گھر میں بڑھ گیا۔ کبھی کبھار ماما بھی اس طرف آجاتے۔

بازار آتے جاتے بھابھی اور ماریہ بھی چکر لگاتیں۔ ارشاد صاحب کی فیملی اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ لیکن دراصل وہ لوگ اس گھر کے باخول کا جائزہ لے رہے تھے۔ اسی اوچڑ بن میں ایک ماہ اور نکل گیا اور جب زارش اپنی اور ارحم کی گفتگو ایک جذباتی نوجوان کی دل لگی سمجھ کر بھول جانے کو تھی۔

اسی شام خالد احمد اپنے اہل خانہ کے ساتھ آکر منٹوں میں ارشاد کو اپنی بہن کو قائل کر کے کچھ قربت داری کا پیار بھرا دے۔ جاکر زارش کے ہاتھ میں ارحم کے نام کی انگوٹھی پہنا گئے۔

ارحم اپنے وعدوں میں سچا اور کھرا ثابت ہو گیا تھا۔ زارش کی آنکھوں میں حسین خوابوں کے عکس جھلکاتے۔ لبوں پر پھیلی مسکراہٹ آسودگی کی خبر دیتی۔ وہ خوابوں کی انگلی تھام کر ارحم کے ساتھ حقیقی منزل کی طرف گامزن ہو گئی۔

زندگی ایک دم ہی بہت حسین اور خوب صورت ہو گئی تھی۔ دل سے سارے خوف خدشے اور واسے نکل گئے تھے۔ ارحم کے نام کی انگوٹھی انگلی میں پہن کر حقیقت کی پہلی میٹھی بریبر رکھ دیا تھا۔ اس کے گھر والے اور وہ جتنا رعب کا شکر ادا کرتے کم تھا۔ زارش اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ قدرت نے کامران کا نعم البدل بہت اچھا دیا۔ اس کے صبر کا پھل ارحم کی صورت میں ملا تھا۔

وہ بے فکری ہو کر حسین رنگوں کی دنیا کی رنگینوں میں کھو گئی۔

\*\*\*

دوسری صبح یہ خبر زارش کے پورے پیار ٹمنٹ میں پھیل گئی۔ لڑکیوں نے کھڑے کھڑے اس خوشی میں

ٹرنٹ کا مطالعہ کر دیا اور زارش کو پتا چڑی۔

ساتھ کے سوا کسی کو خبر نہ تھی کہ یہ منگنی اس کی دوسری شادی کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہ بھی سب سے اسے معمول کا ایک واقعہ سمجھا تھا اور جن لڑکیوں نے ارحم کو دیکھ رکھا تھا انہیں اس خوب صورت سی جوڑی کے ملاپ پر بے حد خوشی تھی۔ دوسری طرف ارحم جس نے زارش کی انگلی میں اپنے نام کی انگوٹھی کو اپنے جذبات کی فتح سمجھا تھا۔ وہ ایمانداری سے وفا کی راہ کا مسافر بننا چاہتا تھا۔ ایسا مسافر جسے زندگی بھر سفری درپیش رہے۔ اسے کسی سے چھپانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ زارش کو جاننے کے لیے اسے چند لمحے کافی رہے تھے۔ وہ اس سے کچھ پوچھ کر اس کے زخم ہرے کرنے کے حق میں نہ تھا۔ اسے سب

کچھ روجی بتا چکی تھی۔ روجی زارش کی بہن جو اسے بڑے بھائی کی حیثیت دے کر اس سے احترام بھری محبت کرنے لگی تھی۔ اسی روجی کے توسط سے وہ فاصلے گھٹانا چاہتا تھا۔ اپنے اور زارش کے درمیان موجود فاصلے۔ وہ زارش کو اپنی زندگی میں لانے سے قبل اسے اپنی محبت کا اعتماد بخشنا چاہتا تھا۔

انگوٹھی پہن لینے کے بعد سے اب تک ارحم سے اس کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ جبکہ ارحم ایسا موقع تلاش کرنے میں لگا تھا۔ اس کے لیے اس نے جھٹ سناٹ اور ہانکا سہارا لیا۔ ان کا نمبر ملایا۔ اپنا مدعا ان پر واضح کر دیا۔

روحی سے اس نے ذکر تک نہیں کیا۔ کیونکہ وہ کبھی اسے ایسا نہیں کرنے دیتی۔ اس لیے وہ دونوں ہی زارش کو اپنی ہمدرد اور رازدار نظر آئیں اور یہ رازداری ہمدردی اس کے گلے پڑ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی دوستیں دشمن بن جائیں گی۔ آستین کا سائبین کر ڈس لیں گی۔

ساتھ بہانے سے زارش کو اپنے گھر بلا لائی۔ ارحم کافی دیر اس سے باتیں کرتا رہا۔

”ارحم مجھے بارہا احساس ہوتا ہے میں نے کسی کا حق

چھین لیا ہے۔ کسی کا قیمتی سرمایہ چرایا ہے۔ میں چرائی ہوئی چھینی ہوئی چیزوں سے خوشیاں حاصل کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔“

”ایک دم پاگل اور بے وقوف ہو۔ اس میں چرا لینے یا چھین لینے والی بات ہی کیا ہے۔ تم خوش نصیب ہو زارش۔ میں تمہارے دل کے زخم اپنی محبت سے مٹا دوں گا۔ میں تمہیں پوری ایمان داری سے اپنی زندگی کا شریک بنا رہا ہوں زارش اور مجھے امید بھی ہے کہ تم خوب صورت آنکھوں اور دماغ کے سبب ہی نہیں اپنی دوسری خبیثوں کے سہارے مجھے مکمل طور پر جیت لو گی۔ ایک تمہارے فاسٹ ایئر کی فکر ہے۔ ورنہ منگنی کی انگوٹھی کی جگہ تمہارے گلے میں میری عمر بھر کی غلامی کا حسین طوق ہوتا۔“ وہ شرارت پر اتر آیا۔

”یہ تو وقت بتائے گا۔“ وہ بولی۔

”ہاں یہ ہی تو کہہ رہا ہوں۔“

زارش نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے اسے گھورا۔ تو وہ ہنس دیا اور میں بھی ہنس پڑی۔

\*\*\*

دونوں گھرانے اس بندھن کے بعد ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ آئے دن ماریہ زارش کے پاس موجود ہوتی۔ خالد احمد فرصت کے کسی لمحے اپنی بیگم کے ساتھ آجاتے۔ رات گئے تک گپ شپ رہتی۔ عندئہ بے حد مصروف بندے تھے۔ البتہ راویہ دو چار دنوں بعد ایک بار ضرور چکر لگاتیں۔ قربت نے فاصلے مٹائے تو چھپی باتیں بھی عیاں ہوئیں۔ خالد احمد پورے خاندان کو کسی نہ کسی بہانے اپنے گھر مدعو کر لیتے۔ زارش کے سوا سب لوگ چلے جاتے اور ان لمحوں میں جب زارش گھر پہنچتا ہوتی۔ ارحم فون کے سہارے حال دل اس تک پہنچانے کی سعی کرتا۔ کبھی کبھار ماریہ کے ساتھ ان کے گھر آو جھٹکا۔ لیکن آنے کے بعد اسے سخت بے محبت ہوتی۔ ارشاد بے چارے اپنی محبت کے اظہار کے طور پر بھرپور توجہ دیتے چائے اور پر تکلف لوازمات سے اس کی تواضع کرتے۔ ماریہ

زارش اور روحی کے ساتھ باتیں کرتی رہتیں اور وہ تھک ہار کر واپسی کی ٹھکان لیتا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے زارش کی قربت کے لیے ایک اور بہانہ ڈھونڈ لیا۔ ان دنوں فاسٹل امتحان نزدیک تھے۔ زارش چھٹی کے بعد دیر تک لائبریری میں موجود رہتی۔

پچاس کلومیٹر کا فاصلہ وہ گھنٹے میں طے کر کے دوڑا چلا آتا۔ اسے گھر چھوڑنے کے بہانے طویل سڑکوں پر آہستہ روی سے گاڑی چلاتا۔ اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتا۔ لیکن وہ اس کی قربت میں سمی رہتی۔ دل کھول کر مسکرا بھی نہ سکتی۔ درمیان میں جو فاصلے جائل تھے وہ منگنی کی انگوٹھی نہ مٹا سکتی تھی۔ ارحم نے نفسیات بے شک نہ پڑھی تھی لیکن وہ جذبات کو پڑھنے پر قادر تھا۔ انسانوں کے احساسات سمجھتا تھا۔ وہ زارش کا سہارا بن کر ایک اخلاقی فرض بھی نبھاتا تھا اور اپنے جذبات کی تکمیل بھی جس کی اس جیسے کھانڈرے سے اور بے پروا شخص سے کسی کو امید بھی نہ تھی اور اسی سبب گھر والوں نے اس کی تجویز کی مخالفت کی تھی۔

ارحم اس کے دل میں اتر کر اس مقام تک پہنچ گیا۔ جسے محبت کی معراج کہنا بے جا نہ تھا۔ تبادلہ خیالات نے دونوں کو ہم آہنگی کا پتا دیا۔ ایک جیسی پسند زندگی کے متعلق ایک جیسا نقطہ نظر۔ ارحم میں خود اعتمادی بلا کی تھی۔ جبکہ زارش میں اس کا زبردست فقدان تھا۔ صرف اس کی خاطر وہ پچاس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے گھر لوٹ آتا۔ شام کو ارشاد گھر پہنچتے تو ایسی صورت میں سب سے الگ بیٹھ کر ارحم سے بات کرنا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ کیونکہ روحی کچھ دنوں کے لیے دادا کی طرف گئی ہوئی تھی اور ایسے میں بابا بار بار کام کے لیے اسے ہی پکارتے۔ اس نے ایک حل نکالا اس کا۔

گمبائن اسٹڈی کا بہانہ کر کے ساتھ کے گھر جانے لگی اور ارحم سے باتیں کرتی۔ فون تو ارحم ہی کرتا تھا۔ وہ ہنر فیکل دیا کرتی تھی بات فون سے آگے بڑھی اور



دوسری تیسری شام باہر ملنے گئے اور یہاں بھی سائہ نے اس کا ساتھ دیا۔ وہ اس کے ساتھ ہوئی۔ مئی کو معلوم تھا وہ ارحم کے ساتھ جاتی ہے بس ان دونوں کا علم نہیں تھا پہلے پہل تو ارحم کو ان کی موجودگی کھلی۔ لیکن زارش کے دلائل نے اسے چپ رہنے پر مجبور کر دیا۔ ارحم رکھ رکھاؤ کا بے حد قائل تھا۔ سائہ اور ہما کی موجودگی میں تو معاملہ تکلفات تک جا پہنچتا۔ کبھی کھانا ہوش میں کھایا جاتا۔ کبھی آکس کریم پر اکتفا کیا جاتا۔ کسی نہ کسی تفریحی مقام کو منزل بنایا جاتا۔ جہاں چند لمحے فراغت کے ارحم کے لیے حاصل جاتے۔

فاصلے ختم ہوئے تو تکلفات کی دیوار بھی گری۔

ارحم زارش کو شاپنگ کے لیے لے کر آیا تھا۔ ایک سوٹ کے ڈیزائن اور رنگوں پر تبصرہ کر رہے تھے۔ زارش نے فیروزی فکر کے ڈیزائن والا سوٹ پسند کیا تھا اور ارحم اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ کہ وہ کچھ اور چرس دیکھنے کے لیے پلانہ کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ ارحم اس کے آنے کا منتظر تھا کہ ایک دم اس کی بیک پر جالی بچانی آواز ابھری۔

”یو آر اے گرٹ ارحم صاحب۔“ سائہ اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

”جی، آپ یہاں۔؟“

”اُدھر سے گزر رہے تھے کہ ہمارے آپ کو دیکھ لیا تو سوچا ہیلو بائے کرتے جائیں۔“

”ایسے نصیب تو ہزاروں خوبیوں کی مالک لڑکیوں کے بھی نہیں ہوتے۔ زارش تو پھر بھی۔“

”آپ نے سچ کہا۔“

”اور کیا ہم تو گھر میں بھی اکثر آپ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ آپ جیسے لوگ دنیا میں کم ہی پائے جاتے ہیں۔“

”شکریہ۔“

”شادی کا ارادہ کب تک ہے؟“

”انگزام کے بعد۔“

”لیکن ارحم صاحب ایک بار پھر سوچ لیجے گا۔ شادی عمر بھر کا بندھن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ زارش بے چاری ایک بار پھر سے۔“

نقرو اُدھورا رہ گیا۔ زارش سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

ارحم تھوڑا سا گھبرا گیا۔ سائہ ہمارے کچھ کہنے لگی۔ ارحم سب سے نظریں چرائے نکل آیا۔ زارش نے بھی اس کی تقلید کی۔ واپسی میں بھی خاموش رہا۔ ورنہ وہ ہنستا بولتا آتا تھا۔ زارش نے محسوس کیا۔ لیکن خاموش رہی۔

کئی دنوں بعد وہ ایک دوپٹے پر بیٹھ کر آگیا اور آتے ہی زارش کو ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

”آج تمہاری خاطر ہاف ڈے کر کے آیا ہوں۔“

”مگر میں تو مصروف ہوں۔“ اس نے عذر تراشا۔

”لخت بھیجو مصروفیت پر۔ میں پریشان ہوں۔“

”خیریت۔؟“

”چلو کسی برس کن جگہ چل کر بیٹھتے ہیں پھر بتاؤں گا۔“

”بہت مشکل سے وہ راضی ہوئی۔ گاڑی میں آ بیٹھی۔“

”زارش لوگ تعلقات کو جانے کس پیمانے سے پرکتے ہیں۔“

”کیا مطلب۔؟“

”میں تمہاری دوستوں کو نہیں سمجھ سکا۔ خلوص کے پردے میں ان کے دلوں میں حسد اور جلن بھری ہے۔“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ارحم۔ ان کا تعاون نہ ہوتا تو میں اس منزل تک نہ پہنچتا۔ میں نے تو انہیں بھی وہ اہمیت ہی نہیں دی۔ جو وہ ڈیزر و کرتی ہیں۔“

”کیسی اہمیت۔ میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”کوئی بھی نہیں۔ پھر بھی میرا مشورہ ہے۔ تم کوشش کیا کرو کہ یہ لوگ نہ ہوا کریں تمہارے ساتھ ہر وقت دم چھلے کی طرح لگی رہتی ہیں تمہاری وجہ سے خوش اخلاقی دکھانا پڑتی ہے اور۔“

”مگر کیوں۔؟“

”میں نے وجہ بتادی تو تمہارا دل خراب ہو جائے گا۔“

”پتا دو کیا وجہ ہے؟“

”تم جانتی ہو نا زارش میں جدید تہذیب کی پروردہ لڑکیوں کو نا پسند کرتا ہوں۔ ان میں شرم و حیا، آثار، خلوص کی کمی ہے۔ کئی دنوں سے میں محسوس کر رہا ہوں۔ میرے بارے میں وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔“

”کیا مطلب۔؟“

”ہاں زارش۔ انہیں میرے بارے میں غلط فہمی ہو گئی ہے۔ جب کہ میں ان سے خلوص سے پیش آتا ہوں تمہاری دوست سمجھ کر۔“

”نہیں، نہیں تمہیں غلط فہمی ہو گئی ہے۔ جاننے ہو یونیورسٹی میں کئی لڑکے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ اس نے کبھی کسی کو گھاس نہیں ڈالی۔ وہ اتنی کم ظرف نہیں ہے۔ پلیز ارحم آئندہ ایسا ذکر بھی مت کرنا۔“

”اور میں کہتا ہوں کہ آئندہ تم ان سے کبھی نہ ملنا۔“

”بغیر کسی قصور کے میں نے کبھی کسی کو سزا نہیں دی۔“

”یہ میں کہہ رہا ہوں۔“

”مگر کیوں۔؟“

”وجہ تم سننا ہی نہیں چاہتی ہو تو پھر ٹھیک ہے۔ لیکن تم نہیں ملو گی ان سے۔ بس۔“

”اور اس وقت مجھے ایسی کئی کہانیاں یاد آرہی ہیں جن میں شوہر بیوی کی دوستوں سے بظاہر اجتناب برت کر۔“

ارحم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”کیا سمجھتی ہو تم۔ میں اجتناب کے پردے میں کوئی کھیل کھیلنا چاہ رہا ہوں۔“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”تم مرد لوگ اتنے شکی اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ کیا نقصان پہنچایا ہے میری دوستوں نے تمہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں کسی کو ضرورت سے زیادہ سرجھٹانا اپنے حق میں برا ثابت ہوتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ زارش مسکرائی۔ اس کا مقصد صرف مذاق تھا۔ مگر ارحم سنجیدہ تھا۔

”بہر حال مجھے ایسی لڑکیاں تمہاری دوستوں کی حیثیت سے بھی قبول نہیں انڈر اسٹینڈ۔“

”اور میں تمہاری طرح بدگمانی کی عادی نہیں ہوں۔ جب تک آنکھوں سے نہ دیکھوں گا توں سے نہ سنوں یقین نہیں کر سکتی۔ مجھے تمہاری کم ظرفی پر افسوس ہے۔ ارحم تمہیں اتنی بری رائے قائم کرنے کا کوئی حق نہیں۔ شاید تمہیں خبر نہ ہو ان سب نے مل کر ہی مجھے یہ حوصلہ دیا کہ میں تمہیں قبول کر سکی۔ بہر حال اب مجھے جانا ہے۔ امید رکھوں گی تم اپنی رائے بدل لو۔“

”مطلب تم مجھے جھوٹا سمجھتی ہو۔ میری بات کا یقین نہیں۔“

”ایسا کب کہا میں نے؟“ وہ حیرانی سے بولی۔

”دھکے خچے لفظوں میں یہی مطلب تھا۔“

”پلیز ارحم۔“

”میں بدل لوں گا تم نہیں بدلو گی خود کو؟“

”تم۔ ارحم۔ تم۔“

”ایک بات کان کھول کر سن لو۔ میں سائہ کے گھر کسی قسم کی بات چیت کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہے نہ کرنا۔“

زارش نے اپنی دھن میں کہہ دیا۔

”چاہو تو مجھ سے کہیں بھی کوئی بات نہ کرنا۔ ملنا بھی نہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ مجھے تمہاری بات نہ دکھ دیا۔“

وہ ایک دم کھڑی ہوئی۔ ارحم اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ خاموشی سے سفر کرتا۔ وہ اسے گھر کے گیٹ پر امار کر چلا گیا۔

زارش بہت اچھے بچے دل کی مالک تھی۔ کسی پر شک کرتا اس کی فطرت میں تھا نہ عادت۔ ہر ایک کو اپنی نظر سے دیکھتی اور سب اچھے بچے ہی نظر آتے۔ ارحم اسے سچ سمجھا رہا تھا۔ لیکن وہ اپنی سادگی کی وجہ سے ان شاطر دوستوں کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔ اس روز



بھی اس نے شاپ میں کچھ نہیں سنا تھا۔ کیونکہ جب وہ ان کے قریب پہنچی تھی تو سارے اپنی بات مکمل کر چکی تھی۔ اپنی صاف طبیعت کی وجہ سے ہی کسی لہجہ میں نہیں گئی اور ہمیں نقصان اٹھائی وہ۔ بہت بڑا نقصان

☆ ☆ ☆  
ارحم سے یہ اس کی آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد وہ ایک بل کے لیے بھی اپنا نہ لگا۔ مسلسل پندرہ دن وہ انتظار کرتی رہی۔ آخر اسے ہی قدم آگے بڑھانا پڑے اور ارحم نے اسے بری طرح جھڑک کر دھتکار کر اس کی عزت نفس کو پار چارہ کر دیا۔

اور...  
ساتھ سے اس کی گفتگو سن کر وہ عرش کی بلند یوں سے فرش پر آ رہی اس کا جسم اس کی جان اس کے دل و دماغ سب کے سب اس حادثے کی نذر ہو گئے۔ ساتھ کی طنزیہ گفتگو حقارت بھرے الفاظ سارے مل کر اس کی پور پور میں نشتر چھونے لگے۔ ہاتھ کی انگلی میں بڑی ہیروں کی چمک والی انگوٹھی اسے اذیت دینے لگی۔ یہ دیکھ اس دکھ سے کہیں بڑا تھا جو اس سے قبل وہ اٹھا چکی تھی۔

کامران نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ صرف اس کا شوہر تھا۔ محبت کے بلند و بانگ دعوے تو نہ کیے تھے اس نے اور ارحم نے ارحم نے تو زمانے بھر کے دکھ محبت کے نام پر اس کی جھولی میں ڈال دیے تھے۔

شاید اس نے اس کی بے بسی کا خوب صورت انداز میں مذاق اڑایا تھا۔ اسے بہت کچھ یاد آیا تھا۔ ارحم کی قربت میں گزرے سارے لمحے جن میں ساتھ بھی اس کی شریک ہوتی تھی۔ وہ سب سے خوش دلی سے بات کرتا تھا۔ کبھی کسی لمحے اس کی بے زاری اور نفرت کا پتہ نہ چلا تھا۔ نئی بار اس نے باتوں باتوں میں ساتھ کی تعریف بھی کر ڈالی تھی۔ متعدد بار کھانا کھاتے ہوئے اس نے زارش کے بجائے اس کی دوستوں کا خیال رکھا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کئی باتیں ارحم کی بے وفائی کے ثبوت بن کر سامنے آنے لگیں۔ اور جو کچھ اس نے آج سنا تھا۔ وہ تو حرف آخر ہی تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے

ارحم کا نمبر ملایا تھا۔  
”سوری مس زارش میں اتنا فارغ نہیں ہوں کہ بے کار کی فضول گفتگو میں کھویا رہوں۔ مجھے بہت سے ضروری کام کرنے ہیں۔“  
”ارحم۔ صرف چند منٹ۔ میں۔“

”میں نے کہہ دیا تھا میں مصروف ہوں۔“  
”ارحم میں تمہاری مصروفیت میں حائل نہیں ہونا چاہتی۔“  
”تو کیا چاہتی ہو؟“  
”صرف ایک وضاحت۔“  
”کیسی وضاحت۔“

”تم نے میرے ساتھ کھیل کیوں کھیلا۔ اگر تمہیں یہی کچھ کرنا تھا تو راستے دشوار تو نہ تھے۔“  
”تمہیں خبر ہے نا پندرہ دن بعد میری شادی ہے اور ابھی تک گھر مکمل نہیں ہو پایا۔ یہ چھٹی میں نے تم جیسی لڑکی سے باتوں کے لیے نہیں۔ اپنے لائف سیٹ اپ کے لیے لی ہے۔ خدا حافظ۔“ وہ تو ایک پل کو بھی شناسنا نہ لگا تھا۔  
”ہیلو۔ ہیلو۔“

وہ ریپورر رکھ کر جا چکا تھا۔ زارش سر ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆  
بھابھی جب عالیہ پھوپھو کو سب معلوم ہو گا اور گھر آ کر سب پوچھیں گی تو کیا ہو گا۔ کیا جواب دے سکیں گے ہم۔ جہاں تک مجھے اندازہ ہے۔ ان لوگوں کو کچھ خبر نہیں ہے یا پھر زارش آپنی نے ذکر نہیں کیا کوئی؟  
”ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ دونوں صورتیں ہی قابل غور ہیں۔ اگر عالیہ پھوپھو کو کچھ خبر ہو تو وہ ضرور آئیں۔ اس کا مطلب ہے زارش نے اپنے تک ہی رکھا ہے سب۔“  
”تو پھر کیا کیا جائے بھابھی۔ حالات سنگین نظر آ رہے ہیں!“

”پاپا سے بات کرتی ہوں۔ باقی کے حالات می کے آنے پر رکھتے ہیں۔“  
بات ہی ایسی تھی۔ خالد صاحب سنتے ہی غصے میں آ گئے۔

”تم نے یہ بات اس سے کیوں نہیں پوچھی۔ خواہ مخواہ کسی شریف لڑکی پر اپنے نام کا ٹھہرا لگا دیا اور اب منگنی ختم کرنے اور شادی سے انکار کر رہا ہے۔ وہ سری بار اس بچی کو عذاب سے گزار رہا ہے۔ کیوں کر رہا ہے وہ ایسا؟ پہلے ضد کر کے منگنی کر دالی اور اب بغیر کسی وجہ کے انکار میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ میں تو ارشاد کو منہ نہیں دکھا سکتا۔ اگر اسے زارش سے شادی نہیں کرنی تھی یا اب اس کا نظریہ بدل گیا ہے تو یہ سارا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب کیوں اس کے دماغ میں کیزا رنگ رہا ہے۔ اس کا حل اسی سے مانگو۔ میں کیا جواب دوں؟“

”اس کے پاس تو ایک ہی حل ہے کہ انکار کر دو۔“  
رادیا نے دھیرے سے کہا۔ کیا کرتی وہ۔  
”اس کا تو اب یہ حال ہے کہ زارش کو فون کرتا ہے نہ گھر جاتا ہے۔ اس کی پیشانی پر ناپسندیدگی کی تیوریاں صاف نظر آتی ہیں۔ ہم خود شرمندہ ہیں۔ کیا بات کریں۔ کیا جواز بنا کر جواب دیا جائے گا۔ ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں ان باتوں کی خبر زارش کی فیملی میں کس کس کو ہے۔“

”تم ارحم سے بھی بات کرو۔ بلکہ عدنان کو بھی کہو اور پھر ارشاد کی طرف ایک چکر لگا کر کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ پھر ہی کچھ کر سکیں گے۔“  
”میں نہیں چاہتی پاپا کہ وہ لڑکی والے ہو کر ہمارے گھر کے چکر لگائیں۔ کتنی مجبوریاں ہوتی ہیں بیٹی والوں کے ساتھ۔ وہ بھی زارش کے ساتھ ایک حادثے کے بعد۔“

”رادیا بیٹا اب یہ مسمی تم لوگوں کو ہی سلجھانا ہے۔ ارحم کو اعتماد میں لے کر بیار بیار سے پوچھو آخر وہ ایسا کیوں چاہتا ہے۔“ وہ اٹھ گئے اور ماحول پر سناٹا چھا گیا۔



”کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھایا۔“  
”ٹھیک ہوں۔ بس سر میں درد تھا۔ طبیعت بھی عجیب سی ہو رہی تھی اس لیے کھانا نہیں کھایا۔“  
”اچھا میں چائے لاتی ہوں۔ جب تک فریض ہو جاؤ۔“

”بہت شکریہ۔“  
وہ کمرے سے نکل کر کچن میں گئیں۔ ملازمہ جو پہلے ہی چائے تیار کر رہی تھی اسے ایک کپ لے کر وہ اس کے کمرے میں چلی آئیں۔  
”یہ لو چائے اور ساتھ میں پن کمر بھی۔“ وہ انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ بڑی تھکی تھکی سی مسکراہٹ تھی۔  
”تھینک یو بھابھی۔“ وہ چائے کا خالی کپ رکھتے ہوئے بولا۔

”تکلفات تو بہت ہو گئے۔ یہ بتاؤ کچھ آرام محسوس ہوا۔“  
”ہاں جی۔“  
”جانتے ہو میں تم سے سخت ناراض ہوں۔“  
”جی اور مار یہ بھی۔“  
”تم نے ہی خفا کیا ہے۔“  
”کوئی بات نہیں نماں لوں گا۔“  
”اور میں۔“

”آپ ناراض رہ ہی نہیں سکتیں کیونکہ اگر خفا ہو تو زارش اس بات پر پریشان نہ ہو جائیں اور میں جانتا ہوں اس ناراضی کے پیچھے آپ کی بے پایاں محبت چھپی ہے۔ میری کوتاہیوں کو معاف کر دیجئے گا بھابھی۔“ وہ کچھ اداس سا ہو گیا۔  
”ایک شرط پر تمہیں معافی ملے گی۔“ رادیا مسکرا دیں۔ ”فرمائیے۔“

”ارحم خدا کو منافقت پسند نہیں۔ سچ بولو مگر جھوٹ میں لپیٹ کر نہیں۔ آج میں تمہارے منہ سے پورا سچ سن کر جاؤں گی۔“  
”تم شادی کرو یا نہ کرو۔ میں بھی زبردستی کی قائل نہیں۔ لیکن میں تمہیں پریشان نہیں دیکھ سکتی۔“



تب ارحم نے فرار کا کوئی راستہ نہ دیکھ کر آہستہ آہستہ سب کمانی سدا دی۔

”بھالی مجھے اندازہ تو پہلے ہی تھا لیکن میں اوجھڑے انداز کے ساتھ نہیں پورے رچ کے ساتھ اصلیت کھلتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اور حقیقت بہت تلخ اور میری سوچ کے مطابق نکلی۔ پھر بھی مجھے دھچکا لگا کہ یہ لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں۔ جنہیں اپنی عزت کا پاس نہیں رہتا۔ پس ایسی لڑکیوں کو صرف اچھے خوب صورت اور خصوصاً دولت مند لڑکوں کی تلاش ہوتی ہے اور جو بہت خوبی سے اپنے جال میں پھانس لیتی ہیں۔ لیکن میں ایسا نہیں تھا اور وہ بے چاری ہاتھ ملتی رہ گئی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ فیصلہ اس کے حق میں ہو گا لیکن

”کیا تمہیں اس سے محبت ہو گئی تھی؟“ وہ چونک پڑا۔

”نہیں۔“ اس کے لمبے میں بہت سختی تھی۔

”لیکن اس کے دل میں میرے لیے ایک اچھا مقام بن گیا اور اسے مجھ میں اپنے خوابوں کی تعبیر پوری ہوتی نظر آئی۔ لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ میں ایسی چلتر باز لڑکیوں سے آج تک متاثر نہیں ہوا۔ میرے دل میں اس کے لیے پہلے بھی بے زاری تھی اب بھی وہ سمجھتی تھی مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ لیکن ایک رچ جو بہت کھرا ہے کہ ایسی لڑکیاں کسی سے محبت نہیں کرتیں۔ ان کا دین ایمان پیسہ اور اپنا مطلب نکالنا ہے۔ اگر میں نہیں تو اور سہی اور نہیں تو اور سہی تو بھلا میں ایسی کسی لڑکی کو اپنی زندگی میں داخل کر سکتا ہوں۔ جو چور دروازے اور کسی کے حق پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے کسی معصوم کے جذبول کو روند کر اپنی زندگی کی خوشیاں حاصل کرے۔“

راویہ خاموشی سے سنتی رہیں۔ لیکن انہیں بھی بڑا دکھ تھا۔ آج کل کی لڑکیوں کی ذہنیت پر صرف پیسے کی خاطر اپنی عزت تک کو دبا کر لگادی ہیں۔

یہ تو ارحم تھا کہ سب جان گیا اور نہ بہت سے معصوم اور معقول آدمی غیر سنجیدہ لڑکیوں کی نامعقولیت کا شکار

ہو جاتے ہیں۔ راویہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”گڈ میں تمہیں جانتی ہوں اور تمہارے جذبات بھی سمجھتی ہوں۔ تم آرام کرو اور اپنے ذہن سے سب کچھ جھٹک دو اور اس بات پر یقین رکھو کہ ہر لڑکی اس جیسی نہیں ہوتی۔ یہ تو دینا ہے جہاں بھانت بھانت کے لوگ اللہ نے پیدا کیے ہیں۔ سب کے رنگ اور مزاج جدا جدا ہوتے ہیں۔ بلاشبہ بعض طبیعتیں صرف منفی کردار میں تسکین پاتی ہیں۔ غلطی تمہاری بھی تھی کہ تم نے اسے اعتماد میں لیا ہوتا، لیکن تم بغیر سوچے سمجھے اس کا خیال کیے بنا اپنی پلاننگ میں لگ گئے۔ ٹھوڑی سی سزا تو بہر حال تمہیں بھی ملنی چاہیے۔“ وہ مسکرائیں۔

”خیر جو ہوا سو ہوا۔ لیکن اب ساری ذمہ داری تمہاری ہے تم اس معاملے کو کس طرح ہینڈل کرتے ہو۔ لیکن یہ سب اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ لیکن میرا تعاون ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔“

”اتنے گنس تو ہیں آپ کے دیور میں کہ مسئلے کو چٹکیوں میں حل کر لوں۔ اور کسی کو اپنا بنا سکوں۔ چاہے اسے بے وقوف ہی بنا رہا ہوں۔“

”اور بے وقوف بھی بن رہے ہو۔“

بھالی نے مسکرا کر اپنے دیور کو پیار سے دیکھا۔ جو انہیں بھائیوں کی طرح ہی عزیز تھا۔

”یہ جو ہر تو تب کھلیں گے جب ہماری دیورانی تمہاری زندگی میں آئے گی۔“

”یہ میرا وعدہ ہے۔ سات سلام کریں گی آپ۔ دن رات خطروں سے کھیلنا شغل ہے ہمارا۔“

”اچھا۔ مگر زندگی کے سب سے بڑے خطرے سے نمٹ کر دکھانا پھرناووں گی۔“

”آپ دیورانی تو لانے کے انتظامات کریں پھر کوئی جو ہر دکھاؤں گا۔“

”یہ بھی ہو جائیں گے بے فکر ہو۔ می آئے والی ہیں۔“

”بہت دیر مت کیجیے گا۔“

”ارے اپنی جلدی بے قرار کئے چینی۔“

”ہاں بہت سے حساب ہیں۔ جن کا مقروض ہوں۔ پوری دیانت داری سے ادا ہو جائیں یہ ہی خواہش ہے۔“

”اگر وہ ضد پر اڑ گئی تو۔“

”یہ مجھ پہ چھوڑ دیں۔“

”دیکھ لو دیور جی یہ من پسند بیویاں بہت ناز نخرے اٹھواتی ہیں تب کہیں جا کر بات سمجھتی ہیں۔ بہت دلیلوں کے بعد۔“

”کہنا نا بھابھی جی یہ اپنے دیور پر چھوڑ دیں اگر اعتبار ہے تو۔“

”اعتبار۔ بلکہ اعتبارات، اعتماد بھروسہ، یقین سب کچھ ہے۔“

”تو بس پھر وقت کا انتظار کیجیے اور ایک بات یہ سب کچھ آپ کے اور میرے بیچ رہے گا۔“

”وعدہ۔“ تو دونوں مسکرا دیے۔

\*\*\*

صبح سے گھر میں ایک ہلچل مچی تھی۔ ادھر کی چھریں ادھر، ادھر کی ادھر ساتھ ابھی پوئی پار لر سے فیشیل کرا کے آئی تھی۔ بالوں کی تراش خراش بھی بلکہ ہما کے کہنے پر کٹنگ بھی کروائی۔ آج کے لیے اس نے خاص لباس منتخب کیا تھا۔ آج ارحم کی مہمات کی کرنے کے لیے آرہی تھیں۔ ایک بجے ارحم کا فون آیا تھا۔

”ہیلو ساہو ڈیر۔“

”ہیلو۔“

”کیا ہو رہا ہے۔“

”آپ ہی کا انتظار ہے۔“

”خوش نصیبی کے سوا اور کیا ہے۔“

”میں نے کھانے کا انتظام کر رکھا ہے۔ رات سے پہلے واپسی ناممکن ہے۔“

”ہم تو آپ کے اشارے کے منتظر ہیں۔ جو حکم دیں گی ماننا ہو گا۔“ ساہو ہنس دی۔

”زارش تو نہیں آئی تھی۔“

”کیا کرنے آئی۔ آپ کی مرضی اس کے لیے کافی رہی۔“

”اگر آج ہمارے ہوتے ہوئے وہ آگئی تو۔“

”اچھا ہے۔ اسے آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ خود ہی جان جائے گی۔ ویسے ایک بات پوچھوں۔“

”ایک نہیں سو باتیں۔“

”آپ نے اس میں دیکھا کیا تھا۔“

”اصل میں اس سے پہلے کوئی نہیں دیکھی تھی۔ کاش یہ تعلق صرف تم سے ہی جڑا ہوتا۔ ساہو کیا تم میری یہ خطا معاف کر سکتی۔“

”بھول کو معاف کرنا اعلا طیف کی دلیل ہوتی ہے۔“

”اچھا یہ خوبی لڑکیوں میں ہی ہوتی ہے۔ یعنی بھول کو معاف کر دینے کی چلو۔ اس بات نے اطمینان بخش دیا ہے ورنہ پریشانی ہوتی۔“ ساہو پھر ہنس دی۔

”آپ بہت خوبی ہیں۔“

”آج تو بہت کچھ یاد آ رہا ہے ہمیں۔ سوچتے ہیں تم نے اظہار میں پہل نہ کی ہوئی تو ہم تم جیسی شریک زندگی سے محروم رہ جاتے۔“

”مجھے اندازہ ہو گیا تھا آپ زارش سے رشتہ جوڑ کر بچھتا رہے ہیں۔“

”ارے تم انسانوں کے دل کا حال بن بتائے جان مٹی ہو۔“

”اچھا اب اگر آپ اجازت دیں تو مہربانی ہوگی۔“

”نے شامی کیا بنا نے کی ذمہ داری مجھے سونپی ہے۔“

”چلو تم کچن میں جاؤ۔ ہم تمہارے ہاتھوں کے ڈانٹے کے تصور میں لطف لیتے ہیں۔ اوکے شام پانچ بجے ملاقات ہوگی۔“

”خدا حافظ۔“

”خدا حافظ جان۔“ ارحم نے اس کے جواب میں کہا اور فون بند کر دیا۔

”نالہ نے اسے ایک جھٹکے سے بستر سے اٹھایا۔

”کیا بد تمیزی ہے۔ یہ بستر کیوں سنبھال رکھا ہے؟“

زارش اسے دیکھ کر ایک دم رونے لگی۔ شام کے پانچ بجنے میں بندہ منٹ تھا۔

”مجھے تو آثار پہلے ہی دن سے نظر آ رہے تھے۔ ان



لڑکیوں کا اور کام بھی کیا ہے۔ کسی کی خوشی ان سے برداشت نہیں ہوتی۔ تجھ سے زیادہ نفیر تو اس پر بھیجنی چاہیے۔ جس نے تمہاری آڑ میں سارے کا انتخاب کیا۔ کیا ضرورت تھی اسے تمہیں دکھ دینے کی یہاں بیٹھی ماتم کر رہی ہو۔ احتجاج کیوں نہیں کرتیں تمہیں خبر ہے آج وہ اپنی ماں کے ساتھ سارے کے گھر آ رہا ہے۔ میں تو مرنے مارنے کا پروگرام بنا کر آئی ہوں وہیں سارے لوگوں میں بے عزتی نہ کی تو نام بدل دینا۔ ”چھوڑو نالکہ جو جا رہا ہے اسے جانے دو۔ مجھے تو ویسے بھی کسی خواب کی تعبیر پر یقین نہیں تھا۔ اب تو خوشیاں خواہوں میں مشکل نظر آتی ہیں۔ وہ اسی بات پہ آمادہ ہے تو تھک ہے۔“

”واہ کیسے تھک ہے؟ تم آج اسے آنے دو۔ سارے نے مجھے فون پر بتایا تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایسی دیدہ دلیری خدا کی پناہ۔ یہ ظلم نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ویسے زارش تمہارے پیلا کو بھی خبر ہے کہ نہیں۔“

”نہیں! نہیں تو کچھ بتائیں ہے۔ جانتی ہو پیلا کو کتنا دکھ اور تکلیف ہوگی۔“

”لیکن یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ ارحم کے والد شہر کے معزز آدمی ہیں۔ کیا انہوں نے بھی ارحم کو ایسی ذلیل حرکت کی اجازت دے دی۔“

”مرضی ماموں کی نہیں ارحم کی چلے گی۔“

”خیر کچھ بھی ہو“ آج ارحم کی میرے ہاتھوں بے عزتی کا منظر بھی ایک زمانہ دیکھے گا۔ وہ وہ سناؤں گی کہ سارے بھی ساری عمر یاد رکھے گی۔ شرم نہ آئی اسے تمہارے حق پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے کس نے کہا تھا۔ اپنے ہر معاملے میں اسے شریک کرو۔ دوستیں تو اکثر ہی جان کا وبال بنتی آتی ہیں۔“

روحی کمرے میں داخل ہوئی تو نالکہ نے اسے مخاطب کیا۔

”روحی تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے ابھی اور اسی وقت چلو۔“

وہ اسے تقریباً گھسیٹی باہر لے گئی۔ زارش

دروازے کی طرف آئی اوپر کی منزل کے اس کمرے سے سارے کے گھر کا لان با آسانی نظر آتا تھا۔

ارحم کی گاڑی بڑی شان سے گھر کے گیٹ پر آکھڑی ہوئی تھی۔ نالکہ اور روحی مزے سے ارحم سے باتیں کر رہی تھیں۔ اسے ساری دنیا ہی بڑی مکار نظر آئی۔

زمین میں موجود فاصلے کے باوجود نالکہ کا مسکراتا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ ارحم نے ایک پکٹ اس کی طرف پھسایا۔ جو اس نے تمام کیا۔ روحی وہ کھول کر دیکھ رہی تھی پھر وہ تینوں اندر چلے گئے۔ گاڑی سے نکلنے والی ماریہ بھی۔ اس کی ممشاید اندر جا چکی تھیں۔

آنسو جو دو سروں کی موجودگی میں بہتے ہوئے ڈرتے تھے۔ بے چلے جا رہے تھے۔ نیچے جنید اور وقار نے شور مچا رکھا تھا۔ رات کے کھانے کے لیے زبردست اہتمام ہو رہا تھا ارشاد اپنے دوستوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں باتوں میں مصروف تھے۔ میچکن میں تھیں اور زارش جو بھرے جہان میں خود کو تنہا سمجھ رہی تھی اور بھی رنجیدہ ہو گئی۔

روحی ایک روز پہلے ہی تو دادا جان کے ہاں سے آئی تھی ساری صورت حال سے ناواقف تھی۔ زارش اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی گھلتی رہی مگر کسی کو ہوا نہ لگنے دی اور اب نالکہ نے آکر اس کے دل کا حال معلوم کر لیا۔ سب راز افشا ہو گئے تھے۔

\*\*\*

”اے جھوٹی لڑکی۔ تو نے خواہ مخواہ ہمیں ذلیل کیا۔“ نالکہ ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ چہرے پر رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

”تو بے زاری۔ تم نے تو میرا خون خشک کر دیا۔“ وہ بے چارہ شریف زادہ تو شادی کا رو یا بنتا پھر رہا تھا۔

”کس کی شادی کے؟“

”اپنی شادی کے اور کس کی ہوتی۔“

”جتنی جلدی بات بھی فاسل ہو گئی۔ اس کا مطلب ہے سارے نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔“ معاملہ پہلے

ی طے ہو چکا تھا۔ ”کیسا معاملہ۔؟ کس سے معاملہ ہے۔“ متلنی کو دو سال ہونے کو آچکے ہیں۔ شادی ناگزیر ہی تھی۔ سارے کو کارڈ ارحم نے اپنے دست شفقت سے عنایت کیا۔

”میں سمجھی نہیں ارحم کی ماما اور ماریہ۔“

”ہاں ہاں آخر معاملہ پورے شہر میں کارڈ دینے کا ہے۔ سب کا موجود ہونا ضروری تھا۔ سارے کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ وہ ہکا بکا ہم سب کا منہ دیکھ رہی تھی۔ ارحم کھانے کی میز پر ڈٹ گیا۔ کہ لائے سارے بیگم کھانے کو جو بھی ہے۔ میز انوار و اقسام کے کھانوں سے پر تھی۔ ہم سب اس پر ٹوٹ پڑے خوب مزے لے کر کھایا۔ سارے ہمارے کانوں تو بدن میں لہو نہیں۔ نہ ننگے بنے نہ اگلے۔ ارحم نے کہا۔

”میں آپ سب کی پر خلوص شرکت کا منتظر رہوں گی۔“

”اور ہاں نیچے وہ سب لوگ آئے بیٹھے ہیں۔ تم اچھی بیٹیوں کی طرح پیس چھپی رہنا“ آج سے تمہارا سب سے بڑا ماریہ کو بھی نزدیک نہ لگنے دینا۔“

زارش کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ یہاں تک کہ وہ دلہن بن کر ارحم کے کمرے میں اتر آئی۔ سب لوگ اس کے ارد گرد تھے۔ ان میں سارے اور ہما بھی موجود تھیں۔ چہرے پر ایک نئی ہمدردی کا ماسک چڑھائے۔ سارے اس سے سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔

”میں کہتی نہ تھی زارش۔ ارحم میں بے وفائی کی جرات نہیں۔ والدین کلن سے پکڑ کر لے آئیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ لے آئے۔ نہ جفا کرنا بھی کوئی اتنا آسان نہیں۔ ویسے ایک بات کہوں بیشہ پلو سے باندھ کے رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ پھر۔“

”ارحم کی کیا مجال۔ کھجی۔ راہ میں لاکھوں لڑکیاں بھی آجائیں تو آنا نہیں زارش کے پاس ہی تھا۔“

ماریہ نے کہا تو سارے خاموش ہو کر رہ گئی۔ مارے نفرت کے کچھ نہ کہہ سکی۔ زارش اس سارے ڈراے

دم بخود تھی۔ اسے تو ایک معمول کی طرح دلہن بنادیا گیا تھا۔ نکاح کے فارم بردستخط کرتے وقت گویا ہوش و حواس اس کے تھے ہی نہیں اور اب دلہن بن کر اس گھر میں لے آیا گیا تھا۔ ارد گرد مہمانوں کا ہجوم تھا۔ جو ہاتھوں میں تحفے لیے اسے دیکھنے چلے آ رہے تھے۔ ان میں تیا جان، تانی جان، دادا جان اور پھوپھیاں سب لوگ تھے۔

رات کے جانے کتنے پھر گزر گئے۔ روشنیوں اور رنگوں نے وقت کی لگام کو تھام رکھا تھا۔ وہ تھک چکی تھی۔ لڑکیاں اسے اس کی اوپر کی منزل میں موجود خواب گاہ میں لے آئیں۔ سامنے ہی ارحم کی تصویر دکھائی دی۔ جس میں وہ بڑی ادا سے مسکرا رہا تھا۔ زارش نے منہ پھیر لیا۔ جل کر رہ گئی۔ اس نے دل ہی دل میں ارحم کو سزا دینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ جانے کب لڑکیاں گئیں اور ارحم کمرے میں داخل ہوا۔

”اپنے گھر کمرے میں آکر پر بندہ ناچیز مبارک باد کہتا ہے۔“ وہ خاموش رہی۔

”محترمہ زبان گھر گروی رکھ آئی ہو؟“ وہ بل کھا کر رہ گئی۔ مگر لبوں کے قفل نہ ٹوٹے۔

”کو کیسی رہی میری اسکیم۔ تمہارے فاسل ایمر کے ادھورے رہ جانے کا قطعاً“ افسوس نہیں مجھے۔“

”ہوں! اسکیم تو تمہاری فیل ہو گئی۔“ اس نے سوچا۔

”کچھ سنا نہیں۔؟“

”ارحم صاحب میں مذاق کے موڈ میں قطعاً“ نہیں ہوں۔“

”اور میں بھی حد درجہ سنجیدہ ہوں۔ ایسے لمحوں میں کون کافر غیر سنجیدہ رہ سکتا ہے۔“

”مجھے افسوس ہے کہ آپ کی تمام باتوں کے جواب میں تمہیں میری بے لگائی ہی ملے گی۔“

”کیوں۔؟“

”وہ اس لیے مسٹر ارحم صاحب کہ میں تمہاری بے وفائی کی خود گواہ ہوں۔“

”کیا مطلب۔؟“



”سب مطلب یہ ہیں تمہیں اتنے معصوم مت بنیے۔“ وہ توجانے کیا بات ہوئی تم نے مجھ سے شادی کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔ ورنہ تمہیں ساڑھ جیسی لڑکی کی شدت سے ضرورت تھی۔“

”ہاں وہ تمہاری دوست جو تھی اس لیے۔“ میری دوستی ’مت‘ نام لیجیے۔ تمہیں تو اس کے کردار سے نفرت تھی۔ اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ پھر اسی سے محبت کرنے لگے۔“ ارحم نے قہقہہ لگایا۔

”کہہ دو یہ جھوٹ ہے۔ لیکن تمہارے کہنے سے کیا ہوگا۔ میں نے سب کچھ اپنے کانوں سے سنا تھا۔ جو کچھ تم نے اس سے کہا۔“

”غلط جو اس نے مجھ سے کہا وہ سنا تم نے۔“ قانون اور شریعت نے مجھے تمہاری بیوی بنا دیا ہے مگر میرا دل۔ میرے دل میں تمہارے لیے نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں نے اپنی ذات کو الزام سے بچانے کے لیے تم سے شادی کر لی ہے۔ ورنہ میرے پیامی بھی سوچ لیتے۔ میں پہلے بھی خطا دار تھی۔ میں نے یہ زہرائی عزت نفس بچانے اور ماں باپ کو دکھ نہ دینے کی خاطر لی لیا ہے اور یہی بات تمہارے حق میں فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔“

”میری بات تو سنو۔“ اور کیا۔ کیا سنو۔ تم نے یہ سلوک کر کے مجھے احساس دلایا ہے کہ میں واقعی ہی تمہارے قابل نہ تھی۔ تم کو یہ اختیار اب بھی رہے گا کہ مجھے میری معاشرتی حقیقت یاد دلانے کی نوک پر رکھو۔ بات بات پر مجھے پچھلی زندگی کا طعنہ دو تو پھر کیا یہ بہتر نہیں کہ میں تم سے کسی قسم کی توقع ہی نہ رکھوں۔“

”زاری پلیز۔ میری بات۔“ میں نے سنجیدگی کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تمہاری راہ میں دیوار نہیں بنوں گی۔ مگر اس سب کے بدلے میرے ماں باپ مجھے اس گھر میں آباد دیکھ کر

خوش رہیں گے۔ اس گمان میں مبتلا رہیں گے کہ ان کے سر سے بوجھ ہٹ گیا ہے۔ لیکن کرو میری کوئی امید، کوئی آرزو، کوئی امنگ تمہاری ذات سے وابستہ نہیں تم اپنے معاملوں میں آزاد ہو۔“

”زارش یہ سب کچھ۔ تم کہہ رہی ہو۔ ہوش میں تو ہو تم۔“ ہوش میں تو اسی دن آگئی تھی جس روز ساڑھ سے باتیں کرتے سنا تھا۔ جب وہ میرا مٹھکا اڑا رہی تھی۔ تمہارے قدموں کے جواب میں بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ تم جرات نہیں کر سکتے لیکن تم فکر نہ کرو میں تمہارے گھر والوں کو کہہ دوں گی کہ وہ تمہیں ’ساڑھ‘ کو اپنانے کی اجازت دے دیں۔ اور اگر تمہیں میری ذات کی ہوا نظر آئے تو مجھے طلاق دے دینا۔ مزید ایک گناہ میرے کھاتے میں لکھا جائے گا۔ چند دن اور لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں گے اور بس اس کی ذمہ داری تو تم پر عائد نہیں ہوتی۔ ایسی اچھی ہوتی تو وہ اتنا بڑا فاران کو ایفائیڈ انجینئر ہی میرا رہ جاتا۔“

”ارے۔ ارے۔ ارے لگتا ہے معاملہ تو بہت سنگین ہو گیا ہے۔ ایک لڑکی کے کہنے پر کہ لڑکیاں بھول معاف کر دیتی ہیں۔ ہم نے فرض کر لیا تھا۔ تم ہمیں معاف کر دو گی۔ بخدا مجھ پر یقین کرو۔ میں بے وفائی کا مجرم نہیں ہوں۔۔۔ یقین کرو زارش۔ تم جو بے اعتباری کے صحراؤں میں بھٹک رہی تھیں۔ تمہیں سزا دے کر میں تمہیں تمہاری اہمیت کا اندازہ لگوانا چاہتا تھا جان من۔“

”تجھی ہی تم ساڑھ سے عشق کی پینگیں پڑھاتے رہے۔ خوب صورت الفاظ سے اس کا دل بسلاتے رہے۔“ ارحم قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ ”ہم اس الزام سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے لیکن زارش میری زندگی۔ وہ تو صرف ڈیل کر اس تھا۔“

”ڈیل کر اس۔؟“ زارش نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ ”ہاں ہاں تمہیں ساڑھ پر بھروسہ تھا نا ہم تمہارے

بھروسے کو غلط ثابت کرنے کے لیے بہت اُگے نکل گئے اور تم سے خفگی کا ڈرامہ ہمیں اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کو کھیلنا پڑا۔ اس نے خود ہی آخر کی تھی۔ تمہیں بھول جانے کی ہدایت کی تھی اور تمہیں بھول جانے کا بہانہ کر کے ہم اسے حوصلہ دیتے رہے کہ تمہاری وہ خیر خواہ دوست ہمارے سامنے پوری طرح عیاں ہو جائے۔ اس غریب نے ہمارے ڈرامے کو جج سمجھا۔ اس میں ہمارا کیا قصور۔ ہم تو خدا کی قسم مزاح کے موڈ میں تھے۔ ورنہ لڑکیوں کی اس فطرت سے تو ہم پہلے ہی واقف تھے۔ یہی واقعیت تو ہمیں تم جیسی سیدھی سادی لڑکی کے قریب لے آئی۔ بھلا اس خود غرض لڑکی کی خاطر ہم تمہیں نکھو دیتے۔ نا ممکن تھا۔ لڑکیاں تو قدم قدم پر ہاتھوں ہاتھ لینے کو تیار نظر آتی ہیں۔ جو زندگی بھر اپنی چالاکیوں سے مردوں کو تنگی کا ناچ نبھاتی ہیں۔ ہمیں تو ایک بے ریا اور سچے سا بھی کی ضرورت تھی۔ تم ہماری کائنات ہو خدا کے لیے اب تو خود کو اس معاشرے کا ایک اہم جزو سمجھ لو کہ تمہیں ایک ایسے بندے نے منتخب کیا ہے جس کی خواہش سینکڑوں لڑکیوں کے دلوں میں تھی۔“ ارحم نے پھر مزاح سا لہجہ اختیار کیا۔

”خدا کے لیے زندگی کی ابتدا اس یقین سے کرو کہ ہم تمہارے ہیں اور ہاں کل دسمہ میں تمہاری دوست ساڑھ بیگم نظر آجائے تو اس سے خوش دلی سے ملنا۔ تاکہ بے چاری کا یہ بھرم قائم رہ جائے کہ تم اس حقیقت سے واقف نہیں ہو۔ یہاں ہر ہاتھ ملانے والا دوست نہیں ہوتا لیکن ہر ایک سے مسکرا کے ملنا اچھے انسان کی نشانی ہوتی ہے۔ دوست سے تو اس لیے ملا جاتا ہے کہ وہ دوست ہے۔ دشمن سے خندہ پیشانی سے ملنے والا ہی بے غرض انسان ہوتا ہے۔ اور پھر بے چاری اپنے غلط اعتماد کے ہاتھوں زبردست شکست سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کی دل جوئی تمہارا فرض ہے۔ بے چاری نے ہمیں بہت بڑی خوشی بخشی ہے۔ اس کا وجود درمیان میں نہ ہوتا تو ہم ایک بہت بڑے یقین سے محروم رہتے۔ ہمارے بغیر ہمارا یہ دوست مٹنے چلا

تھا۔ اے دوست! ہم تمہارے مٹنے سے پہلے ہی لوٹ آئے۔ وعدہ کرتے ہیں۔ زندگی میں ایسا کوئی گناہ نہیں کر س گے یعنی ڈیل کر اس قسم کا اور تم بھی وعدہ کرو۔“

”کیسا وعدہ۔؟“ ”ہمیں کسی اور کے رحم و کرم پر نہ چھوڑنے کا۔ میرا مطلب ہے۔“

”جی ہاں جیسے اس بات کو تو بھول ہی جاؤں گی۔“ ”میاں بیوی کا رشتہ بنیادی طور پر اعتماد کا رشتہ ہوتا ہے۔ اعتبار کرو اس رشتے کا۔ عورت کے دل میں تو بہت گنجائش ہوتی ہے۔ بہت بڑا دل ہوتا ہے۔ وہ شوہر کی ہر خطا معاف کر دیتی ہے۔ اگر میں جھوٹ کہہ رہا ہوں تو اپنے اندر جھانک کے دیکھ لو۔ تم کبھی میری حکم عدولی نہیں کرو گی۔ مجھ سے ناراض نہیں رہ سکو گی۔ اور تم کبھی نہیں چاہو گی کہ خواہ مخواہ دلوں میں گرہیں پڑ جائیں۔ زندگی تو بہر حال تمہارے ساتھ ہی گزارنی ہے۔“

”ہوں۔“ وہ کہہ کر رہ گئی۔ ”مجھے معاف کر دوزاری میں نے تمہیں بہت دکھ دیے ہیں کرو یا نا معاف؟“

یہ کہتے ہوئے اچانک ارحم نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ زارش نے مسکرا کر ارحم کی طرف دیکھا دکھ اور مایوسی کے بالوں سے اچانک اپنا روشن چہرہ دکھا کر اس کی کائنات منور کر گیا تھا۔

”تم میرا آئینہ ہو زاری۔ تمہاری ذات، تمہارا کردار، تمہاری شفاف آنکھیں، میں ان میں اپنا آپ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

دوبارہ آگے بڑھے اور اسے تھام کر سینے سے لگا لیا۔ وہ تڑپتی محلی، آنسو بھرا چہرہ اٹھایا۔ ”نہو نہ۔ اب نہیں پلیز زاری۔“

وہ اس کے سینے سے لگ کر شانت ہو گئی۔ ارحم کا وجود اس کی ذات کو بہار کے خوشبو بھرے پہلے جھونکے کی طرح مسطر کر گیا۔





## بقیہ سروے

انڈے

نماز

نمک

سبز مرچ

سفید زیرہ

آئل

بادام

سرخ مرچ

چائیز نمک

سفید مرچ

دو عدد

دو عدد

حسب ذائقہ

دو عدد بڑی

ایک چائے کا چمچ

تیل کے لیے

10 عدد

حسب ضرورت

ایک چائے کا چمچ

پسی ہوئی حسب ذائقہ

سب سے پہلے انڈے قرانی کریں۔ اس کے بعد نماز کو گرم کریں اور اس کا پھلکا اتاریں۔ پھر توڑے قرانی پن میں آئل ڈال کر نماز بھون لیں۔ کہ اس کا پانی خشک ہو جائے اس کے بعد انڈے اس کے اوپر ڈال دیں اور سارے سالے ڈال کر جتنا پکانا چاہیں پکالیں۔ آئل چھوڑ دے تو اتار لیں اور اس کے بعد بادام سے سجاوٹ کر لیں اور گرم گرم کھائیں۔

2 - ہائے یہ تو ان بایوں کو معلوم ہو۔ یا ان آٹیوں کو جو قربانی کا گوشت رکھتی ہیں۔ ہم تو ہاتھ جھاڑ کے ہی اٹھتے ہیں۔

3 - بکرے کے حوالے سے بہت سے واقعات ہیں۔ جن میں سے چند حاضر خدمت ہیں۔ ایک دفعہ بکرے نے مجھے گھر سے باہر نکال دیا اور جب اندر آنے کی کوشش کرتی تو میں میں کر کے ٹکرس مارنے لگتا۔ پھر گھر والوں نے بکرے کو پکڑا تو میں اندر گئی۔

عید کے دن بکرے صاحب اپنی رسی کھول کر آزاد ہو گئے اور پورے گھر میں آزاد گھوم رہے تھے ہم سب بہنوں نے بچن کا دروازہ بند کر لیا۔ باقی سارے دروازے کھلے تھے۔ گیٹ بند تھا۔ بکرے صاحب کبھی ایک کمرے میں کبھی دوسرے والے کمرے میں۔ کبھی صحن میں کبھی ادھر کبھی اُدھر بھائی اور ابو عید کی نماز پڑھ کر آئے اور بکرے کو پکڑا۔

مجھلی عید پر بکرا ذرا ”وگھرے ٹامپ“ کا تھا۔ ”لاؤ لا“ سا۔ ویسے تو سارے قربانی کے جانور لاڈلے ہوتے ہیں کہ اللہ نے ان کو خاص کام کے لیے چنا ہوتا ہے۔

ماہنامہ کرن 264

## مقابلہ ہے اکتانہ

## آسیہ آفتاب

ادارہ



س - ”آپ کا پورا نام۔ گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟“

ج - ”پورا نام بھی آسیہ آفتاب ہے۔ مختلف رشتوں کے لحاظ سے کانوں میں مختلف آوازوں کی پکاریں آتی ہیں تاہم ”گھر والے“ کی پیار اور غصے دونوں میں ایک ہی پکار ہوتی ہے مولو! مولو!“

س - ”کبھی آپ نے آئینے سے یا آئینے نے آپ سے کچھ کہا؟“

ج - ”آہ اب تو مدت ہوئی اتنی فرصت سے آئینے سے گفت و شنید کیے ہوئے تاہم آئینہ یہ کہتا ہے۔“

کبھی خوبصورت تھے اب خوب سیرت کھلی نہیں رہے رفتہ رفتہ خوبیاں ساری زمانہ لے گیا!!!

س - ”آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟“

ج - ”میرا اللہ برکمل بھروسہ اور کامل یقین۔“

س - ”اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟“

ج - ”میری زندگی کے دشوار ترین لمحے وہ تھے جب میرے بے حد قریبی رشتے مجھے دائمی مفارقت دے گئے۔ اس پر دشوار کہ میرا قلم آج بھی ان لمحوں کو احاطہ تحریر میں نہیں لا سکتا۔ میں نے بہت چاہا بہت کوشش کی کہ میں کرن کے سلسلہ ”ماں جی“ میں لکھوں مگر میرا قلم میرا ساتھ نہیں دیتا۔“

س - ”آپ کے لیے محبت کیا ہے؟“

ج - ”محبت ہی تو وہ الوہی اور بے غرض جذبہ ہے جس کا بدولت یہ دنیا آباد ہے اگرچہ سچی محبت نایاب

ماہنامہ کرن 265



س۔ "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟"

ج۔ "میری رات دن رب کائنات سے دعا ہے کہ وہ اپنے اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کی زیارت کراوے۔"

س۔ "پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور اور مطمئن کر دیا؟"

ج۔ "میرا اطمینان اب اپنے بچوں کی تعلیمی مدارج کی کامیابیوں سے مشروط ہے۔ لہذا اور طے کے بورڈ کے امتحان میں ۸۵ نمبر حاصل کرنا دل کو خوش کر گیا جبکہ کمنزہ نے ۹۹ فیصد نمبر لے کر "مکرم" میں انعام وصول کیا جہاں اس کے ساتھ ساتھ میں اور اس کے بابا بھی مدعو تھے۔ ان لمحوں نے اندر تک جی خوشی عطا کی۔"

س۔ "آپ اپنے گزرے کل "آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"

ج۔ "سوال بہت بڑا ہے "ایک" لفظ میں اس کا جواب میرے لیے دینا ممکن نہیں۔"

س۔ "اپنے آپ کو بیان کریں؟"

ج۔ "ہناوٹ ریا کاری اور تصنع سے دور اندر اور باہر سے ایک۔"

س۔ "کوئی ایسا دور جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوں؟"

ج۔ "میں تو ہمہ وقت ہی بہت سے خوفوں کی زد میں رہتی ہوں۔"

س۔ "آپ کی کمزوری اور آپ کی طاقت؟"

ج۔ "ہر اچھی چیز میری کمزوری ہے جبکہ طاقت کو بھی خود پر سوار نہیں کیا سب طاقتیں اللہ رب العزت کی ہیں۔"

س۔ "آپ خوشگوار لحاظ کیسے گزارتی ہیں؟"

ج۔ "بچوں کے ساتھ گھوم پھر کر کسی اچھی سی جگہ پر کھانا کھا کر یا پھر اپنے میاں صاحب کے ساتھ لوگ

ڈرائیو جاکر۔"

س۔ "آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟"

ج۔ "دولت اگرچہ انسان کا امتحان ہے تاہم اس ٹھوس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زندگی کے لیے بہت ضروری بھی ہے۔"

س۔ "گھر آپ کی نظر میں؟"

ج۔ "مگر سکون اور آسودگی میرا ہوتا دنیا میں ہی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ جنت۔"

س۔ "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟"

ج۔ "رب معاف کرنے والے کو محبوب رکھتا ہے یہ سوچ کر معاف کر دیتی ہوں مگر آسانی سے بھول نہیں پاتی۔"

س۔ "اپنی کامیابیوں میں کسے حصہ دار ٹھہراتی ہیں؟"

ج۔ "میرے مالک کا کرم" میرے ماں باپ کی دعا میں ساس بھری دعا میں اور اب میاں صاحب اور بچوں کا تعاون۔"

س۔ "کامیابی کیا ہے آپ کے لیے؟"

ج۔ "کامیابی ہی وہ روشن راستہ ہے جس پر چل کر آپ چاہیں تو ستاروں پر کندھال سکتے ہیں۔"

س۔ "سائنس کی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کال کر دیا ہے کیا یہ واقعی ترقی ہے؟"

ج۔ "سائنس کی ترقی نے تو ہر انسان کو متحرک کر دیا ہے۔ آج کے دور میں ان مشینوں سے انحراف ممکن ہی نہیں۔"

س۔ "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"

ج۔ "کسی دوسرے ملک کی یونیورسٹی میں اردو ادب اور منظر ہنسی پڑھاؤں۔"

س۔ "برکھارت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

ج۔ "وقت اور حالات پر منحصر ہے۔ گرمیوں میں نما بھی لیتی ہوں بارش میں کبھی گرام گرم چائے کے گگ کے ساتھ بس کھڑکی یا ٹیرس سے نظارہ کر کے اور کبھی

میاں صاحب کے ساتھ سیر کر کے تاہم پہلی فکر یہ دامن گیر ہوئی ہے۔ چھت پہ کپڑے تو نہیں ہیں۔"

س۔ "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟"

ج۔ "جب میرے میاں یہ کہتے ہیں کہ عورت گھر کی فہر ہوئی ہے اس کو گھر کی سلطنت پر حکومت کرنے کا اختیار دینا چاہیے۔"

س۔ "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

ج۔ "حساس ذمہ داری اور وعدے کی پاسداری۔"

س۔ "کیا آپ نے اپنی زندگی میں وہ سب پایا جو آپ چاہتی تھیں؟"

ج۔ "الحمد للہ مجھ حقیر ناچیز پر میرے رب کے بے انتہا احسان ہیں، مگر ایک خلش، ایک قلق زندگی کی آخری سانس تک رہے گا کاش! میرا شمار میرا نام بہترین استادوں اور بہترین اونیوں کی صف میں ہوتا۔"

س۔ "اپنی ایک خوبی اور خالی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کر دیتی ہے؟"

ج۔ "میں بہت ذمہ دار ہوں یہ میری خوبی ہے زندگی سلیقے اور قریبے سے ہلکنار دیکھنا چاہتی ہوں۔ بے ترتیبی اور غلط رویوں پر غصہ آتا ہے یہ میری خالی ہے۔"

س۔ "کوئی ایسا واقعہ جو آج بھی آپ کو شرمندہ کر دیتا ہے؟"

ج۔ "اللہ ایسے وقت سے بچا کر رکھے۔"

س۔ "کیا آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوف زدہ ہوتی ہیں؟"

ج۔ "نہ انجوائے کرتی ہوں نہ خوف زدہ ہوتی ہوں" میرا موقف اصول پر ہوتا ہے۔"

س۔ "مستشرقین کتاب مصدق مصنف؟"

ج۔ "بہت سی کتابیں ہیں بہت سے مصنفین ہیں کس کس کا نام لوں؟ انڈیا کی فلم "پاغبان" اچھی لگی۔"

س۔ "آپ کا غور؟"

ج۔ "اس خرافات سے کوسوں دور ہوں اور خدا اور

ہی رکھے۔"

س۔ "کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو اداس کر دیتی ہو؟"

ج۔ "کوئی نہیں۔ اللہ بنی ہوئی عزت کی حفاظت کرے۔"

س۔ "کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا ہو؟"

ج۔ "حسد تو نہیں کرتی۔ مگر جو لوگ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو خوب ٹھوس کرکھاتے ہیں پھر بھی دہلے تلے رہتے ہیں ان کو دیکھ کر سچے دل سے آپس ضرور نفرتی ہیں۔"

س۔ "مطالعہ کی اہمیت آپ کی نظر میں؟"

ج۔ "دل، دماغ اور روح کی غذا۔"

س۔ "آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی کیا ہے؟"

ج۔ "زندگی اللہ رب العزت کی عطا کردہ بیش قیمت نعمت ہے اس کی قدر کریں، اس سے پیار کریں، جدوجہد، لگاتار محنت، ٹیک بیتی، خلوص اور اشتک محنت سے اپنی زندگی کو اور خوب صورت بنالیں۔"

س۔ "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"

ج۔ "شیر شاہ سوری، جس نے ستر برس کی عمر میں اقتدار سنبھالا اور چھا گیا۔"

س۔ "ہمارا سارا پاکستان خوب صورت ہے۔ آپ کا پسندیدہ مقام؟"

ج۔ "اپنا لاہور۔"

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	شمن عابد
میک اپ	روز بیوی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا



شعاعِ نبوی



قربانی کرنے والوں کے لیے مستنون ہے

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جس آدمی کے پاس (قربانی کا جانور) ذبح کرنے کے لیے ہو تو جب وہ ذی الحجہ کا چاند دیکھ لے تو وہ اس وقت تک اپنے بالوں اور ناخنوں کو نہ کٹوائے جب تک کہ قربانی نہ کر لے۔“ (صحیح مسلم شریف) 601

صغریٰ یاسین۔ کراچی

مقبول حج کا ثواب

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”حج اور عمرہ بے درجے کیا کرو، کیونکہ یہ دونوں فقر اور گناہوں کو اس طرح ختم کر دیتے ہیں جیسے بھٹی لوہے سونے اور چاندی کے میل کو ختم کر دیتی ہے اور مقبول حج کا بدلہ صرف جنت ہی ہے۔“ 708 (جامع ترمذی شریف)

کشور منیر۔ کراچی

پڑوسیوں کا حق

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں بکری ذبح کی گئی تو انہوں نے اپنے گھروالوں سے فرمایا: ”کیا تم لوگوں نے میرے یہودی ہمسائے کو اس بکری کے گوشت میں سے کچھ ہدیہ بھیجا ہے یا نہیں؟“ گھروالوں نے کہا نہیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”اس میں سے کچھ گوشت ہدیہ

کے طور پر بھیج دو۔ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے جبریل علیہ السلام ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید فرمایا کرتے تھے کہ میں نے سمجھا کہ اس کو ورثہ کا حصہ دار بنادیں گے۔“ سیدہ نسبت زہرا۔ کمرہ ٹپکا

چاہت

چاہا تو چاہتوں کی حدوں سے گزر گئے نشہ محبتوں کا اترنے نہیں دیا اس نے ہنسی ہنسی میں محبت کی بات کی میں نے عدم اس کو مکر نے نہیں دیا

گڑیا شاہ۔ کمرہ ٹپکا

انمول موتی

☆ انسان دکھ اور غم تو کھوں میں حاصل کر لیتا ہے لیکن خوشیاں تلاشتے تلاشتے زندگی تمام ہو جاتی ہے۔ ☆ دعا ایک ایسی چیز ہے جس سے بڑی سے بڑی آرزو کی تکمیل میں مدد ملتی ہے۔ ☆ زندگی ایک ہار کا نام ہے جس کا ہمیں یقین ہے کہ وہ ضرور ہارے گی تو کیوں نہ ہم پہلے ہی اس ہار اور حقیقت کو تسلیم کر لیں۔ ☆ دل کی بات ماننے کے بجائے فہلے دماغ سے کیے جائیں تو زندگی آسان و سہل ہو جائے گی۔ اسماء خان۔ کے جی ایم

ہیرے میرے ہاتھ میں

☆ اگر آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو بہت کچھ کریں تب کہیں جا کر آپ بھی کچھ کر سکیں گے۔

☆ دنیا میں کہیں بھی آپ کی سیرت پر آپ کی صورت کو ترجیح نہیں دی جائے گی۔

☆ استاد بادشاہ نہیں ہوتا لیکن بادشاہ بناتا ہے۔ ☆ اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کچھ بھی نہیں تو جان لیں کہ آپ بہت کچھ ہیں۔

☆ عاقل پہلے قلب سے پوچھتا ہے پھر منہ سے بولتا ہے۔

☆ جس درخت کی لکڑی نرم ہوتی ہی اس کی شاخیں گھنی ہوتی ہیں۔

☆ جس کی تعلیم صحیح ہو وہ آنکھ سے بھی دیکھتا ہے دماغ سے بھی اور دل سے بھی۔

☆ اعتبار بہت کا پتھر ہے اگر ایک باریہ اکھر جائے تو پھر نیچے ہی آتا ہے۔

☆ جو شخص ہوش میں ہو وہ غور نہیں کرتا۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کمرہ ٹپکا

موتی مالا

☆ محبت جنہیں یاد کرتی ہے انہیں سدا سفر میں دوڑائے پھرتی ہے محبت صرف جوگ ہے۔

☆ ہم کسی کو اپنی مرضی سے چاہ تو سکتے ہیں لیکن کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ نہیں کہہ سکتے تم بھی مجھ سے محبت کرو۔

☆ جو زندگی اندر مر چکی ہو اسے جھوٹ موٹ جینا کتنا دشوار ہے۔

☆ جو دکھ کو گلے کا ہار بنالیتے ہیں وہ کبھی دکھ سے نجات نہیں پاتے۔

☆ پہلی محبت ان دیکھی سرزمین کے لیے جانے والے سفر کی طرح ہمیشہ ہماری یادوں میں تازہ رہتی ہے۔

☆ محبت کتنی آنکھوں کے آنسو پیتی ہے پھر بھی یہ کھاری بد ذائقہ نہیں ہوتی لوگ اسے امرت سمجھ کر پی لیتے ہیں۔

☆ جو چیز خواہش بھی ہو اور ضرورت بھی ہو محبت

☆ جڑیں سلامت ہو تو ٹنڈ منڈ درختوں پر بھی موسم بدلتے ہی پھول آجاتے ہیں۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کمرہ ٹپکا

برسات

ہم سے کہیے درد کے قصے

ہم سے کہیے رنج کی بات

ہم پر بے کیا گیا موسم

تبادلہ لگا کھوں آفات

آج دل کچھ ٹھہرا تھا

اور آج ہی آنکھیں خشک سی تھیں

آج ہی ظالم ٹوٹ کے برسی

موسم کی پہلی برسات

فوزیہ شمس۔ سحرات

بریک فیل

☆ ایک خاتون نے ٹریفک سارجنٹ کو اپنی جیزرقاری کی وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

”میری گاڑی کے بریک فیل ہو گئے ہیں اس لیے میں چاہتی ہوں کہ کسی حادثے کے بغیر جلد از جلد گھر پہنچ جاؤں۔“

وجیر رحمن۔ کراچی

بڑھاپا

بڑھاپا جوانی کی پیروڈی ہے۔ بندہ چاہتا ہے وہ جوان ہو تو اسے کوئی نہ پوچھے اور جب وہ بوڑھا ہو تو ہر کوئی اسے پوچھنے والا ہو۔ بوڑھے تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو جوان ہوئے ہیں۔ دوسرے وہ جو ابھی جوان ہوں گے اور تیسرے وہ جو ابھی جوان نہیں ہوئے۔ خواتین کو جنم سے ڈرانا ہو تو یہ کہتے ہیں۔ وہاں آپ بوڑھی کھوسٹ ہوں گی۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ بوڑھوں کی عمریں جوانوں سے لمبی ہوتی ہیں۔ کوئی نوجوان سو سال تک زندہ نہیں

ماہنامہ کرن 269

ماہنامہ کرن 268



# پیغام دوست

## ادارہ

ثناء شہزاد کا پیغام سوزان میں مقیم اپنی دوست  
حنا کے نام

یار صبا مجھے تمہاری بہت یاد آتی ہے۔ میں ان دنوں  
کو بہت مِس کرتی ہوں جب ہم ٹائی کے یہاں اکٹھے  
ہوتے تھے خوب انجوائے کرتے تھے ساری رات  
جاگ کر باتیں کرتے تھے تم مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا  
کھلاتی تھیں۔ یار تم واپس آ جاؤ ہم سب تمہاری کمی  
محسوس کرتے ہیں۔ فوزی کو بھی آخری بار نہیں دیکھ  
سکیں تم اب عظیم مہمان کی شادی سے پہلے پہلے آ جاؤ۔  
ایمان اور جنت کو پیار کرنا میری طرف سے بہت سارا  
اور اپنا خیال رکھنا۔

شمینہ اکرم کا پیغام شہر خوشاں میں سوئے  
اپنے پیارے شہزادے معین اکرم کے نام  
پچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی  
اک شخص سارے شہر کو دیران کر گیا  
شہید معین اکرم تمہیں پچھڑے دو برس ہونے کو  
ہیں تمہیں دیکھنے کو پل پل میری آنکھیں ترستی ہیں۔  
تبھی تو اپنی غمزدہ ماں کے خواب میں آ جاؤ کہ اس کے  
بے قرار دل کو قرار نصیب ہو۔ اللہ پاک تمہیں  
شہادت کے بلند درجے رفاً فرمائے۔ (آمین)

11 نومبر 2014ء کو معین اکرم کی دوسری برسی  
ہے، آپ سب سے دعائے مغفرت کی درخواست

نوشاہ منظور کا پیغام سرگودھا میں مقیم اپنی  
پیاری دوست عروج مصطفیٰ کے نام

عروج جسے میں پیار سے نونا کہتی ہوں کرن کے  
ذرے سے میں تم سے کچھ کتنا جاہوگی تمہارے ہونے  
سے کبھی مجھے بس اور دوست کی کمی محسوس نہیں ہوئی  
تم میرے لیے کیا ہو شاید کبھی نہ جان سکو آخر میں اک  
دعا تمہارے لیے۔

دعا

میں نے چاہا  
کہ ایسا تحفہ تیری نذر کروں  
جسے تو عمر بھر یاد رکھے  
پھر ایک لمحے کی سوچ نے  
میرے ہاتھ بلند کیے

کچھ لفظوں کے پھول دعاؤں کے پنجھی  
دل کی گرائیوں میں آزاو کیے

کہ آنے والے موسموں میں  
غم کی گھنائیں، کبھی تیرے قریب نہ آئیں  
تیری آنکھوں کے دیے سدا چمکیں  
خدا تیرا دامن ہمیشہ مسرتوں سے ہمکنار کرے  
کبھی جو تو زندگی کی کڑی دھوپ میں  
ڈھلتی عمر کی شام میں پلٹ کر دیکھے تو  
بہت سی خوش رنگ یادیں

ہمیشہ لمحوں کی چاندنی تیرے دل کو ہلائے  
تو گزرتے لمحوں سے پیار کرے  
تو خدائے لم پریل تیرے عمر دراز کرے

ماہنامہ کرن 271

اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بھی بے وار کر دیتی ہے۔  
منزل چاہے ان دیکھی ہو، لیکن جب منزل کا تعین  
کر کے اس کی راہ پر گامزن ہوا جاتا ہے تو پھر زاور راہ کی  
بھی سمجھ آ جاتی ہے اور راستوں کی رکاوٹ بھی خود بخود  
دور کرنا آ جاتا ہے۔ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو  
شے چاہیے ہوتی ہے وہ ہے خلوص۔ یہ عقائد تو پھر ہر  
کو شش بے مقصد ہو جاتی ہے۔

(عشق کا قاف سے اقتباس)  
آمنہ اندلس۔ سرگودھا



ایک مرتبہ حضرت عمرؓ بیت الحرم کا طواف کر رہے  
تھے اتنے میں انہوں نے سنا ایک اعرابی رب کو  
مخاطب کر کے کہہ رہا ہے۔  
”یا اللہ! مجھے اپنے قلیل بندوں میں سے بنا

یہ سن کر حضرت عمرؓ متوجہ ہوئے اور نولے  
”اس شخص کو میرے پاس لے آؤ۔“  
جب وہ سامنے آیا تو فرمایا۔

”اے اعرابی! ایسی نرالی دعا میں نے آج تک نہیں  
سنی اس کا مطلب کیا ہے؟“  
اعرابی نے کہا۔

”کیا آپ نے قرآن پاک کی یہ آیت نہیں  
پڑھی؟ ”میرے بندوں میں بہت کم شکر گزار  
بندے ہیں۔“ لہذا میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے  
شکر گزار بندوں میں شامل کر دے اور چونکہ شکر گزار  
بندے کم ہیں لہذا اپنے کم یعنی قلیل بندوں میں شامل  
کر دے۔“

یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا۔  
”سچ کہا تو نے اب تو جاسکتا ہے۔“  
پھر آپ نے فرمایا۔

”ہر شخص عمر سے زیادہ عالم اور واقف ہے۔“  
نایلہ طارق — ضلع علیہ

رہ سکتا۔ بوڑھا رہ سکتا ہے۔ وہ تمام کی جنگ کے بعد  
وہاں ایک سروے رپورٹ شائع ہوئی جس کے مطابق  
جنگ کے بعد وہاں لوگ بوڑھے ہونے بند ہو گئے۔  
صرف جوان ہی ہوتے۔ کیونکہ جنگ نے بوڑھے  
ہونے کے لیے جوان چھوڑے ہی نہ تھے۔

(ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی نوک جوک سے اقتباس)  
افشاں یا سر۔ اٹالہ

ازاد یہ

☆ اچھی بات تو سب کو اچھی لگتی ہے جب تمہیں  
کسی کی بری بات بھی بری نہ لگے تو سمجھ لینا تمہیں اس  
سے محبت ہے۔

☆ نجر۔ انسان کو غلط فیصلے سے بچانا ہے مگر تجربہ غلط  
فیصلے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

☆ عزت دل میں ہونی چاہیے لفظوں میں نہیں  
ناراضی لفظوں میں ہونی چاہیے دل میں نہیں۔

☆ خوش نصیب وہ نہیں جس کا نصیب اچھا ہے بلکہ  
خوش نصیب وہ ہے جو اپنے نصیب پہ خوش ہے۔

سہ رنگا پوستر

محبت وہ شخص کر سکتا ہے جو اندر سے خوش اور  
مطمئن ہو اور پرہیز ہو، محبت کوئی سہ رنگا پوستر نہیں  
کہ کمرے میں لگا لیا۔ سونے کا تختہ کہ سینے پر سجایا۔  
چوڑی نہیں کہ خوب کلف لگا کر باندھ لی جائے اور بازار  
آگئے طرہ چھوڑ کر۔ محبت تو روح ہے۔ آپ کے اندر کا  
اندر ہے آپ کی جان کی جان ہے۔ محبت کا دروازہ  
صرف ان لوگوں پر کھلتا ہے جو اپنی انا، اپنی ایلگو، اپنے  
نفس سے جان چھڑا لیتے ہیں۔

(اشفاق احمد من حلقے کا سودا)

شکیلہ شہزادی شالہ۔ ملکوال

مقصد

مقصد نہ صرف انسان کو توانا کر دیتی ہے بلکہ

ماہنامہ کرن 270



بشری مجھ



## خانہ بدوش،

چار تنگے اٹھانے کے جنگل سے  
ایک بالی اناج کی لے کر  
چند قطرے ٹپکتے اشکوں کے  
اور کچھ فاقے سوکھے ہونٹوں کے  
مٹی خرابی قبر کی مٹی  
جھولی بھر آرزوؤں کا گارا

ایک تعمیر کی لیے حسرت  
تیرا خانہ بدوش بے چارہ  
شہر میں درد برد بھگتا ہے  
اک سہارے کی راہ نکلتا ہے  
تیرا کاندھا ملے تو سر ٹپکے

فوزیہ شہر بٹ، کی ڈائری میں تحریر

عظیم ہاشمی کی غزل  
تعلق توڑتا ہوں تو ممکن توڑ دیتا ہوں  
جسے میں چھوڑتا ہوں مکمل چھوڑ دیتا ہوں

محبت ہو کہ نفرت ہو بھرا رہا ہوں شدت سے  
جدھر سے آئے یہ دیا ادھر ہی موڑ دیتا ہوں

یقین رکھتا نہیں ہوں میں کسی کے تعلق پر  
جو دھکا گا ٹوٹنے والا ہوں اس کو توڑ دیتا ہوں

مرے دیکھے ہوئے سینے کہیں لہریں لے نہ جائیں  
گھر وندے ریت کے تعمیر کر کے چھوڑ دیتا ہوں

میں شیش گر نہیں، آئینہ سازی تو نہیں آتی  
جو دل ٹوٹے تو ہمدردی سے اس کو جوڑ دیتا ہوں

عظیم اب تک وہی بچپن وہی تخریب کاری ہے  
نفس کو توڑ دیتا ہوں پرندے چھوڑ دیتا ہوں

راتی، کی ڈائری میں تحریر  
اقبال عظیم کی غزل  
سفر میں عمر کٹی اور دُحویہ میں بھی چلے  
مگر نہ پیر ہمارے ٹھکے نہ پاؤں جلے

قدم اُٹھے ہیں تو منزل بھی مل ہی جائے گی  
سفر طویل و مسلسل سہی چلے تو چلے

تم اپنی بزم کی رونق کا اہتمام کرو  
ہمارے گھر کے چراغوں کا کیا جلے نہ جلے

جو ذرہ خیز محبت بھی خوش نصیبی ہے  
تو خوش نصیبوں سے جیسے ہم بد نصیب بچلے

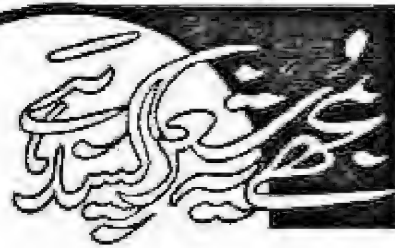
تمہارے بعد چراغوں کا کام ہی کیا تھا  
نہ تم ہی ٹوٹ کے آئے نہ پھر چراغ جلے

کسی کا بوجھ کوئی اور کیا اٹھائے گا  
سسک رہا ہے زمانہ خود اپنے بوجھ تلے

نہ جلنے کو نہ سی منزل نے کارواں لوٹا  
کوئی نہیں جو مرے ساتھ دو تہا جی چلے

صابرہ یار محمد، کی ڈائری میں تحریر  
عمر زاد کی نظم

شکستہ میلان



نمرہ  
اس بچے کی عید نہ جانے کیسی ہوگی  
جس کی جنت تنگے پاؤں بھرتی ہے

اقرا  
اس سے کیا حاصل دلوں میں شوق کا بند نہ تھا  
بندہ پرورد عید ملنا تو کوئی بے جا نہ تھا  
صائمہ سلیم  
اسلام آباد

ان کی مسرت میں رہے تجھ کو حیاں  
عید کے دن بھی ہیں کچھ دل پر مال  
اسیہ جاوید  
علی پور چھتہ

اس مہرباں کی نظر عنایت کا شکریہ  
تجھ دیا عید پہ ہم کو فراق کا  
عذرا ناصر  
کراچی

اسلام کا انقلاب نہ آیا تھا جب تک  
عیدین میں یہ تمکنت و دلبری نہ تھی  
اقصی ناصر  
کراچی

ایسی نہ شب برات نہ بقرعید کی خوشی  
جیسی کہ ہر اک دل میں ہے اس عید کی خوشی  
صائمہ جمی  
کے ڈی لے

افسوس صد افسوس کہ پہلے کی طرح اب بھی  
عید آئی مگر عید حائی نہ گئی  
تحریم فاطمہ  
فیصل آباد

ایرول کے لیے ہر روز روز عید ہے  
غریب خوش ہوں تو جانیں کہ عید آئی ہے  
روہینہ شریف  
کراچی

کسی کو کیا فرق پڑتا ہے یہاں ان چیزوں سے  
احساس ختم جذبات دلتن دل ٹوٹے جان چھوٹے  
اسیہ حنیف  
کراچی

وفا کا نام بھی زندہ ہے میں بھی زندہ ہوں  
اب اپنا حال سنا مجھ کو بے وفا میرے

ماہ نور علی  
ابھی تو خشک ہے موسم بارش ہو تو سوچیں گے  
کہ ہم نے اپنے ارمانوں کو کس مٹی میں بونا ہے

گر یا شاہ  
کسے خبر وہ محبت تھی یا دقاوت تھی  
بہت سے لوگ سبھے دیکھ کر ہمارے ہوئے

سیدہ نسبت زہرا  
وہ جذلوں کی تجارت تھی، یہ دل کچھ اور سمجھا تھا  
اسے ہنسے کی عادت تھی، یہ دل کچھ اور سمجھا تھا  
ہمیشہ اس کی آنکھوں میں دھنک رنگ ہوتے ہی  
یہ اس کی عام حالت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا

نذا، فقفہ  
اس کو کھونے کا بہت ڈکھ ہے مگر  
ہم اسے پالنے کے اسباب کہاں سے ملاتے

صدف عمران  
خواب میں بھی تم اب نہیں آتے  
مطلب لغز میں ان دنوں عروج پر ہیں

مدیحہ نویدین مہک  
ساری عمر میری ماں نہیں سوئی تائیں  
میں نے اک بار کہا تھا مجھے فد لگتا ہے

ارم کمال  
فلک سے توڑ لایا ہوں مگر پھر سے نئی ضد ہے  
ستارے میں نہیں لیتی مجھے تو چاند لگا کر دو

نمل تاج  
اڑ جائیں گے تصویر کے رنگوں کی طرح ہیں  
ہم وقت کی شہنی پہ پرندوں کی طرح ہیں

حلا قریشی  
کسی کو طر کے آنسو ہیں شاید  
کہانی میسر پر بھیگی پڑی ہے

ماہ نور علی  
ابھی تو خشک ہے موسم بارش ہو تو سوچیں گے  
کہ ہم نے اپنے ارمانوں کو کس مٹی میں بونا ہے

قصہ کالونی







سونف

سونٹھ

سبز الائچی

تیز پات

بادیان کے پھول

گرم مسالا

آنا

ترکیب :

ایک کھانے کا چمچ  
1/4 چائے کا چمچ

دو عدد

ایک عدد

1/4 چائے کا چمچ

1/2 چائے کا چمچ

تین کھانے کے چمچ

ثابت دھنیا، سفید زیرہ، سونف، سونٹھ، سبز الائچی، تیز پات، بادیان کے پھول اور گرم مسالا پاؤڈر کو توڑے پر بھون لیں اور پس لیں۔ تیل گرم کریں، پیاز ڈال کر لائٹ براؤن کر لیں۔ پیاز ہوا مسالا ڈال کر دس منٹ تک بھون لیں۔ اب پائے گوشت، نمک، لال مرچ، ہلدی، لہسن اور کاپیٹ ڈال کر اچھی طرح بھون کر 5-6 گلاس پانی ڈال کر گھٹنے کے لیے رکھ دیں۔ اچھی طرح گل جائے۔ ڈیڑھ کپ پانی میں آنا حل کر کے ڈالیں، پندرہ منٹ تک پکائیں۔ سرو کرتے ہوئے ہر ادھنیا، پودینہ، مرچ، اور ک باریک کاٹ کر ڈالیں۔

سندھی مٹن تنک

اشیا :

گوشت (غیر ہڈی کا) ایک کلو

اشیا :

بکرے کا گوشت

ایک کلو

پیاز (باریک کاٹ لیں) چار عدد (درمیانہ سائز)



ماہنامہ گرن 276

لہسن پیسٹ

ثابت زیرہ

لونگ

سیاہ مرچیں

بڑی الائچی

دار چینی

چھوٹی الائچی

دھنیا پاؤڈر

دہی

لال مرچ پاؤڈر

نمک

بادام

(چھلکا اُتار کر دو ٹکڑے کر لیں)

جیل

ترکیب :

دو کھانے کے چمچ

ایک چائے کا چمچ

دس عدد

دس عدد

دو عدد

دو ٹکڑے

چھ عدد

تین چائے کے چمچ

ایک پاؤ

لال مرچ پاؤڈر

نمک

ایک کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

ڈیڑھ کپ

کشمیری پلاؤ

اشیا :

ماہنامہ گرن 277

بکرے کا گوشت  
پادل  
نمک  
گرم مسالا پاؤڈر  
ثابت دھنیا  
دار چینی  
بڑی الائچی  
نونگ  
سونف  
اور ک لہسن پیسٹ  
سیاہ مرچ پاؤڈر  
جائفل جاوتری پاؤڈر  
دہی  
تلی ہوئی پیاز  
جیل  
بادام، تل، ہر شمس  
ترکیب :

ایک پتیلی میں پانی ڈال کر اس میں گرم مسالا، نمک اور چاول ڈال کر ایک کٹی رہ جانے تک پکائیں اس کے بعد پانی نکھار کر چاول الگ کر لیں۔ ٹھنک کے کپڑے میں سونف اور ثابت دھنیا ڈال کر پونلی بنالیں۔ گوشت میں نمک، دار چینی، بڑی الائچی، لونگ اور ک لہسن کاپیٹ، سیاہ مرچ پاؤڈر، جائفل، جاوتری اور مسالا کی پونلی ڈال کر پکائیں گوشت گل جانے کے بعد اس میں دہی ڈال کر بھون لیں۔ ایک بڑے تیلے میں تیل گرم کریں اور اس میں ایک تہ چاول اور ایک تہ گوشت کی لگا میں اوپر تلی ہوئی پیاز، بادام، کشمش، زعفران، کیوڑہ اور زرد رنگ ڈالیں۔ دس منٹ دم پر رکھیں، مزے دار کشمیری پلاؤ تیار ہے گرم گرم کریں۔

☆ ☆



## سنگ کی کہانی

☆ بہت خوب...! اچھا یہ بتائیں کہ آپ کے نئے مالک پریشان ہیں یا انتہائی پریشان۔

☆ ☆ ☆

☆ منگائی کی گاڑی کے بریک نہیں ہوتے۔  
☆ بجٹ تو آتا ہے سالانہ۔ مگر اشیاء کی قیمتیں بڑھتی ہیں روزانہ۔

☆ ہر آنے والی حکومت غریب کے لیے نہیں بلکہ غریب کے غلے کے لیے کوشاں رہتی ہے۔

☆ نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ہر رائج افراد میں سے ایک شخص لازمی ذہنی طور پر بیمار ہوتا ہے۔ آپ اپنے دوستوں کا بخوبی جائزہ لیں، اگر ان میں سے چار بالکل ٹھیک ہوں تو باقی تین آدمی آپ ہی ہو سکتے ہیں۔  
☆ عورت کی خواہش اور مرد کی تا عمر آزمائش کو شادی کہا جاتا ہے۔

☆ شادی سے پہلے آدمی کی زندگی رنگین و حسین اور شادی کے بعد سنگین و غمگین ہو جاتی ہے۔

☆ آپ یقین کریں کہ آپ کے راز آپ سے زیادہ آپ کے پڑوسیوں کو معلوم ہوتے ہیں۔

☆ عورت مرتے دم تک ساتھ نبھاتی ہے، مرد کا نہیں، نیشن کا۔

☆ بیوی۔ پہلی ہو تو لڑتی ہے اور دوسری ہو تو لڑاتی ہے۔

☆ کھڑکی کے بند پٹ سے در تک دیکھنے والی مائیکرو اسکوپ کا نام عورت ہے۔

☆ جب بھی دیکھو بیوی کے کان غیبتوں سے بولیں گی، جیب کرنسی نوٹوں سے جبکہ مظلوم شوہر کی آنکھیں

پوشیدہ ٹیکس

محمود نے سگریٹ کا آخری کش لیتے ہوئے سرفراز سے پوچھا۔ "اس دفعہ سگریٹوں پر نئے ٹیکس کیوں لگا دیے گئے ہیں؟"

سرفراز نے جواب دیا۔ "یہ ایک پوشیدہ ٹیکس ہے، اس نے قبرستان کو ترقی دینے کے لیے جو صرف سگریٹ نوشوں کے لیے مخصوص ہو گا۔"

عائشہ بشیر۔ پھول مگر

سرکاری ملازم

سرکاری ملازم نے معالج سے کہا۔ "براہ کرم مجھے دلا ہونے کا کوئی موثر طریقہ بتائیں۔"

معالج نے جواب دیا۔ "بے حد آسان طریقہ بتاتا ہوں، آپ بس اتنا کریں کہ صرف اپنی تنخواہ سے کھایا کریں۔"

عرفانہ عارف۔ کراچی

ہری مرچیں

○ کیا تمہارے والد کے انتقال کے وقت ان کی جسمانی اور ذہنی حالت بالکل ٹھیک تھی؟

☆ یہ تو کل ہی پتا چلے گا جب ان کا وصیت نامہ پڑھا جائے گا۔

○ خدا کی پناہ۔ ان دونوں لڑکیوں میں کس قدر مشابہت ہے، کیلیدہ دونوں جڑواں بہنیں ہیں؟

☆ نہیں! اتفاق سے یہ دونوں ایک ہی سرجن سے پلاسٹک سرجری کروا چکی ہیں۔

○ میں نے مکان بدل لیا ہے۔

محبت کی حسین چاندنی رات اتنی جلد کیسے ڈھل گئی؟  
آؤ ڈیر۔ اپنی محبت کی ہر نشانی۔ اپنے تحائف۔ اپنے خطوط، آخری بار جی بھر کر دیکھ لیں کہ یہ دن اب لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

لڑکی گھبرا کر بولی۔ "ڈیر۔! خدا کے لیے ہوش میں آؤ۔ ہم دونوں کی شادی کی خبر سن کر آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

فرح بشیر۔ بھائی پھیرو

عمر قید

ایک موکل اپنے وکیل سے۔  
"کوشش کرنا عمر قید ہو سزائے موت نہ ہو۔"

مقدمے کے بعد موکل نے پوچھا "کیا ہانا۔"  
وکیل۔ "جناب بڑی مشکل سے عمر قید ہوئی ورنہ وہ تو رہا کرنے والے تھے۔"

مدیحہ نورین مہک۔ برٹالی

جواز

ایک معمولی شکل و صورت کی عورت نے اپنے خوب صورت شوہر سے کہا۔ "تم نے ہر طرف یہ جھولی خبر کیوں پھیلا رکھی ہے کہ میں لاکھوں کی جائیداد اور کاروبار کی تھمادار تھوں۔"

شوہر نے جواب دیا۔ "تم سے شادی کرنے کا کوئی نہ کوئی جواز تو مجھے پیش کرنا ہی تھا۔"

ہانیہ عمران۔ گجرات

امی جان

پہلا دوست "یار میں جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے شادی نہیں کی۔"

دوسرا دوست! "تم نے اسے بتایا نہیں تھا کہ تمہارے ابو کوڑھتی ہیں۔"

پہلا دوست "بتایا تھا۔" "تو پھر اس نے ابو سے شادی کر لی۔"

لڑکا غمگین لہجے میں بولا "پہلے میں اسے جان کتا تھا۔"

آنسوؤں سے بھری رہتی ہیں۔  
☆ شاہجہاں نے تاج محل کی ہر کھڑکی کو دیکھا، ہر دروازے، ہر جھروکے، ہر دیوار اور ہر دالان کو دیکھا۔

ایک دفعہ نہیں بار بار دیکھا اور آخر میں لمبی ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔ "ماں قسم۔ بہت خرچا ہو گیا۔"

☆ میرا گھر میرے لیے جنت سے کم نہیں ہے کیونکہ میں نے ابھی شادی نہیں کی ہے۔

☆ میرا دوست اپنی بیوی کے سامنے بیٹھ اپنی زبان بند رکھتا ہے اس لیے نہیں کہ وہ لڑنا نہیں جانتا بلکہ اس وجہ سے کہ وہ گونگا ہے۔

☆ وہ روزانہ صبح سویرے اٹھتا ہے نماز پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ دفتر جانے سے پہلے اپنے حصے کے برتن دھونے کے لیے۔

لکھنشاں انجم۔ فیصل آباد

احساس

☆ اس نے پہلی بیوی کی وفات پر اپنی سالی سے شادی کر لی کیونکہ وہ نئی ساس کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

☆ میاں بیوی لڑ پڑے۔ بیوی نے ماں کو فون کیا اور بولی۔ "اماں میں آپ کے گھر آ رہی ہوں۔" ماں نے

کہا۔ "نہیں بیٹی اسے اپنے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔ میں تمہارے گھر آ رہی ہوں۔"

☆ یار کمال ہے! مجھے تو یقین نہیں آ رہا ہے کہ تمہاری ساس شادی کے دن سے اب تک تمہارے گھر صرف ایک مرتبہ آئی ہیں۔

"ہاں یار! میں سچ کہہ رہا ہوں کیونکہ وہ شادی والے دن ہی آگئی تھیں اور پھر وہ گئی ہی نہیں۔"

رفعت جبیں۔ ملتان

یہ کیا ہو گیا؟

لڑکے نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔  
"ڈارلنگ! آخر یہ کیا ہو گیا ہے۔ ہماری محبت کی دنیا کیوں اجڑ گئی؟ اب ہم نیسے پھولوں، کلیوں اور جہنم کے موضوع پر باتیں کریں گے؟ آخر یہ کیوں ہو گیا؟ ہماری



اب امی جان کہتا ہوں

فوزیہ۔ گجرات

غلط فہمی

ایک صابر قسم کے شوہر نے اپنی بیوی سے کہا "تمہاری والدہ تین سال سے ہمارے ساتھ رہ رہی ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اب وہ اپنا الگ گھر لے کر رہنے لگیں۔"

"میری والدہ۔" بیوی حیرت سے چلا اٹھی۔ "میں تو اب تک یہی سمجھتی رہی کہ وہ تمہاری والدہ ہیں۔"

شہناز پنڈی

وجہ تسمیہ

ایک صاحب کو رات سوئے وقت اچانک بہت بھوک لگی تلاش کرنے پر انہیں ایک میز کے خانے سے دو بسکٹ مل گئے انہوں نے وہ بسکٹ کھائے تو بہت لذیذ لگے وہ اپنی بیوی سے کہنے لگے کہ وہ ایسے بسکٹ اور بھی لے آئے۔ دوسرے روز ان کی بیوی بسکٹ خریدنے گئیں تو دکاندار نے کہا "آپ اتنے زیادہ بسکٹ کا کیا کریں گی" آپ کا کتا تو ایک ہی ہے۔" بیوی نے جواب دیا۔ "میرے شوہر کو یہ بسکٹ بہت لذیذ لگتے ہیں۔"

گمریہ بسکٹ تو خاص طور پر کتوں کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ انسان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔" دکاندار نے تنبیہ کی مگر وہ خاتون ہر روز بسکٹ لے جاتیں اور ان کے شوہر شوق سے وہ بسکٹ کھاتے ایک دن خاتون نے اس دکاندار سے کہا۔ "کل میرے شوہر کا انتقال ہو گیا۔"

دکاندار نے کہا۔ "میں نہ کہتا تھا کہ انہیں کتوں کے بسکٹ نہ کھانے دیں۔ وہ مر جائیں گے۔" عورت نے جواب دیا۔ "مگر وہ بسکٹ کھانے سے تو نہیں مرے بلکہ وہ تو کاروں کے پیچھے بھاگنے سے فوت

ہوئے ہیں۔"

فوزیہ ثمرٹ۔ گجرات

کامیابی

انپکٹر نے اپنے دو ماتحتوں سے پوچھا۔ "میں نے تمہیں جس ڈاکو کو تلاش پر لگایا تھا وہ ملا یا نہیں؟" "سر جی! ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔" ایک ماتحت نے مستعدی سے جواب دیا۔ "ہم اسے پکڑنے میں تو کامیاب نہیں ہوئے لیکن سر جی! اس پر ہماری دہشت اتنی بڑھ گئی ہے کہ جب ہم گشت پر ہوتے ہیں تو وہ بالکل سانسے نہیں آتا۔ یہ بھی کچھ کم کامیابی نہیں ہے سر جی!"

نوسید جہانگیر، ممبر آزاد کشمیر فلم

سر دار۔ "کل رات تین گھنٹے تک ایک انگلش فلم دیکھی۔ اس میں نہ کوئی سین تھانہ آواز۔" دوست۔ "فلم کا نام کیا تھا۔" سر دار۔ "No disc inserted"

رسی

ایک ٹرک دوسرے ٹرک کو رسی باندھ کر لے جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر سردار ہنس ہنس کر پاگل ہو گیا اور کہنے لگا۔

"ایک رسی لے جانے کے لیے دو دو ٹرک۔" نمرین خورشید، نسرین خورشید۔ خانیوال

نظام تعلیم

دہشت گردی میں ایک تقریب تھی۔ بڑی بانی گرامی لوگ موجود تھے۔ جرمن، فرانسیسی اور پاکستانی وزیر تعلیم بھی وہاں موجود تھے۔ جرمن اور فرانسیسی وزیر محو گفتگو تھے پاکستانی وزیر بھی ان کی طرف بڑھ گئے۔ رسی دعا سلام کے بعد پاکستانی وزیر تعلیم دوسروں کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا۔

"آپ کے اعلیٰ معیار تعلیم کا کیا راز ہے؟" جرمن وزیر تعلیم نے جواب دیا "اس کی کوئی خاص وجہ نہیں بس ہمارے طالب علم آج کا کام۔ آج ہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

پھر پاکستانی وزیر تعلیم نے یہی سوال فرانسیسی وزیر تعلیم سے کیا انہوں نے جواب دیا "مختصری بات ہے ہمارے ہاں ایک کتاب میں کئی باب نہیں ہوتے بلکہ باب برکٹی کتابیں ہوتی ہیں۔" اس کے بعد جرمن وزیر تعلیم نے پاکستانی وزیر تعلیم سے پوچھا۔

"آپ کا نظام تعلیم پست گردانا جاتا ہے کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟" پاکستانی وزیر تعلیم نے شرمندگی چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

"ذرا اصل بات یہ ہے کہ ہمارے امتحانی پرچہ جات امتحانات سے تقریباً ایک دو ماہ پہلے آؤٹ ہو جاتے ہیں۔" "بہت حیرانی کی بات ہے۔" جرمن اور فرانسیسی وزیر تعلیم بیک وقت چلائے۔ "حیرانی یہ نہیں" پاکستانی وزیر تعلیم نے معصومیت سے کہا۔ "حیرانی تو یہ ہے کہ طالب علم پھر بھی فیل ہو جاتے ہیں۔"

سیدہ نسبت زہرا، کمروژپکا

راز و نیاز

"بہت دن بعد نظر آئے کہاں تھے؟" "میں اسپتال میں تھا۔" "اوہ یہ سن کر افسوس ہوا۔" "نہیں افسوس کی کوئی بات نہیں ہے" میں نے نرس سے شادی کر لی تھی۔" "بہت خوب۔" تو اچھا ہوا۔" "اچھا کہاں سے ہوا" شادی کے بعد پتا چلا کہ اس کے تین بچے ہیں۔" "اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔"

"نہیں کچھ ایسا برا نہیں ہوا۔ اس کے ایک کنوارے ماموں اس کے لیے بہت بڑی کوٹھی چھوڑ کر مرے تھے۔"

"پچلو یہ تو اچھی بات ہے۔" "خاک اچھی بات ہے، پچھلے دنوں آگ لگ گئی اور کوٹھی بالکل تباہ ہو گئی۔"

"لوہ یہ تو بہت برا ہوا۔" "نہیں ایسا برا بھی نہیں ہوا" میری بیوی بھی کوٹھی میں جل کر مر گئی۔" "پچلو یہ تو اچھا ہوا۔"

سویا۔ کراچی

از واجبات

شادی : ایک ایسا ذریعہ جس سے شوہر کو رفتہ رفتہ علم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی کیسے شوہر کی طلبہ گار ہے۔ شوہر : ایسا محسوس ہوتا ہے میں تمہا بوڑھا ہونا جا رہا ہوں، میری بیوی نے گزشتہ کئی سال سے سالگرہ نہیں منائی۔

جہانی : منہ کھولنے کے لیے شادی شدہ مردوں کے لیے قدرت کا عطیہ۔

کنوارہ : جو صبح کام پر جانے کے لیے صرف ایک بندے کا ناشتہ تیار کرتا ہے۔

افواہ : بیوی کی لائی ہوئی اطلاع۔

عقل مندی کا تقاضا : بیوی سے بحث میں جیت جانے کے باوجود معافی مانگ لینی چاہیے۔

ماہر نفسیات نے کہا "لڑکیاں ان مردوں سے شادیاں کرنا چاہتی ہیں جس میں ان کے باپ کی صفات موجود ہوں۔" یہی تو لڑکی کی شادی پہ ان کی مامیں روتی ہیں۔

حرمت ردا اگر مہر و لوال

☆ ☆



# حبیب و صحت

اداکر



## مساج

تمام کاموں سے فارغ ہو کر شام کا کوئی وقت اس کام کے لیے سلیکٹ کر لیں آپ اپنے پیروں کا مساج میلی وژن دیکھتے ہوئے بھی کر سکتی ہیں۔

## کندھوں کا مساج

بہت سے لوگوں کو گردن اور کندھوں میں زیادہ کھنچاؤ محسوس ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ سر کے درد کی بھی شکایت کرتے ہیں لہذا کندھے اور گردن ہی وہ پرفیکٹ جگہ ہیں جہاں سے آپ مساج شروع کر سکتی ہیں اس کے علاوہ تقریباً ہر ایک کی پسند بھی یہی حصہ ہے جن کی وجہ سے آپ کے پورے جسم کی مود منٹ ممکن ہوتی ہے۔

اپنے سیدھے کندھے کو الٹے ہاتھ سے آہستہ آہستہ دبائیے اپنے ہاتھ سے اپنے جسم کے وہ تمام حصے دبائیں جہاں جوڑ ہوتے ہیں اپنے سر سے مساج شروع کیجیے اور آہستہ آہستہ گردن پر آئیے پھر اپنے کندھوں کا مساج کریں اس کے بعد اپنے بازوؤں اور پھر کہنیوں

کیا آپ مساج کی ضرورت محسوس کر رہی ہیں اور کوئی مساج کرنے کے لیے آپ کو میسر نہیں ہو رہا ہے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے آپ خود مساج کر لیں۔ جی ہاں یہ کام آپ خود بھی ذرا سی بھرپور توجہ سے کر سکتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس مساج میں آپ کو وہ انجوائے منٹ نہیں مل سکے گی جو کسی دوسرے کے ہاتھ سے کیے گئے مساج میں ملتی ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ آپ کافی حد تک ریلیکس اور ٹینشن سے آزاد ضرور ہو سکتی ہیں آپ اپنے جسم کے تمام حصوں سے بخوبی واقف ہیں اور جانتی ہیں کہ کس جگہ کو مساج کی ضرورت ہے لہذا آپ یقیناً بہتر مساج کر کے اپنے جسم کے اس حصے کو ریلیکس کر سکتی ہیں۔

آپ کسی بھی وقت مساج کر سکتی ہیں اور یہ فیصلہ بھی آپ کو خود ہی کرنا ہے کہ مساج آپ کو تیز کرنا ہے یا دھیرے دھیرے کام شروع کرنے سے قبل بھی خود کو تازہ کرنے کے لیے صبح مساج کیا جاسکتا ہے یا پھر

## ٹانگوں کا مساج

آپ ایکٹو زندگی گزار رہی ہوں یا پھر بے کار بیٹھی رہتی ہوں ٹانگوں کے مساج کے بارے میں جاننا دونوں ہی صورتوں میں بہت ضروری ہے۔ ٹانگوں کے مساج سے زیادہ دیر کھڑے رہنے کی صورت میں بہت زیادہ سکون ملتا ہے اور زیادہ دیر کھڑے رہ کر آپ کے مسلز جو تھک جاتے ہیں وہ اس مساج کے ذریعے بہت سکون محسوس کرتے ہیں تھوڑی سی ایکسرسائز کر کے اگر آپ کی ٹانگوں کو آرام ملتا ہے تو اس میں کیا برائی ہے ریگولر مساج آپ کی رانوں کو بھی بہترین حالت میں رکھتا ہے ہم میں سے بہت سے لوگوں کا زیادہ تر وزن رانوں پر ہی ہوتا ہے اس لیے اس کے مساج سے بہت سکون ملتا ہے اور رانیں با آسانی آپ کی پیٹھ میں بھی ہوتی ہیں یاد رکھیں کہ ایک ٹانگ پر پہلے مساج کریں اس سے فارغ ہونے کے بعد دوسری ٹانگ کی طرف توجہ دیں دونوں ٹانگوں کا بیک وقت مساج نہ کریں۔

اپنی ٹانگوں کا مساج آپ اپنے پاؤں کے انگلیوں سے شروع کر کے اس کا خاتمہ اپنی رانوں پر کر سکتی ہیں اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی ٹانگ کے دونوں طرف بہتر انداز میں استعمال کریں ایک ٹانگ سے فارغ ہو کر دوسری کی طرف توجہ دیں یہ سلسلہ کم و بیش پانچ مرتبہ دہرائیں۔

ران کے پٹھوں کی اچھی طرح مالش کریں فرنٹ والے اور باہر والے حصے پر خصوصی توجہ دیں۔ بھی ایک ہاتھ سے تو کبھی دوسرے ہاتھ سے آرام آرام سے مالش کریں اگر آپ ریگولر اپنی رانوں کی مالش کا سلسلہ جاری رکھیں تو نہ صرف یہ کہ انہیں ریلیکس ہونے میں آسانی ہوگی بلکہ ان کی شکل بھی اچھی ہو جائے گی۔

اس کے بعد اپنی ران کو ہلکے ہلکے اس انداز سے ہاتھ سے مالش کیجیے کہ اختتام آپ کے گھٹنوں پر ہو۔



کا مساج کریں۔ یہ سلسلہ کم از کم تین بار کریں اس کے بعد جسم کے کسی اور حصے کا مساج شروع کریں۔ اپنی گردن پر موجود ہڈی کے دونوں طرف کے حصوں کو اپنی انگلی کی پوروں سے آہستہ آہستہ دباؤ بڑھا کر مساج کریں اس کے بعد دونوں کندھوں کی طرف آئیں اور آہستہ آہستہ دباؤ بڑھا کر مساج کریں اس کے بعد یہ سلسلہ اپنے بازوؤں کے ساتھ کریں۔

اپنے الٹے ہاتھ کی انگلیوں سے سیدھے کندھے پر مساج کریں اپنی کلائی کو ڈھیلا رکھیں یہ سلسلہ آپ کے خون کی گردش کے لیے انتہائی اہم ثابت ہو سکتا ہے اور آپ کی تھکاوٹ کو بہتر طریقے سے دور کر سکتا ہے یہی سلسلہ اپنے دوسرے کندھے پر بھی دہرائیں۔

دونوں ہاتھوں سے آہستہ آہستہ اور آرام وہ انداز میں اپنے چہرے گردن بازوؤں اور کندھوں پر مساج کریں یہ سلسلہ اپنے چہرے سے شروع کریں اور اپنی ٹھوڑی تک مساج کا دائرہ بڑھائیں اپنی گردن کے گرد ہاتھ اس طرح باندھیں کہ آپ کا ہاتھ مخالف کندھے پر ہو آہستہ آہستہ اپنے کندھوں پر مساج کرتے ہوئے اپنے بازوؤں کی طرف آئیں اور پھر اپنی انگلیوں کی طرف یہ سلسلہ جتنی مرتبہ آپ چاہیں اس سلسلے کو دہرا سکتی ہیں اس سے نہ صرف یہ کہ آپ کو بہت آرام محسوس ہوگا بلکہ آپ کے سر کے درد میں بھی خاطر خواہ کمی واقع ہوگا۔





اس عمل سے عمل طور پر لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آپ تمام تر توجہ سے یہ کام کریں۔ اپنی رانوں کے فرنٹ اور باہر کے حصے پر مسلسل گھولنے ماریں۔ غصے میں نہیں بلکہ آرام آرام سے یہ عمل آپ کی رانوں میں خون کی گردش کو تیز کرے گا جو بعض مرتبہ دیر تک بیٹھنے کی وجہ سے رک جاتا ہے۔ اپنے گھٹنے پر ہر طرف سے مساج کیجیے پورے غصے کو آہستہ آہستہ اسٹوک لگائیے اور پھر اپنی انگلیوں کی مدد سے اپنی رانوں پر دباؤ آہستہ آہستہ برہاتی جائیں اختتام اپنے گھٹنوں کے پیچھے آرام آرام سے اسٹوکس لگا کر کریں۔

### اپنے پاؤں کا مساج

اپنے پاؤں کا مساج خود کرنا بہت آسان ہے اگر آپ پیچھے ہوتی ہیں تو اپنا ایک پیر اپنی دوسری ران پر رکھ لیں اگر آپ لیٹنا چاہتی ہیں تو کوئی مسئلہ نہیں آپ اپنی اٹھی ہوئی ران پر اپنا پیر رکھ لیں سب سے پہلے اپنے ایک پیر کا مساج کریں اس کے بعد دوسرے پر کام کریں۔ آپ کی ذرا سی محنت اور توجہ آپ کو اپنے پاؤں کے بہت سے مسائل سے نجات دلا سکتی ہے۔ اپنے پاؤں کا روزانہ مساج آپ کو ٹھکن سے بھی نجات دلا سکتا ہے اور آپ اس مساج سے اپنے پورے جسم میں سکون اور تازگی بھی محسوس کر سکتی ہیں۔

اپنا ایک ہاتھ پیر کے اوپر اور دوسرا اپنے پاؤں کے تلووں پر رکھیں پھر آہستہ آہستہ اپنے انگوٹھے اور انگلیوں کی مدد سے تلووں پر مساج کریں اپنی ایڑھی سے لے کر پیروں کی انگلیوں تک خوب مساج کریں اور یہ ایکسر سائز کئی مرتبہ کریں۔ ایک ہاتھ سے اپنے پیر کو اچھی طرح پکڑ لیں اور دوسرے ہاتھ سے پیر کی ایک ایک انگلی پر مساج کریں انہیں ایک ایک کر کے پیچھے ہٹائیے تاکہ ان میں اگر کوئی تکلیف ہو تو اس عمل سے دور ہو جائے۔ اپنے پیر کے تلوے پر اپنے دونوں ہاتھوں کے

اپنے ایک ہاتھ سے اپنے پیر کو مضبوطی سے سپورٹ فراہم کریں۔ جبکہ دوسرے کو اس انداز میں ڈھیلے طور پر رکھیں کہ اس کی انگلیاں مڑی ہوئی ہوں اور با آسانی پورے تلوے پر مومنٹ کر سکیں اس سلسلے کو بار بار دہرائیں بہت سکون محسوس ہوگا۔

پھر اپنے ہاتھ سے اپنے پیر کو اس طرح پکڑے رہیں اور اپنے تلوے کو دوسرے ہاتھ سے اچھی طرح دبائیں آہستہ آہستہ دباؤ سے بہت سکون ملتا ہے۔ اپنی انگلیوں کی مدد سے اپنے پیر کے انگوٹھے کے اطراف مساج کیجیے بالکل اسی طرح جس طرح آپ اپنی ٹانگ کا مساج کرتی ہیں۔ اس ایکسر سائز کا اختتام اسی طرح کریں جس طرح آپ نے اسے شروع کیا تھا۔

### اپنے ہاتھوں کا مساج

یہ بڑی حیران کن بات ہے کہ لوگ اپنے ہاتھوں میں ٹینشن زیادہ محسوس کرتے ہیں مگر اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں آپ جب اپنا ہاتھ مستقل استعمال کرتی ہیں تو اسے ٹینشن تو ہوتی ہے۔ زیادہ تر ہم چیزوں کو پکڑنے اور چیزوں کو اٹھانے کے لیے اپنے ہاتھ ہی تو استعمال کرتے ہیں لہذا آپ اپنی ہتھیلی کو کھول کر اپنی انگلیوں کو کھینچیں تو آپ کے ہاتھ کی تمام تھکاوٹ کافی حد تک دور ہو سکتی ہے۔

اپنے ہاتھ کے پچھلے حصے کو آرام آرام سے اسٹوکس لگائیے اور اپنی کلائی تک ایسا کیجیے اور پھر اسی

طرح واپس انگلیوں تک مساج کرتے ہوئے آئیے اسی طرح اپنی ہتھیلی اور انگلیوں کے درمیان والے حصے پر مساج کیجیے بہت سکون محسوس کریں گے۔ اپنی ہر انگلی کو الگ الگ پیچھے اور اپنے انگوٹھے کی مدد سے انہیں مساج کیجیے۔

اپنے ہاتھ کے پچھلے حصے پر اپنی کلائی کے قریب کی جگہ پر اپنے انگوٹھے سے آہستہ آہستہ دباؤ ڈالیے اور یہ سلسلہ کچھ دیر تک جاری رکھیے۔

اپنے ہاتھ کو پلٹ کر اس کے پچھلے حصے کو اپنی انگلیوں سے سپورٹ دیں اپنی ہتھیلی کے درمیان اپنے انگوٹھے سے دباؤ ڈالیں اس طرح اپنی پوری ہتھیلی اور کلائی پر مساج کا سلسلہ جاری رکھیں۔

اپنے مساج کا اختتام اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں سے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی کو دباتے ہوئے کیجیے دونوں ہاتھوں پر ایک دوسرے کی مدد سے یہ سلسلہ جاری رکھیے۔

### بازوؤں پر مساج

اگرچہ اکثر خواتین اپنے بازوؤں کو فراموش کر دیتی ہیں مگر آپ اپنے بازوؤں پر مساج کر کے خود محسوس کریں گی کہ آپ کے پورے جسم سے درد اور ٹینشن

کافی حد تک بھاگ گئی ہے۔ خاص طور پر آپ کو اپنے کندھوں میں بہت آرام محسوس ہوگا۔ اپنے پورے بازو کو (اپنی کلائی سے لے کر کندھے تک) اپنے دوسرے ہاتھ سے اچھی طرح دبائیے جب آپ اپنے بازو کی طرف پیچیں تو دباؤ میں تیزی لے آئیں۔ کئی بار اس سلسلے کو دہرائیں۔

اپنے بازو کو اچھی طرح دوسرے ہاتھ سے بار بار دبائیے خاص طور پر بازو کے اوپری حصے پر خصوصی توجہ دیں اور اس کے پیچھے والے حصے کو زیادہ تیزی سے دبائیں۔

اپنے پورے ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے کے ذریعے آرام آرام سے دبائیے اس میں آپ اپنی انگلیاں بھی شامل کر سکتی ہیں اپنی گھٹنی تک کے پورے حصے پر اس طرح بار بار مساج کریں۔

اپنے بازو کے اوپری حصے پر آہستہ آہستہ تھکی دینے کے انداز میں دوسرے ہاتھ سے ماریں اس سے آپ کے بازوؤں کی گردش نہ صرف بہتر ہوگی بلکہ ان کو بہتر انداز بھی ملے گا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ اپنے پورے بازو پر اسٹوکس کے ذریعے مساج کیجیے۔

☆ ☆



محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال وجوہ شائع کیے جا رہے ہیں۔



ذوالقرنین



رخانہ شمشاد کراچی

س نین جی! ہم نے تم کو دیکھا، تم نے ہم کو دیکھا کیسے؟

ج سرف میں دھلا ہوا اجلا تروتازہ، لکس میں نہایا ہوا ہاشمی سرمہ لگایا ہوا۔

شع تبسم فیصل آباد

س کیا بلک روز پر بھی تشلیں آتی ہیں؟

ج ہم پر تو آتی ہیں۔

شہناز وحید شڈوالہ یار

س محبت اور سیاست میں کیا فرق ہے؟

ج سیاست میں اجتماعی طور پر دھوکا کھایا اور دیا جاتا ہے جب کہ محبت میں صرف فرد واحد ہی دھوکا کھاتا ہے۔

راحت مسعود کمالیہ

س کہتے ہیں محبت خدا کا انمول عطیہ ہے لیکن جب بل پلاسٹک کے لگائے جائیں گے تو؟

ج محبتیں بھی پلاسٹک کی ٹل جایا کریں گی۔

سلمیٰ صدیقی جوہی کراچی

س اللہ تعالیٰ نے ایک نافرمان کو شیطان کیوں بنا ڈالا کسی حور کی یہ شامت کیوں نہیں آتی؟

ج خداوند کے معاملات میں ایک گناہ گار بندہ کچھ نہیں بول سکتا۔

ثمینہ عندلیب ٹیکسلا

س لوگ اپنی تعریفیں تو خوشی سے من لیتے ہیں مگر اپنی خامیاں سننے کا حوصلہ کیوں نہیں رکھتے بے چارے لوگ؟

ج میرے علاوہ۔

ایس اختر خواجہ بھیرہ

س ذوالقرنین بھیا! آپ کو کھانے میں مرغی پسند ہے یا انڈا؟

ج جب مرغی سامنے ہو تو انڈے کو دل چاہتا ہے اور جب انڈا مل جائے تو مرغی پسند آتی ہے۔

شادیاں نفیس کراچی

س آپ کا پسندیدہ پھول گو بھی کیا کاغذ کا؟

ج گو بھی کا پھول اگر کاغذ پر بنا ہو۔

\*\*\*

ماہنامہ کرن 286

مدیر مکران



جویریہ خان ماریہ خان کراچی

اب تو میری بہن اور میں نے باقاعدگی سے شروع کر دیا ہے خط لکھنا اور جب شائع ہوتا ہے تو خوشی کی انتہا مت پہنچیں کہ بس بہت خوشی ہوئی ہے۔

سب سے پہلے ایک دوست جو کہ لاہور کی ہے۔ اس کا میسج آگیا کہ کرن آگیا ہے۔ اور ہم یونیورسٹی سے واپسی پر خرید کر ہی گھر گئے۔ دور سے ہی دیکھنے میں آتا پیارا لگا کہ بس دل چاہا اور دکان کے پاس پہنچ جائیں اور ہاتھ میں آجائے۔ جب ہاتھ میں آیا تو وہی پہلے ”دل اک شرملاں“ پڑھا۔ اس دفعہ کی قسط نے تھوڑا رالایا ہے۔ ساحر کو ایک دفعہ تو سنا چاہیے تھا کہ جس پر وہ ہاتھ اٹھا رہا ہے وہ ہے کون؟ خیر ایک اچھی بات بھی ہوئی اس کی ماں اور بہن کی اصلیت ساحر کے سامنے آگئی۔ اب اگلی قسط کا انتظار کرنا دو بھر ہو رہا ہے بس جلدی سے آجائے۔

”شام آرزو“ کی تو سمجھ ہی نہیں آتا بات شروع کہاں سے کروں اور ختم کہاں پر کروں سنعان بے چارہ۔ اب تو ترس آنے لگا ہے سنعان پر اور مزا تو تب آیا جب پتا چلا کہ عقیدت کا گیم پارنر کوئی لڑکا ہوگا۔ وہی نہ ہو جو اس کو گھورتا رہتا ہے۔ بابا با عقیدت بے چاری ڈری سہمی سی۔ انٹرویوز میں فصیح باری اور عروۃ الوثقی کو پہلے بھی پڑھ چکے ہیں کہ آواز کی دنیا سے صادم کو پڑھا اچھا لگا۔ اسی طرح آواز کی دنیا سے ایک آرہے ہیں آصف ملک ریاض ہم ان کا بھی انٹرویو پڑھنا چاہیں گے ان کا بھی انٹرویو کریں۔

اسماء خان۔ کس جی ایم

اگست کے شمارے میں اپنا نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی، مگر پھر طبیعت ناساز ہونے کے باعث خط نہیں لکھ پائی، پھر میں میرا نام ”مجھے یہ شعر پسند ہے“ میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس بار ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ ”اک

سارگر ہے زندگی“ اچھا جا رہا ہے۔ ”دل اک شرملاں“ مجھے بہت پسند ہے۔ ”شام آرزو“ بھی بہت اچھا ہے۔ ہلکی پھلکی تحریر ”بہم دیرینہ“ نے تھوڑی دیر کے لیے ہمیں زینت کی سطح حقیقتوں سے دور کر کے جو دل کو سکون دیا ناقابل بیان ہے۔ نبیلہ نازش راؤ کی ”معتبر ٹھہرے“ تحریر دل کو چھو گئی۔ ”بلا عنوان“ بھی اچھی تھی۔ کسی کو کھو کر جب احساس ہو تو زندگی کا روگ بن جاتا ہے۔ خدیجہ مغل نے اس میں اس بات کو اچھی طرح واضح کیا ہے کہ کتنے کو تو اور بھی بہت کچھ ہے پر آپ کے پاس شاید اتنا وقت ہو نہ صفحات اس لیے اجازت دیں۔

رابعہ اسلم وڑائچ رحیم یار خان

بہت عرصہ ہو گیا قلم اٹھانے کی فرصت ہی نہیں ملی تو شاید آپ مجھے بھول گئی ہوں۔ مگر میرے پاس تو کرن کے تمام شمارے موجود ہیں جن میں میرا نام ہوا کرتا تھا اور یقیناً ”آپ پہچان بھی گئی ہوں گی۔ شادی کے بعد بچوں کے ساتھ وقت نکالنا انتہائی مشکل ہے۔ جیسے ہی فرصت کے لمحات ملے برائی یادوں نے ذہن کے در پہلوں میں آکا جھاکی شروع کر دی۔ واہ جی کیا وقت تھا جب اسکول کالج میں فری پریڈ میں بیٹھ کر کہانیوں پر تبصرہ کرتا۔ دولہا میں ڈائجسٹ پڑھ کر ڈائجسٹ بھی سفر پر نکل پڑتا۔ کبھی کسی فرینڈ کے گھر کبھی کوئی ٹیچر لے جاتیں۔ کہاں گئی وہ باتیں اور کہاں کھو گیا وہ وقت۔

بہر کیف اب بھی زندگی بہت اچھی ہے اور کرن کو جگہ گانے کے لیے حاضر ہو گئے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے تبصرے پر بھی فرینڈز تبصرہ کرتی تھیں بہت پاپو لرتھے میرے تبصرے۔

اب آپ سے اجازت چاہ رہی ہوں کہ مجھے میرے کرن میں جگہ دی جائے۔ میں واپس آگئی ہوں اپنی بہت سی تحریروں کے ساتھ۔ کرن عید کی مبارک باد اور

ماہنامہ کرن 287



کرن کا معیار بالکل بھی نہیں بدلا بلکہ بہتر سے بہتر بن گیا ہے۔ میری دعا میں آپ کے ساتھ ہیں۔ اگلے ماہ میں اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی اگر اب جگہ ملی تو اپنے بہت ہی قیمتی وقت میں سے اپنے قیمتی کرن کے لیے وقت نکال ہی لیں گے ہم

### سنا ز عرفان۔ ملکوال

آپ کے ڈائجسٹ کی مستقل قاری ہوں۔ کوئی نقطہ کوئی جگہ میری نظر سے بچ نہیں جاتا۔ اس قدر توجہ سے پڑھنے کے بعد کئی بار خط لکھنے کو دل چاہا مگر سستی آڑے آگئی۔ ہمیشہ یوں ہی ہوتا ہے کہ ”نمائے میرے نام“ پڑھ کر اپنے ذوق خط کی تسکین کر لیتی ہوں۔ اب جس بات نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا وہ ہے شینہ اکرم کراچی کا خط جس میں انہوں نے ناول ”دل اک شرملاں“ پر عجیب سی تنقید کی ہے۔ ناول اچھا تھا۔ اس لحاظ سے اور بھی اچھا تھا کہ نئی مصنفہ کی کاوش تھی۔ شینہ نے کہا کہ حمزہ کا دور ری ایکٹ کرنا برا لگا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ ہم دوسروں کے دکھوں کو محسوس کرنے کے بجائے بے حسی سے رائے کیوں دیتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ پہلی قسط کے آخری صفحات میں نے دو ہر میں تین گھنٹے لگا کر پڑھے۔ کیونکہ بار بار میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے اور میں ڈائجسٹ ایک طرف رکھ دیتی تھی۔

کسی اپنے کے گھمڑے پر کوئی انسان کتنی اذیت سے دوچار ہوتا ہے اس کا اندازہ آپ سے بڑھ کر کون کر سکتا ہے۔ پھر حمزہ جیسی بن ماں کی لڑکی جس کا واحد ساتھیان اس کا باپ تھا۔ باپ کی موت پر وہ جتنا محسوس کرے کم ہے۔ پھر اس کے بھائی اور اس کی ماں نے اس کے ساتھ اچانک جو کرنے کا پروگرام بنایا۔ مجھے تو جیسے جھرجھری آگئی۔ ساحر کو جیسا وہ سمجھتی تھی ایسے میں اس بے چاری حالات کی ماری لڑکی نے ہاتھ روم میں کھڑے ہو کر اپنے لیے کوئی راہ سوچنے کی کوشش کی۔ مجھے بہت رلایا۔ آپ کے کمنٹس پڑھ کر مجھے لگا شاید مجموعی طور پر ہماری قوم اسی شدید قسم کی بے حسی کا شکار ہے۔ ہم حکمرانوں کے خوابوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ مگر اپنے تکلیف زدہ بدن بھائیوں کا کوئی درد دل میں نہیں رکھتے۔ ناول بے شک فرضی ہوگا مگر احساس تو سچا ہوتا ہے۔ نبیلہ جی آپ اپنے نئے ناول کے ساتھ کب آ رہی ہیں۔

”مسکراتی کرنیں“ آج کل بہت زبردست جا رہی ہیں۔ نفیسہ سعید کا ناول اچھا ہے۔ امید ہے کہ آگے جا کر اور اچھا ہوگا۔ میرا پہلا خط ہے شائع ہوا تو آئندہ بھی حاضری دوں گی۔

### ثناء شہزاد۔ کراچی

شہزاد کا شمار 10 تاریخ کو ملا تو بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ کیونکہ اب تو 14 تاریخ تک ملنے لگا ہے۔ پتا نہیں کرن میں ایسی کیا بات ہے کہ جتنا اس کا اور ہمارا ساتھ پرانا ہو رہا ہے اتنا ہی اس کی اور ہماری محبت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اب آتے ہیں تبصرے کی طرف، حمد و نعت ہمیشہ کی طرح لا جواب تھے۔ تھوڑا آگے بڑھے انٹرویوز میں صرف عروۃ الوثقی کو پڑھنے کا شرف بخشا۔ اس کے بعد دیکھا کہ ایک نیا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ ”پیغام دوست“ کے نام سے۔ دیکھ کر خوشی ہوئی اور سب کے پیغام اچھے لگے۔ ”مقابل ہے آمنے“ میں صدق مختار موجود تھیں۔ ان کے جوابات اچھے لگے۔ کیونکہ تقریباً ہر جواب میں کسی نہ کسی خالہ جان کا ذکر تھا اور مجھے بھی اپنی خالادوں سے بہت محبت ہے۔ افسانوں میں باج تو بہت اچھے لگے۔ ”لبتہ دو کچھ خاص پسند نہیں آئے“ ”بلا عنوان“ اور ”دل تو پچھ ہے“ ”پانچویں جو نمبروں رہا وہ سمیہ عثمان کا تھا۔“ ”وہ مہربان ہے“ ”اچھی تحریر تھی“ موضوع بھی اچھا لگا۔ اینڈ میں بہت زبردست میسج تھا۔ سلمیٰ فقیر حسین کے ناولٹ ”ہمد و مرید“ میں ایک جگہ تو بہت ہی آئی جب دو لہامیاں اپنی دلہن کو رکشے میں رخصت کروا کے لے گئے، بہت خوب۔ دوسرا ناولٹ ”طن کی ساعتیں“ تھا۔ اس کہانی میں ویسے تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ لیکن ارفع کا شبیر جان سے ایک دم فری ہو جانا اور بعد میں گھر والوں کے راضی نہ ہونے پر کورٹ میرج کی بات کرنا اچھا نہیں لگا مگر شبیر جان نے جس طرح اسے سمجھایا اور اپنی محبت کو رسوا نہ کرنے کی جو بات کی وہ من کو بھائی۔ رفاقت جاوید کا ناولٹ ایک تو اتنا طویل تھا اور پڑھ کر زیادہ مزا بھی نہیں آیا جو ان کے ساتھ ہوا وہ ہی بنی کے ساتھ ہو گیا، جبکہ یہ حقیقت ہے کہ ہر انسان الگ تھیل لے کر آتا ہے۔ مجموعی طور پر کہانی زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ معذرت کے ساتھ۔ ”کرن کے دسترخوان“ میں چھلی کے کباب لڑائی کروں گی اور آپ سے ایک ریکوئسٹ ہے کہ چکن جلیفیری کی ترکیب بتا دیں۔

”مجھے یہ شعر پسند ہے“ میں فوزیہ تمرث اور عاصمہ ندیم کا شعر اچھا لگا۔ ”یادوں کے درتپے“ میں سب کے انتخاب اچھے تھے۔ ”نمائے میرے نام“ میں اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، سب کے تبصرے پسند آئے۔ نشانورین نے کرن کے بارے میں جو بات کہی اس سے میں بھی سو فیصد متفق ہوں۔ کرن اتنا اچھا ہے کہ اسے پڑھ کر جو خراب بھی ہوا وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ کرن واقعی میں رہنمائی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

### الفشین فاروق۔ کراچی

سب سے پہلے ٹائٹل پر بات کرنا چاہوں گی ماڈل کا ڈریس میک اپ سینئر اسٹائل ہر چیز میں پرفیکشن کا خاص خیال رکھا گیا ہے ہاتھ میں لیتے ہی دل خوش ہو گیا۔ اس کے بعد حمد اور پھر نعت بہت اچھا لگا ایمان نازہ ہو گیا سبحان اللہ۔ اس کے بعد نصح باری سے ملاقات بہت اچھا لگا ڈرامہ تو سب دیکھتے ہیں لیکن جس کی تخلیق ہے اس سے متعلق بھی معلومات ہونا چاہیے۔ عروہ اور صارم کا انٹرویو بھی پڑھنے میں مزا آیا۔ اب کچھ کہانیوں پر تبصرہ کروں گی سمیہ عثمان کا افسانہ ”وہ مہربان ہے“ پڑھ کر مزا آیا یہ ایک سبق آموز کہانی ہے ہم اپنی ذات پر تو خوب خرچ کرتے ہیں لیکن اگر کوئی اللہ کے نام کی صدا لگائے والا آجائے تو ہم بغیر غور فکر کے ٹال دیتے ہیں یا دوپانچ روپے دے دیتے ہیں۔ سلمیٰ فقیر حسین کا ”ہمد و مرید“ پڑھ کر بہت انجوائے کیا ساری کہانی ہنستے ہنستے ختم ہوئی۔ عقیدت ملک کا کھل ناول ”دل ایک شہر ملاں“ ان مردوں سے متعلق کہانی ہے جو رشتوں میں توازن رکھنا نہیں جانتے ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیتے ہیں محبت کرنے پر آمیں تو سب کچھ بچھاؤ کر دیتے ہیں لیکن نفرت کرنے پر آمیں تو سب بھول جاتے ہیں ایسے مردوں کی تعداد اکثریت رکھتی ہے۔ عمرین اعجاز کا ”دل تو پچھ ہے“ ایک بہت ذہین ذہن کی تخلیق ہے اس کو میں نے دو مرتبہ پڑھا اور بہت ہی انجوائے کیا۔ ایک بچے کے کیا جذبات ہوتے ہیں ہم تو اسے پیار سے چھلتے ہیں دیتے اور کہتے ہیں لیکن اس کی بھی پسند ناپسند ہوتی ہے۔ کچھ دل کے فیصلے ہوتے ہیں جی آخر دل تو پچھ ہے۔ عفیہ مظفر ”مکافات عمل“ دل کو چھو جانے والی تحریر ہے ہماری اکثریت ماؤں کی بھی سمجھتی ہے کہ لڑکا شادی کے

بعد ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا تو آنے والی چاہے بے چاری مظلوم بھی ہو تو اس کو سب مل کر دباتے ہیں اور داماد ان ماؤں کو غلام چاہیے ہوتے ہیں آنے والی بھی جذبات رکھتی ہے اس کا بھی دل ہے اپنا سب کچھ چھوڑ کر آئی ہے لیکن اس کے ساتھ غیردوں جیسا سلوک اس کی دی گئی قربانیاں بے کار کر دی جاتی ہیں اس کو ہر طریقے سے بد دل کر دیا جاتا ہے لیکن دنیا گول ہے ہم کچھ بھی کریں سب گھوم پھر کے ہمارے آگے آ جاتا ہے۔ اور ہم ہاتھ ملتے رہ

### ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
بسا و دل	آمنہ ریاض	500/-
درد و موسم	راحت جبین	750/-
زندگی ایک روشنی	رخسانہ گارہدان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ گارہدان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
حیرت نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فازہ افتخار	500/-
بہول بھلیاں تیری گھیاں	فازہ افتخار	600/-
بھلاں دے رنگ کالے	فازہ افتخار	250/-
یہ گھیاں یہ چہارے	فازہ افتخار	300/-
میں سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
تج مکمل پہ پانہ نہیں	رنیہ جمیل	200/-
درد کی منزل	رفیہ جمیل	200/-
میرے دل میرے مسافر	حمیمہ قریشی	300/-
تیری راہ میں دل لگی	سمونہ خورشیدی	225/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	400/-

ناول بھگانے کے لئے نئی کتاب ڈاک خرچ 30/- روپے  
سکھانے کا پتہ:  
مکتبہ مہمان ڈائجسٹ۔ 37 اردو بازار، کراچی۔  
فون نمبر: 32216361



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

جائے ہیں۔  
فوزیہ ثمرت۔ گجرات  
تبر کا شمار تیرہ کی شام کو پادی حسین نے پایا کے ساتھ لا کر دیا۔ پہلے تو اپنے پیارے بیٹے ہادی حسین کو چوم پھوپھو جانی کا عزیز ڈائجسٹ کرن لا کر دیا۔ اور پھر اپنے پیارے

کرن کو۔  
سرورق پہ ماڈل دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا بلکہ گل گلزار ہو گیا۔ بھی پسند جو بے حد آیا۔ ماڈل کی مسکراہٹ پستہ گلر کا ڈریس اور بیسٹو اسٹائل سب کچھ بہت ہی رہا تھا۔ انٹرویو میں فصیح خان سے ملاقات اچھی رہی۔

”میری بھی سینے“ کافی کم عرصہ میں دونوں بہنوں نے اپنا مقام بنالیا ہے۔ ویل ڈن۔ انسان کی محنت اس کو کبھی مایوس نہیں کرتی۔ ”آواز کی دنیا سے“ صارم خان کی باتیں اچھی لگیں۔ بھی آواز اور اچھی آواز بھی ایک ساحر ہوتی ہے۔ اور یقین کریں پہلی دفعہ اس سلسلے کو دیکھیں سے بڑھا اگلے مہینے اگر آپ پرانی اداکارہ ہما نواب کا انٹرویو کریں تو خوشی ہوگی محترمہ ایک بار پھر T.V. پر نظر آ رہی ہیں۔ ”پیغام دوست“ اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ زندگی کے اس حصے میں جہاں دوست دوستی خواب لگتے ہیں۔ بہر کیف زندگی کی کتاب سے ہم بھی کچھ بھول نما دوست کو تلاش کر کے آپ کے ساتھ شیر کر لیں گے۔

”مقابل ہے آئینہ“ صدف کی باتیں اچھی تھیں۔ اتنی چھوٹی عمر میں پختہ سوچ یقیناً ”زندگی میں اپنی خواہش کو حاصل کر پائے گی یہ لڑکی۔“

مکمل ناول میں سب سے پہلے ”دل اک شرملاں“ کو پڑھا۔ ساری کہانی اچھی جاری ہے مگر پتا نہیں کیوں عتیقہ صاحبہ حمزہ کے ماضی سے پردہ نہیں اٹھا رہیں۔ ساحر کا حمزہ پہ اتنا ظلم ذرا بھی پسند نہیں آیا۔ جب ساحر نے اتنی تک دوسرے حمزہ کو حاصل کیا۔ تو اسے حمزہ پہ اعتبار بھی کرنا چاہیے تھا۔

”میرے دل میرے مسافر“ چوتھی اور آخری قسط تھی۔ مگر ابھی تک پڑھ نہیں سکی۔ ”ہدم ویرینہ“ سلسلی فقیر نے تو ہنسنا ہنسنا کے ماری دیا اور اس جملے نے تو بے تحاشا قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔

صبا خان۔ آزاد کشمیر

اس دفعہ کرن جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل ٹھیک ہی تھا۔ سب سے پہلے چھانٹ لگائی ”شام آرزو“ کی جانب۔ فرحانہ ناز ملک کافی خوبصورتی سے کہانی آگے بڑھا رہی ہیں۔ پلیز فرحانہ جی۔ سغان اور عقیدت کی ملاقات اب گروا دیں۔ دسویں قسط تک تو لازمی گرا دیں۔ اس کے بعد نفیسہ سعید کا اک ساگر ہے زندگی پڑھا۔ ابھی تو آغاز ہے۔ اس پر تبصرہ محفوظ ہے۔ رفاقت جاوید کا مکمل ناول کافی اچھا ہے۔ ناول خوبصورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ بالی کرن اچھی پڑھا نہیں۔ مستقل سلسلے پسند آئے۔

✽ ✽

ماہانہ کرن 290

